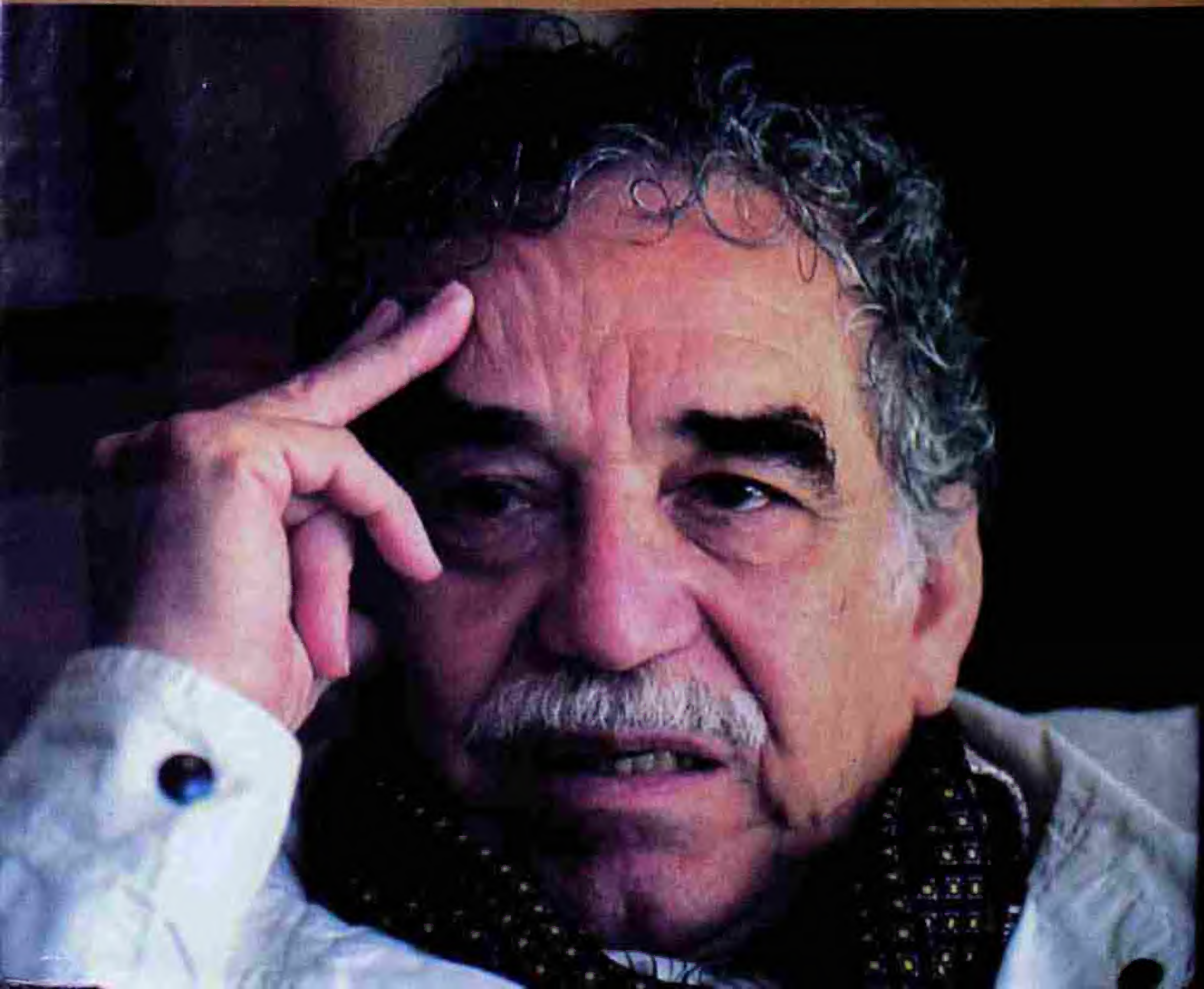
لاطینی امریکا کا نوبل انعام یافتہ ادیب

Gabriel Garcia Marquez

گبرئیل گارسیا مارکیز

(مکالمات، تخلیقات اور تنقیدات)

مرتب: سیدہ عطیہ



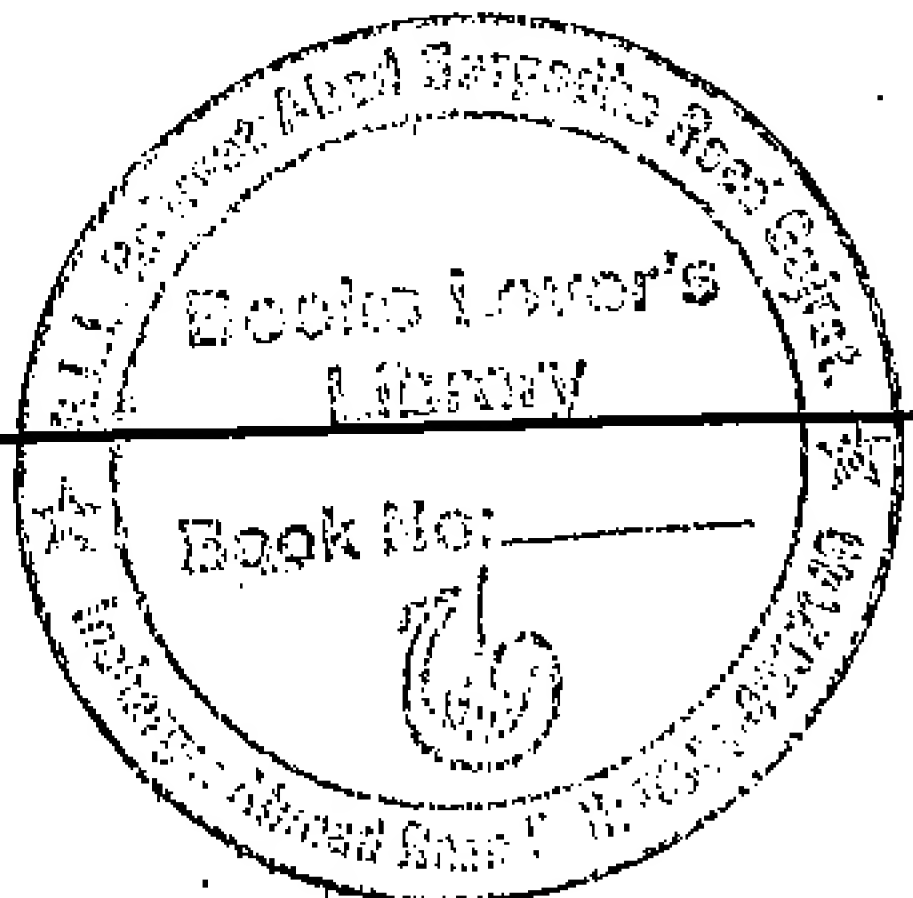
بہت خوبصورت انسان
کے لیے

لاطینی امریکا کا نوبیل انعام یافتہ ادیب

گیبرئیل گارسیا مارکیز

(مکالمات، تخلیقات اور تنقیدات)

مرتب: سیّدہ عطیہ



Book Time
Urdu Bazzar, Karachi

ادارہ Book Time کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیش نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

نام کتاب: گیبریئل گارسیا مارکیز

مرتب: سیدہ عطیہ

ناشر: بک پوائنٹ

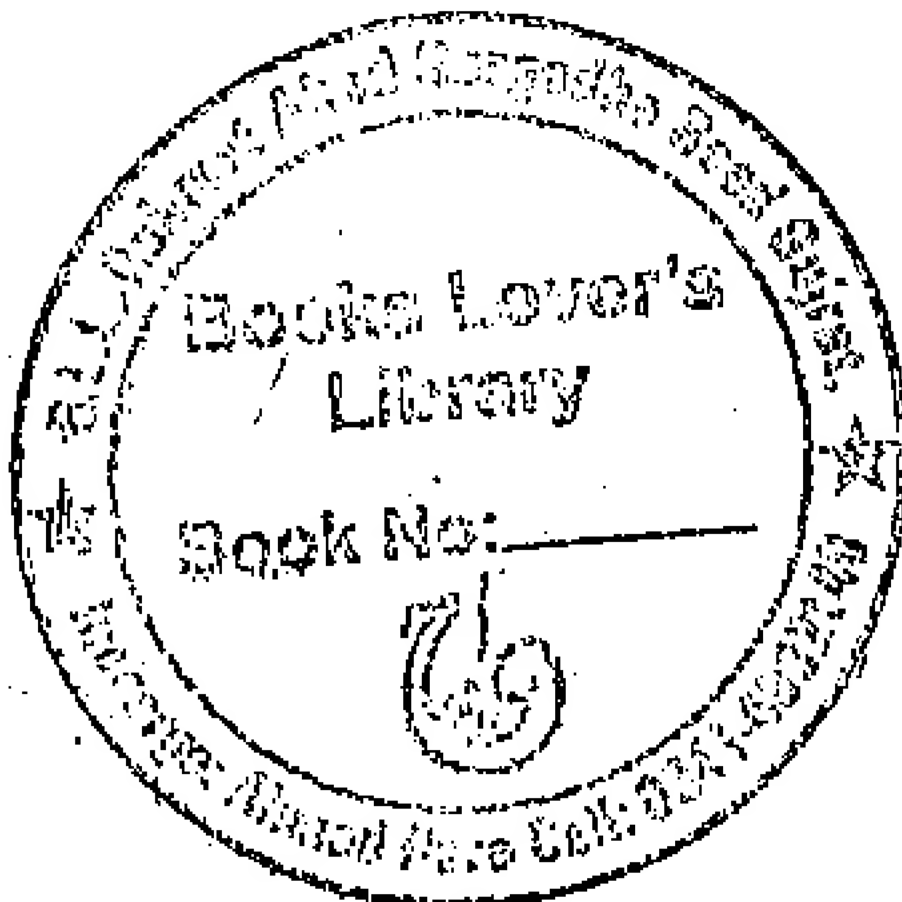
تعداد: 500

اشاعت سن: 2015ء

قیمت: =/700 روپے

انتساب

ازلی ابدی
تنہائی کے نام
جو ہر انسان کا
مقدر ہے



ترتیب

گیبرئیل گارسیا مارکیز: طلسماتی حقیقت نگار

گیبرئیل گارسیا مارکیز(Gabriel Garcia Marquez) 6 مارچ 1927 کو آراکاٹاکا(Aracataca) کولوبیا(Colombia) میں پیدا ہوا جو لاطینی امریکہ کا دوردراز ملک ہے اوران کی وفات 17 اپریل 2014 میکسیکو شہر،میکسیکو میں 87 برس کی عمر میں ہوئی۔وہ ہسپانوی زبان کا بے مثل ادیب ہے جسے بحیثیت ناول وافسانہ نگار، صحافی اوراسکرین پلے رائٹر عالمی شہرت حاصل ہوئی۔اس کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز طالبِ علمانہ زندگی میں ہی ہو گیا تھا جبکہ اُس نے چند سال قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ ہسپانوی زبان میں "Cien anos de soledad,1967" جس کا انگریزی ترجمہ " One Hundred Years of Solitude,1970" اور اُردو ترجمہ ''تنہائی کے سو برس'' کے عنوان سے کیا گیا، کی بے پناہ مقبولیت کے بعد گیبرئیل گارسیا مارکیز کو 1982ء میں ادب کا نوبیل انعام ملا۔اس ناول کی اشاعت سے قبل بھی اُس کے کئی عمدہ ناول قارئین میں بہت مقبول رہے۔ان میں ''پتوں کا طوفان'' "Leaf Strom and other stories,"، ''کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" No One Writes to the Colonel"، ''منحوس وقت'' "In Evil Hour"، ''سردار کا زوال'' "The Autumn of the Patriarch" اہم ہیں۔ادب کے نوبیل انعام کے بعد اس کے تمام ناولوں کو بے انتہا عالمی شہرت نصیب ہوئی۔خصوصاً ''پیش گفتہ موت کی روداد'' "Chronicle of a Death Fortold" اور ''وبا کے دنوں میں محبت'' "Love in the Time of Cholera" کا ادبی مقام ادب کے کسی سنجیدہ قاری کے لیے اجنبی نہیں۔

کولمبیا (جو مارکیز کی جنم بھومی ہے) کا کریبئین ساحل اور برازیل مل کر لاطینی امریکہ کا وہ حصہ ہیں جو افریقہ سے قریب ترین ہے۔ اس طرح افریقہ کی متنوع تہذیبی اور ثقافتی ہیتوں کے گہرے اور دور رس اثرات کولمبیا کے باشندوں کی زندگی کا حصہ ہیں۔ ان اثرات کے علاوہ مختلف خطوں اور تہذیبوں میں سفر کے ذریعے بھی مارکیز کو اپنی تہذیبی تشکیل میں مختلف کلچر کی باہم آمیزش کا شعور حاصل ہوا۔ چنانچہ وہ سفر اور اس سے حاصل شدہ مسحور کن تجربات کو تخلیقی شعور کا حصہ بناتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ اپنے تجربات کو بچپن کی یادوں اور ماضی کے ساتھ ہم آہنگ کر کے بنیادی تخلیقی فکر حاصل کرتا ہے اور تجربات کے ماضی و حال میں تلازماتی آہنگ پیدا کرتا ہے۔ اُسے اپنی بچپن کی یادوں کی بازیافت کا شوق ہے۔ یوں وہ اپنی کہانیوں میں یادوں کی بازیافت کے ساتھ ساتھ خود بھی ماضی میں جیتا ہے۔ مخصوص فکری رویے، بچپن کی یادوں کی بازیافت، کلچرل اور وراثتی اثرات سب باہم یکجا ہو کر مارکیز کے اسلوب کو طلسماتی ندرت عطا کرتے ہیں جو اس کے بیانیہ کا امتیازی وصف تخلیق کرتا ہے۔ چنانچہ مارکیز کے ہاں حقیقت کو دیکھنے کا بھی ایک مخصوص تخیلی اور طلسماتی انداز ہے۔ اس طلسماتی اندازِ نظر میں تہذیب کی مختلف النوع ہیئتوں کی کارفرمائی ہے۔ جہاں افریقی مقامی تہذیبی ہئیتیں بہت منفرد اور مضبوط ہیں۔ کسی علاقے کے ادب، مصوری، موسیقی کا مخصوص اسلوب مختلف تہذیبی ہیئتوں کے اشتراکِ عمل سے پیدا ہوتا ہے اور یہی اسلوب جمالیاتی اظہار کا مظہر بھی ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جمالیاتی اظہار مختلف تہذیبی ہیئتوں کے باہم یکجا ہونے سے اسلوب پذیر ہوتا ہے اور اپنے طلسماتی اندازِ نظر میں تہذیبی ہیئتوں کو کلچر کے مختلف النوع عناصر کے یکجا ہونے سے مشروط کرتا ہے۔

مارکیز اپنی تخلیقات کے لئے ایک مخصوص اور خاص تنقیدی رویہ رکھتا ہے۔ وہ حقیقت کے جامد اور محدود وژن کو تخلیقی اعتبار سے ناپسند کرتا ہے اور ان کتابوں کو جو اپنے آخری صفحے پر ختم ہو جاتی ہیں، بہت محدود کن پاتا ہے۔ اسی طرح وہ عالمگیر فکری رویہ کا حامل ہے کیونکہ وہ کولمبیا کی سیاسی استبداد اور ملک کی سماجی و سیاسی حقیقت کو موضوع بنانے کے بجائے پوری موجودہ اور آئندہ دنیا کی حقیقت کو منعکس کرنا چاہتا ہے۔ خصوصاً زندگی کی حقیقت کو منعکس کرنا اُس کا ادبی رویہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ زندگی کی کسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے تحقیر و طرف داری کے پہلو سے بچتا ہے۔ اگرچہ وہ ذاتی سیاسی انتخاب کے حق کو محفوظ رکھتا ہے لیکن ادب میں سیاسی وابستگی یا ''وابستہ ادب'' کو درست نہیں سمجھتا۔ ''فوری سیاسی حقیقت سے وابستگی'' اور ''حقیقت سے وابستگی'' دونوں میں بنیادی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ ادیب سے حقیقت سے وابستہ ہونے کا متقاضی ہے۔ اس طرح

وہ تخیل اور فینٹسی میں بھی حدِ امتیاز کا احساس پیدا کرتا ہے۔ مارکیز تخلیق میں تخیل کی اہمیت کا قائل ہے جبکہ فینٹسی کو تخلیقی سطح پر رد کرتا ہے کیونکہ یہ حقیقت سے دور کرنے والا رویہ ہے اور اس طرح تحریر انتشار اور لغویت کا شکار ہو جاتی ہے۔ کولمبیا کے باشندے جو اساطیر، روایات، عقائد کو بہت فطری انداز میں روزمرّہ زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں، مارکیز اسے بھی زندگی کی حقیقت سے وابستہ کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اساطیر، روایات و عقائد کا حقیقت سے براہِ راست کیا تعلق ہے؟ مارکیز اس کا زندگی اور باشندوں سے حقیقی رشتہ تلاش کرتا ہے۔ ایسی اساطیر، روایات، عقائد، شگون، پیش قیاسیاں اور وہم جو کولمبیا کے باشندوں کی زندگی کے روزمرّہ میں فطری انداز میں داخل ہو گئی ہیں، مارکیز اسے مستند طور پر حقیقی زندگی کا حصہ سمجھ کر بیان کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے استناد کی حقیقی سطح کیا ہے؟

عقلیت پسند اور اسٹالسٹ لوگ حقیقت کے محدود تصور کے قائل ہیں جبکہ مارکیز ان مغالطوں یا عدم تناسب کو جو کہ اس کی تحریروں میں موجود ہے، اسے وسیع و عریض کرۂ ارض کی حقیقت کی ایک جہت تصور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ہاں مافوق الفطرت عناصر بھی حقیقت کی جہات میں شامل ہیں۔ اگرچہ ایک خاص اور مخصوص تہذیبی دائرے میں قید ادیب اور قاری حقیقت کا محدود تصور رکھتا ہے جو کسی دوسری تہذیب کے مافوق الفطرت عناصر کو غیر حقیقی تصور کرتا ہے۔ یہاں مارکیز کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا میں ایسی حیرت انگیز حقیقتیں ہیں جن کا بیانیہ فینٹسی معلوم ہوتا ہے۔ مارکیز اظہار کے ایسے ذریعوں کا بھی متمنی ہے جو ناقابلِ یقین حقائق کو بھی قاری کے لیے پر یقین بنا سکے۔ مارکیز کی تخلیقات نے جس طرح عالمی ادب اور فکر میں گراں قدر اضافہ کیا ہے اور دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے قاری کو گرد و پیش کی حیرت انگیز حقیقتوں کا ادراک بخشا ہے، اسی طرح اس کے اسلوب نے حقائق کے اَن ہونے پن کا یقین بھی دلایا ہے۔

''گیبریئل گارسیا مارکیز: مکالمات، تخلیقات اور تنقیدات'' میں ان تعارفی اور تنقیدی مضامین کو یکجا کیا گیا ہے جن میں اُردو ناقدین نے مارکیز کے سوانحی حالات و واقعات، ادبی و صحافتی زندگی اور کسی حد تک اس کی فنی تکنیک کاری کو موضوع بنایا ہے۔ سوانحی مضامین میں گیبریئل گارسیا مارکیز کی خودنوشت بعنوان ''چیلنج'' (ترجمہ: سید سعید نقوی) شامل ہے، علاوہ ازیں ''مارکیز کی سوانح'' از خالد جاوید، ''گیبریئل گارسیا مارکیز'' از دانیال شیرازی، ''گیبریئل گارسیا مارکیز کی یاد میں'' از غلام شبیر رانا شامل ہیں جبکہ تنقیدی مضامین میں ''زوال آمادہ تنہائی اور گارسیا مارکیز'' از اشولال، ''گارسیا مارکیز: سیاست اور نثر'' ایڈتھ گراسمین / پروفیسر خالد سعید، ''مارکیز

: یاد، طلسم اور تخیل کا امتزاج'' از ڈاکٹر امجد طفیل، ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' از پروین افشاں راؤ، ''گارسیا مارکیز اور معاصر لاطینی امریکی فکشن'' از عبدالعزیز ملک، ''مارکیز کے حُسن پرست بوڑھے کی یادیں'' از فاروق سرور، ''محبتوں کے آسیب : پیش لفظ، ایک نوٹ'' از ضیاء الحق میں افسانوں اور ناولوں کا کسی حد تک تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مارکیز کے سوانحی حالات و واقعات پر مشتمل مضامین غیر ادبی تحریروں کے زمرے میں آتے ہیں لیکن بین الاقوامی شہرت کے حامل ادیب کی ذہنی ساخت و پرداخت اور نشوونما کے ارتقائی مراحل کا حقیقی شعور بھی ادب کی بقا اور ترقی کے لیے اہم ہے۔

''گیبریئل گارسیا مارکیز: مکالمات، تخلیقات اور تنقیدات'' کی اشاعت سے قبل سہ ماہی ''آج'' (کراچی) نے مارکیز کی تخلیقات کے تراجم پر مشتمل ایک خصوصی شمارہ ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔ مارکیز کی تخلیقات کا انتخاب کتابی صورت میں بعنوان ''منتخب تحریریں'' ادارہ ''آج'' سے ہی جولائی ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا جبکہ اسی کتاب کی تیسری اشاعت مارچ ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔ اس انتخاب کو اس حوالے سے اہمیت حاصل رہی کہ اس کے ذریعے مارکیز کے افسانوی ادب کے اُردو تراجم کی ایک مربوط صورت سامنے آئی۔ ''منتخب تحریریں'' کے بعد تاحال گارسیا مارکیز کے منتخب افسانوں اور نثری تخلیقات کے علاوہ اس کے انٹرویوز اور دیگر تحریروں کے ترجمے تسلسل سے شائع ہوتے رہے، جن کا یکجا ہوکر قارئین کے مطالعے میں آنا ادب کی فکری وفنی ارتقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس سے عالم گیر شہرت کے حامل ادیب کی پاکستانی قارئین میں مقبولیت کا گراف مزید بلند ہوگا۔ گارسیا مارکیز کی تخلیقات کے مترجمین، قارئین اور ناقدین میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے چنانچہ اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ مارکیز پر مختلف جرائد ورسائل میں شائع شدہ سوانحی وتنقیدی مواد کو صحت کے ساتھ مرتب کیا جائے بلکہ مارکیز کے ادبی اور فنی نظریات کو بھی قارئین تک پہنچایا جائے۔ زیرِ ترتیب مجموعے میں مارکیز کے نوبیل خطبے کا متن، اُنیس افسانے، ایک ناولٹ، ایک صحافتی مضمون (کالم)، چار انٹرویوز اور مارکیز کا ای میل پیغام کے علاوہ بچوں کی کہانیاں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ادارہ ''آج'' سے قبل ''ذہن جدید'' (دہلی) نے مارکیز کے افسانوی مجموعہ (Big Mama's Funeral) کے آٹھ افسانوں کے اُردو ترجمے شائع کیے۔ یہاں ''ذہنِ جدید'' سے لیے گئے اُن آٹھ افسانوں کے تراجم کو شامل کیا گیا ہے تاکہ قاری مارکیز کے اہم افسانوی مجموعے (Big Mama's Funeral) کے مترجمین کے منفرد لہجے سے حظ اُٹھا سکیں۔ علاوہ ازیں چند افسانوں کے دو مختلف تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں تاکہ قارئینِ ادب

ایک ہی تحریر کے لیے دو منفرد لہجوں کے آہنگ میں سے بہترین کے انتخاب کا حق محفوظ رکھیں۔ مارکیز کی تخلیقات کے ترجمہ نگاروں کی مستحسن اور قابلِ قدر کارکردگی بھی قابلِ تعریف ہے کیونکہ ترجمہ نگاری ایک بے حد دقت طلب کام ہے۔ مارکیز بھی اسے دوبارہ تخلیق سا مشکل ترین عمل قرار دیتا ہے۔ باوجود اس کے مترجمین کو تخلیقی فنکار کی سی پذیرائی نصیب نہیں ہوتی بلکہ اُسے وہ قدر و منزلت بھی میسر نہیں آتی جو اس دقیق، مشکل اور پیچیدہ کام کی انجام دہی کے فریضے کے عوض ان کا حق بنتی ہے، اس انتخاب کے مترجمین نے گارسیا کے اسلوبِ بیان کی طلسماتی آہنگ کو تراجم میں صحت مندانہ انداز میں قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس انتخاب و ترتیب کے لیے گارسیا مارکیز کی تخلیقات کے مترجمین، رسائل و جرائد کے مدیران اور اُن اشاعتی اداروں کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی، گارسیا مارکیز کی تخلیقات کے حوالے سے جن کے شائع شدہ تراجم، سوانحی و تنقیدی مواد علاوہ ازیں خصوصی شخصیت نمبر اور بین الاقوامی ادب نمبر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ رسائل و جرائد میں ''ذہنِ جدید'' (دہلی)، ''دنیا زاد''، ''آج''، ''بادبان''، ''قومی زبان'' (کراچی)، ''نقاط'' (فیصل آباد)، ''سطور'' (ملتان)، ''ادبِ لطیف''، ''امرِ بیل''، ''فنون''، ''کہانی گھر'' (لاہور)، اور ''تناظر'' (گجرات) قابلِ ذکر ہیں۔ ''ادب کا عالمی دریچہ'' (اسلام آباد)، ''تجزیہ'' (کراچی)، ''نوبیل ادبیات'' (کراچی)، ''ماسٹر پیٹر کی داستانِ محبت'' (ملتان)، ''کتھا نگر: لاطینی امریکی کہانیاں'' (لاہور)، گابریئل گارسیا مارکیز: منتخب تحریریں'' (آج، کراچی)، ''تنہائی کے سو سال'' (فکشن ہاؤس، لاہور)، ''نوبل انعام یافتہ ادیبوں کے بہترین افسانے'' (نواب سنز، راولپنڈی)، '' گابریئل گارسیا مارکیز: فن اور شخصیت'' (شہرزاد، کراچی) سے بھی خصوصی استفادہ کیا گیا۔ جن کے لیے میں ان اداروں کی انتہائی شکرگزار ہوں۔ انفرادی سطح پر جن پرخلوص افراد کا تعاون مجھے ہر حال میں میسر رہتا ہے ان میں میرے سبھی اہلِ خانہ، خصوصاً میری والدہ، بھائی، بھابی، بہن خصوصی شکریے کی حق دار ہیں جنہوں نے مجھے ہمیشہ پرسکون مطالعے کا موقع فراہم کیا۔ ایم۔ خالد فیاض (مدیر: تناظر) نے اپنی ذاتی لائبریری سے مواد کی فراہمی میں انتہائی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا، علاوہ ازیں اپنے قیمتی اوقاتِ کار اور بے حد و حساب مصروفیات میں سے وقت دے کر اس مجموعے کی ترتیب و توازن کے لیے عمدہ تکنیکی مشورے فراہم کیے اُن کا یہ احسان مجھ پر قرض ہے۔

مارکیز کے بنیادی نقطۂ نظر پر بات اختتام کرنا چاہوں گی کہ زندگی کی شناخت کا پیمانہ ہر تہذیب میں یکساں سطح کا حامل نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کتنی ہی مافوق الفطرت اور طلسماتی کیوں نہ ہو،

اگر ایک تہذیب اپنے محدود وژن کا شکار ہو جائے اور دیگر تہذیبی تغیرات سے لاتعلقی کی روش اختیار کرے، تو تنہائی اس کا مقدر ہوتی ہے۔ یہی اس انتخاب کا بنیادی مقصد بھی ہے کہ پاکستانی ادب کو فکری سطح پر تنہائی اور لاتعلقی کے عذاب سے بچایا جائے۔

سیّدہ عطیہ

سوانحی مطالعہ

چیلنج

گیبریئل گارسیا مارکیز / سید سعید نقوی

یہ بات تو میرے گمان سے بھی باہر تھی، کہ ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے نو ماہ بعد ہی میری پہلی کہانی فن ڈی سیمانا (Fin de Semana) میں شائع ہو جائے گی، جو بگوٹا سے شائع ہونے والے، سب سے دلچسپ اور معیاری اخبار ایل اسپیکٹیڈور کا ہفتہ وار ادبی ضمیمہ تھا۔ اس کے بیالیس دن بعد ہی میری دوسری کہانی بھی شائع ہو گئی تھی۔ میرے لیے سب سے زیادہ خوشگوار حیرت اس کے ساتھ ضمیمے کے ایڈیٹر ایڈورڈو وضالامیا بورڈا (Eduardo Zalamea Borda)، جو یولیسس کے قلمی نام سے لکھتے تھے، ان کا تبصرہ تھا۔ یہ اپنے وقت کے سب سے مشاق نقاد تھے، جن کی نئے رجحانات پر گہری نظر تھی۔

یہ سب اتنا غیر متوقع تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ اپنے والدین سے وعدے کا پاس کرتے ہوئے میں نے فروری ۱۹۴۷ء میں بگوٹا سے قانون کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس وقت میں شہر کے مرکز میں واقع ایک ہاسٹل میں رہا کرتا تھا، جس پر عموماً مجھ ہی جیسے دوسرے بحرِ اوقیانوس کے ساحل سے متصل ممالک سے آئے ہوئے طلبہ قابض رہتے۔ فارغ دوپہروں میں، بجائے اپنے لیے دو پیسو کمانے کے، میں کمرے یا کیفے میں بند کتابیں پڑھتا رہتا۔ ان کتابوں کے حصول میں بھی قسمت کا ہی دخل تھا۔ کیونکہ میرے جو دوست کتاب خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے، وہ مجھے اتنے مختصر وقت کے لیے کتاب ادھار دیتے کہ مجھے راتوں کو جاگ کر انہیں ختم کرنا پڑتا۔ اب تک میں نے ذیپاقرا (Zipaquira) کے اسکول میں مہیا کتابیں ہی پڑھی تھیں، لیکن وہ تو جیسے صحیفوں کا ایک مدفن تھا۔ جب کہ یہ کتابیں تو تنور سے نکلی گرم نان کی مانند تھیں۔ جو دوسری جنگِ

عظیم کے تعطل کے بعد بیونس آئرس سے نئے تراجم کی شکل میں شائع ہوئی تھیں۔خوش قسمتی سے اس طرح میں ایسے معروف ادیبوں سے روشناس ہوا جیسے: بورخیس، ڈی ایچ لارنس، ہکسلے، گراہم گرین، چیسٹرٹن، ولیم آئرش اور کیتھرین مینسفیلڈ وغیرہ۔

عموماً تو یہ کتابیں ہماری پہنچ سے دور دکانوں کی کھڑکیوں میں سجی رہتیں۔لیکن چند کاپیاں طلبہ کے کیفے میں گردش کرتیں۔ یہ کیفے مختلف صوبوں سے آئے طلبہ کے مابین ثقافتی تبادلوں کا اہم مرکز تھے۔بہت سے طلبہ تو ان کیفوں میں اپنی میز سالہا سال مخصوص کرا لیتے۔ان کی ڈاک، یہاں تک کہ منی آرڈر بھی یہاں کیفے میں ہی پہنچتے۔ان کے مالکان اور چند قابلِ بھروسہ ملازمین کی فراخدلی سے یونی ورسٹی کے کئی طلبہ فیضیاب ہوئے۔ملک کے کئی کامیاب پیشہ ور افراد غیر حاضر اساتذہ سے زیادہ ان کیفے میں بننے والے تعلقات کے مقروض ہیں۔

میرا پسندیدہ کیفے ال مولینو(ELMolino) تھا، جہاں زیادہ تر بزرگ شاعر بھرے رہتے۔یہ اوینڈیا ہیمینیز(Vandia Jiminez de Quesada)اور کریرا سیپٹیما(Carrera Septima)کے سنگم پر واقع، میرے ہاسٹل سے محض دو سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔یہاں طلبہ کو میز مخصوص کرانے کی سہولت نہیں تھی۔مگر ہم اردگرد کی میزوں پر بیٹھ کے، کیفے میں ہونے والی ادبی بحثوں سے اتنا سیکھ لیتے جو کتابی تعلیم سے بہتر ہوتا۔یہ ہسپانوی طرز کا ایک بہت وسیع اور شاندار کیفے تھا، اس کی دیواریں سینٹیاگو ڈیلگاڈو(Santiago Delgado)نامی مصور کی اس نقش نگاری سے مزین تھیں جو ڈان کوئیزوٹ کی'' ہوائی چکیوں کے درمیان جنگ'' کے پس منظر میں بنائی گئی تھیں۔میری جگہ مخصوص تو نہیں ہوتی تھی، لیکن میں ویٹر کی منت سماجت کر کے ہمیشہ لیون ڈی گریف(Leon De Grief)جیسے استاد کے نزدیک نشست حاصل کر لیتا۔باریش، خوش دل لیکن اکھڑ مزاج، لیون اپنی ادبی گفتگو، اوّل شام اس وقت کی معروف شخصیات کے ساتھ شروع کرتے، اور رات گئے سستی شراب سے سرشار اپنے شطرنجی طلبہ کے ساتھ ختم کرتے۔ملک بھر میں فنون لطیفہ سے وابستہ شاید ہی کوئی ایسی قابلِ ذکر ہستی ہوگی جو اس میز پر نہ بیٹھی ہو۔ہم لوگ اپنی میزوں پر دم سادھے بیٹھے رہتے کہ کوئی لفظ سماعت سے محروم نہ رہ جائے۔حالانکہ ان کی گفتگو کا بیشتر وقت سیاسی نیرنگیوں کے بجائے خواتین کے ذکر میں گزرتا۔پھر بھی وہ کوئی ایسی بات ضرور کہہ دیتے جو ہمارے لیے نئی ہوتی۔

سب سے زیادہ متوجہ بحرِ اوقیانوس کے ساحلی علاقوں کے طلبہ تھے۔ان کا اتحاد سیارا کے عوام کے خلاف کیریبین سازشوں کی بجائے کتابوں کا نشہ تھی۔ایک روز ہورغے ایلیسی نوزا(Jorge

Espinosa) جو قانون کا طالب علم تھا اور جس نے مجھے بائبل کی راہ سجھائی تھی، اور حضرت ایوبؑ کے ساتھیوں کے نام ازبر کرنے پر مجبور کیا تھا، اس نے میرے سامنے میز پر ایک ضخیم کتاب رکھی، اور ایک بشپ کی سی اتھارٹی کے ساتھ کہا "یہ ہے بائبل نمبر دو۔"

ظاہر ہے کہ یہ جیمس جوائس کی ''یولی سیز'' تھی۔ جو میں نے ادھر ادھر سے ایسے ہی بھاگتے دوڑتے پڑی تھی، لیکن پھر مجھ سے برداشت نہ ہوئی، یہ ایک بے شرمی کی حد تک احمقانہ بات تھی۔ کئی برسوں کے بعد ایک اصلاح پذیر نوجوان کے طور پر میں نے اسے سنجیدگی سے دوبارہ پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ یوں میں نے اپنی ذات میں وہ حقیقی زندگی دریافت کی جو تا حال میری آنکھ سے اوجھل تھی۔ اس سے مجھے وہ تکنیکی مہارت ملی کہ زبان کی پیچیدگیوں سے کیوں کر آزادی حاصل کی جائے، اور زمان و مکان کو اپنی تحریروں میں مرتب کرنے کا کیا سلیقہ ہے۔ ہاسٹل میں میرے کمرے کا ایک ساتھی ڈومینگو ویگا (Vega Domingo) تھا۔ ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ، جو سکری (Sucre) میں گزرے بچپن کے ایام سے ہی میرا لنگوٹیا تھا، وہ بھی میری طرح کتابوں کا دیوانہ تھا۔ ایک رات ویگا میرے کمرے میں آیا، اور نئی خریدی تین کتابوں میں سے ایک مجھے تھما دی کہ اسے پڑھتے پڑھتے سو جاؤں۔ لیکن اس کا مجھ پر بالکل الٹا اثر ہوا۔ مجھے دوبارہ کبھی پھر وہ سکون کی نیند نصیب نہ ہوئی۔ وہ کافکا کی ''میٹا مورفوسس'' تھی، جو لوساڈا نے بیونس آئرس سے شائع کی تھی۔ اس کی پہلی سطر ہی نے میری بقیہ زندگی کا ایک نیا رخ متعین کر دیا، جسے آج ادبی دنیا میں ایک مستند طرزِ نگارش کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ''گریگور سیمسا جب اپنے پریشان کن خوابوں سے ایک صبح بیدار ہوا تو اس نے دریافت کیا کہ وہ ایک عظیم الجثہ کیڑے میں تبدیل ہو چکا ہے۔''

یہ بہت پراسرار کتابیں تھیں۔ ان کی خطرناک تحریریں نہ صرف میرے گزشتہ مطالعے سے مختلف تھیں، بلکہ اکثر متضاد بھی۔ مجھے ان سے یہ سبق ملا کہ حقائق کو تحریر کرنا ہی ادب نہیں۔ صرف انکی طرف اشارہ ہی کافی ہے۔ حقائق کے بارے میں ثبوت کے لیے مصنف کی تخلیقی قوت اور آواز کی سچائی ہی کافی ہے۔ یہ شہرزاد ہی ہے، لیکن اپنی نسائی خیالی دنیا میں نہیں کہ جہاں سب کچھ ممکن تھا بلکہ ایک جہانِ شکستہ میں کہ جہاں سب کچھ لٹ چکا تھا۔

میٹا مورفوسس نے میرے دل میں اس اجنبی جنت میں بود و باش کی ناقابلِ برداشت تمنا پیدا کر دی۔ اگلی صبح کے سورج نے مجھے اس ٹائپ رائٹر پر جھکا پایا جو ڈومنگو ویگا نے مجھے عاریتاً دیا تھا۔ میں کافکا کی اس کہانی کی طرز پر ایک کہانی کا متلاشی تھا کہ جس میں ایک بیوروکریٹ ایک عظیم الجثہ کاکروچ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگلے چند روز میں اس خوف سے یونی ورسٹی نہیں گیا

کہ کہیں اس کہانی کے سحر سے آزاد نہ ہو جاؤں۔ رشک کے جذبات نے مجھے لکھتے رہنے پر آمادہ رکھا۔ پھر ایڈورڈو بورڈا نے ایک شکایتی مضمون لکھا، جس میں اس بات کا شکوہ تھا کہ کولمبیا کے مصنفوں کی نئی نسل میں کوئی اہم نام موجود نہیں اور مستقبل قریب میں اسے امید کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آ رہی۔ نہیں معلوم مجھے کس بات نے اکسایا، اپنی نسل کی بدنامی نے یا اس مضمون کے اشتعال آمیز انداز نے۔ لیکن اسے غلط ثابت کرنے کے لیے میں دوبارہ اپنی کہانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے میٹا مورفوسس میں زندہ لاش کو کے پلاٹ کو وسعت دی اور کہانی کو اس کی استعاراتی آلائشوں اور حشریاتی تعصبات سے آزاد کیا۔

میں پھر بھی ایسی غیر یقینی کا شکار تھا کہ ایل مینو میں اس کا تذکرہ اپنے کسی ساتھی سے نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ اپنے ہم عصر قانون کے طالب علم، گونزالو مولارینو (Gonzalo Mallorino) سے بھی نہیں۔ کلاس کی بوریت سے بچنے کے لیے میں جو شاعرانہ نثر پارے لکھا کرتا، وہی ان کا واحد قاری تھا۔ میں نے اس کہانی کو اتنی بار درست کیا اور دہرایا کہ تھک گیا۔ آخر کار میں نے ایڈورڈو ضالمیا، جس سے میں کبھی نہیں ملا تھا، اس کے نام ایک نجی خط لکھا، گو اس خط کا مجھے اب ایک لفظ بھی یاد نہیں۔ خط اور کہانی، ہر چیز، ایک لفافے میں بند کر کے بذاتِ خود ایل اسپیکٹیڈور کے استقبالیے پر لے گیا۔ وہاں موجود دربان نے مجھے دوسری منزل پر موجود ضالمیا کو خود یہ لفافہ پیش کرنے کی دعوت دی، لیکن اس خیال سے ہی میرے چھکے چھوٹ گئے اور میں وہ لفافہ دربان کے پاس چھوڑ کر ہی بھاگ آیا۔

یہ منگل کے روز ہوا تھا۔ مجھے اپنی کہانی کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہ شائع ہو بھی گئی تو ایسا فوراً تو ہونے سے رہا۔ اس دوران اگلے دو ہفتے میں نے بے چینی سے ایک کیفے سے دوسرے کیفے کے چکر کاٹ کر گزارے کہ ہفتہ کے روز والے واقعے کے خوف پر قابو پا سکوں۔ یہاں تک کہ جب ۱۳ ستمبر کو میں ایل میلینو پہنچا تو میری نظر ایل اسپیکٹیڈر پر پڑی جس میں میری کہانی ''تیسرا استعفیٰ'' پورے صفحے کی چوڑائی پر پھیلی ہوئی تھی۔

میرا پہلا ردِعمل تو یہ اندوہناک ادراک تھا کہ میرے پاس اخبار خریدنے کے لیے پانچ سینٹو بھی نہیں ہیں۔ یہ میری غربت کا بین ثبوت تھا۔ کیوں کہ اخبار ہی نہیں پانچ سینٹو تو ضرورت کی کئی چیزوں کی خریداری کے لیے ناگزیر ہیں، مثلاً ایک کپ کافی، ٹرالی کا کرایہ، ٹیلیفونی کال یا جوتے کی پالش۔ میں موسلا دھار بارش کی پرواہ کیے بغیر فوراً باہر لپکا کہ شاید کوئی ترس کھا کر مجھے پانچ سینٹو دیدے، لیکن نزدیکی کیفے میں میرا کوئی شناسا موجود نہ تھا۔ ہاسٹل میں بھی چھٹی کے دن کا سناٹا

گونج رہا تھا، صرف مکان مالک موجود تھی جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ کیوں کہ اس کا تو میں پہلے ہی دو مہینے کے کرائے یعنی دو سو بیس بار پانچ سینٹو کا مقروض تھا۔ کسی بھی امکانی صورتِ حال کے لیے تیار ہو کر میں پھر باہر نکلا۔ اسی وقت غیب سے بھیجا ہوا ایک آدمی ٹیکسی سے اترا، جس کے ہاتھ میں ایل اسپیکٹیڈر تھا، میں نے فوراً ہی اس سے یہ اخبار مانگ لیا۔

یوں میں نے اپنی پہلی شائع ہوئی کہانی پڑھی تھی، جس کے ساتھ اخبار کے مصور ہرمن میرینو کا بنایا خاکہ بھی تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں چھپ کر ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالی۔ ہر سطر میں یہی سبق تھا کہ چھپی ہوئی تحریر ڈوب بھی سکتی ہے۔ مجھ پر یہ تاریک حقیقت منکشف ہوئی میں نے کہ ایک عالمگیر جینیس کی نقالی میں، انتہائی محبت اور محنت سے جو حقیری کوشش کی تھی وہ کتنی مبہم اور کمزور تحریر تھی۔ بمشکل تین یا چار قابلِ ذکر جملوں پر مشتمل۔ کوئی بیس برس گزر جانے کے بعد میں نے اسے دوبارہ پڑھنے کی جرأت کی، تو جذبۂ ترحم بھی میرے اس فیصلے پر اثر انداز نہ ہو سکا جو پہلے سے زیادہ بے رحمانہ تھا۔

ایک بڑی دشواری یہ ہوئی کہ دوستوں کا ایک گروہ میرے کمرے پر حملہ آور ہوا، ہاتھوں میں اخبار اٹھائے وہ میری کہانی کے گن گا رہے تھے، گو مجھے یقین تھا کہ وہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آئی ہے۔ یونی ورسٹی کے ہم عصر طلبہ میں سے کچھ نے اسے پسند کیا، کچھ اس میں الجھ گئے اور جو زیادہ باشعور تھے انہوں نے چوتھی سطر سے آگے پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ لیکن گونزالو میلا رینو، جس کے ادبی شعور پر میں انگشت نمائی نہیں کر سکتا، اس نے کھل کر بلاتحفظ اس کی تعریف کی۔

مجھے سب سے زیادہ خوف ہورنے ایسپی نوزا سے تھا کہ ان کی تنقیدی تلوار کی پہنچ ہمارے حلقے تک ہی محدود نہیں تھی۔ میرے جذبات ملے جلے سے تھے، ایک طرف تو میں چاہتا تھا کہ ان سے فوراً ملاقات ہو جائے اور یہ معاملہ پار لگے، لیکن دوسری طرف ان کا سامنا کرنے سے خوف بھی آ رہا تھا۔ وہ منگل تک نظر نہیں آئے اور ان جیسے کتابوں کے جویا کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اور جب وہ ال مولینو دوبارہ نمودار ہوئے تو انہوں نے میری کہانی کی بجائی میری جرأت پر گفتگو شروع کی:

''تمہیں اندازہ تو ہوگا کہ تم نے کس مشکل میں قدم رکھ لیا ہے؟'' انہوں نے اپنی کنگ کوبرا والی سبز آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر کہا۔ ''اب تم معروف مصنفین کی صف میں کھڑے ہو گئے ہو، اور یہ جگہ برقرار رکھنے کے لیے تمہیں بہت محنت کرنی ہوگی۔'' یولائسس کے بعد صرف ان ہی کی رائے مجھ پر اثر انداز ہو سکتی تھی، اور میں سخت خوفزدہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل

کرتے میں نے سوچا کہ حفظ ماتقدم میں وہ بات کہدوں جو میرے خیال میں اس وقت سچ تھی، اور آج بھی اتنی ہی سچی ہے: ''یہ کہانی بہت فضول ہے!''

انہوں نے کسی فوری ردِعمل پر قابو رکھ کر کہا کہ وہ ابھی فیصلہ صادر کرنے سے قاصر ہیں کہ ابھی انہوں نے اسے محض سرسری ہی پڑھا ہے۔ ''لیکن''، انہوں نے مجھے سمجھایا ''اگر یہ اتنی فضول ہے بھی کہ جتنی تم کہہ رہے ہو، تب بھی یہ اتنی فضول نہیں ہے کہ تم اس سنہری موقع کو ضائع کر دو جو زندگی نے تمہیں فراہم کیا ہے۔''

''بہر حال وہ کہانی تو اب ماضی کا حصہ بن چکی'' انہوں نے اپنی بات کے اختتام پر کہا'' اب اہم یہ ہے کہ آئندہ کہانی کیسی ہوگی؟''

میں اتنا بونگا اور حیرت زدہ تھا کہ اس بات کو رد کرنے کے لیے دلائل سوچنے لگا، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اس سے زیادہ صائب تبصرہ میں آئندہ کبھی نہیں سنوں گا۔ انہوں نے اپنے اس غیر متزلزل مشورے کو مزید یوں واضح کیا کہ پہلے کہانی کو سوچو اور پھر اس کے اندازِ بیان کو۔ لیکن یہ ایک دوسرے کے باہم خدمت گزار ہیں، اور یہی کلاسیکی ادب کی جادوئی چھڑی ہے۔ ایک اور بات جو انہوں نے کہی، جو بعد میں بھی کئی بار موضوعِ گفتگو بنی، کہ مجھے سنجیدگی سے اور ایک غیر جانبدار قاری کے طور پر یونانی ادب کا دوبارہ مطالعہ کرنا چاہیے، اور محض ہومر کو ہی نہیں کہ جسے میں نے گریجوٹ کورس کے مضمون میں پڑھا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ ضرور پڑھوں گا، اور چاہا کہ ان سے کچھ یونانی مصنفوں کے نام بھی حاصل کرلوں، مگر انہوں نے موضوع بدل دیا، اور آندرے ژید کی کتاب ''جعلساز'' پر گفتگو شروع کر دی، جو انہوں نے اختتام ہفتہ پڑھی تھی۔ لیکن میری کبھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ ان کو بتاتا کہ ان کی گفتگو نے شاید میری زندگی کا رخ متعین کر دیا ہے۔ میں ساری رات جاگ کر آئندہ کہانی کی جزیات سمیٹتا رہا، جس میں پچھلی کہانی والی سست رفتاری نہ ہو

-

میرے خیال میں جن لوگوں نے مجھ سے کہانی کے بارے میں گفتگو کی تھی، وہ کہانی سے تو زیادہ متاثر نہیں تھے، شاید انہوں نے یہ کہانی پڑھی ہی نہیں تھی، یا پڑھی تھی تو سمجھے ہی نہیں تھے۔ وہ تو محض اس بات سے متاثر تھے کہ یہ کہانی اتنے اہم اخبار میں اتنے غیر معمولی اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ لیکن مجھے ضرور ادراک ہو گیا تھا کہ جو بنیادی خامیاں ممکن ہیں وہ دونوں ہی اس میں موجود ہیں۔ ایک الجھی ہوئی استعاراتی فکر، جسے میں نے جذبوں کو الٹ کر مزید پیچیدہ کر دیا تھا۔

اپنی دوسری کہانی کے لیے مواد کی تلاش میں، جب میں نے اپنی حقیقی زندگی کی یادوں کو

کریدا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے بچپن میں جو حسین ترین عورت دیکھی تھی، اس نے ایک بار کہا تھا کہ 'کاش وہ اس بلی میں سما جائے جسے وہ گود میں بٹھائے پیار کر رہی تھی۔' میرے دریافت کرنے پر اس نے یہ جواز پیش کیا تھا'' کیوں کہ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے!'' اس سے مجھے اپنی دوسری کہانی کا خاکہ ملا اور ایک خوبصورت عنوان بھی ''ایوا اپنی بلی میں سمائی ہوئی ہے۔'' باقی خانہ پری کے لیے میں نے پہلی کہانی کی مانند خیالی بیان گھڑ لیا۔ شاید اسی وجہ سے جیسے کہ اس زمانے میں ہم لوگ کہا کرتے تھے، اس کہانی میں خود تباہی کے بیج بو دیے۔

یہ کہانی بھی پہلی کہانی کی مانند، ہفتہ ۲۵ اکتوبر اسی طمطراق سے شائع ہوئی۔ ساتھ ہی کیریبین کے افق پر ابھرتے ہوئے مصور، ایزک گراؤ (Enrique Grau) کی خاکہ سازی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی اس دفعہ میرے دوستوں نے اسے ایک عام سی واردات کے طور پر قبول کیا، اور مجھے ایک معروف مصنف کے طور پر۔ جب کہ میں اپنی جگہ (کہانی میں موجود) غلطیوں پر افسردہ تھا۔ اس کی کامیابی کی طرف سے تو مشکوک رہا، لیکن اپنی امیدوں کو بلند ہی رکھا۔ بامِ عروج چند روز بعد آیا جب ضالمیا نے اپنی عرفیت یولی سیز میں اسے اپنے روزانہ کے اخباری کالم میں جگہ دی، وہ سیدھے مطلب کی بات پر آ گئے'' اس اخبار کے ادبی ضمیمے'' فن ڈی ساتا، کے قارئین نے یقیناً ایک نئے، طبع زاد سوچ اور پر جوش طبعیت کے مالک لکھاری کی تحریر کو پڑھا ہو گا۔ تخیل کی پرواز گو ہر ذی روح کا حصہ ہے۔ لیکن اس سے سادہ، گفتگو کے انداز میں ایسا موتی تراشنا، ہر اس بیس سالہ نوجوان کے بس کی بات نہیں، جو لفظ سے اپنا رشتہ استوار کر رہا ہو۔'' پھر مزید کسی ہچکچاہٹ کے انہوں نے لکھا؛'' گارسیا مارکیز کی شکل میں ایک اہم اور قابلِ ذکر مصنف پیدا ہوا ہے۔''

اس تبصرے نے مجھے انتہائی مسرور کیا، اور کیوں نہ کرتا۔ لیکن مجھے یہ بھی حیرت ہوئی کہ ضالمیا نے اپنے لیے مفر کا کوئی دروازہ باقی نہیں رکھا تھا۔ اب جب انہوں نے یہ سب کہہ ہی دیا تھا، تو ان کی یہ عنایت میرے شعور کے لیے ایک ایسی مہمیز تھی جو بقیہ زندگی میرے ساتھ رہے گی۔

اپنی مسلسل غیر حاضری اور باقاعدہ غفلت کے باوجود میں قانون کے سال اول کے امتحان میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس میں کچھ دخل تو آخری لمحات میں لگائے ہوئے رٹے کا تھا۔ اور زیادہ مشکل سوالات کے لیے میری پرانی ترکیب یہ تھی کہ میں جوابات میں ایک الجھاوا سا ڈال دیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس مضمون میں بالکل مزا نہیں آ رہا تھا اور یہی فکر تھی کہ اس بند گلی میں کہاں تک جا سکوں گا۔ کالج میں جتنے مضامین میرے پاس تھے، ان میں قانون سب سے کم سمجھ میں آتا، اور

میرے نزدیک سب سے غیر دلچسپ مضمون تھا۔ پھر مجھے یہ بھی گمان تھا کہ اب اتنا بڑا تو ہو گیا ہوں کہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کر سکوں۔ مختصر یہ کہ سولہ مہینے کسی معجزے کے اثر سے عبور کرنے کے بعد میرے ہاتھ چند اچھے دوست آئے، جن سے زندگی بھر کا ساتھ رہا۔

قانون سے میری واجبی سی دلچسپی بھی یولیسیز کے مضمون کے بعد بالکل ہی ختم ہو گئی۔ یونی ورسٹی میں کچھ طلبہ مجھے ماسٹرو کہہ کر بلاتے، اور بطور ایک مصنف متعارف کراتے۔ اس سے مجھے مزید حوصلہ ملا کہ ایسی کہانی بنا سیکھوں جو ماورائے عقل تو ہو لیکن قابلِ یقین بھی، بنا کسی جھول کے۔ میرے سامنے ماضی بعید کے کئی اہم نمونے تھے، مثلاً سوفوکلیز کی اوڈیپس ریکس، جس کا ہیرو، اپنے باپ کے قاتل کی تلاش میں خود اپنے آپ کو ہی قاتل پاتا ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو جیکب کی کہانی ''بندر کا پنجہ'' وہ مکمل کہانی جس میں ہر چیز حادثاتی ہے، موپاساں کی ''بااَل دی سوف'' اور اس قسم کے دوسرے کئی گناہ گار، خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ایک اتوار کی شب کا واقعہ ضرور ایسا ہے کہ اسے یہاں دہرانا چاہیے۔ گونزالو مالا رینو کے گھر واقع ایونڈیا چلی (Avandia Chile) میں دن بھر ایک مصنف کی مشکلات کا رونا رونے کے بعد میں ہاسٹل واپس لوٹ رہا تھا۔ تو اس رات کی آخری ٹرام کار میں شپی نیرو (Chapinero) کے اسٹیشن سے ایک گوشت پوست کا یونانی دیو مالائی جانور سوار ہوا۔ جی آپ نے صحیح پڑھا ہے ایک بکرا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نصف شب کی مسافت میں جو گنے چنے مسافر موجود تھے انہوں نے اسے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے مجھے خیال ہوا کہ یقیناً یہ بکرے کے بھیس میں کوئی آدمی ہے۔ جو اکثر اتوار کے روز بچوں کے پارک میں بھیس بدل کر مختلف چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اس کے اصلی ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کی داڑھی اور سینگ بالکل ایک اصلی بکرے ہی کی مانند تھے، اور جب وہ میرے پاس سے گزرا تو اس کی کھال کی بو نے کوئی شبہ نہیں رہنے دیا۔ اپنی پر اسرار شخصیت کی تکمیل کے لیے وہ چھبیسویں گلی سے ذرا پہلے قبرستان کے نزدیک اتر کر، پارک کے درختوں میں غائب ہو گیا۔

آدھی رات تک مجھے کروٹیں بدلتا دیکھ کر ڈومینگو ویگا نے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ ''محض یہ کہ ٹرام میں ایک بکرا سوار ہو گیا تھا'' میں نے غنودگی میں اسے جواب دیا۔ اس نے اپنی پوری بیداری میں جواب دیا کہ اگر یہ کوئی ڈراؤنا خواب ہے، تو اتوار کی متوقع بدہضمی کا انجام ہے۔ لیکن اگر یہ میری آئندہ کہانی کا خیال ہے تو بہت زبردست ہے۔ دوسری صبح مجھے یقین نہیں تھا کہ میں نے واقعی ٹرام میں بکرا دیکھا تھا یا وہ فریب نظر تھا جو اتوار کو ہی ممکن ہے۔ میں نے اپنے آپ کو یقین

دلانے کی کوشش کی کہ اتوار کا دن تھا، میں شاید تھک کر سو گیا تھا، اس لیے ایسا سچا خواب دیکھا کہ جسے حقیقت سے جدا کرنا دشوار ہو رہا ہے۔ آخر کار میرے لیے یہ بات اہم نہیں رہی، کہ بکرا حقیق تھا یا نہیں، لیکن مجھے تو اس کی موجودگی کا تجربہ ایسے ہی ہوا کہ جیسے وہ موجود رہا ہو۔ اب چاہے وہ خواب رہا ہو یا حقیقت، اسے محض ایک خیالی تصویر سمجھنا بیکار ہے، یہ یقیناً میری زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا۔

میں نے اگلے روز، ایک ہی نشست میں، وہ کہانی لکھ کر تکیہ کے نیچے رکھ دی۔ آئندہ کئی راتیں میں نے اسے کبھی سونے سے پہلے اور کبھی صبح دم بیدار ہو کر دہرایا۔ یہ واقعہ کا بالکل سادہ سا بیانیہ تھا، بالکل اسی طرح جیسے وہ ٹرام کار میں داخل ہوا تھا۔ یہ ایسی سادہ اور حقیقت پر مبنی تحریر تھی جیسے کسی عقیقے کا اعلان ہو۔ آخر کار اپنی بے یقینی سے تنگ آ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اسے صفِ اول کے ادبی جریدے کو بھیجوں۔ نہیں، ایل اسپیکٹیڈ ور نہیں، بلکہ ایل ٹیمپو (El Tiempo)۔ شاید اس طریقے سے میں ایدورڈو ضیلما سے مختلف کسی دوسرے نقاد کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ ضیلما کو اس تجربے کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہ کہانی ہاسٹل کے ایک دوست سے دستی بھیجی اور ساتھ ہی ادبی صفحے (Supplimento Literario of El Tiempo) کے نوجوان ایڈیٹر کے نام ایک خط بھی منسلک کر دیا۔ نہ وہ کہانی چھپی نہ ہی اس خط کا جواب موصول ہوا۔

ال اسپیکٹیڈر میں شائع ہونا، ادب کی اعلیٰ ترین مقام کے نزدیک پہنچ جانا تھا۔ اس سے میرے لیے دوسری نوعیت کے مضحکہ خیز مسائل بھی پیدا ہوئے۔ غلط فہمی کا شکار دوست مجھے راستے میں روک کر ادھار مانگتے کہ اپنی مالی دشواریوں کا سد باب کر سکیں۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایک مصنف جو اتنے طمطراق کے ساتھ شائع ہو رہا ہو، اسے اپنی کہانیوں کا قابلِ ذکر معاوضہ نہیں ملا۔ کچھ ہی لوگوں نے اس بات پر یقین کیا کہ کہانیوں کے معاوضے میں مجھے ایک پائی بھی نہیں ملی تھی، اور نہ ہی وصول ہونے کی امید تھی، کیوں کہ ملک کے اشاعتی اداروں میں اس بات کا رواج ہی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ میرے والد کی ناامیدی تھی، کہ جس وقت ان کے گیارہ میں سے تین بچے اسکول میں زیرِ تعلیم تھے، میں خود اپنا خرچہ بھی نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ مجھے گھر سے (خرچ کی مد میں) تیس پیسو وصول ہوتے تھے، اس میں سے ہاسٹل کا کرایہ ہی اٹھارہ پیسو تھا، جس میں ناشتے میں انڈے تک نہیں ملتے تھے۔ مجھے ہمیشہ آڑے وقتوں کے لیے بچائے پیسے میں سے ہی خرچ کرنا پڑتا۔ مجھے یاد نہیں کہ غیر ارادی خاکے بنانے کی عادت کہاں پڑی تھی، اخبارات کے

حاشیوں پر، ریسٹورانٹ کے نیپکن پر یا کیفے میں ماربل کی میزوں پر۔ لیکن ایل میلینو میں دور کا ایک واقف کار، جسے نقشہ سازی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، تعلقات کے زور سے منسٹری میں ڈرافٹ مین کی نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے تجویز کیا کہ اگر میں اس کا کام کر دیا کروں تو ہم اس کی تنخواہ آدھی آدھی بانٹ سکتے ہیں۔ میں زندگی بھر کرپشن کے دوبارہ اتنا نزدیک نہ آیا، لیکن یہ اتنی قربت بھی نہیں تھی کہ میں منع کر دیتا۔

اسی زمانے میں موسیقی سے میری دلچسپی فروغ پانے لگی۔ کیریبین کے مقبول گیت تو جیسے بذریعہ شیرِ مادر مجھ تک پہنچے تھے۔ وہی موسیقی اب بگوٹا میں بھی مقبول ہو رہی تھی۔ سب سے زیادہ مقبول ڈان پاسکل کا پروگرام ''ساحلی گھنٹا'' ہوا کرتا تھا۔ وہ گویا بحرالکاہل کے ساحلوں کا سفر موسیقی تھا۔ یہ اتوار کی صبح نشر ہوتا تھا اور اتنا مقبول ہو گیا کہ ہم کیریبین کے طلبہ ریڈیو اسٹیشن پہنچ جاتے اور دوپہر تک اس پر رقص کرتے۔ اس پروگرام سے اندرون ملک بھی ہماری موسیقی کی مقبولیت کا آغاز ہو گیا۔ بعد میں اسی پروگرام نے بحراوقیانوس کے ساحلی ممالک سے آنے والے طلبہ کے بگوٹا کے دور دراز علاقوں کی معاشرت میں جگہ بنانے کا موقع دیا۔

ساحلی علاقے کے طلبہ کے لیے دارالخلافے میں ''زبردستی کی شادی'' کا الزام بدنامی کی باعث تھا۔ نہ جانے وہ کون سے شیطانی واقعات تھے جن کے سبب یہ بات مشہور ہو گئی کہ بگوٹا کی لڑکیاں ساحلی ممالک کے طلبہ کے ساتھ باآسانی ہم بستری پر راضی ہو جاتی ہیں۔ اور گویا اس طرح بستر کی شکنوں میں ایک جال بنتی ہیں، جس میں پھنسا کر انہیں شادی پر مجبور کرتی ہیں۔ اور یہ کوئی محبت کی تلاش نہیں بلکہ ایسے مکانوں میں رہنے کا اشتیاق ہے جن کی کھڑکی ساحل سمندر کی سمت کھلتی ہو۔ میں نے اس پر کبھی یقین نہیں کیا بلکہ میری زندگی کی سب سے تاریک یادیں تو بگوٹا کے اطراف کے وہ چکلے ہیں جہاں ہم نشے کی مدہوشی اتارنے جاتے تھے۔ میں تو اپنی تھوڑی سی خودداری بھی وہاں ایک دن تقریباً گنوا بیٹھا تھا۔ جب ایک عورت، جس کے ساتھ میں کچھ دیر پہلے ہم بستر ہو چکا تھا، چیختی ہوئی برہنہ برآمدے میں نمودار ہوئی کہ میں نے اس کی دراز سے بارہ پیسو چرا لیے ہیں۔ دو بدمعاش کہیں سے نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھے زمین پر گرا کر میری تلاشی لی۔ کئی بار کی ہم بستری کے بعد جو دو پیسو بچے تھے، انہیں برآمد کر کے بھی ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ انہوں نے ان بارہ پیسو کی تلاش میں مجھے بالکل برہنہ کر دیا، یہاں تک کہ میرے جوتے بھی اتروا کے دیکھے۔ جب اس عورت کو یاد آیا کہ اس نے ایک روز قبل ہی ان پیسوں کو چھپانے کی جگہ تبدیل کی تھی اور وہ پیسے اسے وہاں مل بھی گئے، تو انہوں نے، مجھے قتل کرنے کے بجائے

پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آخرِ کار میں نے فیصلہ کیا کہ قانون کی تعلیم میں مزید وقت ضائع نہ کروں۔ لیکن مجھ میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اپنے والدین کا سامنا کر کے یہ بات صاف کہہ دیتا۔ وہ تو میری گریجویشن اور پھر قانون کے سالِ اول کے نتائج سے اتنے خوش تھے، کہ انہوں نے میرے بھائی لوئس ایزک سے جو فروری ۱۹۴۸ء میں بگوٹا آ کر ایک اچھی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس کے ہاتھوں سب سے جدید اور ہلکا ٹائپ رائٹر بھیجا۔

یہ میرا پہلا ٹائپ رائٹر تھا، لیکن بہت ہی بدنصیب۔ اس لیے کہ ہم نے اسے اسی دن ایک کباڑیے کے ہاتھوں بارہ پیسو میں فروخت کر دیا، تاکہ اپنے بھائی اور ہاسٹل کے دوستوں کے ساتھ جشن منایا جا سکے۔ دوسرے دن نشے سے بوجھل سر درد کے ساتھ ہم کباڑیے کے پاس پہنچے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ ٹائپ رائٹر اسی شکل میں وہاں موجود ہے، سیل شدہ، اور اب بھی آسمان سے ہم پر بارہ پیسو برسیں تو ہم جا کر اسے واپس حاصل کر سکیں۔ ایک بہت اچھا موقع اس وقت آیا جب میرے نقلی نقشہ نگار دوست نے میرے حصے کے پیسے دیے، مگر آخری وقت پر ٹائپ رائٹر واپس لینے کا فیصلہ پھر موخر ہو گیا۔ جب بھی میں یا میرا بھائی اس گلی سے گزرتے، تنہا یا باہم، تو ضرور توجہ دیتے کہ وہ ٹائپ رائٹر ویسا ہی پلاسٹک میں ملفوف، اس پر گلابی ربن بندھی، دوسرے گھریلو سامان کے درمیان، ہیرے کی مانند سجا بندھا موجود ہے۔ ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی وہ نشے کی حالت میں کیا گیا حساب گو غلط ہی ثابت ہوا۔ لیکن وہ ٹائپ رائٹر بحفاظت وہیں موجود تھا، اور موجود رہے گا، جب تک ہم اس پر سہ ماہی سود ادا کرتے رہیں۔

(نیویارکر، اکتوبر ۲۰۰۳ء)



(مشمولہ: ''دُنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴۱، اکتوبر ۲۰۱۴ء)

مارکیز کی سوانح

خالد جاوید

گیبریئل گارسیا مارکیز کی پیدائش ۶ مارچ ۱۹۲۸ء کو کولومبیا کے اراکاتا شہر میں ہوئی۔ اس کے والد کا نام گیبریئل ایلیکیو گارسیا تھا اور والدہ کا لوئیسا سانتیگا مارکیز۔

اراکاتا کولومبیا کے شمالی ساحل پر کیریبین علاقے میں بسا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں امریکی یونائیٹڈ فروٹ کمپنی اس علاقے میں بنانا کی پیداوار کا فائدہ اٹھانے کے لیے داخل ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں ۱۹۱۲ء تک اراکاتا کی شہرت دور دور پھیل چکی تھی مگر ۱۹۴۱ء میں جب امریکن فروٹ کمپنی کولومبیا سے واپس چلی گئی تو اس علاقے کی ساری معاشیات بھی تباہ ہو گئی۔ یہ کمپنی ۱۸۹۹ء میں کولومبیا آئی تھی اور اس کی آمد کے تقریباً ۱۹ سال بعد مارکیز کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس سال ۱۹۲۸ء میں شمالی کولومبیا کے قصبے سانتا مارتا کے نزدیک بنانا کمپنی کے مزدوروں کی ایک بڑی ہڑتال ہوئی تھی جس کے نتیجے میں اُن کا قتل عام ہوا تھا۔

۱۹۱۴ء میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کے کولومبیا سے واپس جانے کے بعد ایک بار جب مارکیز اپنی ماں کے ساتھ نانا نانی کے گھر واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ اراکاتا اب ایک ویران کھنڈر نما شہر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہی زمانہ تقریباً اسپین کی خانہ جنگی کا بھی تھا۔ مارکیز کی ماں لوئیسا ایک جانے مانے اور اعلیٰ خاندان کی لڑکی تھیں مگر اس نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ایک معمولی ٹیلی گرافسٹ سے شادی کی تھی۔ مارکیز کی پیدائش کے موقع پر لوئیسا اپنے ماں باپ کو خوش اور رضا مند کرنے کے لیے اپنے مائیکے چلی آئی تھیں اور پھر بیٹے کی پرورش کے واسطے اُسے نانی کے گھر ہی چھوڑ آئی تھیں۔ اس طرح تنہائی کا تجربہ تو مارکیز کو اپنی زندگی کے ان بالکل ابتدائی دنوں میں ہی

ہو گیا تھا۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۶ء کے درمیان مارکیز نے یہ سال اپنے نانا اور نانی کے ساتھ ننہال کے لمبے چوڑے مکان میں گزارے۔ اُس کا بچپن خوش حال تھا۔ مارکیز کے نانا اور نانی کے پاس قصے کہانیوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ جس ماحول میں پلا بڑھا اُس میں خاندان کے بڑے بوڑھے اپنے شہر اور قصبے اور خاندان کی تاریخ کے سیکڑوں قصے سناتے رہتے تھے۔ مارکیز کے نانا کرنل نکولس لبرل دستے کی طرف سے برسرِ اقتدار کنزرویٹیو پارٹی سے اُس جنگ میں شریک ہوئے تھے جو ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء کے درمیان ہوئی تھی اور جسے ہزارروزہ جنگ کا نام دیا گیا ہے۔ اس جنگ کے زمانے میں کولوبیا میں انتشار کا دور اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا۔ مارکیز کے نانا اس سنسنی خیز زمانے کے واقعات اکثر سناتے رہتے تھے۔ دوسری طرف اس کی نانی اور تین خالائیں تھیں جو روحانی کرشموں میں یقین رکھتی تھیں اور مارکیز کو طلسمی واقعات اتنے عام انداز اور لہجے میں سنایا کرتی تھیں جیسے وہ روزمرّہ کے معمولی واقعات ہوں۔ بعد میں گارسیا مارکیز نے ہر جگہ یہ کہا ہے کہ ان کی تحریروں کے اسلوب اور بیان پر نانی کا ہی اثر ہے۔ اس نے قبول کیا ہے کہ ایک طرح سے لکھنا اس نے نانی سے ہی سیکھا ہے۔

۱۹۳۶ء میں مارکیز کے نانا کا انتقال ہو گیا اور ساتھ ہی مارکیز کے بچپن کی دنیا کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مارکیز کہتا ہے کہ ان آٹھ سالوں سے بہتر جو اس نے نانا کے گھر گزارے، کوئی زمانہ نہ رہا۔ بڑے ہونے پر مارکیز نے اکثر یہ خواب دیکھا کہ وہ اس مکان سے باہر ہی نکلا۔ اس کا کہنا ہے کہ تب سے لے کر اس کے ساتھ کوئی واقعہ ہی پیش نہ آیا۔

نانا کے گھر سے نکلنے کے بعد مارکیز بارنکیلا میں اپنے والدین کے گھر آ گیا جہاں اس کے والد ایک فارمیسی کے مالک بن گئے تھے۔ تیرہ برس کی عمر تک گارسیا مارکیز نے پرائمری تعلیم بارنکیلا اور پاکیرا میں ہی حاصل کی اس کے بعد وہ کولوبیا کی دارالحکومت ''بوگاتا'' پہنچ گیا۔ ۱۹۴۷ء میں مارکیز نے بوگوتا کی نیشنل یونیورسٹی میں قانون پڑھنے کے لیے داخلہ لے لیا مگر مارکیز کو اینڈیز کے پہاڑوں کا وہ روکھا سوکھا ماحول پسند نہیں آیا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کولوبیا میں اس بے قابو اور متواتر تشدد کا دور شروع ہوا جس میں مارے جانے والوں کی تعداد تین لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ اس تشدد کا آغاز لبرل رہنما ''ہورٹے گیتان'' کے قتل سے ہوا تھا۔

مارکیز کا دل اب قانون کی پڑھائی میں لگنا بند ہو گیا۔ اس نے کہانیوں اور ناول کی دنیا میں

پناہ لی۔ اس زمانے میں مارکیز پر کافکا کی کہانی ''میٹا مورفوسس'' کا زبردست اثر ہوا۔ مارکیز کے کہنے کے مطابق اس پر گویا لرزہ طاری ہو گیا۔ آخر کار ۱۹۴۸ء میں اس نے قانون کی پڑھائی چھوڑ دی اور واپس شمال کے ساحلی علاقے پر واقع کارتاجینا میں آ کر پھر کچھ ہی عرصے بعد بارنکیلا آ کر وہاں کے اخباروں کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے ہی مارکیز نے بوگا تا کے اخبار ''ایل السپکتا دور'' اور کارتاجینا کے اخبار ''ایل یونیورسل'' کے لیے کالم لکھنا شروع کر دیے تھے اور ''ایل السپکتا دور'' میں تو اس کی اولین کہانیاں بھی شائع ہوئی تھیں۔

بارنکیلا آ کر مارکیز نے ہمہ وقت صحافی کا پیشہ اختیار کر لیا اور ''ایل ہیرالدو'' اور ''ایل ناسیونال'' اخباروں کے لیے بھی کام کرنے لگا۔ بارنکیلا کا یہ زمانہ مارکیز کی ادبی نشوونما اور ارتقا کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا۔ یہاں آرٹ و ادب سے متعلق بہت سی شخصیات سے اس کے دوستانہ تعلقات بن گئے۔ ان دوستوں نے ہی مارکیز کو ماڈرن ادیبوں مثلاً جیمس جوائس، ولیم فاکنر، ورجینا وولف وغیرہ سے متعارف کرایا۔ اپنے ناول ''تنہائی کے سو سال'' میں مارکیز نے ناول کے آخری باب میں ''بارنکیلا'' کے اپنے احباب کے ٹولے کا ذکر کر کے ایک طرح سے اسی ٹولے کو خراج پیش کیا ہے۔

بارنکیلا میں مارکیز نے کہانیاں لکھنے کی رفتار اور تیز کر دی۔ ''تیسری مایوسی'' (The Third Resignation) اس کی پہلی شائع شدہ کہانی تھی۔ اس کا پہلا ناول 'پتوں کا طوفان' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا مگر بطور ایک ناول نگار اس کی شناخت نہیں قائم ہو سکی۔ مگر ایک صحافی کی حیثیت سے اب تک اس کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ اس شہرت میں ''ایل ایکس پکتا دور'' اخبار میں اس اسٹوری کا بھی بہت ہاتھ رہا جس کا نام ''ایک غرقاب شدہ جہاز کے ملاح کی داستان'' تھا اور جو ۱۹۵۵ء میں اخبار میں چودہ قسطوں میں شائع ہوتی رہی تھی۔ اس اسٹوری سے کولمبیا کی بحری فوج کی غیر ذمے داری اور منافق کردار کھل کر سامنے آ گئے تھے اور عوام میں ایک تنازعہ پیدا ہو گیا تھا۔

اس لیے ایکس پکتا دور نے مارکیز کو اپنے نامہ نگار کی حیثیت سے یورپ روانہ کر دیا کیونکہ ''جنرل روہاس پنیلا'' کی ملٹری حکومت شاید ان حالات میں مارکیز کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی کچھ عرصہ بعد ڈکٹیٹر روہاس پنیلا کے ہاتھوں اخبار کی اشاعت بند کر دی گئی حالانکہ ۱۹۵۷ء میں روہاس پنیلا نے استعفیٰ دے دیا اور مخلوط حکومتوں کا ایک سلسلہ اقتدار میں آ گیا مگر کولمبیا میں بدامنی اور انتشار کا دور نہیں تھم سکا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مارکیز قلاش اور بے روزگار ہو گیا تھا اور پیرس میں غریبی کے دن گزار رہا تھا، حالانکہ اسی زمانے میں اس نے روم سے فلم سازی کا بھی ایک کورس مکمل کر لیا تھا جس سے اسے کچھ بھی فوری طور پر حاصل ہونا ممکن نہ تھا، مگر مارکیز ان دنوں اپنے ناولٹ 'کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا' کے نوٹس تیار کر رہا تھا جس کی اشاعت ۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی۔ اگرچہ ۱۹۵۷ء تک وہ ناولٹ کو مکمل کر چکا تھا مگر اسے شائع کرنے کے لیے جلدی کوئی پبلشر تیار نہ ہوا۔ انہیں حالات میں مارکیز نے کئی سوشلسٹ ممالک کا دورہ کیا اور اپنے تاثرات بھی قلم بند کیے۔ اس تحریر کا عنوان ''آئرن کرٹین کے پیچھے نوے دن'' تھا۔

بہرحال ۱۹۵۸ء وہ سال ہے جس میں بارنکیلا میں واپس آ کر مارکیز نے مرسیڈس بارچا سے شادی کر لی، اب بھی اس کی معاشی حالت تقریباً ویسی ہی رہی۔ وہ ''وینی زویلا گرافیکا'' اور کاراکاس کے دوسرے جرائد میں ملازمت کرتا رہا ''بڑی ماما کا جنازہ'' میں جو کہانیاں شامل ہیں، وہ انہیں دنوں لکھی گئی تھیں۔ ۱۹۵۹ء میں فیدل کاسترو کی فوجوں نے ہوانا پر قبضہ کر لیا تھا۔ مارکیز آپریشن وردادا نامی مقدمے کی نامہ نگاری کے لیے ہوانا آ گیا۔ اس نے بوگاتا میں کیوبن نیوز ایجنسی قائم کی اور اسی نیوز ایجنسی کے لیے ہوانا میں باقاعدہ کام کرنے لگا۔ یہ زمانہ مارکیز کی انتہائی جدوجہد کا زمانہ تھا، اس نے میکسیکو سٹی میں کئی جرائد کی ادارت کی۔ ایک اشتہاری ایجنسی تک میں ملازمت کی۔ انہیں دنوں ۱۹۶۲ء میں اس کا ناول ''منحوس وقت'' شائع ہوا جس پر اسے کولومبیا کی ایک تیل کمپنی کا جاری کیا ہوا انعام بھی ملا۔ اسی زمانے میں مارکیز نے کئی فلموں کے اسکرپٹ پر بھی کام کیا مگر جو بہت بڑا کام اس عرصے میں اس نے کیا وہ یہ تھا کہ ''تنہائی کے سو سال'' لکھنے کے دوران اس نے خود کو پندرہ ماہ تک گھر میں قید کر لیا۔ اس کی بیوی مرسیڈس اُدھار مانگ کر گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ آخر ۱۹۶۷ء میں ''تنہائی کے سو سال'' شائع ہوا اور ایک تاریخ بن گیا، ناول کو فوری طور پر جو بے پناہ کامیابی اور مقبولیت ملی اس سے خود مارکیز بھی ششدر اور حیران رہ گیا۔ ''تنہائی کے سو سال'' کے شائع ہونے سے پہلے ۱۹۶۵ء میں لاطینی امریکہ کے تین قد آور ادیبوں کے ناول شائع ہو چکے تھے۔ یعنی خولیو کورتازار کا شہرۂ آفاق ناول ''ہاپ اسکاچ''، ماریو برگس یوزا کا ''گرین ہاؤس'' اور انفانتے کا مشہور ناول ''Three Tigers Trapped'' مگر ''تنہائی کے سو سال'' کی شہرت اور مقبولیت نے ان تینوں ناولوں کو دبا کر رکھ دیا حالانکہ مارکیز کورتازار کا مداح تھا اور اس نے ''تنہائی کے سو سال'' کے آخری باب میں ہاپ اسکاچ کے کردار روکا میندور کا ذکر کیا ہے اور بڑے معنی خیز انداز میں کورتازار کے اس افسانوی کردار کو پیش کیا

ہے۔۱۹۶۷ء میں ہی لاطینی امریکی کے ایک اہم اور بڑے ناول نگار کارلوس فیونتیس کا ناول ''کھال کی تبدیلی'' بھی منظر عام پر آیا تھا مگر ''تنہائی کے سو سال'' کی مقبولیت کی بات ہی اور تھی اور اسے ڈان کیہوتے کے بعد اسپینی زبان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب کا لقب دیا گیا۔

اب کامیابی دولت اور شہرت سب مارکیز کے قدم چوم رہی تھی۔ کولوبیا یونیورسٹی نیویارک سے اسے ایک اعزازی ڈگری بھی مل چکی تھی۔ اس نے بوگاتا کے ایک سیاسی رسالے آلٹر ناتیوا کو قائم کرنے میں اپنا تعاون دیا اور رسل ٹربیونل کا نائب صدر بھی مقرر ہوا۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۱ء تک میکسیکو سٹی اور بوگاتا میں مقیم رہا۔ کئی فلموں کے اسکرپٹ لکھیں، انگولا اور نکاراگوا کا دورہ کیا اور اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ یہ زمانہ اس نے ایک سرگرم سیاسی کارکن کی حیثیت سے بتایا۔

مارکیز کولوبیا کی پارٹی فرمیز کا بانی رکن مقرر ہوا۔ یونیسکو کے لیے اس نے مواصلات کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کی۔ مارکیز نے سیاسی قیدیوں کی امداد کے لیے ایک ادارہ بھی قائم کیا جس کا نام Habeas تھا۔

۱۹۸۲ء میں ایک ادیب کی حیثیت سے اس کا سب سے کامیاب دن وہ تھا جب اسے ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔

۱۹۸۱ء میں اس کا ناول ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' شائع ہو چکا تھا جسے ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا تھا مگر نوبیل پرائز ملنے کے بعد اس ناول نے بھی مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ ۱۹۸۵ء میں مارکیز کا ناول ''ہیضے کے دنوں میں محبت'' منظر عام پر آیا جس میں مارکیز نے ایک نئے موضوع اور ایک نئے اسلوب کو اپنا کر اپنے قارئین کو چونکا دیا۔

سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں۔ مارکیز کے صحافتی مضامین بھی بے حد مقبول ہو رہے تھے، ۱۹۸۹ء میں اس کا ایک نیا ناول پھر شائع ہوا جس کا نام ''جنرل اپنی بھول بھلیوں میں'' تھا، نقادوں نے اسے تاریخی ناول کا نام دیا۔ یہ ناول بہت مقبول ہوا اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔

۱۹۹۳ء میں مارکیز کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ''اجنبی زیارتیں'' شائع ہوا۔ ان کہانیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے سارے کردار لاطینی امریکہ کے ہیں مگر کہانیوں کا محل وقوع یورپ ہے جہاں پر کردار اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر انہیں ناکامی ہی میسر ہوتی ہے کیونکہ ان کے ساتھ دیارِ غیر میں صرف عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم واقعات ہی پیش آتے ہیں۔

۱۹۹۴ء میں مارکیز نے اپنا ناول ''محبت اور دوسرے آسیب'' شائع کیا جو طلسمی حقیقت

نگاری کا ایک نمونہ ثابت ہوا۔ مارکیز سیاسی حیثیت سے ایک فعال اور باضمیر زندگی گزار رہا تھا کہ ۱۹۹۹ء میں اچانک اس میں کینسر کی بیماری کی تشخیص کی گئی۔ لاس اینجلز کے ایک اسپتال میں اس کی کیموتھراپی ہوتی رہی۔

ان دنوں اسے فطری طور پر اپنی خودنوشت لکھنے کی خواہش ہوئی۔ بیماری کے عالم میں ہی اس نے لکھنا شروع کر دیا۔ ۲۰۰۲ء میں اس کی پہلی جلد ''کہانی سنانے کے لیے زندہ رہنا'' شائع ہوئی۔

۲۰۰۴ء میں مارکیز کا ناول ''میری اداس ویشیاؤں کی یادیں'' شائع ہوا اور ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ ایران نے اپنے یہاں اس ناول پر پابندی لگا دی۔ ناول پر بعض حلقوں میں یہ الزام بھی لگا کہ یہ ناول نابالغوں کے جنسی استحصال کو جائز ٹھہرانے کا پیغام دیتا ہے۔ اگرچہ اس ناول پر یہ الزام لگانا ناانصافی ہے۔ یا تو ناول کو کچھ لوگوں نے سمجھا ہی نہیں ورنہ مارکیز سے رشک وحسد رکھنے والے دانشوروں، سیاسی کارکنوں اور ادیبوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

مارکیز کے کہنے کے مطابق اب اس نے اپنے تمام دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے تعلقات کم سے کم کر لیے ہیں، وہ ٹیلی فون کاٹ دیتا ہے اور کہیں آنے جانے کا پروگرام ترک کر دیتا ہے، مستقبل کے لیے بھی کوئی منصوبہ نہیں بنانا چاہتا، وہ صرف اپنی یادیں لکھنا چاہتا ہے جو تین جلدوں میں مکمل ہو سکے گی۔

مارکیز اب کوئی نیا ناول نہیں لکھنا چاہتا۔ اس نے بہت ایمان داری کے ساتھ یہ قبول کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس نے اتنے ناول لکھے ہیں کہ اپنے تجربے سے ہی وہ نیا ناول لکھ سکتا ہے، مگر اصل بات یہ ہے کہ اب اس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ ناول لکھے۔ اس کی طبیعت بھر گئی ہے، حالانکہ دو سال پیشتر مارکیز کے بیان کے برخلاف ادبی حلقوں میں مارکیز کے نئے ناول کی افواہ اڑی تھی جس کا موضوع محبت تھا اور عنوان تجویز نہیں کیا گیا تھا، مگر بعد میں مارکیز کے سیکریٹری کارمین بالسیز نے چلی کے اخبار ٹیرسیرا کو یہ بیان دیا کہ مارکیز اب کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔

مارکیز جیسے ادیب کے حوالے سے افواہیں پھیلنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ ۲۰۰۰ء میں پیرو کے ایک روزنامے La Republica میں مارکیز کی موت کی غلط خبر شائع ہو گئی تھی۔ ہندوستان میں انگریزی کے اخبار ہندوستان ٹائمز نے اس خبر کو چھاپنے میں بڑی عجلت سے کام لیا تھا، دلچسپ بات یہ تھی کہ مارکیز کی موت کی جھوٹ خبر شائع ہونے کے بعد دوسرے دن کئی اخباروں نے مارکیز کے نام سے ایک الوداعی نظم بھی شائع کی۔ یہ نظم بھی ہمارے یہاں ہندوستان

ٹائمز نے ہی چھاپی تھی۔

مگر فوراً ہی مارکیز نے اس نظم کے خالق ہونے سے انکار کیا اور تمام اخبارات کو اس سلسلے میں بیانات بھی دیے، بعد میں پتہ چلا کہ یہ نظم جس کا عنوان لاماریونیتا تھا وہ میکسیکو کے ایک آرٹسٹ کی تھی۔ مارکیز کی عمر اب ۸۲ سال کی ہو چکی ہے۔ کینسر جیسی موذی بیماری اور بڑھاپے کی وجہ سے وہ اب پھر ایک تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ وہی تنہائی جو اسی روز اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی جب اس کی ماں لوئیسا نے اسے پرورش کے لیے نانی کے گھر چھوڑ دیا تھا۔ بچپن کی اس تنہائی اور عمر کے آخری پڑاؤ کی اس تنہائی کے درمیان کون سا رشتہ ہے یا ان دونوں میں کیا مشترک ہے ؟ یہ تو ہمیں مارکیز کی کوئی کہانی یا ناول پڑھ کر ہی معلوم ہو سکتا تھا مگر اندازہ یہ ہے کہ اگر وہ کچھ لکھ بھی رہا ہو گا تو کاغذ پر ہرگز نہیں۔

مارکیز جیسے قصہ گو ادیب اپنی خودنوشت میں اپنے کسی روحانی یا ذاتی تجربے کو سپاٹ انداز میں بیان کرنے میں ہی حق بجانب ہو سکتے ہیں اس لیے مارکیز کی طرح ہی ہم جیسے اس کے معمولی سے قاری بھی مجبور اور بے بس ہیں۔

مارکیز کے سیاسی اور سماجی سروکار کبھی بھی مبہم نہیں رہے۔ کولومبیا کے سیاسی حالات نے ہی اس کی ادبی شخصیت کی تشکیل کی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں کولومبیا کے صدر کے امیدوار اور لبرل رہنما ایلسیئر گائیتیان کے قتل کے بعد ملک میں برپا ہوئے سیاسی تشدد نے مارکیز پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۲ء کے درمیان دو سے تین لاکھ لوگوں کی جانیں گئیں اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک کولومبیا تاناشاہی اور جبر کے سخت شکنجے میں گرفتار رہا۔ بچپن کا وہ زمانہ جب انہیں نانا، نانی کے گھر رہنا پڑا تھا اس لحاظ سے اہم ہے کہ ان کے ذہن پر اپنے نانا کے انقلابی لبرل ازم کی چھاپ بچپن میں ہی پڑ گئی تھی۔ ان کے نانا نے ۱۹۲۸ء میں سیئنگا میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کے ہڑتالی مزدوروں کے قتل عام کے بارے میں جو کچھ سنایا تھا اس نے مارکیز کے دل و دماغ پر ایک کبھی نہ مٹنے والا نقش چھوڑ دیا تھا۔ مارکیز جب سپاکرا میں اسکولی طالبِ علم تھا، تب ہی وہاں کے کچھ مارکسسٹ ٹیچروں کے ذریعے وہ بائیں بازو کی تحریک کا حامی ہو گیا تھا اور ہمیشہ وہ یہ کہتا آیا کہ انسانیت کا مستقبل سوشلزم سے ہی وابستہ ہو سکتا ہے۔

کولومبیا وہاں کی سیاست، مارکیز کا خاندان اور مارکیز کی تنہائی ان سب نے مل کر مارکیز کی تخلیقات کے لیے خام مواد فراہم کیا ہے، مثلاً اس کے ناول "ہیضے کے دنوں میں محبت" میں مارکیز کے اپنے ماں باپ کی شادی کے سلسلے میں آئی رکاوٹوں کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ مارکیز کی

آئیڈلوجی میں اس کے نانا کے خیالات کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے اور دوسری طرف اس کی نانی تھیں جن سے اس نے تحریر میں قصہ گوئی کرنا سیکھا۔ یہ قصہ گوئی کا انداز ہی تقریباً تیس سال کے بعد ''تنہائی کے سو سال'' میں ایک ادبی شاہکار کے روپ میں سامنے آیا۔ اپنے دوست پلنیو اپولیومیندوزا سے ایک انٹرویو کے دوران مارکیز نے بتایا تھا کہ:

''میرے نانا کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میری عمر نو سال تھی۔ میں نے انہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھا کیونکہ اس وقت میں ارا کاتا سے دور ایک اور قصبے میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس خبر نے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کیا تھا مگر اب جب بھی میرے ساتھ کوئی خوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو جس واحد شے کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ میرے نانا کی موجودگی ہے۔''

(حوالہ: امرود کی مہک۔ ترجمہ: اجمل کمال، کراچی ۱۹۹۳ء)

اسی کتاب میں ایک جگہ مارکیز نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اس کے ناول ''پتوں کے طوفان'' کے کرنل کا کردار اس کے نانا کی اندرونی شخصیت اور ظاہری روپ سے متاثر ہو کر تخلیق کیا گیا ہے، جب کہ ''تنہائی کے سو سال'' میں کرنل اولیا نو بوئیند کا کردار میرے نانا کے کردار کے قطعی برعکس ہے۔

مارکیز کا اپنی ماں سے ایک سنجیدہ تعلق رہا ہے۔ دونوں میں گفتگو بہت کم ہوتی تھی مگر بقول مارکیز اس کی ماں وہ واحد شے تھی جو اس کے کرداروں کے عقب میں پوشیدہ حقیقی افراد کو پہچان سکتی تھی۔ جہاں تک مارکیز کے والد کا سوال ہے تو ان سے مارکیز کا تعلق شروع سے ہی کم رہا۔ اپنی ماں کے بمقابل اپنے باپ کو مارکیز نے کم جانا اور سمجھا ہے، پھر بھی مارکیز کو اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ادب سے اس کی دلچسپی بڑی حد تک اپنے باپ کی وجہ سے ہی ہوئی۔ مارکیز کے باپ نہ صرف نظمیں لکھا کرتے تھے بلکہ ٹیلی گراف آپریٹر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ وائیلن بھی بہت عمدہ بجایا کرتے تھے، وہ مطالعے کے بھی بہت شوقین تھے۔

انہوں نے زندگی میں کبھی شراب اور سگریٹ کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ وہ کنزرویٹو پارٹی کے حامی تھے، مارکیز کے نانا کے برخلاف جو کہ لبرل تھے دراصل مارکیز کو باپ کا ٹھوس تصور نانا کی شکل

میں مل چکا تھا، اس کے والد کا تصور نانا سے متضاد تھا۔ مارکیز کے والد میں ایک قسم کی سخت گیری تھی اور اپنی سولہ اولادوں میں سے (جن میں ایک مارکیز تھا) وہ قربت کا رسمی تعلق زندگی بھر نہ رکھ پائے۔ مارکیز کے والد نے ایک بار مذاق میں اپنے کسی دوست سے کہا تھا کہ مارکیز خود کو ایک ایسا چوزہ سمجھتا ہے جو مرغے کی مدد کے بغیر پیدا ہو گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مارکیز نے ہر جگہ اپنی ماں کا ذکر تو کیا ہے مگر والد کا ذکر نہیں کیا۔ مارکیز زندگی بھر اپنے والد کو گہرائی کے ساتھ جان ہی نہ سکا پھر ان کا تذکرہ وہ کیسے کرتا۔

مارکیز کو نانا نانی کے گھر سے اپنے ناولوں اور کہانیوں کے لیے سب کچھ فطری طور پر ملتا چلا گیا۔ ایک طرف تو اس کے نانا کرنل نکولس رکاردو مارکیز تھے جو بچپن میں اسے پچھلی خانہ جنگیوں کے ہولناک واقعات سنایا کرتے تھے۔ نانا کمپنی کے مزدوروں کے قتلِ عام کے بارے میں بتایا کرتے تھے تو دوسری طرف اس کی نانی تھیں جو انتہائی عجیب وغریب واقعات اس انداز سے سنایا کرتی تھیں جیسے کہ وہ حقیقت ہی ہوں۔ لہٰذا ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مارکیز کی تحریروں کا موضوع اور اسلوب دونوں ہی اسی خاندانی پس منظر سے حاصل ہو گئے۔ مثلاً موریسیو بابیلونیا کا کردار ''تنہائی کے سو سال'' میں جس کے گرد زرد تتلیاں منڈلائی پھرتی ہیں، مارکیز کے نانا کے گھر آنے والے ایک الیکٹریشن سے اخذ کیا گیا ہے۔ ایک بار جب وہ گھر آیا تو پانچ سال کے مارکیز نے دیکھا کہ اس کی نانی ایک ڈھول جھاڑنے والے کپڑے کی مدد سے ایک تتلی کو بھگا رہی ہیں پھر ان کے منھ سے یہ جملہ ادا ہوا کہ جب بھی یہ آدمی گھر میں آتا ہے، یہ زرد تتلی بھی اسی کے پیچھے پیچھے آجاتی ہے۔ یہ وہ پس منظر تھا جس کی وجہ سے مارکیز اپنے ملک کے برسرِ اقتدار نظام کی حمایت کے بجائے اس کے خلاف بغاوت کا حامی بنا اور ان موضوعات یا اپنی آئیڈیالوجی کو اس نے قصہ گوئی کے انوکھے اسلوب کے ذریعے پیش کیا۔

مارکیز کی شادی مرسیڈس سے ہوئی۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات سیوکرے میں ہوئی تھی۔ مارکیز اور مرسیڈس کے والد دونوں بچپن کے دوست تھے۔ مارکیز نے مرسیڈس سے شادی کی درخواست تب کی جب وہ صرف تیرہ سال کی تھی حالانکہ شادی اس کے بہت بعد ہوئی۔ اس درمیان دونوں آپس میں ملتے رہتے تھے۔ مرسیڈس سے مارکیز کی شادی بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ مارکیز کے پاس بیوی بچوں کے لیے وقت کی کوئی کمی نہیں تھی، گھر کے مسائل مارکیز اور اس کی بیوی بچے مل کر حل کرتے اور بچوں سے مارکیز دوستوں کی طرح ملتا۔ یعنی مارکیز کوئی بوہیمین قسم کا ادیب نہیں ہے جسے صرف اپنی ذات کی نمائش سے دلچسپی ہو اور گھربار یا بیوی بچوں میں

دلچسپی رکھنا وہ کسر شان سمجھتا ہو مگر مارکیز نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

''اگر مجھے کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہو تو میں مرسیدس اور اپنے لڑکوں کو اس میں شریک کرتا ہوں اگر کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو تو غالباً اپنے دوستوں سے رجوع کر کے ان کا دماغ چاٹوں گا لیکن اگر مسئلہ واقعی بہت ہی بڑا ہے، بے حد بڑا تو میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کرتا۔ اس کی وجہ ایک تو میری کم گوئی ہے اور دوسرے یہ کہ میں مرسیدس یا اپنے لڑکوں یا دوستوں کو ان اضافی فکروں میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا، سو میں ان سے خود ہی نمٹتا ہوں، اس کا نتیجہ بے شک آنتوں کا یہ السر ہے۔ میں نے پوشیدہ عاشق کی طرح اس کے ساتھ رہنا سیکھ لیا ہے یہ دشوار ہے کبھی کبھی تکلیف دہ بھی لیکن اسے بھولنا ناممکن ہے۔''

(بحوالہ، امرود کی مہک، ترجمہ: اجمل کمال، آج کراچی ۱۹۹۳ء)

کتابیں پڑھنے سے مارکیز کی دلچسپی تب شروع ہوئی جب وہ بوگاتا میں سکینڈری اسکول میں پڑھتا تھا، تنہائی اور تنگ دستی کا زمانہ تھا اس لیے یہ مشکل وقت مارکیز کو کتابوں کی پناہ میں لے آیا۔ ٹامس مان، وکٹر ہیوگو اور الیگزینڈر ڈیوما کی کتابیں تو اسے اسکول کی ڈورمیٹری میں ہی بلند آواز میں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں مگر اس زمانے میں اس کی ملاقات چند ایسے کمسن شاعروں سے ہوئی جنھوں نے اسے روبن ڈاریو، حوان رومون خمینز سے متعارف کرا دیا۔ ان شاعروں نے پتھر اور آسمان کے نام سے اپنا ایک گروہ بنا رکھا تھا، یہ نام پابلو نرودا سے متاثر ہو کر رکھا گیا تھا، یہ سب ادبی باغیوں کی ایک جماعت تھی۔ مارکیز نے اکثر یہ اعتراف کیا ہے کہ اگر اس کی ملاقات ان لوگوں سے نہ ہوتی تو وہ شاید ادیب بھی نہ بن پاتا۔

اس زمانے میں مارکیز کی دلچسپی صرف شاعری سے تھی جب اس نے بوگاتا کی نیشنل یونیورسٹی میں قانون پڑھنے کے لیے داخلہ لیا تب بجائے قانون کی کتابوں کے وہ صرف نظمیں پڑھا کرتا تھا اور ایسے کسی بھی شخص کی تلاش میں رہتا تھا جو اس کی پڑھی ہوئی نظموں پر اس سے گفتگو کر سکتا۔

ایسی ہی ایک رات میں اس نے کافکا کی مشہور کہانی ''میٹا مورفوسس'' پڑھی اور بقول مارکیز اس پر لرزہ طاری ہو گیا، اس نے سوچا میرے خدا ایسے بھی لکھا جا سکتا ہے؟ اگلے ہی روز اس نے اپنی پہلی کہانی لکھی، پھر ناول اور کہانیوں سے اس کی دلچسپی جنون کی حد تک بڑھ گئی اور اس کا دل

اپنی تعلیم میں لگنا بند ہو گیا۔ مارکیز کے والد کو اس کا یہ پاگل پن پسند نہ آیا مگر اب مارکیز کے لیے واپسی کا راستہ ممکن نہ تھا، بس اس نے یہی کیا کہ کارتا جینا میں ''ایل یونیورسل'' اخبار میں ملازمت کر لی۔ کارتا جینا کے بعد جب مارکیز بارنکیلا پہنچا تو ادب کے ایک دوسرے جنونی گروپ سے اس کا تعلق پیدا ہو گیا، اب جوائس، ورجینا وولف اور ولیم فاکنر کی تحریروں سے اس کا تعارف ہوا اور اس کی ادبی تعلیم کا ارتقا آگے کی منزلوں کی طرف گامزن ہو گیا۔

اس زمانے میں وہ پوری طرح ادب میں ڈوب گیا۔ ادب ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا اور وہ بھی ناول۔ اس کے چاروں طرف صرف ناول ہی ناول تھے۔

پلینیو اپولیومینڈوزا نے اپنے مضمون گیبریئل میں لکھا ہے:

''ادب کے جنون میں مبتلا دیوانوں کے جس گروہ سے گیبریئل کی بارنکیلا میں ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ملاقات ہوئی انہیں آج یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں لاطینی ادب کے ماہرین سنجیدگی سے پڑھتے ہیں۔ ان کے خیال میں گارسیا مارکیز اسی دیدہ زیب خاندان کا خلف ہے جسے بارنکیلا گروہ کہا جاتا ہے۔ خواہ اس براہ راست نسب پر اصرار درست ہو یا نہ ہو، یہ یقیناً درست ہے کہ یہ گروہ اس براعظم کے انتہائی باعلم اور عقلی تجسس کے حامل گروہوں میں سے تھا اور گارسیا مارکیز کی ادبی تربیت پر اس کا فیصلہ کن اثر ہوا۔''

(ترجمہ: اجمل کمال، مارکیز منتخب تحریریں، آج کراچی ۱۹۹۳ء)

مارکیز ان دیوانے اور غریبی بھرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے اکثر طوائفوں کے اس ہوٹل کو یاد کرتا ہے جہاں ایک کمرے میں وہ رہتا تھا اور جب اس کے پاس اگلی رات کرایہ ادا کرنے کو پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی تھی تب وہ ہوٹل کے ایک ملازم کے پاس اپنے زیرِ تحریر ناول ''پتوں کے طوفان'' کا مکمل مسودہ ضمانت کے طور پر رکھ دیا کرتا تھا۔ ''تنہائی کے سو سال'' لکھنے کے بعد جب مارکیز سے ملنے اور آٹو گراف لینے کے لیے ایک مجمع موجود تھا اس میں اس ہوٹل کا یہ ملازم بھی موجود تھا۔

مارکیز ان دنوں کو گندے، غلیظ اور آوارہ گردی کے دن کہتا ہے مگر یہ دن اس کے ناسٹلجیا بھی ہیں۔

مگر شہرت نے مارکیز کا دماغ کبھی خراب نہیں کیا، دنیا کی معروف شخصیات اس سے ملنے کی

خواہش مند رہتی ہیں، دنیا کے تمام صحافی اور آٹو گراف لینے والے اس سے ملاقات کے خواہش مند رہتے ہیں یہاں تک کہ کئی ملکوں کے سربراہ بھی اس سے ملنا باعث اعزاز سمجھتے ہیں۔ اپنے دونوں بیٹے رودریگو اور گونزالو اسے دوستوں کی طرح عزیز ہیں۔ اس نے اپنے بیٹوں کی تربیت لاطینی امریکہ کے مطابق نہیں کی جہاں بچے اپنے والدین سے بدتمیزی سے پیش آتے ہیں یا ان سے کوئی مطلب ہی نہیں رکھتے۔

مارکیز اپنے غربت کے دنوں میں رات کو لکھا کرتا تھا مگر عظیم اور شہرۂ آفاق ناول نگار بننے کے بعد اس نے لکھنے کے لیے صبح کا وقت مقرر کر لیا۔ شام کو وہ چند پیگ پینے اور دوستوں سے گپ شپ میں ہی اپنا وقت گزارنا چاہتا ہے۔ مارکیز کے بقول یہ سب ولیم فاکنر کے خیال سے مطابقت رکھتا ہے۔ ولیم فاکنر نے کہیں لکھا تھا کہ کسی بھی ادیب کے لیے لکھنے کی آئیڈیل جگہ طوائف کا کوٹھا ہے، جہاں صبح کے وقت خاموشی اور سناٹا ہے مگر شام کو ایک جشن برپا رہتا ہے۔

مارکیز نے اپنے انٹرویو میں کبھی اپنی آنے والی کتاب کا خاکہ بیان نہیں کیا۔ وہ اس قسم کی سستی اشتہار بازی سے ہمیشہ دور رہا ہے۔ زندگی بھر مارکیز سفر کا بہت شائق رہا۔ اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے وہ تمام دنیا کا چکر بھی لگا سکتا تھا۔ ابتدائی دنوں میں اس کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع تھا مگر بعد میں مارکیز نے لوگوں پر سادہ لوحی سے اعتماد کرنا بند کر دیا کیونکہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی اسے بہت نقصان پہنچا ہے، مارکیز نے بہت سے دھوکے کھائے ہیں مثلاً اس کے ایک دوست نے مارکیز کے ذاتی خطوط یو ایس اے کی ایک یونیورسٹی کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ مارکیز کو اس سے بہت رنج پہنچا اور اس واقعہ کے بعد اس نے لوگوں کو خط لکھنا بند ہی کر دیا۔ مارکیز نے بارہا اپنی گفتگو یا انٹرویو میں یہ دہرایا ہے کہ اسے کسی بھی سطح پر اقتدار کے لیے کوئی طلب نہیں ہے اور نہ ہی اس میں اس قسم کی کوئی صلاحیت ہے۔ جن سربراہان مملکت سے اس کی دوستی ہے اس کا کوئی تعلق اقتدار یا شہرت سے نہیں ہے بلکہ اسے ذاتی نوعیت کی چیز سمجھنا چاہیے۔

فیدل کاسترو سے مارکیز کی قریبی دوستی رہی ہے یہ دوستی بقول مارکیز ادب کے حوالے سے ہوئی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جب مارکیز ''پرنیسا لاطینا'' میں ملازمت کر رہا تھا، اس کی ملاقات فیدل سے ہوئی تھی پھر ایک زمانہ وہ آیا جب فیدل دنیا کا بدترین سیاست دان بن چکا تھا اور مارکیز دنیا کا مشہور ترین ادیب مگر اس زمانے میں بھی دونوں کے درمیان کتابوں کا مطالعہ اور ان پر گفتگو ہی دونوں کے بیچ دوستی اور قربت کی بنا تھی۔ فیدل کاسترو مطالعہ کا بھی بہت شوقین ہے اور ادب پر اس کی گہری نظر ہے مارکیز نے اپنا ناول ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' لکھنے کے بعد

اس کا مسودہ فیدل کو پڑھنے کے لیے دیا اور فیدل نے اس میں شکاری رائفل کی خصوصیات کے بارے میں ایک غلطی کی نشان دہی کی۔

بقول مارکیز فیدل کو اس بات کی بڑی حسرت ہے کہ وہ اگلے جنم میں ایک ادیب بنے۔

''مارکیز کی دوستی فرانسوا متراں سے بھی ادب کے ذریعہ ہی شروع ہوئی۔ ان دونوں کی ملاقات پابلو نرودا نے کرائی تھی، بعد میں جب فرانسو امتراں فرانس کا صدر بنا تب بھی یہ دوستی قائم رہی۔ فرانسو امتراں سے مارکیز کی گفتگو زیادہ تر سیاست پر ہی ہوتی رہی کیونکہ مارکیز کو فرانسیسی ادب سے زیادہ واقفیت نہ تھی مگر پناما کے حکمراں جنرل توریہوس سے مارکیز کی دوستی کی ابتدا ایک شکایت سے ہوئی۔ مارکیز نے ایک انٹرویو میں جنرل توریہوس پر تنقید کی تھی۔ بعد میں توریہوس نے مارکیز کو پناما آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ اس کا بیان کتنی بڑی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ اس دفعہ تو مارکیز باوجود کوشش کے وہاں نہ جا سکا مگر توریہوس کی دوبارہ دعوت پر وہ پناما گیا اور یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ توریہوس فیدل کاسترو کی طرح مطالعے کا شوقین نہ ثابت ہوا مگر تازہ ترین کتابوں کے بارے میں اس کی معلومات مکمل تھیں۔ پینلو اا پولیو سے گفتگو کے دوران مارکیز نے بتایا کہ میری توریہوس سے آخری ملاقات اس کی موت سے تین دن پہلے ہوئی۔ میں ۲۳ جولائی ۱۹۸۱ء کو پناما میں اسی کے مکان پر اس کے ساتھ تھا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ اندرون ملک دورے پر چلنے کو کہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ کیوں؟ مگر اس سے دوستی ہونے کے بعد پہلی بار میں نے انکار کر دیا۔ اگلے روز میں میکسیکو روانہ ہو گیا، دو دن بعد ایک دوست نے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ توریہوس نے اس جہاز میں خود کو ہلاک کر ڈالا جس میں اس کے اور دوستوں کی طرح ہم نے بھی متعدد بار اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس کی موت کے ردعمل کے طور پر مجھے اپنی آنتوں میں سے گہرا طیش اٹھتا محسوس ہوا کیونکہ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ میرا اس سے لگاؤ اس سے زیادہ تھا جتنا میں سمجھتا تھا اور یہ کہ میں اس کی موت کا کبھی عادی نہیں ہو سکوں گا۔

ہر گزرنے والا دن میرے اس خیال کو اور پختہ کرتا جاتا ہے۔"

(ترجمہ: اجمل کمال، حوالہ: امرود کی مہک، آج کراچی ۱۹۹۳ء)

توریہوس کی دوستی نہ صرف مارکیز سے بلکہ معروف ادیب گراہم گرین سے بھی تھی۔ مارکیز نے گراہم گرین کی اہمیت کو قبول کیا ہے مگر اسے اس بات پر حیرت بھی ہے کہ گراہم گرین جیسے عظیم ناول نگار کو نوبیل انعام کیوں نہیں مل سکا۔ بقول مارکیز گراہم گرین کی تحریروں نے اسے یہ سکھایا کہ گرم منطقہء حارہ کے خطوں کو کیسے دریافت کیا جائے اور یہ بھی کہ ادب میں حقیقت فوٹو گرافی کی طرح نہیں بلکہ مرکب ہوتی ہے۔

دراصل مارکیز کی شخصیت کو آسانی سے نہیں سمجھا جا سکتا، خاص طور پر اس کے سیاسی سروکاروں کو مثال کے طور پر مارکیز فیدل کاسترو کا قریب دوست ہوتے ہوئے بھی اس زمانے کی سوویت بیوروکریسی کے خلاف تھا، اس کے یہاں برزنیف اور کاسترو دو مختلف مظاہر ہیں یعنی کٹر قسم کے کمیونزم کے وہ خلاف نظر آتا ہے مگر فیدل کاسترو پر بھی ڈکٹیٹر شپ کا لیبل چسپاں ہے۔ لاطینی امریکہ کے دائیں بازو کا گروہ ہمیشہ ڈکٹیٹر شپ کی حمایت میں رہتا ہے اس لیے وہ مارکیز کے مخالف اس وجہ سے رہتا ہے کہ وہ عسکری آمریت کے خلاف لکھتا ہے مگر دوسری طرف لوگ اسے فیدل کاسترو کا ایجنٹ بھی سمجھتے رہے۔ کچھ لوگ اس بات پر بھی ناراض ہیں کہ مارکیز نے ایسی شاہانہ زندگی بسر کرنا کیوں شروع کر دی اور یہ کہ آخر وہ اپنی دولت میں غریبوں کو حصے دار کیوں نہیں بناتا۔ ساری دولت وہ عمدہ شراب اور اعلیٰ لباس اور اول درجے کے ہوٹلوں میں ٹھہرنے پر کیوں گنواتا رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں بعض اعتراضات تو مارکیز کے سیاسی نظریات کو خلوص کے ساتھ نہ سمجھ پانے کے سبب پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا لبرل رویہ ہر قسم کے کٹرپن کے خلاف ہے اور ایک سچے ادیب کی طرح اس میں ہر معاملہ میں انتخاب کرنے کی جرأت اور حوصلہ ہے۔ دوسری طرف ایسے اعتراضات ہیں جن کی نوعیت قطعی طور پر بچکانہ ہے اور وہ شاید اس سبب سے پیدا ہوتے ہیں کہ مارکیز کی شخصیت میں ایک قسم کا سحر رہا ہے۔ لوگ اس کے دیوانے رہتے ہیں اور لوگ ہی اس سے حسد رکھتے ہیں۔ اس کی شخصیت جس میں ظاہر اور باطن دونوں شامل ہیں، لوگوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔

جہاں تک فیدل کاسترو کا سوال ہے تو مارکیز نے اپنے بہت سے انٹرویوز میں اور گفتگو کے دوران فیدل سے اپنے تعلق اور دوستی کا برملا اظہار کیا ہے بغیر کسی لاگ لپٹ کے اس نے حقائق

بیان کیے ہیں۔ گابو کے ساتھ تین دن کے عنوان سے سلوانہ پیٹر کاترو نے ایک عمدہ مضمون لکھا ہے مضمون میں ایک مقام پر مارکیز کی صحافیوں سے ہوئی گفتگو کو پیش کیا گیا ہے۔ اس گفتگو کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

میں فیدل کے بارے میں صرف جذباتی ہو کر ہی بات کر سکتا ہوں میں اس کے بارے میں اونچے منبر پر کھڑا ہو کر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں، وہ دنیا کے ان لوگوں میں سے ایک ہے جنہیں میں سب سے زیادہ پیار کرتا ہوں ایک ڈکٹیٹر! کوئی کہتا ہے:
جمہوری ہونے کا مطلب صرف الیکشن منعقد کرنا ہی نہیں ہے۔ مارکیز جواب دیتا ہے پھر کہتا ہے یہ کوئی انٹرویو نہیں ہے اگر میں فیدل پر اپنی رائے کا اظہار کروں گا تو میں اسے خود لکھ کر کروں گا جو یقیناً اس بات چیت سے بہتر ہی ہوگی۔

(حوالہ پیرس ریویو، ماڈرن لائبریری، نیویارک ۲۰۰۳ء)

لاطینی امریکہ کے اہم ادیب اور کسی زمانے میں مارکیز کے گہرے دوست ماریو برگاس یوزا نے ایک انٹرویو میں بیان دیا کہ مارکیز کی ادبی تخلیقات کو میں بہت اعلیٰ درجے کی مانتا ہوں مگر یہی بات میں اس کے سیاسی نظریات کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔ میں اس کے ادبی کام پر چھ سو صفحات پر مبنی کتاب لکھی ہے مگر ذاتی طور پر میرے دل میں مارکیز کے لیے اب زیادہ احترام کا جذبہ نہیں رہا کیونکہ اس کی سیاسی آئیڈیالوجی مجھے سنجیدہ نہیں محسوس ہوتی یہ مجھے اشتہار بازی اور موقع پرستی دونوں کا ایک ملغوبہ نظر آتی ہے۔ (بحوالہ: پیرس ریویو، ماڈرن لائبریری نیویارک ۲۰۰۳ء)

کیوبا کا مشہور ناول نگار انفانتے بھی فیدل کاسترو کو ایک مظالم ڈھانے والے ڈکٹیٹر ہی کی شکل میں دیکھتا تھا اور اس لیے مارکیز پر بھی نکتہ چینی کرتا رہتا تھا۔

کیوبا کے ایک دوسرے ادیب رینالڈو ارینا س نے اپنی خود نوشت Before falls Night میں لکھا ہے کہ گارسیا مارکیز فیدل کاسترو کی ہمیشہ جھوٹی تعریف کرتا ہے حالانکہ مارکیز نے فیدل کی کچھ معاملوں میں تنقید بھی کی ہے۔ بہر حال ان سب باتوں سے یہ تو بالکل صاف نظر آتا ہے کہ مارکیز نے فیدل کاسترو سے اپنی دوستی کے حوالے سے کبھی منافقانہ باتیں نہیں کی ہیں، دوسروں کو خوش کرنے کے لیے مارکیز نے کبھی کوئی لبادہ نہیں اوڑھا۔ یوالیس اے کی تانا شاہی پر

جس طرح مارکیز نے کھل کر تنقید کی اس کے نتیجے میں کئی سالوں تک اسے یو، ایس، اے کا ویزا نہ مل سکا جب بل کلنٹن امریکہ کا صدر بنا تو اس نے مارکیز پر لگی اس پابندی کو ہٹایا اور یہ بھی قبول کیا کہ ''تنہائی کے سو سال'' اس کا بے حد پسندیدہ ناول رہا ہے۔

مارکیز کو فلموں سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ اپنے شروعاتی دنوں میں اس نے روم سے فلمسازی کا ایک کورس بھی کیا تھا۔ وہ میکسیکو میں فلموں کی اسکرپٹ لکھنے کے لیے بہت عرصے تک ٹھہرا بھی رہا مگر مارکیز نے محسوس کیا کہ فلم ایک قسم کا انڈسٹریل آرٹ ہے اور سینما میں اپنے آپ کا اظہار کر پانا بے حد مشکل ہے۔ اس لیے آہستہ آہستہ مارکیز اس شوق سے دور ہوتا گیا۔ چند سال پہلے اس نے اسپینی ٹیلی ویژن کے لیے چند فلموں کی سیریز ضرور بنائی تھی۔ ان فلموں کو پسند کیا گیا تھا مگر خود مارکیز کی تخلیقات پر فلمیں بنی ہیں۔ ''ہیضے کے دنوں میں محبت'' ''محبت کے اور دوسرے آسیب'' ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' ''بڑے بڑے پروں والا ایک بوڑھا پھوس'' ''کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا ہے'' ''معصوم اریندرا'' اور ''آئیز آف اے بلیوڈاگ'' پر بنائی گئی فلمیں بہت پسند کی گئی ہیں۔

اریندرا کا اسکرین پلے خود مارکیز نے ہی لکھا تھا۔ مارکیز نے کارلوس فیونتیس کے ساتھ مل کر حوان رلفو کی ایک تخلیق پر مبنی اسکرپٹ لکھا ہے۔ مارکیز فلموں کا ناقد رہا اور لاطینی امریکی فلم فاونڈیشن کا چیئر مین بھی۔

صحافت سے مارکیز کی دلچسپی برابر قائم رہی۔ ۱۹۹۵ء میں اس نے جرنلزم کا ایک انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا جو نئے صحافیوں کو جدید ترین ٹریننگ دینے کا کام بخوبی انجام دے رہا ہے۔

ایک عظیم ادیب کی سوانح محض ظاہری واقعات کے حوالے سے ترتیب دینا کبھی کبھی کارِ رائیگاں بھی محسوس ہوتا ہے۔ خاص طور سے وہ ادیب مارکیز ہو اور جس کی شخصیت اس کی تخلیقات سے کم سحر انگیز نہ ہو۔ مارکیز نے ہمیشہ ایک آزاد خیال دانشور کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ اس کے بعض خیالات لوگوں کو باغیانہ یا عجیب و غریب محسوس ہوتے ہیں مثلاً اس کا کہنا ہے کہ اس کے تعلقات مردوں کی بہ نسبت عورتوں سے بہتر رہے ہیں۔ وہ یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ اسے اسکول جانا اس لیے پسند تھا کہ جو عورت وہاں پڑھاتی تھی وہ بہت خوب صورت اور پر وقار تھی۔ مارکیز کو یقین ہے کہ اگر وہ کسی عورت کے ساتھ ہو تو اسے کوئی بری بات پیش نہیں آسکتی۔ یہ یقین ایک قسم کی توہم پرستی میں بدل چکا ہے۔ مارکیز کا بیان ہے کہ محض عورتوں کی بدولت ہی اسے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ مارکیز کی نانی اور اس کی تینوں خالاؤں نے اس کے تخیل کو جس طرح بیدار کیا اس کا ذکر

آچکا ہے۔

مارکیز کا خیال ہے کہ شاید جارح مردانگی عام طور پر مادری معاشروں کی پیداوار ہی ہوتی ہے مگر آگے چل کر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ خود اس کے وجود میں جارح مردانگی کا ایک ذرہ تک نہیں ہے مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اصل محرومی تو محبت کرنے کی اہلیت کا فقدان ہے اس سے بڑھ کر دوسری کوئی انسانی ابتلا نہیں ہو سکتی۔

پلینو اپولیو مینڈوزا سے ایک گفتگو کے دوران مارکیز نے کہا تھا کہ (جنسی آزادی کے بارے میں) ہم سب اپنے اپنے تعصبات کے ہاتھوں یرغمال ہیں، ایک آزاد خیال آدمی کے طور پر میرا عقیدہ ہے کہ نظری طور پر جنسی آزادی کو کبھی بھی اور کسی بھی طرح محدود نہیں کیا جانا چاہیے لیکن عملی طور پر میں اپنے کیتھولک پس منظر اور بورژوا معاشرے کے تعلقات سے فرار اختیار نہیں کر پاتا اور دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح دوہرے معیارات کا شکار ہو جاتا ہوں۔ (بحوالہ؛ امرود کی مہک ،ترجمہ: اجمل کمال، آج کراچی ۱۹۹۳ء)

گیبریئل گارسیا مارکیز جس کی اصل کہانی اس کے نانا کے گھر سے شروع ہوئی تھی جب وہ آٹھ سال کا بچہ تھا۔ ایک اکیلا بچہ جو اس وسیع و عریض مکان کے ہر کونے میں بھٹکتا پھرتا تھا، نانا کے علاوہ اس گھر میں بہت سی عورتیں تھیں جو اسے طرح طرح کی عجیب و غریب کہانیاں سناتی رہتی تھیں۔ وہ مُردوں سے بھی اس طرح باتیں کرتی تھیں جیسے وہ زندہ ہوں۔ یہ عورتیں خود بھی پرانی یادوں میں ہی زندگی بسر کر رہی تھیں، وہ توہم پرست تھیں اور اسی توہم پرستی نے ان کے اندر تخیل کا ایک ایسا عجیب و غریب سنسار رچا رکھا تھا جو ان کی نظروں میں حقیقت سے الگ کچھ نہ تھا، ان عورتوں میں پیش گوئی کی صلاحیت بھی تھی۔ مثال کے طور پر مارکیز کی خالہ فرانسکا سیمونو سیا اچانک ایک روز کفن بننے بیٹھ گئی۔ مارکیز نے اس سے پوچھا آپ یہ کفن کیوں بن رہی ہیں خالہ؟ اس لیے میرے بیٹے کہ میں مرنے والی ہوں۔ خالہ نے جواب دیا اور واقعی ایسا ہی ہوا جونہی خالہ کا کفن تیار ہوا وہ بستر پر لیٹ گئیں اور مر گئیں۔

یہ ہے وہ پراسرار ناقابلِ فہم ماحول اور دھند میں گھرے یہ کردار جو مارکیز کے ساتھ آج بھی موجود ہیں۔ اس کی تنہائی کو لازم بناتے ہوئے۔

پلینو اپولیو مینڈوزا اپنے مضمون گیبریئل کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے:

یہ بلاوجہ نہیں ہے کہ تنہائی کا موضوع اس کی تمام تحریروں پر چھایا ہوا ہے۔
اس کی جڑیں اس کے اپنے تجربے میں بہت گہری ہیں۔ اس وقت جب

وہ اراکاتا میں اپنے نانا نانی کے بڑے سے مکان میں ایک تنہا بچہ تھا یا اس وقت جب وہ بوگاتا کی ٹراموں میں طالبِ علمی کے زمانے میں اتواروں کی سہ پہروں کی اداسی کو شاعری کے مطالعے میں ڈبویا کرتا تھا یا اس وقت جب وہ بارنکیلا کے ایک قحبہ خانے میں مقیم ایک نوجوان ادیب تھا، تنہائی کا سایہ ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہا اب بھی جب وہ ایک مشہور عالم ادیب ہے یہ سایہ ہر جگہ اس کا پیچھا کرتا ہے ان پر تکلف شاموں میں بھی جب وہ دوستوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے، تنہائی کا سایہ موجود رہتا ہے۔ اس نے وہ بتیس جنگیں جیت لی ہیں جو کرنل اورلیانو بیوئندیا ہار گیا تھا لیکن وہ تقدیر جس نے پورے بوئیندیا خاندان پر ایسا انمٹ نشان چھوڑ دیا تھا، وہی بے رحم تقدیر اس کی بھی ہے۔

(ترجمہ: اجمل کمال، بحوالہ آج، کراچی ۱۹۹۳)

آج مارکیز کی عمر بیاسی سال کی ہو چکی ہے۔ نانا، نانی کے گھر آٹھ سال کی عمر تک تنہائی کی جس سزا کو اس نے بھگتا تھا، اس کا ایک سرا بیاسی سال کے مارکیز کی تنہائی سے جا ملا ہے۔

بلڈ کینسر، کمزوری، بڑھاپا یہ سب شاید مارکیز کے لیے عام اور معمولی باتیں ہوں کیونکہ اس کی اپنی ازلی تنہائی سے ان سب کو ہارنا پڑا ہے موت کو بھی ہارنا ہی پڑے گا۔ موت مارکیز کے لیے بس ایک نیا کام ضرور کر سکتی ہے اور وہ یہ کہ مارکیز کی تنہائی کو ابدی تنہائی بنا دے۔

اس وقت جب یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں مارکیز زندہ ہے۔ ہمارے زمانے کا سب سے عظیم قصہ گو مصنف زندہ ہے۔ وہ اپنی یادداشتیں لکھ رہا ہوگا اور اس کی نظروں کے سامنے ایک خون کی لکیر ہوگی جو بہتے بہتے اراکاتا کے اس کے نانا نانی کے ویران اور بڑے سے مکان کی کسی موری میں جا کر مل جائے گی، اسے اپنے ماخذ تک پہنچاتی ہوئی اس کے کمزور اور بیمار دل سے نکلتی ہوئی خون کی لکیر۔ بالکل ''تنہائی کے سو سال'' کے ایک منظر کی مانند۔

یہی وہ ابدی تنہائی ہوگی جس میں گیبریئل گارسیا مارکیز ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس اندیشے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس بار اخباروں میں اگر اس کی موت کی خبر شائع ہوئی تو شاید پہلے کی طرح اب وہ جھوٹی نہ ثابت ہو۔



(مشمولہ: ''گابریئل گارسیا مارکیز: فن اور شخصیت'' از خالد جاوید، کراچی، شہرزاد، ۲۰۱۰ء)

گیبرئیل گارسیا مارکیز

جیرالڈ مارٹن/ دانیال شیرازی

گیبریل گارسیا مارکیز، جس کا ۸۷ سال کی عمر میں کینسر سے انتقال ہوا، بیسویں صدی کے حیرت انگیز ادبی مظاہر میں سے ایک تھا۔ وہ کولمبیا کے ایک چھوٹے سے مضافاتی قصبے میں ایک ٹیلی گراف آپریٹر کے گھر ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوا، اس نے ۱۹۸۲ء میں ادب کا نوبیل انعام حاصل کیا، اور ہمارے عہد میں ہسپانوی زبان کا سب سے زیادہ پڑھے جانے اور اثر انداز ہونے والا ادیب بن گیا۔ بہت سے لوگوں کا ایمان ہے کہ وہ سروانتیس کے بعد ہسپانوی زبان کا سب سے بڑا ناول نگار ہے اور اس کے اثرات اتنے ہی دور رس ہوں گے جتنے کہ اس کے ہسپانوی پیش رو کے ہیں۔

وہ تیسری دنیا کا پہلا ادیب ہے جسے اس قدر عالمگیر پیمانے پر ستائش حاصل ہوئی اور وہ عصر حاضر میں دنیا بھر میں ان گنے چنے اہل ادب میں سے ہے جسے بلزاک اور ڈکنز جیسے ادیبوں کی سی ہر دل عزیزی اور احترام حاصل ہوا۔ علاوہ برایں، اس کی طلسمی حقیقت پسندانہ تحریریں جو گزشتہ ۵۰ برسوں میں لاطینی امریکہ کی روایت کی غیر معمولی مقبولیت کی، جسے بہ اصطلاح ’’گرم بازاری ‘‘ کہا جاتا ہے، اصل محرک بنیں، اور اس کے فیدل کاسترو، فرانس میتراں، فلیپ گونزالیز، بل کلنٹن سے ذاتی مراسم کی وجہ سے اس کی زندگی کی داستان بے طرح پر مایہ اور مسحور کن بن گئی۔

ان بے خودی طاری کر دینے والی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود، اس نے کبھی اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا: ’’کچھ بھی ہو، میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ اپنی روح کی حقیقت میں، میں اراکاتا کا کے ٹیلی گراف آپریٹر کے ۱۶ بچوں میں سے کسی ایک سے بھی کچھ بڑھ کر یا کم تر ہوں۔‘‘

کولومبیا لاطینی امریکی جمہوریاؤں میں سب سے زیادہ قدامت پسند اور روایت پسند ملک سمجھا جاتا تھا، وہ ملک جہاں انتہائی بے عیب ہسپانوی بولی جاتی تھی، جہاں کیتھولک مذہب سے سب سے زیادہ عقیدت تھی، جہاں پرانے نوآبادیاتی طرزِ زندگی جو انیسویں صدی سے چلا آرہا تھا، کو سب سے زیادہ استحکام حاصل تھا۔ بیسویں صدی میں بھی سیاسی، اجتماعی اور معاشیاتی تباہ کاریوں کی پے در پے لہروں کے باوجود کولومبیا کے لوگوں کے ذہنوں سے یہ نظریات مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئے تھے، اگرچہ بقیہ دنیا کو اب ملک کا نام سنتے ہی صرف منشیات کی تجارت اور معاشرتی انتشار کا خیال آتا ہے۔

گارسیا مارکیز ان تمام تہہ و بالا کر دینے والے تغیرات سے گزرا ہے اور اس کی تحریریں اس کی شہادت دیتی ہیں۔

گیبریئل حوزے گارسیا مارکیز، کیریبین کے شمالی ساحل کے نزدیک اراکاتا کا ایک چھوٹے سے ٹروپیکل قصبے میں مارچ ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوا۔ آٹھ سال کی عمر تک وہ اپنے نانا اور نانی کے پاس رہا، ۶ یا ۷ برس کا ہونے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں کون ہے، اپنے باپ کو اس نے کچھ اور دیر کے بعد پہچانا: وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس کے بچپن میں اس کے لیے سب سے زیادہ اہم شخص اس کے نانا تھے اور آٹھ سال کی عمر کے بعد سے جب اس کے نانا کا انتقال ہوا اس کی زندگی میں پھر کوئی حقیقی اہمیت کا حامل واقعہ پیش نہیں آیا۔ ٹروپیکانہ کے قصبے میں بزرگ خاندان کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کی یادیں مستقبل میں اس کی جذباتی نشوونما میں اہم کردار ادا کرنے والی تھیں۔

گیبریئل گارسیا مارکیز ۔تصاویر میں زندگی

آج کولومبیا کے پورے شمالی علاقے کے گرد ایک اساطیر ہالہ سا بن گیا ہے اور گارسیا مارکیز کی فنتاسیوں نے اس کے ادبی محبوب فاکنر کی تحریروں کی طرح جو امریکہ کے انتہائی دور افتادہ شمالی علاقوں کو ایجاد کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، حقیقت پر حاوی ہونا شروع کر دیا ہے۔ نانا کے انتقال کے بعد گیبریئل کو بارانکویلا کے کہر آلود ساحلی شہر میں ایک جیسوئیٹ اسکول میں بھیج دیا گیا اور بعد میں اس کا داخلہ بگوتا کے قریب اندیزی شہر زیپا کیورا کے ایک ثانوی بورڈنگ اسکول میں کرایا گیا۔ (بگوتا کے متعلق اس کے ابتدائی تاثرات یہ تھے: سرد، مرطوب، معاندانہ اور قدامت پسند شہر۔ یا تاثرات ساری عمر اس کے ذہن سے جدا نہیں ہو سکے۔)

زیپا کیورا میں وہ شدید تنہائی کا شکار اور گھر کی یاد میں بری طرح مبتلا رہا کرتا تھا۔ وہیں اس

نے عالمی ادب کے تمام شاہکار حریصانہ طور پر پڑھ ڈالے۔ سوفوکلیز کی اڈیپس ریکس کا اثر سب سے زیادہ دیرپا نکلا۔ وہیں اس کے اساتذہ نے جن میں سے اکثر ناکام مارکسسٹ تھے، اسے تاریخی مادیت پرستی کے عقائد سے روشناس کرایا۔

۱۹۴۷ء میں گارسیا مارکیز نے بگوتا کا سفر کیا، اب وہ ۱۹ سال کا ہو چکا تھا۔ اس نے نیشنل یونیورسٹی کے قانون کے کلیے میں ایک نادر طالب علم کے طور پر داخل ہوا۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں لبرل رہنما جورجے ایلسر گیتان کے قتل ہونے کے بعد ''بوگا تازاو'' بغاوت کا آغاز ہوا وہ بیس سالہ طویل معاشرتی افراتفری پیدا ہوئی جسے آج عمومی طور پر ''فسادات'' کہا جاتا ہے اور جس کی باز گشت اب بھی کولمبیا کو پریشان کرتی ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح گارسیا مارکیز بھی جس دن اس کے بورڈنگ ہاؤس کی نذر آتش کیا گیا، بگوتا سے دور نکل گیا۔ وہ کارتاجینا کے ساحلی شہر میں اپنے خاندان کے پاس پہنچ گیا اور وہیں اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔

۱۹۵۰ء میں وہ بارانکویلا، جہاں اس نے نوعمری میں تعلیم حاصل کی، واپس آ گیا اور اخبار ال ہرالدو کے عملے میں شامل ہو گیا۔ وہیں اس نے کچھ ادیبوں اور بلانوشوں سے شناسائی پیدا کی جنہیں ''بارانکویلا گروپ'' کہا جاتا تھا۔ شہرت حاصل ہونے کے بعد ایک بار اس نے کہا تھا کہ اس نے لکھنا صرف اس لیے جاری رکھا تھا کہ اس کے دوست اس سے اور زیادہ محبت کر سکیں تو دوستوں سے اس کی مراد یہی ''دی گریٹ لیں نیکرز'' تھے۔ وہیں وہ مرسیڈیز بارچا سے دوبارہ ملا۔ مرسیڈیز جس سے وہ کئی سال پہلے ملا تھا، ایک فارماسسٹ کی بیٹی تھی۔ مرسیڈیز ہی بعد میں اس کی بیوی بنی۔

کرایم اسٹریٹ پر ایک قحبہ خانے میں سکونت کے دوران ۱۹۵۲ء میں اس نے اپنا پہلا ناول ''پتوں کا طوفان'' لکھا جو ۱۹۵۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کی ابتدائی تحریروں کی طرح یہ ناول بھی ایک چھوٹے سے قصبے کی یادداشتوں پر مبنی ہے، جسے اس کے فکشن میں ماکوندو کے نام مشہور ہونا تھا۔ (میرے بارے میں سب سے زیادہ میرے تخیل کی تعریف ہوتی ہے، مگر سچ پوچھئے تو میں ایک سفاک حقیقت نگار ہوں۔ میں نے کچھ بھی اختراع نہیں کیا، جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ سب کچھ پہلے سے ہی موجود تھا۔)

۱۹۵۴ء ایک اور نوجوان مصنف الوارو میوتیس نے اسے بگوتا میں ال اسپکتادور کے لیے کام کرنے پر قائل کر لیا۔ وہاں اس نے جلد ہی بہت ترقی حاصل کر لی اور کولمبیا کے معروف صحافیوں میں شمار کیا جانے لگا۔ فسادات کے عروج کے دنوں میں وہ اپنے سیاسی اور ثقافتی دلچسپیوں کے

امور پر مبسوط وقائع کے وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ہمیشہ سے ایک راسخ العقیدہ سوشلسٹ اور سامراج مخالف گارسیا مارکیز بارانکویلا میں قیام کے دنوں سے ہی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بن چکا تھا ۔۱۹۵۵ء میں اس نے پارٹی کے حلقے میں شمولیت اختیار کی مگر ادب اور سیاست کے تعلق پر پارٹی کے موقف سے اختلافات کے باعث چند ماہ بعد ہی وہ پارٹی کے حلقے سے نکل گیا۔ بعد میں اس نے کہا،'' مصنف کی ذمہ داری -اس کی انقلابی ذمہ داری ، اگر آپ جاننا ہی چاہیں ،تو صرف بہت سے بہتر لکھنا ہے۔''

جولائی ۱۹۵۵ء میں گارسیا مارکیز پہلی بار کولمبیا سے باہر گیا۔ اس نے '' پتوں کا طوفان'' شائع کی تھی ، جسے کوئی پذیرائی نہیں ملی تھی ، اور روہاس پنیلا کی آمرانہ حکومت بھی بدعنوانیوں کے خلاف اس کے مضامین کی اشاعت کی وجہ سے اس کے درپے ہوگئی تھی ۔ اس نے ایک دو ہفتے سوئزرلینڈ میں گزارے ، کئی ماہ وہ روم کے سینا چینا ایکسپریمنٹل فلم اسکول میں رہا جہاں اس نے فلم سازی کا درس لیا اور سال کے اختتام پر وہ پیرس چلا گیا۔

واپس آتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ اس کا اخبار فوجی آمریت کی طرف سے بند کروا دیا گیا ہے ۔ اس کے پاس واپسی کا کرایہ ہی بچا تھا، مگر واپس جانے کے بجائے وہ کیوہاس ریو پر ہوٹل دی فلاندر میں ٹھہر گیا۔ وہ فاقوں کا شکار تھا اور تنخواہ کے اس چیک کا منتظر جو کبھی نہیں ملا۔ اس نے اپنا سارا وقت '' ساعتِ بد میں'' اور '' کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا'' لکھنے کے لیے وقت کر دیا تھا۔ جنوری ۱۹۵۷ء تک دونوں نے ہی اس پر دل شکستگی کا ایک دردانگیز تاثر چھوڑا، جیسے کہ شاید وہ کچھ اور ہی لکھنا چاہتا تھا۔ اس کا ایک ہسپانوی اداکارہ تاشیا کوینتانا کے ساتھ ایک سال تک معاشقہ چلا ،جس کی جھلک اس کے کئی ناولوں میں نظر آتی ہے۔

۱۹۵۷ء کے موسم سرما میں گارسیا مارکیز نے مشرقی یورپ کا دورہ کیا۔ وہ مشرقی جرمنی ، سوویت یونین ، چیکوسلواکیہ ، پولینڈ اور ہنگری گیا۔ اس سفر کا حاصل وہ دس طویل مضامین تھے جو کاراکاس اور بگوتا سے چھپے، ان مضامین کی خاص بات حقیقی طور پر موجود سوشل ازم کی دم توڑتی ہوئی زوال آمادہ دنیا سے اس کی ناامیدی اور اس کے لیے اسٹالن کی کافکائی شخصیت میں دہشت زدہ سحر انگیزی کا نظر آنا تھا۔

اکتوبر ۱۹۵۷ء میں وہ اس امید پر لندن گیا کہ وہاں انگریزی سیکھے گا اور اس نے دو ماہ ساؤتھ کنگسٹن کے ایک ہوٹل میں ٹھہرتے ہوئے گزارے۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں وہ مختصر عرصے کے لیے مرسیڈیز کے ساتھ شادی کرنے بارانکویلا آیا اور '' کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا'' کی اشاعت کا

اہتمام کیا۔ وہ نئی نویلی دلہن کو کاراکاس واپس لے گیا۔ کاراکاس میں وہ صرف اتوار کو تخلیقی کام کیا کرتا، وہیں اس نے ''بڑی ماما کا جنازہ'' کی کہانیوں پر سخت محنت کی، یہ کہانیاں لندن میں شروع ہوئی تھیں۔

۱۹۵۹ء کے اوائل میں کیوبا کے انقلاب کے اولین حامیوں کے طور پر سے اسے اور اس کے دوست پینو مندوزا کو کیوبا کی نئی پریس ایجنسی پریسنا لاطینا کا دفتر کھولنے کی دعوت ملی۔ اس کا پہلا بیٹا رودریگو ۲۴ اگست کو پیدا ہوا جسے اس کے طالب علمی کے زمانے کے ایک دوست کامیلوتورس نے بپتسمہ دیا جو اس وقت کیتھولک پادری بن چکا تھا۔ وہیں اس سے ''بڑی ماما کا جنازہ'' مکمل کی۔ ۱۹۶۰ء کے اواخر میں وہ کیوبا گیا اور تین مشکل مہینے پریسنا لاطینا کے مرکزی دفتر میں کام کرنے میں گزارے، اور پھر ۱۹۶۱ء کے شروع میں وہ نیویارک منتقل ہو گیا۔ ان دنوں امریکہ میں کیوبا کے انقلابی حکومت کے خلاف بڑے پیمانے پر مخالفت کی فضا تھی۔ اسے اور میندوزا کو اسٹالن پرست عناصر کی طرف سے بھی جو کیوبا کی نئی حکومت میں اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کررہے تھے، سخت دباؤ کا سامنا تھا، آخرکار کئی ماہ دباؤ سہنے کے بعد انہوں نے مئی میں فلک بوس عمارتوں کے اس شہر کو چھوڑ دیا۔

کولمبیا واپس جاتے ہوئے، مصنف اور اس کا خاندان ۱۹۶۱ء میں اس دن میکسیکو پہنچا، جس دن ہمینگوے کا انتقال ہوا تھا۔ وہ میکسیکو میں رہنے لگے۔ میکسیکو ایک ایسا ملک تھا جس نے کیوبا کے انقلاب اور اس پر کولمبیا کے ردِعمل کے درمیان ایک طرح کے متوازن طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ اپنے خاندان کی پرورش کے لیے خاص طور پر ایسے وقت میں جب کہ اس کا دوسرا بیٹا گونزولو پیدا ہونے والا تھا، اسے وہاں جو کام بھی ملا اس نے قبول کرلیا۔ اس نے مقبولِ عام رسالوں اور اشتہاری ایجنسیوں کے لیے کام کیا۔ گونزولو ۲۶ اپریل ۱۹۶۲ء کو پیدا ہوا (وہ بڑا ہو کر میکسیکو سٹی میں گرافک ڈیزائنر اور مصور بنا اور رودریگو کو ہالی ووڈ میں ایک کامیاب ڈائریکٹر بننا تھا)۔ ۱۹۸۸ء میں گارسیا مارکیز نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے یوں کہا: ''عمر کے تقریباً ۴۰ سال تک مجھے مالی مشکلات کا سامنا رہا، مجھے روزگار کے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ میں مصنف یا کچھ اور نہیں بن پایا تھا۔ یہ جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے دشوار دور تھا، مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ میں ایک اضافی فرد کی طرح ہوں اور میرا کہیں بھی شمار نہیں ہے۔''

۱۹۶۵ء میں ادبی عزائم کی شکست سے افسردہ خاطر ہو کر اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ وہ اب کبھی فکشن نہیں لکھے گا، گارسیا مارکیز اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لیے اپنی کار میں چھٹیاں منانے

کے لیے اپاکلیو جا رہا تھا کہ وہ معجزہ رونما ہوا جس کا تذکرہ تواتر سے کیا جاتا ہے۔ ''تنہائی کے سو سال'' کی پہلی سطر ایک خواب کی طرح اس کے ذہن میں آئی اور اس نے کار کا رخ موڑا اور سان انجل میں اپنے گھر پہنچ گیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے آپ کو ۱۸ مہینوں تک در بند کیے رکھا اور فروعی معاملات مثلاً گھر کے اخراجات کے لیے پیسے کمانا، مرسیڈیز پر چھوڑ دیے، اور بیسویں صدی میں لاطینی امریکہ کا سب سے مشہور ناول لکھ ڈالا۔

ناول جون ۱۹۶۷ء میں بیونیس آیریز سے شائع ہوا اور اس نے راتوں رات ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس کی ابتدائی سطریں: کئی سال بعد جب فائرنگ اسکواڈ کے سامنے، کرنل اور ریلیانو بیوندیا بہت زمانہ پہلے گزری ہوئی اس دوپہر کو یاد کر رہا ہوگا جس میں اس کے نانا اسے برف دکھانے کے لیے گئے تھے۔'' اب اتنا ہی زبان زدِ عام ہے جتنا کہ سروانتیس کی دان کیو ہوتے کا شروع کا جملہ: ''لا مانچا کے ایک دیہات میں، جس کا نام بھی میں نہیں چاہتا کہ مجھے یاد آئے، بہت دن نہیں ہوئے کہ ایک مہم جو ہوا کرتا تھا۔''

دی ٹائمز نے جون ۱۹۷۰ء کے سنڈے ریویو کا پورا صفحہ اس ناول کے پہلے باب کے لیے ایک سائیکا ڈیلک تصویر کے ساتھ وقف کیا جو ''سارجنٹ پیپر'' یا ''یلو سب میرین'' کی یاد دلا رہی تھی جو اسی ماہ منظرِ عام پر آئے تھے جس میں ''تنہائی کے سو سال'' شائع ہوئی۔ جان برگر تحریر کرنے والا تھا: ''تنہائی کے سو سال'' ان لوگوں کے بارے میں ہے جو تاریخ کی مزاحمت اور المیے کی وسعت اور تلاطم خیزی سے آگاہ ہیں۔''

مفلوک الحال مارکیز جو صرف چند ماہ پیشتر اپنا اثاث البیت رہن رکھ چکا تھا، اب اس حال میں تھا کہ وہ اپنی تحریروں کی یافت پر زندگی بسر کر سکے۔ اکتوبر میں یہ خاندان بارسلونا منتقل ہو گیا۔ اپنی ناخوشگوار آمرانہ فضا کے باوجود یہ عظیم کاتالانی شہر، سیکس بورال پبلشنگ ہاؤس اور ۱۹۶۵ء سے ان کے ادبی ایجنٹ کارمن بالسلز کے توسط سے سن ساٹھ کی اشاعتی گرم بازاری کا اصل مرکز بن چکا تھا۔ ماریو وارگاس یوسا اور حوزے دنوسو بھی جلد ہی کاتالان کے دارالحکومت میں سکونت پذیر ہونے والے تھے۔ گارسیا مارکیز، اپنے نئے دوستوں کے تئیں ''گابو'' کو جلد ہی معروف ادیبوں اور دانشوروں سے واقفیت حاصل ہو گئی۔ اسی دوران ''تنہائی کے سو سال'' کے تراجم دنیا کے مختلف حصوں میں چھپتے رہے۔

۱۹۷۲ء میں گارسیا مارکیز نے رومیولو گالیگوس انعام حاصل کیا اور اس نے ساری انعامی رقم ایک سابق گوریلا تنظیم ایم۔اے۔ایس (سوشلزم کے لیے تحریک) کو، جس سے وہ خود منسلک رہ

چکا تھا، عطیہ کر کے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ مگر ۱۱ ستمبر کو چلی میں آنے والے انقلاب کے بعد اسے ادراک ہو گیا کہ وہ سیاسی طور پر زیادہ متحرک نہیں ہے۔ اس نے بگوتا سے بائیں بازو کے ایک نئے میگزین الترناتیوا شروع کیا۔ میگزین زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا، پھر بھی مارکیز غیر متزلزل رہا اور اپنے نامکمل منصوبے ''پدر سالار کی خزاں'' پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس ناول کی اساس گومز، تروہیو، دوالیئر، یوبیکو اور فرانکو جیسے آمروں کے کرداروں پر ہے (اس کے ایک پرانے دوست نے اس ناول کو پڑھ کر ۱۹۷۵ء میں کہا کہ اس نے اس طرح کا سوانح عمری ناول کبھی نہیں پڑھا تھا۔)

۱۹۷۸ء میں گارسیا مارکیز نے ایک نئے دوست گراہم گرین (''اس کی کتابوں سے مجھے معلوم ہوا ٹروپکس کا کشف کیسے حاصل کیا جاتا ہے'') کے ساتھ امریکہ اور پناما کے درمیان نہری معاہدہ پر دستخط کی تقریب میں مہمان کے طور پر امریکہ کا سفر کیا۔ اس وقت تک یہ کولومبیائی باشندہ ایک غیر اعلانیہ گشتی سفیر بن چکا تھا، اور مذاکرات کے ذریعہ امن کی بحالی کے لیے وسطی امریکہ کے مختلف ممالک کا دورہ کرتا رہتا تھا۔

مارچ ۱۹۸۱ء میں اسے سفارتی تحفظ استعمال کرتے ہوئے کولومبیا سے فرار حاصل کرنا پڑا، کیوں کہ یہ کہا جا رہا تھا کہ فوج اے ایم۔ ۱۹ گوریلا تحریک کے ساتھ مبینہ روابط کی وجہ سے گرفتار کرنے جا رہی ہے۔ یہ واقعہ اس کے نئے ناول ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' کے کتابوں کی دوکانوں میں پہنچنے سے کچھ پہلے پیش آیا تھا۔ صرف کولومبیا میں دس لاکھ پچاس ہزار جلدیں لاطینی امریکہ میں تقسیم کرنے کے لیے طبع ہوئی تھیں، یہ سب سے بڑا ریکارڈ تھا، اور جب اس ناول کی ۱۹۸۱ء میں امریکہ میں اشاعت ہوئی نیوز ویک نے اسے اس سال کی کتاب نامزد کیا۔

اکتوبر ۱۹۸۲ء میں جب مارکیز برازیلی ڈائریکٹر رے گیورا کے ساتھ میکسیکو میں فلم بنا رہا تھا، اسے اطلاع ملی کہ اسے ادب کا نوبیل انعام دیا گیا ہے۔ وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں تک کوئی لاطینی امریکی ادیب بلکہ تیسری دنیا کا کوئی ادیب نہیں پہنچ سکا تھا۔ وکٹر ہیوگو اور زولا کے عہد کے بعد سے بین الاقوامی طور پر اپنے اثرات اور اپنی تکریم کو شاید ہی کسی ادیب نے اسے بڑھ کر تسلیم کرایا ہوگا۔ میکسیکو سے اس کی بیرون ممالک کے دوروں اور واپسی کی خبریں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہونے لگیں۔ وہ دنیا بھر میں ادب پر گفتگو کرنے والوں کے لیے ایک عام موضوع بن گیا۔ دوسرے ممالک کے ادیبوں نے بھی واضح طور پر عظیم کولومبیائی مصنف کے زیر اثر ''طلسمی حقیقت پسندی'' تخلیق کرنی شروع کر دی۔

۱۹۸۸ء میں ''وبا کے دنوں میں محبت'' شائع ہوئی جس کا انتساب مرسیڈیز کے نام تھا۔ یہ ناول کچھ پہلے دنوں کے اور نسبتاً پر امن کولمبیا کے پس منظر میں دو ستر سالہ افراد کے درمیان ایک ناممکن محبت اور اس کے خوشگوار انجام کی داستان ہے۔ گارسیا مارکیز فخریہ انداز میں بتاتا تھا کہ یہ ناول سفر پر جانے والوں میں خصوصی طور پر مقبول تھا: ''ہمارے سروں پر منڈلانے والے ہر جٹ طیارے میں بیٹھا کوئی نہ کوئی شخص ''وبا کے دنوں میں محبت'' پڑھ رہا ہے۔''

اسی دوران اس نے خود کو کیوبا میں فاؤنڈیشن آف نیو لیٹین امریکن سینما کی سرمایہ کاری میں بہت زیادہ مشغول کر لیا تھا، وہ ہر سال کئی ماہ اس پر صرف کرتا اور ہر دسمبر میں فلم فیسٹول میں باقاعدگی سے شریک ہوتا۔ وہ لاطینی امریکی عوام کی ذہنی نشوونما کو جلا دینے کے لیے سنجیدہ سوپ اوپرا کی ترویج کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کئی اعتبار سے اس کا ''وبا کے دنوں میں محبت'' اس مقصد کے لیے بہت موزوں ہے۔ ماریو وارگاس یوسا نے کہا کہ گارسیا مارکیز نے حقیقت کو افسانوی انداز میں دیکھا ہے، وہ ایک ایسا شخص ہے جو نظریہ پردازی اور تعمیم پسندی سے طبعی طور پر بیزار ہے۔'' وہ شاذ و نادر ہی اپنی تحریر پڑھتا تھا۔ اس نے ''تنہائی کے سو سال'' کے تمام نوٹس اور مسودوں کو عمداً تلف کر دیا اس نے اپنی تحریروں کے بارے میں ناقدوں کی آرا پر بہت کم توجہ دی۔ فی الواقع اسے ہمیشہ یہ خوف رہا کہ کہیں وہ اس فکر میں نہ پڑ جائے کہ ناقدین کیا کہیں گے۔

۱۹۸۹ء میں جب وہ واقعات رونما ہونے لگے جن کے نتیجے میں دیوار برلن گرائی گئی، ''دی جنرل ان ہز لیبرنتھ'' شائع ہوا، یہ ناول عظیم آزادی دہندہ سیمون بولیوار کے بارے میں ہے اور اس کا لکھا جانا ناگزیر تھا، گارسیا مارکیز کی ایک اور مرکزی شخصیت، اپنی ہی طاقت، اپنی ہی شہرت، اپنے ہی اسطور اور اپنے ہی فریب نظر کی گرفتار جن سب کا موت تصفیہ کر دیتی ہے اپنی غیر مبہم روش کے باوجود گارسیا مارکیز نے اصرار کیا: ''اس کا خواب ابھی بھی زندہ ہے -ایک متحد اور خود مختار لاطینی امریکہ۔''

اسپین کی امریکہ کی ''دریافت'' کے پانچ سو سال مکمل ہونے کی مناسبت سے ۱۹۹۲ء میں اس نے کہانیوں کا ایک مجموعہ ''حیرت انگیز زیارتیں'' شائع کیا جس میں نئی دنیا اور پرانی دنیا کے درمیان رشتے کو طنزیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۹۹۴ء میں اس نے محبت کے بارے میں ایک اور تاریخی ناول ''عشق اور دیگر آسیب'' بھی لکھا جو ۱۸ویں صدی کے آواخر کے کارتاجینا میں ایک نوعمر لڑکی جس پر ساحرہ ہونے کا الزام ہے اور

کیتھولک پادری کے درمیان عشق کی ایک تمثیل ہے۔ ۱۹۹۶ء میں ''ایک اغوا کی خبر'' جو ۱۹۹۰ء کے اوائل سے اٹھنے والی سیاسی اغوا کی لہر سے تعلق ہے، شائع ہوئی۔ یہ ناول بھی دنیا بھر میں مشہور ہوا۔

۱۹۹۹ء میں گارسیا مارکیز لمفوما کا مرض لاحق ہوا۔ پہلے ہی اس کا ۱۹۹۲ء میں کینسر ہو چکا تھا۔ وہ بیماری سے نبرد آزما ہونے کے لیے تقریباً تین سال تک آرام کرتا رہا اور عوامی تقریبات سے دور رہا۔ کئی عشروں سے وہ اپنی یادداشتیں تحریر کرنے کی باتیں کر رہا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں چھ جلدوں میں مکمل کرے گا، مگر وہ صرف جلدِ اول کی تکمیل کر پایا، جس کا عنوان اس نے ''کہانی کہنے کو زندہ رہنا'' رکھا۔ ۲۰۰۲ء میں چھپتے ہی یہ بین الاقوامی طور پر زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ایک بن گئی۔ اگلے سال سے گارسیا مارکیز نے دوبارہ عوام کے سامنے آنا شروع کیا، مگر اس نے کبھی سیر نہ ہونے والے صحافیوں کو کوئی انٹرویو نہیں دیا۔ اس نے اپنا آخری ناول ''میری سوگوار بیسوائیں کی یادیں'' ۲۰۰۴ء میں لکھا جو ایک ۹۰ سالہ کنوارے مرد اور ایک ۱۴ سالہ باکرہ لڑکی کے درمیان تعلق کی کسی حد تک پریشان کن اور بلاشبہ متنازعہ داستان ہے۔ یہ ناول بھی ناقدین کو پسند آیا، اگرچہ اس کے بیشتر ابواب میں گارسیا مارکیز کے پہلے ناولوں کی سی تابانی اور مسحور کن کیفیت نہیں تھی۔

۲۰۰۷ء میں، اسپین کی روایل اکیڈمی نے گارسیا مارکیز کی ۸۰ویں سال گرہ پر خصوصی ایڈیشن دس لاکھ کی تعداد میں شائع کیا۔ شاہِ اسپین، امریکہ کے سابق صدر بل کلنٹن اور کولمبیا سابق صدور حاضرین میں شامل تھے۔ کارلوس فیونتیس جیسے ادبی دوست بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔

گارسیا مارکیز نے اپنی ایک تقریر میں اپنے سب سے زیادہ شہرت یافتہ ناول لکھنے کے دوران پیش آنے والے نامساعد حالات کا ذکر کیا اور اپنی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر حیرانیوں کا اظہار کیا۔ اب وہ اپنی یادداشت کھونے لگا تھا اور اس کا خاندان روز بروز زیادہ سختی کیساتھ اسے پریس اور عوام کے سامنے آنے سے روکنے لگا تھا۔ یادداشت اس کا اہم موضوع رہی ہے اور اس کا اپنا حافظہ بھی قابلِ رشک تھا، مگر اس کی زندگی کے آخری چند سال انتہائی کرب انگیز گزرے۔

زندگی کے آخری برسوں میں اس کی زیادہ تر توجہ ان خواہشات کی تکمیل کے لیے وقف ہو گئی جو اس کے دل میں صحافت کے ابتدائی دور میں پیدا ہوئی تھیں۔ فنکاروں اور دانشوروں کے

عام روش کے برعکس اس نے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی دولت صرف کی۔

اس نے موسیقی، جرنلزم، فلم اور ٹیلی ویژن میں عوامی ثقافت اور سنجیدہ ادب کے درمیان خلا کو کم کرنے کی کوشش کی تا کہ اس طرح لاطینی امریکہ کی شناخت نمایاں ہو سکے اور اس کی ثقافت سے دینا زیادہ سے زیادہ آشنا ہو سکے۔

اس نے ہمیشہ لاطینی امریکہ خود اپنی تاریخ بنانے کا اختیار حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ اس نے اخبارات اور میگزین جاری کیے اور سنجیدہ ادبی اداروں کی اعانت کی۔ ہوانا میں علم اینڈ ٹیلی ویژن اکیڈمی قائم کرنے کے بعد اس نے ۱۹۸۰ء کے اواخر اور ۱۹۹۰ء کے اوائل میں اپنے ناولوں کی اشاعت سے حاصل کردہ رقوم کارتا جینا میں لیٹن امریکن جرنلزم فاؤنڈیشن پر صرف کیں۔ کاسترو اور کیوبا سے اپنی وفاداری کی باوجود، وہ بلا خوف تردید، لاطینی امریکہ کا سب سے محبوب ناول نگار ہے اور اس کا نام لاطینی امریکہ کی شناخت سے ہمیشہ پیوستہ رہے گا۔



(مشمولہ: ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴۱، اکتوبر ۲۰۱۴ء)

گیبرئیل گارسیا مارکیز کی یاد میں

غلام شبیر رانا

۱۷ اپریل ۲۰۱۴ء کو اجل کے ہاتھ میں جو پروانہ تھا اُس نے گیبرئیل گارسیا مارکیز کا نام بھی رقم تھا۔ علم و ادب کی وہ شمع فروزاں جس نے ۶ مارچ ۱۹۲۷ء کو صبح نو بجے کولوبیا کے ایک نسبتاً کم معروف اور چھوٹے سے قصبے ارا کاٹا کا (Aracataca) سے روشنی کے سفر کا آغاز کیا تھا، موت کے بے رحم ہاتھوں نے اُسے ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔ میکسیکو سٹی کے شہر خموشاں کی زمین نے عالمی ادبیات کے اس آسمان کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ ادبیاتِ عالم میں فکشن کے ہمالہ کی ایک سر بہ فلک چوٹی سیلِ زماں کے تھپیڑوں سے زمیں بوس ہو گئی۔ پوری دنیا میں اُس کے کروڑوں مداح فرطِ غم سے نڈھال ہیں اور اُس کی دائمی مفارقت پر اپنے جذباتِ حزیں کا اظہار کر رہے ہیں۔ اپنی مسحور کُن شخصیت اور منفرد اسلوب سے اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھاتے ہوئے حقیقت نگاری کی طلسماتی کیفیات سے یدِ بیضا کا معجزہ دکھانے والے اس یگانہ روزگار تخلیق کار نے اپنی تخلیقات کی قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جانے والی اثر آفرینی سے دنیا بھر میں اپنے کروڑوں مداحوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ گیبرئیل گارسیا مارکیز کی وفات سے بیسویں صدی میں عالمی فکشن اور صحافت کے ایک درخشاں عہد کا اختتام ہو گیا۔ ایک رجحان ساز ادیب، جری صحافی، حقیقت پسند افسانہ نگار اور باکمال ناول نگار کی حیثیت سے اُس نے پوری دنیا میں اپنے مسحور کُن طلسماتی حقیقت نگاری کے مظہر اسلوب کی دھاک بٹھا دی۔ کولوبیا کی سرزمین سے آج تک اس قدر وسیع النظر اور جامع صفات ادیب نے جنم نہیں لیا۔ گیبرئیل گارسیا مارکیز پہلا کولمبین اور لاطینی امریکا کا چوتھا ادیب تھا جس نے ادب کا نوبل انعام حاصل کیا۔ عملی زندگی میں اس نے

اپنے متنوع تجربات و مشاہدات اور انسانیت کو درپیش حالات و واقعات کو نہایت بے باکی اور تفصیل کے ساتھ حقیقت پسندانہ انداز میں زیبِ قرطاس کیا۔ اپنے عہد کے مقبول ترین ادیب کی حیثیت سے اُس کا نام تاریخِ ادب میں آبِ زر سے لکھا جائے گا۔ اُس کے اسلوب میں سپین کے ممتاز ڈراما نگار اور ناول نگار سروانٹیس میگوئل ڈی (پیدائش: ۱۵۴۷ء، وفات: ۱۶۱۶ء) (Cervantes Miguel De) کے شگفتہ لہجے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جس کے ناول (Don Quixote) کو بے پناہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ یہ ناول جو ۱۵۴۷ء سے ۱۶۱۶ء کے عرصے میں منصۂ شہود پر آیا، اپنے عہد کا سدا بہار ادب پارہ سمجھا جاتا ہے۔ مصنف نے حُسن و رومان کی دلکش داستان کو اپنی گُل افشانیِ گفتار سے اس قدر شگفتہ بیانیہ انداز میں نثر کے قلب میں ڈھالا ہے کہ قاری کے دل کی کلی کِھل اُٹھتی ہے۔ ایک زیرک، فعال اور مستعد تخلیق کار کی حیثیت سے اُس نے مطالعۂ ادب اور تخلیقِ ادب ہی کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا۔ روزانہ آٹھ گھنٹے ادب کے لیے مختص کر کے اُس نے تخلیقی عمل کو مقاصد کی رفعت کے اعتبار سے ہم دوشِ ثریا کرنے کی سعی کی۔ یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ سروانٹیس میگوئل ڈی کے بعد جو شہرت، مقبولیت اور پذیرائی گیبریئل گارسیا مارکیز کے حصے میں آئی ہے اس میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ ایسے ادیب اپنے ابد آشنا اسلوب کی بنا پر نایاب سمجھے جاتے ہیں اور تاریخ ہر دور میں اُن کے فقید المثال ادبی کام اور عظیم نام کی تعظیم کرتی ہے۔ اُس نے اپنی لائقِ صد رشک و تحسین ادبی کامرانیوں سے وطن اور اہلِ وطن کو پُوری دنیا میں معزز و مفتخر کر دیا۔ عالمی ادبیات پر گہری نظر رکھنے والے تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی میں جن ناول نگاروں نے مقبولیت، اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے کام یابی کے نئے باب رقم کیے، گیبریئل گارسیا مارکیز اُن میں سے ایک تھا۔ اُس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے شہرۂ آفاق ناول " One Hundred Years of Solitude " کا دُنیا کی تیس سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس ناول پر مصنف کو چار بین الاقوامی ایوارڈ عطا کیے گئے۔ اُس کو ملنے والے اہم ایوارڈ کی تفصیل درج ذیل ہے:

1. Neustadt International Prize for Literature 1972.

2. Nobel Prize in Literature 1982.

گیبریئل گارسیا مارکیز نے نہایت کٹھن حالات میں تخلیقی سفر جاری رکھا۔ اس کی زندگی میں

کئی سخت مقام آئے لیکن اس نے حوصلے اور اُمید کا دامن تھام کر منزلوں کی جستجو میں انہماک کا مظاہرہ کیا۔ شامِ الم ڈھلی تو درد کی ایسی مسموم ہوا چلی جس نے اُس کے دل میں نمو پانے والی اُمید کی کلی کو جھلسا دیا۔ وہ اُمیدوں کی فصل کو غارت ہوتے نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی اپنی محنت کا اکارت جانا اسے منظور تھا۔ وہ تنہا راتوں کے پچھلے پہر تک مطالعہ اور تخلیق ادب میں مصروف رہتا اور اپنے ناول ''تنہائی کے ایک سو سال'' پر کام جاری رکھتا۔ اس ناول کی اشاعت کے ساتھ ہی اُس کے مقدر کا ستارہ چمک اُٹھا۔ ۱۹۷۰ء میں اس کے ناول (one hundred Years of Solitude) کا گریگوری رباسا (Gregory Rabassa) نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے میں تخلیق کی جو چاشنی ہے وہ مترجم کے ذوقِ سلیم کی مظہر ہے۔ اسی وجہ سے اس ترجمے کو گیبریئل گارسیا مارکیز نے بہت پسند کیا۔ اکثر ناقدینِ ادب کی رائے ہے کہ یہ انگریزی ترجمہ اپنے دلکش اسلوب اور بے ساختگی کے اعتبار سے اصل سپینش تخلیق سے کسی طرح کم نہیں۔ اس ناول کو امریکہ میں سو سال کی بارہ بہترین ادبی تخلیقات میں شامل کیا گیا۔ فرانس میں بھی اس ناول کو غیر ملکی زبانوں کے ادب کی بہترین تصنیف قرار دیا گیا۔ اٹلی میں ۱۹۶۹ء میں اس ناول کو "Chianciano Aprecia" ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اشاعت کے بعد صرف ایک ہفتے میں اس ناول کی آٹھ ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں جب کہ مجموعی طور پر اس ناول کی تیس ملین کاپیاں فروخت ہوئیں۔ ناول ''تنہائی کے ایک سو سال'' میں ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی اور طلسمِ ہوش رُبا کی فسوں کاری ادب کے قاری کو مسحور کر کے اُس پر ہیبت طاری کر دیتی ہے۔ تخلیق کار نے طلسماتی اثر آفرینی کو ایسے دلکش انداز میں روبہ عمل لانے کی سعی کی ہے کہ بیانیہ قاری کے قلب اور روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ طلسماتی کیفیات کی یہ فضا کئی کرداروں کو سامنے لاتی ہے جن میں رمال، نجومی، ستارہ شناس، فعال نکالنے والے، قسمت کا حال بتانے والے اور مستقبل کے بارے میں پیشن گوئی کرنے والے اہم کردار بہت نمایاں ہیں۔ اُس کا ناول ''تنہائی کے ایک سو سال'' ایک خاندان بوندیا (Buendia) کی اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز کے گرد گھومتا ہے۔ ایک نسل کا دوسری نسل کے ساتھ تعلق اور اُن کے مابین پائے جانے والے فکری فاصلے قابلِ توجہ ہیں۔ ستارے جو کہ خود فراخی افلاک میں خوار و زبوں ہیں اُنھیں انسانی تقدیر کے ساتھ وابستہ سمجھنے کے حیران کُن واقعات سامنے آتے ہیں۔ یہاں طلسم ہوش رُبا کی جو صد رنگ کیفیت جلوہ گر ہے اُسے دیکھ کر قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ کئی عامل ہیں جو طلسمی عمل کے زیرِ اثر آ جانے والے افراد کے ذریعے نہ ہونے کی ہونی کے کھیل کے بارے میں چونکا دینے والے واقعات کو بیان کرتے

چلے جاتے ہیں۔ان تمام محیر العقول واقعات اور مافوق الفطرت حکایات کا تعلق ایک پُراسرار قصبے ''مکونڈو'' (Macondo) سے ہے۔مکونڈو کسی خاص مقام کا نام ہرگز نہیں بلکہ جس انداز میں اس مقام کے محلِ وقوع اور لوگوں کی بُود و باش کی لفظی مرقع نگاری کی گئی ہے، اُس سے یہ قیاس تقویت پاتا ہے کہ یہی وہ قصبہ ہے جہاں گیبریئل گارسیا مارکیز کی آنول نال گڑی ہے۔گیبریئل گارسیا مارکیز نے اپنے تخیل کی جولانیوں سے اس پُراسرار قصبے کے بارے میں جو سماں باندھا ہے وہ قاری کو ایک ایسی موہوم طلسماتی فضا میں لے جاتا ہے جہاں ہر طرف تنہائی کے باعث ہو کا عالم ہے۔اس شہرِ ناپُرساں میں کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں۔اگر یہاں کوئی شخص بیمار پڑ جائے تو اُن کی تیمارداری اور علاج پر توجہ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔اس سے بڑھ کر المیہ کیا ہوگا کہ قسمت سے محروم شخص کی موت کی صورت میں بھی کوئی نوحہ خواں نہیں ہوتا جو اپنے جذباتِ حزیں کا اظہار کر کے تزکیۂ نفس کی صورت پیدا کرے۔معاشرتی زندگی میں جب احساسِ زیاں عنقا ہو جائے تو مسلسل شکستِ دل کے باعث وہ بے حسی پیدا ہو جاتی ہے کہ کوئی بھی بچھڑ کے چلا جائے گریہ و زاری کی نوبت ہی نہیں آتی۔دُنیا کے اکثر ممالک میں دیہی زندگی کے مسائل اسی نوعیت کے ہیں کہ وہاں کا ماحول پتھر کے زمانے کی یاد دلاتا ہے۔گرد و غبار سے اٹا ہوا ماحول، توہم پرستی، بے عملی، یاسیت، صحت و صفائی کی غیر اطمینان بخش صورتِ حال اور مواصلات کی ناکافی سہولیات نے دُور دراز کے قصبات کے مکینوں کو کنوئیں کے مینڈک کے مانند بنا دیا ہے۔ان لوگوں کی زندگی صرف ایک ڈگر پر چلتی رہتی ہے اور زندگی کے بدلتے ہوئے موسموں سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔اُن کی زندگی کا سفر تو جیسے تیسے کٹ ہی جاتا ہے لیکن وہ جن صبر آزما حالات سے گزرتے ہیں، اُن کے باعث اُن کا پورا وجود کرچیوں میں بٹ جاتا ہے۔جب اُن کی مسافت کٹ جاتی ہے تو سفر کی دُھول بھی اُن کا پیرہن بنتی ہے۔جب مصنف کو اپنے آبائی قصبے کے وہ اُداس بام اور کُھلے دریا یاد آتے ہیں جہاں مایوسی، محرومی، بے بسی اور اُداسی بال کھولے آہ و فغاں میں مصروف ہے تو وہ تنہائیوں کی مسموم فضا میں اس موہوم قصبے اور اپنے آبائی گھر کو یاد کرتا ہے تو اُس کی ذہنی کیفیت کچھ اس طرح ہوتی ہے:

کوئی
ویرانی
سی
ویرانی

ہے
دشت
کو
دیکھ
کے
گھر
یاد
آیا

گیبریئل مارکیز نے ہر قسم کے ظلم، استحصال اور جبر کے خلاف کُھل کر لکھا اور کبھی کسی مصلحت کی پروانہ کی۔ اُس کی حقیقت نگاری بعض اوقات سراغ رسانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تجسس سے لبریز اُس کی تحریروں کی مقبولیت بہت زیادہ ہے۔ اُس کی تصانیف کو دُنیا میں بہت زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں شمار کیا جاتا ہے۔ عالمی ادبیات بالخصوص فکشن میں یہ وہ عدیم النظیر کامیابی ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ گیبریئل گارسیا مارکیز نے ستاروں پر کمند ڈالی ہے۔ اپنے اسلوب میں اُس نے جو طرزِ ادا ایجاد کی وہ اوروں سے تقلیداً بھی ممکن نہیں ہے۔

اختر الایمان نے کہا تھا:

کون
ستارے
چھو
سکتا
ہے
راہ
میں
سانس
اُکھڑ
جاتی

ہے

گیبریئل گارسیا مارکیز کو تنہائی کے نوحہ گر اور زندگی کی حقیقی معنویت کے باکمال صورت گر کی حیثیت سے دنیا بھر میں عزت و احترام کا اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ اس کی وفات سے وفا کے سارے ہنگامے ہی عنقا ہو گئے ہیں۔ اس کے زینۂ ہستی سے اُترتے ہی ہر طرف ہو کا عالم دکھائی دیتا ہے۔ اب تو فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم خیال و خواب بن گیا ہے۔ وطن، اہلِ وطن اور انسانیت کے ساتھ قلبی وابستگی اور والہانہ محبت اس کا بہت بڑا اعزاز و امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ اس نے تخلیق کاروں کو اس جانب متوجہ کیا کہ تیشۂ حرف سے فصیلِ جبر کو منہدم کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اپنے منفرد اسلوب سے اُس نے تخلیقِ ادب اور تنقید کے تمام معائر کو اسے نئی جہت عطا کی جو اقتضائے وقت کے عین مطابق تھی۔ اپنے افکار کی جولانیوں، بصیرت افروز خیالات اور ذہن و ذکاوت سے اُس نے قارئینِ ادب کے اذہان کی تطہیر و تنویر کی، تخلیقی استعداد کو صیقل کیا اور فکر و نظر کو اس طرح مہمیز کیا کہ قارئینِ ادب ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی کی کیفیت سے آشنا ہوتے چلے گئے۔ اُس کے فکر پرور خیالات اور دل کش اندازِ بیان نے جمود کا خاتمہ کر دیا اور فکر و نظر کی کایا پلٹ دی۔ وہ قطرے میں دجلہ اور جُزو میں کل کی کیفیت دکھا کر قاری کو اپنی طلسماتی حقیقت نگاری سے حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ زندگی کی برق رفتاریوں میں اس کا اسلوب دما دم رواں رہنے کی نوید سناتا ہے اور حیاتِ جاوداں کا رازِ ستیز میں نہاں ہونے کے بارے میں حقائق کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ ادب کا قاری اس انہاک کے ساتھ اُس کی تخلیقات کا مطالعہ کرتا ہے کہ اُس کا مرحلۂ شوق کبھی طے ہی نہیں ہوتا۔ آزادیء اظہار، حریتِ فکر و عمل اور انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے اُس کی خدمات کا ایک عالم معترف ہے۔ اس نے جس جامعیت اور ثقاہت کے ساتھ معاشرتی زندگی کے ارتعاشات اور نشیب و فراز بیان کیے ہیں وہ اُس کی انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ قومی اور معاشرتی زندگی کے واقعات، سماجی زندگی کی اقدار و روایات، انسانیت کو درپیش مسائل و مشکلات اور اقوامِ عالم کے مناقشات و سانحات پر وہ حریتِ ضمیر کا علم بلند رکھتا ہے۔ اس کے اسلوب میں تاریخ کے مسلسل عمل، تہذیبی و ثقافتی اقدار کے معاملات اور عصری آگہی کے بارے میں ایک واضح اندازِ فکر پایا جاتا ہے۔ انسان زندگی کی رعنائیوں میں کھو جاتا ہے اور اپنے انجام سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ کارِ جہاں کے بے ثبات ہونے کا یقین ہونے کے باوجود فرصتِ زندگی کا اسراف ایک بوالعجبی کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ آج کے دُور کا سانحہ یہ ہے کہ انسان آب و گِل کے کھیل میں اُلجھ کر رہ گیا ہے اور یہ تماشا شب و روز جاری ہے۔ سسکتی انسانیت کے لرزہ خیز مسائل

جامد و ساکت پتھروں اور سنگلاخ چٹانوں کے روبہ رو بیان کرنا پڑتے ہیں۔ دیکھنے والے محوِ حیرت ہیں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ گیبریئل گارسیا مارکیز نے تخلیقِ فن کے لمحوں میں خون بن کر رگِ سنگ میں اُترنے کی جو سعی کی ہے، وہ اُس کے ذہن و ذکاوت اور ذوقِ سلیم کی دلیل ہے۔ اُس نے کبھی دریُسری پر صدا نہ کی، اُسے معلوم تھا کہ ان کھنڈرات میں موجود حنوط شدہ لاشیں درد سے عاری ہیں۔ اپنے منفرد اسلوب میں اُس نے افکارِ تازہ کی مشعل تھام کر جہانِ تازہ کی جستجو کی جو راہ دکھائی ہے، اُس سے قاری کے دل میں ایک ولولۂ تازہ پیدا ہوتا ہے اور وہ بیزار کُن جامد و ساکت ماحول سے گلو خلاصی حاصل کر کے نئے زمانے، نئے صبح و شام پیدا کرنے کی دُھن میں مگن ہو جاتا ہے۔ بے یقینی اور بے عملی کے تارِ عنکبوت ہٹا کر یقین و اعتماد کے ساتھ زندگی گزارنے کا جو انداز اُس کی اسلوب میں نمایاں ہے، وہ قارئینِ ادب کے لیے تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند ہے۔ اپنی تخلیقی تحریروں کے اعجاز سے اُس نے تخلیقِ ادب کے لاشعوری محرکات کو تنوع عطا کیا۔ خیالات، مشاہدات اور تجربات کی ندرت سے تخلیقِ ادب میں دھنک رنگ منظر نامہ سامنے آیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُس کی تحریریں ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہیں جس کے معیار پر ہر دور میں ادب پاروں کو پرکھا جا سکے گا۔ مستقبل کے تخلیق کار اس لافانی ادیب کے اسلوب کو پیشِ نظر رکھ کر تخلیقِ ادب میں اپنی سمت کا تعین کریں گے۔

گیبریئل گارسیا مارکیز کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ اس کا والد ملازمت کے سلسلے میں کئی شہروں میں مقیم رہا۔ گیبریئل گارسیا مارکیز کے دس بھائی تھے۔ ۱۹۲۹ء میں اُس کے والدین نے ترکِ سکونت کی اور گیبریئل گارسیا مارکیز کو کم عمری ہی میں اپنے ننھیال پہنچا دیا گیا۔ اپنے ننھیال میں اُسے جو ماحول میسر آیا اس کے اثرات بہت دُور رس ثابت ہوئے۔ اس کی نانی اپنے کم سِن نواسے کو رات کو سونے سے قبل جو کہانیاں سُناتی وہ مافوق الفطرت عناصر کے بارے میں ہوتی تھیں۔ ان کہانیوں میں جن، بھوت، دیو، آدم خور، پریاں، چڑیلیں اور ہوائی مخلوق کے غیر معمولی واقعات کے بیان سے تجسس، خوف اور دہشت کی فضا پیدا کی جاتی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بچپن کے یہ واقعات اس ادیب کے مستقبل کے تخلیقی تجربات کی اساس بن گئے۔ زمانہ طالب علمی ہی سے گیبریئل گارسیا مارکیز کو ادب اور صحافت سے گہری دلچسپی تھی۔ جب وہ گارٹا گینا یونیورسٹی (university of Cartagena) میں زیرِ تعلیم تھا تو وہاں کے علمی و ادبی ماحول میں اُس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو نکھار ملا۔ اس کے احباب عقیدت سے اُسے ''گابو'' (Gabo) کے نام سے پکارتے تھے۔ اس زمانے میں نوعمر گیبریئل گارسیا مارکیز کے مزاج میں

جو غیر معمولی شرمیلا پن اور بیزار کُن سنجیدگی پائی جاتی تھی اُس کے باعث وہ حسن و رُومان ہم عمر طلبا و طالبات اور دوستوں کے ساتھ اٹکھیلیوں سے بالکل دُور رہتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اُس کے ساتھی اُسے بُوڑھا آدمی کہہ کر چھیڑتے اور اُس کا تمسخر اُڑاتے۔ اس کے باوجود یہ حساس ادیب اور مستقبل کا زیرک تخلیق کار نہایت تحمل سے دوستوں کی کج روی پر مبنی سب کچھ سنتا اور یہ سب باتیں خندۂ استہزا میں اُڑا دیتا اور کبھی دل بُرا نہ کرتا۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے والدین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے گیبریئل گارسیا مارکیز نے نیشنل یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم کے سلسلے میں داخلہ لیا لیکن بعض ناگزیر حالات کے باعث یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور اس نے قانون کے بجائے صحافت کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ حالاتِ حاضرہ اور صحافت سے اُسے قلبی لگاؤ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ زندگی کے مسائل کے بارے میں مثبت شعور و آگہی کو پروان چڑھانا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے زندگی بھر حریتِ فکر و عمل پر اصرار کیا اور زندگی کی حقیقی معنویت کو اُجاگر کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ یونیورسٹی آف کارٹا گینا (university of Cartagena) سے فارغ التحصیل ہونے والے اس یگانۂ روزگار فاضل نے صحافت، افسانہ نگاری، ناول نگاری اور علمِ بشریات میں اپنی صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی۔ ۱۹۵۸ء میں اُس کی شادی مرسیڈس بارچا (Mercedes Barcha) سے ہوئی جو اُس سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ باہمی افہام و تفہیم اور پیمانِ وفا کی اساس پر استوار ہونے والا یہ بندھن نہایت کامیاب رہا اور اُس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ یہ دونوں بیٹے اب عملی زندگی میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ اب بیوگی کی چادر اُوڑھے مرسیڈس بارچا اپنے عظیم شوہر کو یاد کر کے اُسے آہوں اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتی ہے۔ ایک وسیع المطالعہ ادیب اور جری صحافی کی حیثیت سے گیبریئل گارسیا مارکیز نے عالمی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اُس نے بیسویں صدی کے ادب پر گہری نظر رکھی اور اس کی روشنی میں اپنے لیے ایک ٹھوس اور قابلِ عمل لائحۂ عمل کا انتخاب کیا۔ برطانیہ کی ادیبہ ورجینا وولف (Verginia Woolf) (پیدائش: ۲۵ جنوری ۱۸۸۲ء، وفات: ۲۸ مارچ ۱۹۴۱ء) کی تصانیف اُسے پسند تھیں۔ نوبل انعام یافتہ امریکی ادیب ولیم فاکنر (willian Faulkner) کی پیدائش (۲۵ ستمبر ۱۸۹۷ء: وفات ۶ جولائی ۱۹۶۲ء) کے اسلوب کو بھی اس نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ خاص طور پر بیسویں صدی کے انتہائی موثر اور جدیدیت کے علم بردار جرمن ادیب فرانز کافکا (Franz Kafka) سے اُس نے گہرے اثرات قبول کیے۔ گیبریئل گارسیا مارکیز نے جب فرانز کافکا (پیدائش : ۳ مارچ ۱۸۸۳ء، وفات: ۳ جون ۱۹۲۴ء) کے

اسلوب کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا تو اُس کے دل میں رشک کے جذبات پیدا ہوئے کہ یہی تو ایسا تخلیق کار ہے جس جیسا بننے کی تمنا کی جا سکتی ہے۔ گیبریئل گارسیا مارکیز کے اسلوب میں تاریخ، تہذیب اور معاشرت کے بارے میں جو مثبت شعور و آگہی موجود ہے اُس کے سوتے ادب کے وسیع مطالعہ سے پھوٹتے ہیں۔ اُس کی تخلیقی فعالیت میں کلاسیکی ادب اور جدید ادب ، اقدار و روایات کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ تاہم اُس نے اپنا تزکیۂ نفس کرنے کے لیے جو طرزِ فغاں ایجاد کی وہ اس کی پہچان بن گئی۔ اُس کا اسلوب اُس کی ذات کی صورت میں اس کی بصیرت کا اثبات کرتا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے اس میں تانیثیت، استعماری نظام کی مخالفت، دیہی تہذیب و معاشرت اور جسم فروشی، رذیل طوائفوں کے جنسی جنون کی کہانیاں جن میں حقیقت نگاری اور فطرت نگاری پر توجہ دی گئی ہے، قابلِ ذکر ہیں۔ اُس کی اہم ترین تصانیف درج ذیل ہیں:

1.One Hundred Years of Solitude.

2.The Autumn of Patriach.

3.Love in the Time of Cholera.

اپنے والدین کی داستانِ محبت کو گیبریئل گارسیا مارکیز نے اپنی تصنیف "Love in the Time of Cholera" میں پیرایۂ اظہار عطا کیا ہے۔ مصنف کی گل افشانئ گفتار قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ محبت تو ایک چنگاری ہے جو عمر کے کسی حصے میں بھی بھڑک سکتی ہے۔ محبت کے بارے میں یہ تاثر غلط ہے کہ یہ بڑھاپے میں نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ محبت کوئی سرکاری ملازمت تو ہے نہیں کہ جو ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد ریٹائرمنٹ پر منتج ہوتی ہے اور اس کے بعد کوئی بھی مُلازم سرکاری ملازمت کرنے کا اہل نہیں رہتا۔ گیبریئل گارسیا مارکیز اپنے مشاہدات کی بنیاد پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ دو پیار کرنے والے اپنے جذبات کو حدودِ وقت میں مقید نہیں رکھ سکتے۔ گو ہاتھ میں جنبش نہ ہو مگر انسان کی آنکھوں میں تو دم ہوتا ہے، وہ حُسن کے جلووں سے فیض یاب کیوں نہ ہو؟ بے شک اعضاء مضمحل ہو جائیں اور عناصر میں اعتدال کا بھی فقدان ہو لیکن محبت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ گیبریئل گارسیا مارکیز کا خیال ہے کہ بعض عشاق تو زندگی کے سُنہری دنوں یعنی جب وہ ستر برس کے ہو چکے ہوتے ہیں، میں بھی کسی حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ اس مرحلۂ زیست میں ہر سُو بکھرے ہوئے موت کے جال بھی اس طرح کی والہانہ محبت کرنے والوں کے لیے سدِ راہ نہیں بن سکتے۔ گیبریئل گارسیا مارکیز نے اسی سال کے معمر جوڑے کی داستانِ محبت کا احوال بیان کیا ہے جس نے خلوص اور چاہت کے

رشتے میں منسلک ہو کر عہدِ وفا استوار کیا اور اسے علاجِ گردشِ لیل و نہار سمجھتے ہوئے اُسے گور کنارے پہنچنے کے باوجود پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی۔ عشق خواہ جوانی کا ہو یا ضعیفی کا کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

اُس کے اسلوب میں ارتقا کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے اسلوب میں نکھار آتا چلا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی ہر تصنیف میں ایک نیا انداز اپنایا گیا ہے۔ وہ پامال راہوں اور کلیشے کے سخت خلاف تھا۔ نقال، چربہ ساز، سارق اور کفن دُزالفاظ حشراتِ سخن کے خلاف اس نے زندگی بھر قلم بہ کف مجاہد کا کردار ادا کیا۔ خوب سے خوب تر کی جانب اس کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے کوئی بھی تخلیق کار اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے کوئی اسلوب منتخب نہیں کرتا بلکہ اسلوب تو ایک تخلیق کار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلوب کی مثال ایک چھلنی کی سی ہے جس میں سے ادبی تخلیق کار کی شخصیت چھن کر باہر نکلتی ہے۔ گیبرئیل گارسیا مارکیز کے اسلوب میں جلوہ گر اُس کی مستحکم شخصیت کا کرشمہ دامنِ دل کھینچتا ہے۔ اُس کا اسلوب موضوع، مواد، ذہنی کیفیت اور تخلیقی وجدان کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ معاشرے اور ماحول میں وہ جو کچھ دیکھتا ہے اور زندگی کے جتنے موسم اُس کے قلب اور روح کو متاثر کرتے ہیں وہ سب کے سب اُس کے اسلوب میں دھنک رنگ منظر نامے کی صورت میں قاری کی نگاہوں میں رچ بس جاتے ہیں۔ طلسمی حقیقت نگاری کے سوتے فکر پرور خیالات اور بصیرت افروز تجربات و مشاہدات سے پھوٹتے ہیں۔ اسی لیے طلسمی حقیقت نگاری قلبی، روحانی اور وجدانی کیفیات پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اُس کی تحریروں میں پریوں کی ڈھول، فضا میں محوِ پرواز مرحومہ دادی کی آوازیں، جنوں، چڑیلوں، بھوتوں اور دیوزادوں کا عمل اور سحر کے اثرات گرچہ ناقابلِ یقین سمجھے جاتے ہیں لیکن دُنیا بھر میں اُس کے اسلوب کی بازگشت اب بھی سنائی دے رہی ہے۔ طلسمی حقیقت نگاری کو فنونِ لطیفہ بالخصوص ادب، فلم اور ڈراما میں بہت پذیرائی ملی۔ بعض اوقات تخلیق کار یہ تاثر دینے میں کامیاب رہتے ہیں کہ طبعی موت کے بعد بھی بعض کردار ہمارے گردونواح میں موجود رہتے ہیں اور نسل در نسل ہماری زندگی کے معمولات میں ناقابلِ یقین انداز میں دخیل رہتے ہیں۔ امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا کا احساس اسی کا ثمر ہے۔

ادبی تحریکیں فروغِ علم و ادب میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ گیبرئیل گارسیا مارکیز کا تعلق بھی ایک ادبی تحریک سے تھا۔ یہ تحریک لاطینی امریکہ بُوم (Latin America Boom)

کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اُس کے رفقائے کار میں مابعد جدیدیت پر دسترس رکھنے والے جولیو کارٹزار (Julio Cartazar) اور نوبل انعام یافتہ ادیب ماریو ورگاس للوسا(Mario Vargas Llosa) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں عالمی ادبیات میں فکشن میں جس رجحان کو پذیرائی ملی اُسے طلسماتی حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گیبریئل گارسیا مارکیز کے اسلوب میں طلسماتی حقیقت نگاری کی کیفیت پتھروں سے بھی اپنی تاثیر کا لوہا منوا لیتی ہے۔ طلسماتی حقیقت نگاری کو اپنے اسلوب کی اساس بنا کر جب ایک تخلیق کار مائل بہ تخلیق ہوتا ہے تو وہ منطق و توجیہہ سے قطع نظر فکشن میں کردار نگاری کو ایسی منفرد بیانیہ جہت عطا کرتا ہے جو قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ اسلوب کی غیر معمولی دل کشی، حقیقی تناظر، موہوم تصورات، مافوق الفطرت عناصر کی حیران کُن کرشمہ سازیاں اور اسلوب کی بے ساختگی قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے اور دل سے نکلنے والی بات جب سیدھی دل میں اُتر جاتی ہے تو قاری اش اش کر اُٹھتا ہے۔ گیبریئل گارسیا مارکیز نے اپنے متنوع تخلیقی تجربات کے اعجاز سے عالمی ادبیات میں تخلیقِ ادب کو متعدد نئی جہات سے آشنا کیا۔ اُس کے نئے، منفرد اور فکر پرور تجربات گلشنِ ادب میں تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند تھے۔ ان تجربات کے معجز نما اثر سے جمود کا خاتمہ ہوا اور تخلیقی فعالیت کو بے کراں وسعت اور ہمہ گیری نصیب ہوئی۔ اُس نے حقیقت نگاری کے مروجہ روایتی اندازِ فکر کے بجائے طلسمی حقیقت نگاری کے مظہر ایک نئے جہان کی تخلیق پر توجہ مرکوز رکھی۔ اُس کے اسلوب میں حیرت کا عنصر نمایاں ہے۔ اُس کے ناول اور افسانے دل دہلا دینے والے مناظر، لرزہ خیز اعصاب شکن سانحات کی لفظی مرقع نگاری، خوف ناک کرداروں، مہم جوئی اور جہد للبقا جیسے موضوعات سے لبریز ہیں۔ اُس نے غیر معمولی انداز میں زندگی کے معمولی واقعات کو بیان کر کے پتھروں سے بھی اپنے اسلوب کی اثر آفرینی کا لوہا منوایا ہے۔ زندگی اور موت کے موضوعات ہی کو لے لیں انھیں گیبریئل گارسیا مارکیز نے جس دل کش انداز میں زیبِ قرطاس کیا ہے وہ اُس کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے اس سے آگے کا سفر تھوڑا سا دم لے کر شروع کیا جاتا ہے۔ موت کے بعد کی روداد کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ گیبریئل گارسیا مارکیز نے اس موضوع پر بھی اپنے تخیل کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اپنے لازوال اسلوب سے گیبریئل گارسیا مارکیز نے گلشنِ ادب کو جس طرح نکھارا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُس نے اپنی بے مثال ادبی کامرانیوں سے لاطینی امریکہ کے ادب کو ثروت مند بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُس نے تخلیقِ ادب، تنقید و تحقیق اور اظہار و ابلاغ کے مروجہ معائر کو یکسر بدل دیا اور واضح کیا کہ

قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جانے والی اثر آفرینی سے متمتع تخلیقی فعالیت کو کسی معیار یا طریق کار کی تقلید کی احتیاج نہیں اور نہ ہی اُسے کسی کی تصدیق اور تائید کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے لیے خود ہی لائحہ عمل کا انتخاب کرتا ہے اور آنے والا وقت اُس کے معیار اور مقام کے بارے میں فیصلہ صادر کرتا ہے:

اب ہوائیں ہی کریں
گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہو
گی وہ دیا رہ جائے گا

اُردو زبان کے جن ممتاز ادیبوں نے گیبریئل گارسیا مارکیز کے تخلیقی شہ پاروں کے ترجمے پر توجہ دی اُن میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی، غفار بابر، ارشاد گرامی، آفتاب نقوی، محمد فیروز شاہ، محمد طلحہ خان، آفاق صدیقی، بشیر سیفی، ذکیہ بدر، شبیر احمد اختر، صابر آفاقی، اسحاق ساقی، رانا عزیز احمد، صابر کلوروی اور محسن بھوپالی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان دانش وروں کے تراجم ابھی ابتدائی مراحل میں تھے کہ فرشتۂ اجل نے ان سے قلم چھین لیا۔ گیبریئل گارسیا مارکیز کی اہم تصانیف کے اُردو زبان میں جو تراجم شائع ہو چکے ہیں اُنھیں بہت پذیرائی ملی۔ اُس کے ناول ''تنہائی کے ایک سو سال'' کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر نعیم احمد کلاسرا نے کیا۔ یہ ترجمہ تخلیق کی چاشنی لیے ہوئے ہے اور قاری کو مصنف کے اسلوب کے بارے میں حقیقی شعور سے متمتع کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس ترجمے کے دیباچے میں ڈاکٹر آشولال نے مصنف کے اسلوب اور تخلیقی عمل کے لاشعوری محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ اُس کے ناول ''Chronicle of a Death Foretold'' کا اُردو ترجمہ معروف ادیب افضال احمد سید نے کیا۔ یہ ترجمہ ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' کے نام سے شائع ہوا اور قارئین ادب نے اس میں گہری دلچسپی لی۔ پنجابی زبان کے نامور ادیب افضل احسن رندھاوا نے اسی عظیم ناول کو پنجابی زبان کے قالب میں ڈھالا جو ''پہلوں توں دسی گئی موت دا روزنامچہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پنجابی زبان میں تراجم کے حوالے سے یہ ترجمہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس ترجمے کی اشاعت سے پنجابی ادب کی ثروت میں اضافہ ہوا ہے۔ پنجابی زبان میں عالمی ادبیات کے تراجم کے سلسلے میں یہ ترجمہ لائقِ صد رشک و تحسین کارنامہ ہے۔ گیبریئل گارسیا مارکیز کی ایک اور مشہور تصنیف ''No one Writes to the Colonel'' کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

یہ ترجمہ جو'' کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا'' کے نام سے شائع ہوا ہے، ممتاز ادیب فاروق حسن کی بصیرت افروز ترجمہ نگاری کا ثمر ہے۔ اُردو کے جن ادیبوں نے گیبریئل گارسیا مارکیز کی تصانیف کے نامکمل تراجم کیے ان میں زینت حسام کا نام قابلِ ذکر ہے جنھوں نے سب سے پہلے'' تنہائی کے ایک سو سال'' کے ابتدائی چند ابواب اُردو کے قالب میں ڈھالے جو کراچی سے شائع ہونے والے کتابی سلسلے'' آج'' کی زینت بنے۔ اُردو زبان میں تراجم کے ذریعے دو تہذیبوں کو قریب تر لانے کی مساعی جاری ہیں۔ اس سلسلے میں گیبریئل گارسیا مارکیز کی تصانیف'' Autumn of the Patriarch'' اور'' Love in the Time of Cholera'' کا اُردو ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔

اگر چہ گیبریئل گارسیا مارکیز نے اس عالمِ آب و گِل سے اپنا ناتا توڑ کر عدم کے کوچ کے لیے رختِ سفر باندھ لیا ہے لیکن اُس کی حسین یادوں سے دامنِ دل ہمیشہ معطر رہے گا۔ اُس کی دائمی مفارقت کے صدمے سے نڈھال دنیا بھر میں اُس کے کروڑوں مداح سکتے کے عالم میں ہیں۔ موت سے کسی کو رستگاری نہیں آج وہ تو کل ہماری باری ہے۔ رخشِ حیات مسلسل رو میں ہے۔ ہمارا ہاتھ نہ تو باگ پر ہے اور نہ ہی ہمارا پاؤں رکاب میں، نا معلوم کس مرحلے پر کوچ کا نقارہ بج جائے اور سو برس کے سامان کے باوجود ہم ایک پل کے بارے میں بھی کچھ نہ جان سکیں۔ دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھنا چاہیے لیکن گیبریئل گارسیا مارکیز کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ حیرت اور حقیقت کو تخیل کی آمیزش سے ابد آشنا بنانے والے اس لافانی تخلیق کار کے اسلوب پر دنیا بھر میں ہزاروں مضامین لکھے گئے ہیں اور یہ سلسلہ غیر مختتم ہے۔ اُس کے الفاظ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اُس کا نام اُفقِ ادب پر مثلِ آفتاب ضوفشاں رہے گا۔ وہ ایک ایسی دُنیا کا مکین ہے جہاں فکر و خیال کے گل ہائے رنگ رنگ اپنی سدا بہار عطر بیزی سے قریہء جاں کو معطر کرتے رہتے ہیں۔ اس دنیا کی فصلِ گل کو اندیشہء زوال نہیں۔ اُس نے فکر و خیال کی انجمن آرائی اور خوابوں کی خیاباں سازیوں سے جو سماں باندھا ہے وہ رہتی دنیا تک قارئینِ ادب کے دلوں کو ایک ولولہء تازہ عطا کرتا رہے گا۔ اس نے طلسمی حقیقت نگاری کی جس دنیا میں اپنا مسکن بنایا ہے وہ سیلِ زماں کے تھپیڑوں سے بالکل محفوظ رہے گا۔ ایک زیرک تخلیق کار اپنے ذہن و ذکاوت کے اعجاز سے طلسمی حقیقت نگاری کی جو دنیا آباد کرتا ہے وہ قارئینِ ادب کے فکر و خیال میں رچ بس جاتی ہے۔ طلسمی حقیقت نگاری کی دنیا کی اقدار و روایات تہذیبی ارتقا کے مانند نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اسی لیے سمے کے سم کے ثمر سے بھی اس کی رعنائی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ گیبریئل گارسیا مارکیز

ناول اور افسانے کی طلسمی حقیقت نگاری کی اقلیم کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس اقلیم میں اُس کی عظمتِ فکر کا ڈنکا بجتا رہے گا اور اس کے اسلوب کا سکہ چلتا رہے گا۔ قارئینِ ادب اُس کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اُس کی فکر و خیال کی جولانیوں، اشہبِ قلم کی روانیوں اور بصیرت و وجدان کی بے کرانیوں میں کھو جائیں گے۔ اُس کے مداح خوابوں میں بھی اس کے ابد آشنا تصورات، روح پرور خیالات اور یادوں کے طلسمات سے دلوں کو آباد رکھیں گے۔ عقیدتوں، محبتوں اور خلوص کا یہ تعلق ہمیشہ قائم رہے گا۔ فضاؤں میں ہر سُو اُس کی عطر بیز یادیں پھیلی ہیں جس سمت بھی نظر اُٹھتی ہے اُس کی یہ مانوس آواز نہاں خانہ دل پر دستک دیتی ہے:

مجھے
لیے
نہیں
صدیاں
سُنیں
گی
میری
آواز
کو
محفوظ
رکھنا

☆☆☆

(مشمولہ: قومی زبان، کراچی، جلد ۶۸، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۴ء)

انٹرویوز

گیبرئیل گارسیا مارکیز سے ایک انٹرویو

پیٹر ایچ اسٹون/مظفر اقبال

(نوٹ: مندرجہ ذیل انٹرویو پیرس ریویو (سرما ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا۔ انٹرویو پیٹر ایچ سٹون نے لیا۔ پیٹر سٹون نیویارک کا رہنے والا لانس رائٹر ہے۔ RAMPARTS MAGAZINE کا سابق ایڈیٹر بھی ہے۔)

پیٹر سٹون کے لفظوں میں گارسیا مارکیز کا مختصر خاکہ یوں ابھرتا ہے:

"گارسیا مارکیز سے یہ انٹرویو اس کے دفتر (سٹوڈیو) جو میکسیکو شہر کے ایک پرانے لیکن پھولوں سے بھرے حسین و دلفریب علاقے، سان اینجل ان میں، اس کے گھر کے پچواڑے واقع ہے، میں لیا گیا، سٹوڈیو گھر سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ یہ نیچی چھت والی ایک لمبی عمارت ہے جو شاید مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کے اندر ایک کونے میں ایک کاؤچ دو آرام کرسیاں ایک عارضی بار۔ اور ایک چھوٹا سا سفید فریج ہے جس کے اُوپر معدنی پانی کا برتن دھرا رہتا ہے، کمرے کی سب سے چونکا دینے والی چیز ایک صوفے کے اُوپر رکھی، گارسیا مارکیز کی بہت بڑی تصویر ہے۔ بغیر آستین کے قبا پہنے وہ کسی آندھی سے بھری گلی میں اکیلا کھڑا ہے اور کم وبیش انھونی کوئین کی طرح لگ رہا ہے۔

گارسیا سٹوڈیو کے آخر میں میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ خوش آمدید کہنے کے بعد وہ ہلکے قدم اٹھاتا ہوا، تیزی سے میری طرف بڑھا۔ وہ دوہرے جسم کا

پانچ فٹ آٹھ یا نو انچ لمبا شخص ہے، جو مڈل ویٹ فائیٹر لگتا ہے۔ اس کی چھاتی چوڑی، لیکن ٹانگیں جسم کی مناسبت سے دُبلی ہیں۔ وہ کارڈ رائے کی عام سی پتلون ٹرٹل نیک سویٹر اور سیاہ بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے بال گھنگریالے سیاہ اور براؤن ہیں۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں ہیں۔

یہ انٹرویو تین ملاقاتوں، جو آخر میں دو گھنٹے تک جاری رہیں، میں مکمل ہوا اگرچہ اس کی انگریزی کافی اچھی ہے لیکن اس نے سوالات کے جواب ہسپانوی میں دیئے۔ اور اس کے دو ہونہار بیٹے جو میکسیکو اور سپین میں کئی برس تک برطانوی سکولوں میں پڑھتے رہے ہیں، اس انٹرویو کا ترجمہ کرنے میں میرے معاون بنے۔ جب گارسیا مارکیز بولتا ہے تو اس کا جسم اکثر آگے پیچھے ہلتا ہے اس کے ہاتھ بھی اکثر متحرک رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی لیکن انتہائی فیصلہ کن حرکات، جو کسی نکتے پر زور دینے کے لیے، یا اس کی سوچ کے زاویے بدلنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ گفتگو کے دوران کبھی کبھی وہ سامع کی طرف جھک جاتا ہے اور کبھی پیچھے ہو کر، ٹانگیں دوہری کر کے، سوچتے ہوئے بولنا شروع کرتا ہے،''

انٹرویو میں اس نے پہلی بار ''تنہائی کے سو برس'' کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی ہیں۔ قبیلے کے سردار کا زوال لکھے جانے۔ بلکہ اسے لکھنے کے خیال کے بارے میں بھی وہ بہت دلچسپ باتیں کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس کا ہلکا تمسخر آمیز انداز انٹرویو کی جان ہے۔

سوال: ٹیپ ریکارڈر کے استعمال کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

گارسیا: بات یہ ہے کہ جیسے ہی آپ کو علم ہوتا ہے کہ انٹرویو ٹیپ کیا جا رہا ہے، آپ کا رویہ بدل جاتا ہے میں عام طور پر بہت محتاط ہو جاتا ہوں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے اب تک انٹرویو میں ٹیپ ریکارڈر کا استعمال نہیں سیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمبی گفتگو کی جانی چاہیے جس کے دوران صحافی نوٹس نہ لے اور اس کے بعد وہ گفتگو یاد کر کے اسے لکھنا چاہیے۔۔۔ اور ضروری نہیں کہ یہ انہی لفظوں میں لکھی جائے جن میں یہ بیان کی گئی تھی، ایک اور طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ نوٹس لیے جائیں اور بعد میں انٹرویو دینے والے شخص سے مناسب وفا داری کے جذبے کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ ٹیپ ریکارڈنگ میں مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح

انٹرویو دینے والے کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ اس کی ذرا ذرا سی بات ریکارڈ ہو جاتی ہے وہ باتیں بھی جو بے اختیاری میں اس کے منہ سے نکل جاتی ہیں۔ لہٰذا ٹیپ ریکاڈر موجو ہو تو مسلسل مجھے یہ احساس رہتا ہے کہ انٹرویو ہو رہا ہے۔ لیکن اگر یہ موجود نہ ہو تو میں بالکل غیر شعوری اور قدرتی انداز میں بولتا ہوں۔

سوال: اب میں خود کو قصور وار سمجھ رہا ہوں۔ لیکن اس طرح کے انٹرویو میں، میرا خیال ہے اس، (ٹیپ ریکارڈر) کے استعمال کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

گارسیا: اس ساری بات کا مطلب، بہرحال صرف یہ تھا کہ تم ڈیفینسو پوزیشن میں آ جاؤ۔

سوال: تو آپ نے کبھی انٹرویو لیتے ہوئے ٹیپ ریکارڈر استعمال کیا؟

گارسیا: نہیں، صحافی کی حیثیت سے کبھی نہیں۔ میرے پاس ایک بہت اچھا ٹیپ ریکارڈر ہے جسے میں صرف موسیقی سننے کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ لیکن پھر۔ صحافی کی حیثیت سے میں نے کبھی انٹرویو لیا ہی نہیں۔ میں نے وقائع نگاری کی ہے لیکن سوالات و جوابات والا انٹرویو کبھی نہیں لیا۔

سوال: لیکن وہ مشہور زمانہ انٹرویو جو ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کے ملاّح سے لیا گیا تھا؟

گارسیا: نہیں، یہ سوالات و جوابات نہ تھے۔ یوں تھا کہ ملاح مجھے اپنی مہمات کے بارے میں بتاتا رہا۔ اور میں نے اسے صیغۂ واحد میں، اس طرح لکھا جیسے ملاّح خود لکھ رہا ہو، میں نے لفظ بھی اسی کے استعمال کیے، اور جب یہ تحریر ایک اخبار میں قسط وار ہفتوں تک شائع ہوتی رہی، تو اس وقت بھی لکھنے والے کے طور پر اس پر اس ملاّح کا نام تھا۔ اور یہ تو کوئی بیس برس بعد کی بات ہے جب میں نے اسے شائع کیا تو لوگوں نے کہا، اچھا یہ تم نے لکھی تھی اور ''تنہائی کے سو برس'' کے چھپنے تک تو کسی ایڈیٹر نے اسے قابلِ اعتنا بھی نہ سمجھا تھا۔

سوال: صحافت کی بات چلی ہے تو میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ ایک لمبے عرصے تک ناول لکھنے کے بعد، اب پھر صحافت کرنا کیسا لگتا ہے؟ کیا کوئی فرق محسوس ہوتا ہے؟

گارسیا: مجھے ہمیشہ سے علم تھا کہ میرا اصل پیشہ صحافت ہے۔ جس چیز سے میں اکتا گیا وہ کام کرنے کی صورتِ حال تھی مجھے اپنے خیالات اور سوچوں کو اخبار کے تابع کرنا پڑا تھا۔ اب ناول نگار کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد، اور فراغت اور مالی آسودگی میسر آ جانے کے بعد میں اپنے موضوعات کا چناؤ کر سکتا ہوں۔ وہ موضوعات جو میرے خیال کے زیادہ قریب ہیں۔ بہرحال میں نے ہمیشہ اعلیٰ پائے کی صحافت سے حظ اٹھایا۔

سوال: آپ کے خیال میں کون سی چیز صحافتی لحاظ سے اعلیٰ پائے کی چیز ٹھہرتی ہے؟

گارسیا: ''ہیروشیما'' جان ہرسے کا ہیروشیما بہت خوبصورت تحریر ہے۔

سوال: کیا کوئی ایسا موضوع ہے جس پر آپ اب لکھنا چاہیں گے؟

گارسیا: بہت، اور کئی ایک پر تو میں نے لکھا بھی ہے، مثلاً پرتگال، کیوبا، انگولا اور ویت نام کے بارے میں، میں نے لکھا ہے، پولینڈ کے بارے میں لکھنا چاہوں گا، اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں حقیقت بیانی سے کام لے سکوں اور وہ سب کچھ لکھوں جو ہو رہا ہے تو یہ ایک انتہائی اہم تحریر ہو گی۔ لیکن پولینڈ جانا، اب خاصا مشکل ہے اور صحافی کی حیثیت سے میں اپنی آزادی کو پسند کرتا ہوں۔

سوال: کیا ناول نگاری سے ایسی چیزیں حاصل ہوسکتی ہے جو صحافت میں ممکن نہ ہوں۔

گارسیا: نہیں، میرا خیال ہے ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ دونوں کی بنیاد ایک ہے۔ دونوں کا مواد ایک ہی جگہ سے آتا ہے۔ زبان و بیان ایک ہے۔DAUIELDEFER کا THE JOURNAL OF THE PLAGUE YEAR ایک عظیم ناول ہے اور ''ہیروشیما'' ایک خوبصورت صحافتی تحریر۔!!

سوال: کیا صحافی اور ناول نگار پر حقیقت اور تصور کو متوازن رکھنے کی مختلف ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

گارسیا: صحافت میں صرف غلط بات، پوری تحریر کا ستیاناس کر دیتی ہے، جب کہ ادب میں صرف ایک سچی بات پوری تحریر کو باعثِ اعتنا بنا دیتی ہے۔ یہی ایک فرق اُن دونوں میں ہے اور یہ لکھنے والے کی وابستگی پر منحصر ہے۔ اگر ناول نگار قارئین کو یقین دلا سکے تو وہ کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔

سوال: چند برس پہلے دیے گئے انٹرویو میں آپ صحافی کی حیثیت سے اپنی زود نگاری پر پشیمان نظر آتے تھے۔

گارسیا: اب لکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے، ناول ہو یا صحافتی تحریر، جب میں اخبارات کے لیے کام کرتا تھا تو اپنے لفظوں کے بارے میں ذرا کم شعور رکھتا تھا جب کہ اب میں بہت محتاط ہوں۔ بوگاٹا میں جب میں "ELESPECATADOR" میں کام کرتا تھا تو ہر ہفتے کم از کم تین موضوعات پر فیچر لکھتا، ہر روز دو یا تین اداراتی نوٹ، پھر فلموں پر تبصرے اور رات کو جب سب لوگ گھروں کو چلے جاتے تو میں بیٹھ کر ناول لکھتا۔ مجھے بارش کی آواز کی طرح بولتی ہوئی لینوٹائپ

مشینوں کا شور بہت پسند تھا، جب وہ رک جاتیں اور خاموشی میرا احاطہ کر لیتی تو مجھ سے لکھا نہ جاتا۔اب میں نسبتاً بہت کم لکھ پاتا ہوں۔کوئی دن بہت اچھا ہو تو میں صبح نو بجے سے سہ پہر دو یا تین بجے تک بمشکل چار یا پانچ سطروں کا پیراگراف لکھ پاتا ہوں جسے عموماً دوسرے روز تلف کر دیتا ہوں۔

سوال: کیا یہ تبدیلی آپ کی تحریروں کی بے تحاشہ تعریف سے پیدا ہوئی یا سیاسی وابستگی کی وجہ سے؟

گارسیا: دونوں سے، دونوں سے۔یہ خیال کہ میں اپنے تصور سے کہیں زیادہ لوگوں کے لیے لکھ رہا ہوں، ایک طرح سے ایک بہت ذمہ داری ہے (جو ادبی بھی ہے اور سیاسی بھی) کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اپنی پہلی تحریروں سے کم تر چیز نہ لکھنے کا غرور آمیز جذبہ بھی اسی میں شامل ہے۔

سوال: آپ نے لکھنا کیسے شروع کیا؟

گارسیا: تصویریں بنانے سے، کارٹون بنانے سے، لکھنا اور پڑھنا سیکھنے سے پہلے میں نے سکول اور گھر پر، کومکس بنانے سیکھے تھے۔ایک مضحکہ خیز بات، جس کا احساس مجھے اب ہوتا ہے، یہ ہے کہ جب میں ہائی سکول میں تھا تو کوئی۔۔۔تحریر لکھے بنا میری شہرت ادیب کی حیثیت سے ہو چکی تھی۔کوئی پمفلٹ لکھنا ہو یا کسی درخواست کا مسودہ۔۔تو نگاہ انتخاب ہمیشہ مجھ پر پڑتی کیونکہ مجھے ادیب تصور کیا جاتا۔کالج میں داخل ہوا تو میری ادبی بیک گراونڈ دوسرے ساتھیوں سے کہیں زیادہ مضبوط تھی بوگاٹا کی یونیورسٹی میں، میں نے کئی دوستیاں لگائیں، ان لوگوں نے مجھے ہمعصر ادیبوں سے متعارف کروایا۔ایک رات میرے ایک دوست نے مجھے فرانز کافکا کی کہانیوں کا مجموعہ دیا۔میں کمرے میں واپس پہنچا اور ''میٹا مورفوسز'' پڑھنا شروع کیا۔پہلی ہی سطر نے چونکا دیا میں بستر سے اچھل پڑا۔پہلی لائن۔۔۔۔۔''جب گریگر سیتمسا اس صبح اپنے پریشان کن خواب سے جاگا تو اس نے اپنے آپ کو بستر پر ایک بہت بڑے کیڑے میں بدلا ہوا پایا'' میں نے یہ سطر پڑھی تو سوچا کہ مجھے علم نہ تھا کہ کسی کو اس طرح کی چیزیں لکھنے کی اجازت ہے۔اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں بہت عرصہ قبل لکھنا شروع کر چکا ہوتا۔تو یوں میں نے افسانے لکھنے شروع کیے۔تاہم وہ سب اکتسابی افسانے ہیں کیونکہ میں انہیں اپنے ذہنی اور ادبی تجربوں کی بنا پر لکھ رہا تھا اور میں نے ابھی زندگی اور ادب کے درمیان مضبوط رشتہ محسوس نہ کیا تھا۔ یہ کہانیاں بوگاٹا "ESPECTADOR" کے ادبی صفحات پر شائع ہوتی رہیں۔انہیں تھوڑی بہت شہرت بھی

حاصل ہوئی شاید اس لیے کہ اس وقت کولمبیا میں کوئی شخص انٹلیکچوئیل افسانے نہ لکھ رہا تھا۔ اس وقت زیادہ تر سماجی اور دیہی زندگی کے بارے میں افسانے لکھے جا رہے تھے۔ افسانہ نگاری کی ابتدا میں کہا گیا کہ میں جوائس کے زیر اثر ہوں۔

سوال: کیا آپ نے اس وقت جوائس کو پڑھ رکھا تھا؟

گارسیا: نہیں، لیکن پھر میں نے ULYESES پڑھنا شروع کیا۔ میں نے اس کا ہسپانوی زبان میں ہونے والا واحد ترجمہ پڑھا۔ لیکن بعد میں اسے انگریزی اور ایک بہت اچھے فرانسیسی ترجمے میں پڑھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہسپانوی ترجمہ بہت بُرا ترجمہ تھا، تاہم ایک چیز میں نے اس سے ضرور سیکھی، جو مستقبل میں بہت مددگار ثابت ہوئی یعنی داخلی خود کلامی کی تکنیک، بعد میں میں نے اسے ورجینا وولف میں بھی دریافت کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اسے جوائس سے بہت بہتر برتتی ہے اگرچہ بہت بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس تکنیک کو دریافت کرنے والا اصل شخص LAZRFLLODE TORWES کا نامعلوم مصنف ہے۔

سوال: شروع میں اور کس نے آپ کو متاثر کیا؟

گارسیا: وہ لوگ جنہوں نے واقعتاً افسانے کی طرف میرے انٹلیکچوئیل رویے کو بدلنے میں مدد دی، وہ امریکہ کی گمشدہ نسل کے ادیب ہیں۔ مجھے علم ہوا کہ ان کا ادب زندگی سے ایک ایسے بندھن میں منسلک ہے جو میری تحریروں میں عنقا ہے۔ اور پھر ایک واقعہ جس کا اس رویے سے بہت اہم تعلق ہے۔ بوگاٹا میں ۱۹ اپریل ۱۹۴۸ء کو ایک سیاسی لیڈر گیتان کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ پھر شہر کے لوگ دیوانہ وار گلیوں میں نکل آئے جس وقت مجھے اس خبر کا علم ہوا تو میں اپنے کمرے میں دوپہر کا کھانا کھانے والا تھا۔ میں جائے وقوعہ کی طرف بھاگا لیکن اس وقت گیتان کو ٹیکسی میں ڈال کر ہسپتال کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ کمرے میں لوٹتے ہوئے میں نے لوگوں کو مظاہرہ کرتے دیکھا۔ وہ دکانیں لوٹ رہے تھے اور عمارتوں کو آگ لگا رہے تھے۔ میں ان میں شامل ہو گیا۔ اس شام پہلی بار میں نے اپنے ملک کو دریافت کیا اور مجھے احساس ہوا کہ اس کا کتنا کم حصہ میری کہانیوں میں شامل ہے۔ بعد میں جب مجھے برانکیلا جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا جانے پر مجبور کیا گیا تو مجھے احساس ہوا یہی زندگی تو ہے جسے میں نے جانا اور برتا ہے اور ہمیشہ اس کے بارے میں لکھنا چاہا ہے۔

۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں لگ بھگ ایک اور واقعہ ہوا جس نے میرے ادبی رجحانوں کی تشکیل کی۔ میری ماں نے مجھ سے آراکاٹا، جہاں میں پیدا ہوا تھا، چلنے کے لیے کہا۔ وہ وہاں اس گھر کو جس

میں میں نے اپنی زندگی کے پہلے پانچ برس گزارے تھے، بیچنا چاہتی تھی، جب میں وہاں پہنچا تو مجھے ایک چونکا دینے والا احساس ہوا۔ اس وقت میں بائیس برس کا تھا۔ اور میں آخری دفعہ وہاں اس وقت گیا تھا جب میں آٹھ سال کا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں اس قصبے کو دیکھ نہیں رہا، بلکہ اسے محسوس کر رہا ہوں، جیسے میں اسے پڑھ رہا ہوں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے سب کچھ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے اور کرنے کی بات صرف اتنی سی ہے کہ یہ سب کچھ، جو لکھا جا چکا تھا، جسے میں اب پڑھ رہا تھا، اسے نقل کر دوں۔ عملی طور پر ہر چیز ادبی بیان میں ظاہر ہو چکی تھی۔ گھر، لوگ، یادیں۔۔۔۔۔ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت تک میں نے فاکنر کو پڑھا تھا یا نہیں، لیکن اب مجھے گمان ہوتا ہے کہ جو منظر میں دیکھ رہا تھا، اسے صرف فاکنر ہی کی تکنیک میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ وہ سارا ماحول، بستی، اس کی حرارت۔۔۔۔۔ یہ کم و بیش اسی طرح تھے جیسے میں نے فاکنر کے ہاں محسوس کیا تھا۔ یہ کیلوں کی کاشت کا علاقہ تھا، جسے میں نے زیادہ جنوب کے ادیبوں کی تحریروں میں محسوس کیا تھا۔ میرے نقادوں نے مجھ پر فاکنر کے اثر کو بہت بیان کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض اتفاق تھا۔ میں نے ایسا مواد دریافت کیا جو صرف اس صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے جو فاکنر نے اس طرح کے مواد کے بیان میں برتی ہے۔

قصبے سے واپسی پر میں نے اپنا پہلا ناول 'پتوں کا طوفان' لکھنا شروع کیا۔ آراکاٹا کے اس سفر میں دراصل ہوا یہ کہ مجھے پتہ چلا میرے بچپن کی ہر یاد کی ایک ادبی حیثیت ہے جسے اب میں دریافت کر رہا تھا۔ ''پتوں کا طوفان'' لکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تو صرف ادیب بننے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ ۱۹۵۳ء کی بات ہے لیکن مجھے پہلی رائلٹی ۱۹۶۷ء میں ملی، جب میں اپنی آٹھ مطبوعہ کتابوں میں سے پانچ لکھ چکا تھا۔

سوال: کیا نوجوان ادیبوں میں اپنے بچپن کے تجربات کو پس پشت ڈالنے اور چیزوں کو انٹلیکچولائز کرنے کی عادت خاصی عام ہے؟

گارسیا: نہیں، بلکہ اس سے برعکس ہوتا ہے لیکن مجھ سے پوچھیں تو میں تو نوجوان ادیبوں کو یہی مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے تجربات کو اپنا موضوع بنائیں۔ اور یہ جاننا تو بہت آسان ہے کہ لکھنے والا اپنے تجربات کے بارے میں لکھ رہا ہے یا خالی خولی پڑھی ہوئی یا سنی ہوئی باتیں بیان کر رہا ہے۔ نیرودا کا ایک مصرع ہے کہ ''خدایا! میں گاتے ہوئے بات بگڑنے کے گناہ سے پناہ مانگتا ہوں۔'' مجھے یہ بات ہمیشہ مضحکہ خیز لگتی ہے کہ میری تحریروں کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والے، ان میں موجود تخیل کی تعریف کرتے ہیں۔ جب کہ اصل یہ ہے کہ میری تحریروں میں ایک بھی سطر

ایسی نہیں ہے جس کی جڑیں حقیقت میں گڑی ہوئی نہ ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جزائر غرب الہند (CARIBBEAN) کی حقیقت داستانی تصورات سے ملتی جلتی ہے۔

سوال: اس وقت آپ کس کے لیے لکھ رہے تھے؟ آپ کے قاری کون تھے؟

گارسیا: ''پتوں کا طوفان'' میں نے اپنے دوستوں کے لیے لکھا۔ وہ لوگ جو میری مدد کر رہے تھے، جو مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کے لیے دیتے تھے، جو میری تحریروں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن عام طور پر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کسی نہ کسی کے لیے لکھ رہے ہوتے ہیں۔ لکھتے ہوئے مجھے مسلسل یہ احساس رہتا ہے کہ میرا فلاں دوست اس لائن کو پسند کرے گا، وہ دوسرا اس بات یا پیراگراف پر مرمٹے گا۔ میں ہمیشہ کسی خاص شخص کے بارے میں سوچتے ہوئے لکھتا ہوں، یوں، آخر میں ساری کتابیں دوستوں کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ لیکن ''تنہائی کے سو برس'' لکھنے کے بعد مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اپنے لاکھوں پڑھنے والوں میں سے میں کس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس کا علم نہیں ہو پاتا۔ اس سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ میں اس سیٹنگ ہوتا ہوں یوں لگتا ہے جیسے لاکھوں آنکھیں آپ پر مرکوز ہیں اور آپ نہیں جانتے کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں۔

سوال: آپ کے ادب کو صحافت نے کس طرح متاثر کیا؟

گارسیا: میرا خیال ہے حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ادب نے میری صحافت کی مدد کی ہے۔ اس کی وجہ سے میری صحافتی تحریروں کی ایک ادبی حیثیت بن گئی ہے۔ لیکن ایک اور طرح سے صحافت نے میری مدد کی ہے، اس سے میری ادبی تحریروں میں حقیقت نگاری پیدا ہوگئی۔

سوال: اُس خاص اندازِ تحریر کی دریافت کے اس عمل کے بارے میں کیا خیال ہے جس سے آپ ''پتوں کا طوفان'' لکھنے کے بعد اور ''تنہائی کے سو برس'' لکھنے سے پہلے گزرے؟

گارسیا: ''پتوں کا طوفان'' لکھنے کے بعد میں نے سمجھا کہ اپنے بچپن اور گاؤں کے بارے میں لکھنا، دراصل وسیع ملکی سیاسی صورتِ حال سے فرار کے مترادف ہے۔ مجھے یہ مغالطہ تھا کہ میں اس طرح کے ناسٹلجیا میں پناہ لے کر سیاسی صورتِ حال سے چھپ رہا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ادب اور سیاست کے رابطے کا بہت چرچا تھا ان دونوں کے درمیان موجود فاصلے کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھ پر فاکنر کا اثر تھا۔ اب ہیمنگ وے نے مجھے متاثر کرنا شروع کیا۔ میں نے NO ONE WRITES TO THE COLONEL (ترجمہ فاروق حسن) THE EVILHOUR (گناہ کی گھڑی) اور FLNERAL OF MAURA GRAND جیسے افسانے لکھے یہ سب کم و

بیش ایک ہی وقت میں لکھے گئے ان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ یہ کہانیاں ایک ایسے قصبے سے اُبھریں جو ''پتوں کے طوفان'' اور ''تنہائی کے سو برس'' سے مختلف ہے یہ ایسا قصبہ ہے جس میں کوئی جادو نہیں ہے۔ یہ صحافتی ادب ہے لیکن جب میں نے گناہ کی گھڑی'' ختم کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے تمام خیالات ایک دفعہ پھر پلٹ گئے ہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ بچپن کے بارے میں میری تحریریں زیادہ سیاسی ہیں اور میرے ملک کے حالات سے زیادہ قریب۔!! اور یہ میرے پہلے خیال کے برعکس بات تھی۔ ''گناہ کی گھڑی'' لکھنے کے بعد، میں پانچ برس تک کچھ نہ لکھ سکا۔ تاہم مجھے ہر لمحے اس چیز کا احساس تھا جو ہمیشہ سے لکھنا چاہتا تھا، لیکن کوئی چیز گم تھی، کم تھی۔ اور مجھے گمان نہ تھا کہ یہ کیا ہے، تاوقتیکہ میں نے اصل آواز کو پالیا۔ وہ آواز جو بالآخر ''تنہائی کے سو برس'' میں ظاہر ہوئی۔ اس کی بنیاد میری نانی کے کہانی سنانے کے انداز میں تھی۔ وہ مجھے عجیب وغریب مافوق الفطرت قصے اس طرح سناتی تھیں کہ وہ بالکل فطری لگتے۔ اس دریافت کے بعد میں لکھنے بیٹھا اور مسلسل اٹھارہ ماہ تک لکھتا رہا۔

سوال: وہ غیر معمولی مافوق الفطرت چیزوں کو کس طرح فطری بنادیتی تھیں؟

گارسیا: سب سے اہم چیز ان کے چہرے کے تاثرات تھے۔ کہانی کہنے کے دوران وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو تبدیل نہ کرتیں اور ہر کوئی حیران ہوتا۔ ''تنہائی کے سو برس'' لکھنے کی کوششوں میں، میں نے ایک ایسی کہانی کہنے کی کوشش کی تھی جس میں مجھے خود یقین نہ تھا۔ میں نے جانا کہ مجھے خود اپنی کہانی پر یقین کرنا ہے اور پھر اسے اس طرح بیان کرنا ہے، جیسے میری نانی کیا کرتی تھی: ایک پتھریلے چہرے کے ساتھ !!

سوال: اس تکنیک یا TONE میں ایک صحافتی کیفیت بھی تو ہے، آپ غیر معمولی چیزوں کو اتنا جزویات کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ وہ حقیقی لگنے لگتی ہیں۔ کیا یہ چیز آپ نے صحافت سے سیکھی؟

گارسیا: ہاں یہ ایک صحافتی ٹیرک ہے۔ جسے آپ ادب میں بھی استعمال کر سکتے ہیں، مثلاً اگر آپ کہیں کہ ہاتھی آسمان پر اڑ رہے ہیں تو لوگ یقین نہیں کریں گے، لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ آسمان پر چار سو پچیس ہاتھی ہیں تو شاید لوگ یقین کر لیں ''تنہائی کے سو برس'' اس طرح کی چیزوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ بالکل میری نانی کی تکنیک ہے اور خاص کروہ کردار میرے سامنے آتا ہے جو پیلی تتلیوں سے گھرا رہتا تھا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تو ایک دفعہ ایک الیکٹریشن ہمارے گھر آیا۔ میں اس میں بہت دلچسپی لینے لگا کیونکہ اس کے پاس ایک ایسی پیٹی تھی جس کے ذریعے

وہ خود کو بجلی کی تنصیبات کے ساتھ لٹکایا کرتا تھا۔ میری نانی کہا کرتی تھیں کہ جب بھی یہ آدمی ہمارے گھر آئے گا۔ گھر تتلیوں سے بھر جائے گا۔لیکن لکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اگر میں یہ نہ کہوں کہ تتلیاں پیلی تھیں تو لوگ یقین نہیں کریں گے اور جب میں RENIEDIOS THE BEAUTY کے جنت میں جانے والا حصہ لکھ رہا تھا تو اسے سچ بنانے کے لیے مجھے بہت تگ و دو کرنی پڑی۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں باغ میں گیا اور میں نے گھر پر کام کرنے والی عورت کو دیکھا جو چادروں کو سوکھنے کے لیے پھیلا رہی تھی، لیکن آندھی بہت شدید تھی اور وہ آندھی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ وہ چادروں کو نہ اڑائے ۔ تب مجھے پتہ چلا کہ اگر میں THE BEAUTY RENEDIOS کے لیے چادریں استعمال کروں تو اسے آسمان کی طرف بھیجا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا یہ ادیب کے لیے مسئلہ ہے اعتماد کا۔ لکھنے والا کچھ بھی لکھ سکتا ہے اگر اس پر یقین کروا سکے۔

سوال: ''تنہائی کے سو برس'' میں بے خوابی کی وبا کا ماخذ کیا ہے؟

گارسیا: ایڈی پس سے وباؤں میں میری دلچسپی کا آغاز ہوا۔ میں نے قرون وسطیٰ کی وباؤں کا بہت مطالعہ کیا۔ میری من پسند کتابوں میں DANIEL DEFOE کی THE JOURNAL OF THE PLAGUE YEAR شامل ہے اس کی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ ڈیفو ایسا صحافی ہے جس کی تحریریں بالکل طلسماتی لگتی ہیں۔ کئی برس تک میں سمجھتا رہا کہ DEFOE نے دراصل لندن کی وبا کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ یہ تو ایک ناول ہے کیونکہ لندن کی وبا کے وقت وہ صرف سات برس کا تھا۔ وبائیں کسی نہ کسی صورت میں میرا موضوع رہی ہیں۔ ''گناہ کی گھڑی'' میں پمفلٹ وبا کی صورت میں ہیں۔ کئی برس تک اس بات پر مکمل یقین رکھتا تھا کہ کولمبیا کی خانہ جنگی اور قتل و غارت گری وباؤں کی مابعد الطبعیات رکھتی ہے۔ ''تنہائی کے سو برس'' سے قبل میں نے وبا کو ایک کہانی THE DAY AFTER SATURDAY میں پرندوں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ''تنہائی کے سو برس'' میں، میں نے بے خوابی کی وبا کو ایک ادبی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، کیونکہ یہ سونے کی وبا کے برعکس ہے، بالآخر ادب بڑھئی کا کام ہی تو ہے۔

سوال: کیا آپ اس تشبیہ کو ذرا اور واضح کریں گے؟

گارسیا: میرا مطلب ہے دونوں بہت مشکل کام ہیں۔ لکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا میز بنانا۔ دونوں صورت میں آپ حقائق سے دوچار ہیں۔ حقائق جو لکڑی کی طرح سخت ہیں۔ دونوں تکنیک

اور ٹرکس سے بھرے پڑے ہیں، بنیادی طور پر بہت کم جادو (معجزے) اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور جیسا کہ شاید پروست نے کہا ہے لکھنا محض دس فیصد وجدان اور نوے فیصد محنت یا پسینہ بہانا ہے، میں نے کبھی بڑھئی کا کام نہیں کیا، لیکن میں اس کام کا عاشق ہوں، خاص کر اس لیے کہ کبھی کوئی دوسرا اسے آپ کے لیے نہیں کرسکتا۔

سوال: ''تنہائی کے سو برس'' میں BANANA FEVER کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس میں کس قدر واقعی یونائٹیڈ فروٹ کمپنی کا کیا دھرا ہے؟

گارسیا: ہاں BANANA FEVER حقائق کے گرد گھومتا ہے، بلا شبہ میں نے کئی چیزیں ایسی ادبی صنعت گری سے لکھی ہیں جو تاریخی طور پر ثابت نہیں کی جاسکتیں، مثال کے طور پر چوراہے کا قتل عام حقیقت ہے، اور جب کہ میں نے اسے شواہد اور واقعات کی بنیاد پر لکھا لیکن یہ بات تاریخی لحاظ سے کبھی ثابت نہیں ہوئی کہ کتنے لوگ مارے گئے۔ میں نے لکھا: تین ہزار۔ جو واضح طور پر مبالغہ آمیز ہے، لیکن میری بچپن کی یادوں میں سے ایک بار ایک لمبی، بہت لمبی گاڑی کو دیکھنے کی یاد ہے، جو بظاہر کیلوں سے لدی، باغ سے روانہ ہورہی ہے۔ لیکن اس میں تین ہزار لاشیں، جو سمندر میں پھینکی جانے والی ہیں، بھی تو ہوسکتی ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اب لوگ کانگریس میں اور اخبارات میں ''تین ہزار لاشوں'' کا ذکر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ ہماری ساری تاریخ اسی طرح بنی ہے۔ ''قبیلے کے سردار کے زوال'' میں آمر کہتا ہے کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لمحہ موجود میں یہ چیز حقیقت نہیں ہے، مستقبل میں کسی وقت یہ حقیقت بن جائے گی۔ جلد یا بدیر لوگ حکومت کی نسبت، ادیبوں پر اعتبار کرنا شروع کردیں گے۔

سوال: یوں تو ادیب بہت طاقتور ہوجاتے ہیں؟

گارسیا: بلا شبہ۔! اور میں اسے محسوس بھی کرتا ہوں اور یہ مجھے ذمہ داری کے ایک بہت بڑے، بوجھل احساس سے بھی دوچار کرتی ہے۔ جو چیز میں اب لکھنا چاہتا ہوں وہ ایک صحافتی تحریر ہے جو مکمل طور پر سچ ہوگی لیکن ''تنہائی کے سو برس'' کی طرح غیر معمولی تخیلاتی۔! ماضی کی یادیں جتنی زیادہ بڑھتی ہیں اتنا ہی مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ ادب اور صحافت میں بہت اہم رشتہ ہے۔

سوال: اور وہ ملک، جو غیر ملکی قرضے چکانے کے لیے اپنے سمندر کے ایک حصہ سے دستبردار ہونے پر تیار ہوجائے۔ مثلاً ''قبیلے کے سردار کا زوال میں''

گارسیا: ہاں وہ تو ہوا۔ واقعی ہوا اور کئی بار ہوگا۔ ''قبیلے کے سردار کا زوال'' ایک تاریخی کتاب ہے۔ حقائق سے ممکنات کی تلاش، صحافی اور ناول نگار کا کام ہے اور پیغمبروں کا۔ قصہ یہ

ہے کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ میں تصوراتی ادب تخلیق کرتا ہوں جب کہ اصل یہ ہے کہ میں بہت حقیقت پسند آدمی ہوں اور صرف وہی لکھتا ہوں جس کے بارے میں مجھے یقین کہ یہ صحیح سوشلسٹ حقیقت نگاری ہے۔

سوال: کیا یہ خیالی حقیقت (Utopian) ہے؟

گارسیا: مجھے یقین نہیں کہ لفظ یوٹوپئین کا مطلب حقیقی ہے یا آئیڈیل۔لیکن میرا مطلب حقیقی سے ہے۔

سوال: کیا ''قبیلے کے سردار کا زوال'' کے کردار، آمر، مثال کے طور پر۔حقیقی لوگوں کے ماڈل پر مبنی ہیں۔ان میں فرانکو، پیرون اور متروکی مشابہت ملتی ہے۔

گارسیا: ناول میں کردار،لوگوں کا مجموعہ ہے۔ایسے لوگوں کا جن سے آپ ملے ہوں جن کے بارے میں آپ نے سنا ہو یا پڑھا ہو۔میں نے پچھلی اور اس صدی کی ابتدا کے جنوبی امریکی آمروں کے بارے میں تقریباً ہر ایسی چیز پڑھ ماری جو مجھے میسر آسکی۔میں بے شمار ایسے لوگوں سے ملا جو آمریت کے تحت زندگیاں گزار رہے ہیں۔اور کم وبیش یہ دس برس تک کرتا رہا ہوں اور جب مجھے واضح طور پر یہ پتہ چل گیا کہ یہ کردار کیسا ہوگا تو میں نے کوشش کی کہ میں وہ سب کچھ، جو میں نے سنا اور پڑھا، بھول جاؤں تاکہ میں حقیقی زندگی میں ہونے والے کسی واقعہ کو استعمال کیے بغیر تخلیق کرسکوں۔ایک نکتے پر پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ میں تو کسی لمبے عرصے تک آمریت کے تحت نہیں رہا۔لہٰذا مجھے خیال ہوا کہ اگر میں سپین جا کر کتاب لکھوں تو مجھے احساس ہو سکے گا کہ آمریت کے شکنجے میں زندگی کیا صورت اختیار کرتی ہے۔لیکن مجھے پتہ چلا کہ فرانکو کے سپین میں ماحول، جنوبی امریکہ کی آمریت سے مختلف تھا۔لہٰذا کتاب کوئی ایک سال تک پسِ پشت پڑی رہی، کوئی چیز کم تھی اور مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ کیا ہے؟ تب میں نے Caubean واپس جانے کا ارادہ کیا۔لہٰذا ہم سب برانکیلا، کولمبیا، واپس چلے آئے اس وقت میں نے صحافیوں سے ایک بات کہی۔جسے انہوں نے مذاق سمجھا۔میں نے کہا تھا کہ میں اس لیے واپس آیا ہوں کہ میں امرود کی خوشبو بھول گیا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ کتاب ختم کرنے کے لیے مجھے اسی کی ضرورت تھی۔میں نے جزائر غرب الہند کا دورہ کیا اور ان جزیروں پر پھرتے ہوئے مجھے ان چیزوں کا احساس ہوا جو میرے ناول میں کم تھیں۔

سوال: آپ نے اکثر اقتدار کی تنہائی کے موضوع کو برتا ہے۔

گارسیا: جتنی زیادہ قوت حاصل ہو، اتنا ہی یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون آپ سے

جھوٹ بول رہا ہے اور کون نہیں - اور جب آپ مکمل قوت حاصل کر لیتے ہیں تو حقیقت سے آپ کا تعلق نہیں رہتا۔ یہ تنہائی کی بدترین صورت ہے۔ طاقتور آمر ایسے مفادات اور لوگوں میں گھرا رہتا ہے جو اسے حقیقت سے دور کر دیتے ہیں یہ چیز اسے تنہا کرنے پر تلی ہوتی ہے۔

سوال: اور ادیب کی تنہائی - کیا یہ مختلف ہے؟

گارسیا: یہ قوت کی تنہائی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ حقیقت کو بیان کرنے کی خواہش۔ ادیب کو اس کے بارے میں ایک غیر حقیقی نظریے کی طرف لے جاتی ہے۔ حقیقت کو ادل بدل کرنے کی کوشش میں وہ اس سے کٹ جاتا ہے۔ بقول شخصے وہ آئیوری ٹاور میں بند ہو جاتا ہے۔ صحافت اچھا توڑ ہے۔ اس لیے میں ہمیشہ صحافت سے، خاص کر سیاسی صحافت اور سیاست سے وابستہ رہا ہوں۔ یہ حقیقی دنیا سے میرا رابطہ ٹوٹنے نہیں دیتے۔ ''تنہائی کے سو برس'' کے بعد مجھے جس تنہائی کا سامنا تھا وہ ادیب کی تنہائی تھی، قوت کی تنہائی سے بہت ملتی جلتی ہے، میرے دوستوں نے مجھے اس سے بہت بچایا، میرے دوست جو ہمیشہ میرے ساتھ ہیں۔

سوال: کیسے -؟

گارسیا: یوں کہ تمام عمر میں اپنے دوستوں کو دوست رکھنے میں کامیاب ہوا ہوں، میرا مطلب ہے کہ میں دوستیاں توڑتا اور جوڑتا نہیں ہوں۔ اور میرے دوست مجھے زمین سے وابستہ رکھتے ہیں اس لیے کہ مشہور نہ ہونے کی وجہ سے وہ زمین پر رہتے ہیں۔

سوال: چیزیں شروع کس طرح ہوتی ہیں؟ ''قبیلے کے سردار کا زوال'' میں بار بار سامنے آنے والی تشبیہ محل کی گائیں ہیں۔ کیا یہ ابتدائی تشبیہات میں سے ایک ہے؟

گارسیا: میرے پاس ایک البم ہے۔ تم بھی دیکھو۔ میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ میری کتابوں کا مرکز ہمیشہ کوئی نہ کوئی تصویر رہی ہے۔ قبیلے کے سردار کا زوال'' کا پہلا امیج، ایک عظیم الشان محل، جس میں گائیں پردوں کو کھا رہی ہیں، آمر ایک بہت بوڑھا آدمی تھا تاہم یہ امیج اس وقت تک کنکریٹ حالت میں سامنے نہ آیا تھا جب تک ایک تصویر پر میری نظر نہ پڑی۔ روم میں، میں کتابوں کی ایک دکان میں فوٹو گرافی کی کتابیں، (جنہیں جمع کرنے کا مجھے شوق ہے) دیکھ رہا تھا۔ میری نظر اس تصویر پر پڑی اور یہ بالکل پرفیکٹ تھی۔ مجھے واضح طور پر علم ہوا کہ یہ کس طرح سے عمل میں آئے گا، کیونکہ میں بہت بڑا انٹلیکچوئل نہیں ہوں، اس لیے پیش رو مثالوں کو عظیم تخلیقات کی بجائے روزمرہ کی زندگی میں دیکھ سکتا ہوں۔

سوال: کیا آپ کے ناول کبھی غیر متوقع موڑ بھی اختیار کرتے ہیں۔

گارسیا: شروع میں ایسا ہوتا تھا۔ مجھے اپنی ابتدائی کہانیوں کے مجموعی تاثر کے بارے میں علم ہوتا لیکن میں اپنے آپ کو واقعات کے حوالے کر دیتا۔ لیکن شروع زندگی میں مجھے جو سب سے قیمتی مشورہ دیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ جوانی میں ایسا کرنے میں حرج نہیں، کیونکہ میرے اندر وجدانی کیفیت کا طوفان برپا رہتا تھا لیکن مجھے بتایا گیا کہ اگر میں نے تکنیک نہ سیکھی تو جب وجدانی کیفیت کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اور تکنیک کی ضرورت ہوگی، تو بہت مصیبت میں پڑ جاؤں گا، اور اگر میں اسے بروقت نہ سیکھ لیتا تو اب میں پلاٹ تشکیل دینے کے قابل نہ ہوتا۔ پلاٹ ایک مکمل تکنیکی مسئلہ ہے اور اگر آپ اسے شروع ہی میں نہ سیکھ لیں، تو کبھی نہیں سیکھ سکتے۔

سوال: تو ڈسپلن آپ کے لیے بہت اہم ہے کیا۔؟

گارسیا: میرا خیال ہے کہ غیر معمولی ڈسپلن کی عدم موجودگی میں ایک بھی قابلِ ذکر کتاب نہیں لکھی جا سکتی۔

سوال: مصنوعی محرکات کے بارے میں کیا خیال ہے؟

گارسیا: ہیمنگ وے کی ایک بات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس نے کہا کہ لکھنا باکسنگ کی طرح ہے، اس نے اپنا اور اپنی صحت کا خیال رکھا۔ فاکنر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر وقت نشے میں مدہوش رہتا تھا، لیکن میں نے اس سے جتنے بھی انٹرویو کیے۔ سب میں اس نے یہی کہا کہ مدہوشی کی حالت میں ایک لائن لکھنا ناممکن ہے۔ یہی خیال ہیمنگ وے کا ہے کئی بڑے قارئین نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بعض تحریریں لکھتے ہوئے میں نشہ آور ادویات کے زیرِ اثر تھا؟ اس سے صرف ایک بات ثابت ہوئی ہے۔ یہ کہ وہ ادب کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ نشہ آور ادویات کے بارے میں۔!! ایک اچھا رائٹر ہونے کے لیے آپ کو لکھنے کے ہر لمحے میں انتہائی واضح اور انتہائی صحت مند ہونا پڑتا ہے۔ اس رومانوی خیال کے بہت ۔۔۔۔ خلاف ہوں کہ لکھنا ایک طرح کی قربانی ہے اور مالی دشواریاں اور جذباتی شکستہ حالی اس کے لیے بہت ضروری ہے، میرا خیال ہے کہ آپ کو جسمانی اور جذباتی طور پر بہت صحت مند ہونا چاہیے۔ ادبی تخلیق شدید صحت مندی کا تقاضا کرتی ہے اور ہماری گمشدہ نسل اس بات سے پوری طرح آگاہ تھی۔ وہ لوگ واقعی زندگی کے شیدا تھے۔

سوال: Blaise Çendrars نے کہا کہ لکھنا دوسرے بہت سے کاموں کے مقابلے میں امتیازی بات ہے اور ادیب اپنے کرب کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا خیال ہے؟

گارسیا: میرا خیال ہے کہ لکھنا بہت مشکل ہے لیکن جو بھی کام احتیاط سے کیا جائے مشکل ہوتا ہے۔ امتیازی بات کام کو اپنی تسلی کے مطابق کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں خود سے اور دوسروں سے بہت زیادہ توقع رکھتا ہوں کیونکہ میں بھدے پن کو برداشت نہیں کر سکتا، میں کہتا ہوں کہ کسی بھی کام کو پرفیکٹ انداز میں کرنا امتیازی بات ہے تاہم یہ درست ہے کہ ادیب خود پسند اور نرگسی ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو معاشرے کا ضمیر اور کائنات کا مرکز وغیرہ قسم کی چیزیں تصور کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز میں بہت پسند کرتا ہوں وہ ہے کام کو انتہائی خوبصورتی سے کرنا۔ سفر کے دوران مجھے ہمیشہ ادیب ہونے کی بجائے اس بات سے طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ یہ پائلٹ، دوسرے پائلٹوں سے بہتر ہے۔

سوال: اب آپ کے لیے کون سا وقت کام کے لیے بہترین ہے۔ کیا آپ کا کوئی ٹائم ٹیبل ہے؟

گارسیا: جب میں نے لکھنے کو پیشے کے طور پر اپنایا تو ٹائم ٹیبل میرا بہت بڑا مسئلہ تھا صحافی ہونے کا مطلب تھا رات کو کام کرنا اور جب میں نے ہمہ وقت لکھنا شروع کیا میری عمر چالیس برس تھی۔ اور میں عام طور پر صبح نو سے سہ پہر دو بجے تک، جب میرے بیٹے سکول سے واپس آتے، لکھا کرتا تھا۔ میں سخت کوشی کا اسقدر عادی تھا کہ محض صبح کے وقت کام کرنے پر مجھے احساس جرم ہونے لگتا۔ اور میں نے سہ پہر کے وقت بھی لکھنا شروع کر دیا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ جو کام میں سہ پہر کو کرتا ہوں اسے صبح دوبارہ کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا میں نے صبح نو بجے سہ پہر ڈھائی بجے تک کام کرنے پر اکتفا کرنا شروع کیا۔ سہ پہر کا وقت ملاقاتوں، انٹرویوز یا اور دوسری چیزوں کے لیے مخصوص ہے۔ میرا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میں صرف مانوس ماحول ہی میں لکھ سکتا ہوں۔ ایسی جگہیں جو میری تحریر کی گرمی سے تپش پا چکی ہوں۔ میں ہوٹلوں میں، کرائے کے مکانوں میں یا مانگے کے ٹائپ رائٹرز پر لکھ نہیں پاتا۔ لہٰذا میں سفر کے دوران لکھ نہیں پاتا، خیر کام نہ کرنے کا کوئی بہانہ تو انسان تلاش کر ہی لیتا ہے۔ اس لیے جو شرائط آپ اپنے آپ پر لاگو کرتے ہیں وقت کے ساتھ مشکل ہو جاتی ہیں۔ آپ ہر طرح کے حالات میں وجدانی کیفیت کے لیے پرامید رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی ترکیب ہے جسے رومان پسندوں نے بہت ایکسپلائٹ کیا ہے، میرے مارکسی کامریڈ اس ترکیب کو بہت مشکل سے نگل پاتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی کہیے، میرا یقین ہے کہ ایک خاص ذہنی حالت ضرور ہوتی ہے جس میں خیالات بہتے ہوئے، آتے ہیں۔ باقی ساری باتیں - کہ میں صرف گھر پر لکھ سکتا ہوں وغیرہ - اس وقت اوجھل ہو جاتی ہیں۔ یہ لمحہ یہ ذہنی حالت اس

وقت وارد ہوتی ہے جب آپ نے ایک خاص موضوع کا چناؤ کرلیا ہو اور اس کو برتنے کا طریقہ ڈھونڈ لیا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اسے پسند بھی کرتے ہوں کیونکہ خلاف مرضی کام کرنے سے بری اور کوئی بات نہیں ہے۔

سب سے مشکل چیزوں میں ایک چیز پہلا پیراگراف ہے۔ ایک دفعہ میں نے ایک پہلے پیراگراف پر کئی مہینے صرف کیے، لیکن جیسے ہی یہ لکھا گیا۔ باقی کا کام بہت آسان تھا۔ کتاب کی بہت سی مشکلات پہلے پیراگراف میں حل ہو جاتی ہیں۔ موضوع، سٹائل اور ٹون۔ کم ازکم میرے ساتھ تو ایسا ہی ہے۔ پہلے پیراگراف کا ذائقہ باقی کتاب کا پتہ دیتا ہے۔ اس لیے افسانوں کا مجموعہ لکھنا، ناول لکھنے سے زیادہ مشکل امر ہے۔ یہ کہانی شروع سے شروع کرنی پڑتی ہے۔

سوال: کیا خواب بھی کبھی انسپائر کرنیکا ذریعہ بنے؟

گارسیا: شروع میں، میں نے ان پر بہت زور دیا۔ لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ زندگی خود انسپائریشن کا بہت بڑا سرچشمہ ہے اور خواب اس سرچشمے کا بہت چھوٹا حصہ ہیں۔ میری تحریروں کے بارے میں ایک اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ میں خوابوں اور ان کی تعبیروں میں بہت دلچسپی لیتا ہوں۔ میں خوابوں کو زندگی کا ایک عمومی حصہ سمجھتا ہوں لیکن حقیقت زیادہ بھرپور ہے۔ شاید میرے خواب بہت گھٹیا خواب ہیں۔

سوال: کیا آپ آمد اور وجدان میں فرق کر سکتے ہیں؟

گارسیا: آمد وہ ہے جب موضوع کا تعین ہو جائے۔ موضوع جسے آپ واقعی پسند کرتے ہوں اس سے کام آسان ہو جاتا ہے، وجدان جو ادب لکھنے کے لیے بہت بنیادی ہے۔ ایک خاص صنعت ہے جس کے ذریعے آپ حقیقت کی تہہ تک کسی سائنسی علم یا کسی بھی علم کے بغیر پہنچ سکتے ہیں۔ کشش ثقل کا قانون سمجھنے کا سب سے آسان طریقہ وجدان کا راستہ ہے۔ یہ شعوری جدوجہد کے بغیر تجربے کی اصل تک پہنچنے کا نام ہے۔ ناول نگار کے لیے وجدان ایک بنیادی چیز ہے۔ اور اصل میں یہ انٹلکچوئیل ازم کی اس قسم کے برعکس ہے جس میں حقیقی زندگی کو ایک کرخت تھیوری میں بند کر دیا جاتا ہے اور [illegible] سے میں نفرت کرتا ہوں۔ وجدانی کیفیت کا فائدہ یہ ہے کہ یا تو یہ موجود ہے یا نہیں۔ آپ ایک گول کیل کو چوڑے سوراخ میں گھسیڑنے کی لاحاصل کوشش نہیں کرتے۔

سوال: کیا یہ نظریہ ساز ہیں، جنہیں آپ ناپسند کرتے ہیں؟

گارسیا: بالکل۔!! بنیادی طور پر اس لیے کہ میں انہیں سمجھ نہیں پایا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجھے

بہت سی چیزوں کو مثالوں سے واضح کرنا پڑتا ہے کیونکہ میرے اندر تجریدیت کی صلاحیت نہیں ہے ۔اس لیے۔ بہت سے نقاد میرے بارے میں کہتے ہیں کہ مجھے کچھ آتا جاتا نہیں ۔ میں زیادہ حوالے نہیں دے سکتا۔

سوال: کیا نقاد آپ کو ایک خاص ڈھانچے میں بند کرنا چاہتے ہیں؟

گارسیا: میرا خیال ہے کہ نقاد انٹلیکچوئیل ازم کی بہت بڑی مثال ہیں ۔سب سے پہلے ان کے ذہن میں ایک تھیوری ہوتی ہے کہ فلاں ادیب کو کیسا ہونا چاہیے۔ پھر وہ اسے اس ڈھانچے میں بند کرنا چاہتے ہیں اور اگر وہ اس میں نہ آتا ہو تو بھی زبردستی اسے اس میں بند کرتے ہیں ۔ میں یہ صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ تم نے پوچھا ہے ورنہ میں نقادوں کی رائے کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا ۔ میں نے کئی برس سے تنقید نہیں پڑھی ۔انہوں نے اپنے لیے قاری اور ادیب کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کا کام فرض کر لیا ہے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میں ایک واضح اور مکمل ادیب بنوں جو نقاد کی مدد کے بغیر قاری تک پہنچ سکے ۔

سوال: مترجموں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

گارسیا: میرے دل میں مترجموں کی بہت عزت ہے، سوائے ان کے جو فٹ نوٹس استعمال کرتے ہیں ۔ایسے لوگ قاری سے وہ بات کہہ رہے ہوتے ہیں جو شاید لکھنے والا نہیں کہنا چاہتا تھا ۔اور کیونکہ یہ بات وہ لکھ دیتے ہیں لہٰذا قاری کو اسے بھی پڑھنا ہے۔ترجمہ نگاری ایک بہت مشکل کام ہے۔اور اس کا صلہ بھی زیادہ نہیں، شہرت بھی اس میں بہت کم ہے۔ایک اچھا ترجمہ۔دوسری زبان میں تخلیق کا نام ہے، یہی وجہ ہے میرے دل میں گریگری راباسا (گارسیا کا امریکی مترجم جس نے اس کی بیشتر کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے) کے لیے عزت ہے، میری کتابیں اکیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں ،لیکن راباسا ہی وہ واحد مترجم ہے جس نے کبھی فٹ نوٹ لکھنے کے لیے کسی بات کی وضاحت طلب نہیں کی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا کام انگریزی میں پھر سے تخلیق کیا گیا ہے۔ کتاب کے کچھ حصے ایسے ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ ناممکن ہوتا ہے۔ قاری کو جو تاثر ملتا ہے وہ یہ ہے کہ مترجم نے کتاب پڑھی اور پھر اپنے حافظے کی مدد سے اسے دوبارہ تخلیق کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مترجموں کے لیے میرے دل میں بہت عزت ہے وہ انٹلیکچوئل نہیں وجدانی ہوتے ہیں ۔ نہ صرف پبلشر انہیں کم پیسوں پر ٹرخا دیتے ہیں بلکہ وہ اپنے کام کی کوئی ادبی حیثیت بھی نہیں سمجھتے ۔کئی کتابوں کا میں ہسپانوی میں ترجمہ کرنا چاہتا ہوں لیکن ایسا کرنے میں اتنی ہی محنت درکار ہے، جتنی نئی کتاب میں - اور اس سے گزر بسر کے لیے پیسے بھی حاصل نہیں

ہوتے۔

سوال: مثلاً آپ کیا ترجمہ کرنا چاہتے تھے؟

گارسیا: مالرو-سنارے کا سارا، کانرڈ Saint Eaupery پڑھتے ہوئے کئی دفعہ احساس ہوتا ہے کہ میں اس کتاب کو ترجمہ کرنا چاہوں گا، عظیم تخلیقات کے علاوہ، میں ہر کتاب کے اوسط درجے کے ترجمے کو اصل زبان سے سر کھپانے پہ ترجیح دیتا ہوں۔ میں غیر زبانوں میں پڑھتے ہوئے کبھی خوش نہیں ہوتا۔ کیونکہ صرف ایک زبان سے جسے میں اپنے اندر محسوس کر سکتا ہوں اور وہ ہسپانوی ہے۔ تاہم میں اطالوی اور فرانسیسی بول لیتا ہوں اور اتنی انگریزی جانتا ہوں کہ بیس برس سے خود کو ہر ہفتے ٹائم میگزین کا زہر پلا رہا ہوں۔

سوال: کیا میکسیکو اب آپ کو گھر کی طرح لگتا ہے۔؟ کیا آپ خود کو ادیبوں کے کسی وسیع کنبے کا حصہ محسوس کرتے ہیں؟

گارسیا: عام طور پر میں ادیبوں یا آرٹسٹوں کا محض اس لیے دوست نہیں بنتا کہ وہ ادیب یا آرٹسٹ ہیں۔ مختلف پیشوں کے لوگ میرے دوست ہیں ان میں آرٹسٹ اور ادیب بھی ہیں۔ عمومی طور پر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں لاطینی امریکہ کے ہر ملک کا باشندہ ہوں لیکن کسی اور جگہ کا نہیں، جنوبی امریکی سمجھتے ہیں کہ سپین ہی وہ واحد ملک ہے جہاں ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جاتا ہے لیکن ذاتی طور پر میں وہاں زیادہ بندھن محسوس کرتا ہوں۔ جنوبی امریکہ میں مجھے سرحدوں کا احساس نہیں ہوتا۔ ان ملکوں میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ میں شعوری طور پر اس کا احساس رکھتا ہوں لیکن میرے دل اور میرے دماغ میں وہ سب ایک سے ہیں۔ اور وہ جگہ جسے میں واقعی اپنا گھر سمجھتا ہوں وہ کیریبئین ہے، خواہ یہ فرانسیسی ہو یا پرتگالی ہو یا انگلش !! جو بات مجھے بہت متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ برانکیلا سے جہاز پر سوار ہونے پر ایک سیاہ فام عورت، جس نے نیلا یونیفارم پہنا ہوتا ہے، میرے پاسپورٹ پر مہر لگاتی ہے اور جب جمیکا میں مَیں جہاز سے اترتا ہوں تو ایک اور سیاہ فام عورت، جس نے نیلا یونیفارم پہنا ہوتا ہے، میرے پاسپورٹ پر مہر لگاتی ہے۔ لیکن اس دفعہ انگریزی میں۔!! میں نہیں سمجھتا کہ زبان سے کوئی بہت زیادہ فرق پڑتا ہے لیکن دنیا کے ہر دوسرے حصے میں، میں خود کو غیر ملکی محسوس کرتا ہوں، ایک احساس جو مجھ سے محفوظ ہونے کا احساس چھین لیتا ہے۔ یہ ایک انتہائی ذاتی جذبہ ہے لیکن دوران سفر مجھے مسلسل اپنے اقلیت ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

سوال: کیا جنوبی امریکی ادیبوں کے لیے کچھ عرصہ یورپ میں رہنا بہت ضروری ہے؟

گارسیا: شاید ہاں۔ باہر سے ایک حقیقی پرسپیکٹو حاصل کرنے کے لیے۔ یا افسانوں کا جو مجموعہ میں لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں وہ یورپ جانے والے جنوبی امریکیوں کے بارے میں ہے۔ یہ گزشتہ پچیس برس سے میرے ذہن پر سوار ہے، ان کہانیوں سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکے گا وہ یہ ہے کہ جنوبی امریکی، خاص کر میکسیکن، بمشکل یورپ کو اپنے اندر سمو پاتے ہیں، وہ تمام میکسیکن جن سے میں یورپ میں ملا ہمیشہ اگلے بدھ کو واپسی کا سفر اختیار کر لیتے۔

سوال: کیوبا کے انقلاب کا جنوبی امریکی ادب پر کیا اثر پڑا؟

گارسیا: اب تک تو یہ منفی اثر ہے۔ بہت سے ادیب، جو خود کو سیاسی طور پر وابستہ سمجھتے ہیں۔ ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ جو کہانیاں لکھیں، وہ ایسی ہوں جو انہیں لکھنی چاہئیں نہ کہ جیسی وہ لکھنا پسند کرتے ہیں، اس سے ایک لگا بندھا ادب پیدا ہوتا ہے جس کا وجدان یا تجربے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہے کہ کیوبا کے جنوبی امریکہ پر ثقافتی اثر کے خلاف بہت کچھ کہا گیا۔ خود کیوبا میں صورتِ حال اس نکتے پر نہیں پہنچی جہاں ایک نئی طرح کا ادب یا آرٹ پیدا ہوتا ہے، یہ ایک ایسی چیز ہے جو وقت کی ضرورت ہے۔ جنوبی امریکہ میں کیوبا کی ثقافتی اہمیت یہ ہے کہ وہ جنوبی امریکہ کے ادب، کو جو کئی برسوں سے یہاں لکھا جا رہا ہے، پھیلانے میں رابطہ بنا۔ ایک طرح سے امریکہ میں جنوبی امریکی ادب کا فروغ کیوبا کے انقلاب کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نسل کا ہر جنوبی امریکی ادیب کوئی بیس برس سے لکھ رہا تھا لیکن یورپی یا امریکی پبلشر اسے ذرا بھی گھاس نہ ڈالتے تھے۔ جیسے ہی کیوبا کا انقلاب شروع ہوا۔ اچانک کیوبا اور جنوبی امریکہ میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ انقلاب اشیائے صرف جیسی کوئی چیز بن گیا اور جنوبی امریکہ فیشن! اور یہ ''دریافت کیا گیا'' کہ جنوبی امریکہ میں ایسے ناول لکھے جا رہے ہیں جو ترجمہ ہونے کے قابل ہیں اور انہیں دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس سارے عمل کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جنوبی امریکہ کی ثقافتی پسماندگی کا یہ عالم ہے کہ خود جنوبی امریکیوں کو یہ بات سمجھانا ناممکن تھا کہ ان کے ہاں اچھے ناول لکھے جا رہے ہیں۔

سوال: کیا کچھ ایسے جنوبی امریکی ادیب ہیں جو زیادہ مشہور نہیں اور جن کے بارے میں آپ اچھی رائے رکھتے ہیں؟

گارسیا: مجھے شک ہے کہ شاید ہی ایسا کوئی ادیب باقی ہو۔ جنوبی امریکی ادب کے فروغ کا ایک اچھا ثانوی اثر یہ ہوا کہ اب پبلشر ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ وہ کسی نئے Cortazar کو نظر انداز نہ کر دیں۔ بدقسمتی سے بہت سے نوجوان ادیب اپنے کام سے زیادہ

اپنی شہرت کے پیچھے پڑے ہیں۔

Tolouse یونیورسٹی میں ایک فرانسیسی پروفیسر ہے جو جنوبی امریکہ ادب پر لکھتا ہے۔ اسے بہت سے نوجوان ادیبوں نے لکھا کہ اسے مجھ پر بہت زیادہ نہیں لکھنا چاہیے کیونکہ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، اور دوسرے لوگوں کو ہے۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جب میں ان کی عمر کا تھا تو نقاد میرے بارے میں نہیں Miquel Angel Asturigs کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ یہ نوجوان ادیب اپنے کام پر توجہ دینے کی بجائے، نقادوں کو خط لکھنے پر ضائع کر رہے ہیں۔ خود پر لکھے جانے سے زیادہ اہم کام خود لکھنا ہے۔ میرے ادبی کیریئر میں ایک چیز جو میں سمجھا ہوں بہت اہم تھی، وہ یہ ہے کہ مجھے رائلٹی کی صورت میں چالیس برس کی عمر سے قبل، پانچ کتابیں لکھنے کے باوجود بھی، ایک ٹکہ تک نہ ملا تھا۔

سوال: کیا ادیب کی زندگی میں شہرت اور کامیابی کا جلد میسر آ جانا نقصان دہ ہے۔

گارسیا: یہ تو ہر عمر میں نقصان دہ ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا، میں اپنی کتابوں کا مرنے کے بعد شائع ہونا بہتر سمجھتا۔ خاص کر سرمایہ دار ملکوں میں جہاں وہ آپ کو مالِ تجارت بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

سوال: اپنے پسندیدہ مصنفوں کے علاوہ آپ آج کل کیا پڑھتے ہیں؟

گارسیا: میں عجیب وغریب چیزیں پڑھتا ہوں۔ اگلے دن میں محمد علی کی یادداشتیں پڑھ رہا تھا۔ بریم سٹوکر کی ڈریکولا بہت اچھی کتاب ہے، جسے کئی برس قبل میں وقت کا زیاں سمجھتا، لیکن کسی کتاب میں گم نہیں ہوتا تاوقتیکہ اپنے کسی ایسے شخص نے لکھا ہو جس پر مجھے یقین ہو۔ میں اب ادب نہیں پڑھتا، ڈاکومینٹس پڑھتا ہوں حتیٰ کہ چھوٹے ڈاکومینٹس بھی - اور میں اپنے پسندیدہ مصنفین کو دوبارہ پڑھ رہا ہوں۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کوئی بھی صفحہ اٹھا کر دوبارہ پڑھ سکتے ہیں۔ میں نے صرف ادب پڑھنے کا مقدس خیال ترک کر دیا ہے۔ میں ہر چیز پڑھنے پر تیار ہوں۔ میں اب ٹوڈیٹ رہنا چاہتا ہوں۔ ہر ہفتے میں دنیا کے تقریباً ہر حصے کے اہم رسائل پڑھتا ہوں۔ جب سے ٹیلی ٹائپ مشین پڑھنے کی عادت پڑی۔ میں ہمیشہ خبروں کی تلاش میں رہتا ہوں لیکن دنیا کے تمام حصوں کے سنجیدہ اور اہم اخبارات پڑھ چکنے کے بعد، مجھے اپنی بیوی کی زبانی ایسی خبر کا علم ہوتا ہے جس کو میں نے پہلے نہیں پڑھا ہوتا۔ جب میں اس سے پوچھتا ہوں کہ تم نے یہ خبر کہاں پڑھی تو وہ کہتی ہے بیوٹی پارلر کے ایک رسالے میں۔ لہٰذا میں سارے فیشن میگزین اور عورتوں کے گریپ میگزین بھی پڑھتا ہوں اور مجھے بہت سی چیزوں کا علم ہوتا ہے جو مجھے انہیں چیزوں کو

پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے یوں میں بہت مصروف رہتا ہوں۔

سوال: ادیب کے لیے شہرت کو آپ اس قدر برا کیوں سمجھتے ہیں؟

گارسیا: بنیادی طور پر اس لیے کہ اس سے آپ کی ذاتی زندگی میں مداخلت ہوتی ہے، آپ سے وہ وقت چھن جاتا ہے، جو آپ اپنے کام میں یا دوستوں کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ یوں آپ حقیقی زندگی سے پرے ہو جاتے ہیں۔ ایک مشہور ادیب، جو مسلسل لکھنا چاہے، اسے شہرت سے بچنا چاہیے۔ یہ کہنا کبھی سچ معلوم نہیں ہوتا لیکن میں واقعی چاہتا ہوں کہ میری کتابیں میرے مرنے کے بعد شائع ہوتیں تاکہ مجھے شہرت اور عظیم اور ادیب وغیرہ کے کھلاڑے سے نہ گزرنا پڑتا۔ تاہم مجھے شہرت کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے اس سے سیاسی فائدہ حاصل کیا۔ اس کے علاوہ یہ بہت تکلیف دہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ دن کے چوبیس گھنٹے مشہور ہیں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے کہ "چلو کل تک کے لیے میں مشہور نہیں" یا کوئی بٹن دبایا اور کہہ دیا "کہ لو بھئی میں شہرت سے توبہ کرتا ہوں۔"

سوال: کیا آپ کو "تنہائی کے سو برس" کی غیر معمولی کامیابی کچھ اندازہ تھا؟

گارسیا: مجھے علم تھا کہ یہ کتاب، میری کئی دوسری تحریروں سے زیادہ، میرے دوستوں کو پسند آئے گی لیکن جب میرے ہسپانوی پبلشر نے کہا کہ وہ اس کی آٹھ ہزار جلدیں شائع کرنا چاہتا ہے تو میں حیران ہو گیا، کیونکہ میری دوسری کتاب کبھی سات سو سے زیادہ نہ بکی تھی۔ میں نے اسے کہا کیوں نہ ہاتھ ذرا نرم رکھا جائے۔ لیکن اس نے کہا کہ یہ بہت اچھی کتاب ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ آٹھ ہزار کتابیں مئی اور دسمبر کے درمیان بک جائیں گی۔ ہوا یہ کہ یہ ساری کتابیں صرف بیونس آئرس میں ہی ایک ہفتے کے اندر اندر بک گئیں۔

سوال: کیوں۔ "تنہائی کے سو برس" کیوں چمک اٹھی؟

گارسیا: مجھے ذرا بھی علم نہیں، میں اپنی تحریوں کا انتہائی بڑا ناقد ہوں، ایک بات جو میں نے اکثر سنی یہ ہے کہ یہ جنوبی امریکی لوگوں کی ذاتی زندگیوں کا احوال ہے، ایک کتاب جو اندر سے لکھی گئی۔ اس سے مجھے واقعی بہت حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب میں نے کتاب لکھنی شروع کی تو اس کا عنوان تھا "گھر" میں چاہتا تھا کہ ناول گھر کے اندر پروان چڑھے اور باہر سے آنے والی ہر چیز اس میں آئے کہ اس کا اثر گھر پر کیا ہوا۔ لیکن بعد میں، میں نے "گھر" کا عنوان ترک کر دیا۔ لیکن ایک دفعہ جب کہانی، میکا ندو کے قصبے میں پہنچتی ہے تو پھر وہاں سے باہر نہیں نکلتی۔ یہ اور بات جو میں نے کتاب کے بارے میں سنی یہ ہے کہ ہر قاری کرداروں کو جو چاہے بنا سکتا ہے، اور یوں انہیں اپنے کردار بنا سکتا ہے۔ میں اسے فلم میں نہیں ڈھالنا چاہتا کیونکہ فلم دیکھنے والا چہرہ

دیکھتا ہے، ممکن ہے اس نے وہ چہرہ تصور نہ کیا ہو۔

سوال: کیا اس پر فلم بنانے میں کسی نے دلچسپی ظاہر کی تھی؟

گارسیا: ہاں۔ لیکن میرے ایجنٹ نے ایسی تمام پیشکشوں کو رد کرنے کے لیے دس لاکھ ڈالر معاوضے کا تقاضا کیا اور جب پیشکشیں اس کے قریب پہنچنے لگیں تو اس نے اسے تیس لاکھ ڈالر کر دیا اس کی فلم بنانے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور جب تک میں ایسا ہونے سے روک سکا، میں ضرور کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ قاری اور کتاب کے درمیان ایک ذاتی رشتہ رہے۔

سوال: کیا ہر کتاب فلم کی صورت میں کامیابی سے ڈھالی جا سکتی ہے؟

گارسیا: میرے ذہن میں کوئی ایسی فلم نہیں جس نے کسی اچھے ناول کو چار چاند لگائے ہوں لیکن کئی برے ناولوں سے بہت اچھی فلمیں بنی ہیں۔

سوال: کیا آپ کے دل میں کبھی فلم بنانے کا خیال آیا؟

گارسیا: ہاں ایک وقت تھا جب میں فلم ڈائریکٹر بننا چاہتا تھا روم میں مَیں نے ڈائریکشن کی تعلیم بھی حاصل کی۔ مجھے گمان ہوتا تھا کہ فلم ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے اور جس میں ہر چیز ممکن ہے۔ میں میکسیکو اس لیے آیا کیونکہ میں فلم میں کام کرنا چاہتا تھا۔ ڈائریکٹر کی حیثیت سے نہیں۔ سکرین پلے رائٹر کی حیثیت سے۔!!

لیکن فلم سازی میں ایک بہت بڑی قباحت یہ ہے کہ یہ ایک انڈسٹریل آرٹ ہے جو بات آپ کہنا چاہتے ہیں، اسے فلم میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ میں اب بھی کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ لیکن اب میں اسے دوستوں کیساتھ ایک تفریح کے طور پر، اپنے اظہار کی کسی توقع کے بغیر کرنا چاہوں گا۔ خیر یوں میں فلم سے دور ہوتا گیا۔ اس سے میرا رشتہ اس جوڑے کی طرح ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔ کسی فلم کمپنی یا رسالے کے درمیان فیصلہ کرنا ہو تو میں رسالے کو ترجیح دوں گا۔

سوال: کیوبا کے بارے میں زیر تصنیف کتاب کے بارے میں کیا خیال ہے؟

گارسیا: اصل میں یہ کتاب ایک لمبے اخباری مضمون، جو کیوبا کے گھروں کے بارے میں ہے، کی طرح ہے، کس طرح لوگوں نے وسائل کے بغیر زندہ رہنا سیکھا۔ گذشتہ دو برس میں مَیں جتنی دفعہ بھی کیوبا گیا، مجھے ایک چیز کا احساس ہوا۔ یہ کہ امریکہ کی طرف سے کیوبا کے مقاطع نے ایک طرح ضرورت کا کلچرل پیدا کر دیا ہے۔ ایک سماجی صورت حال جس میں لوگوں نے چند چیزوں کے بغیر رہنا سیکھ لیا ہے۔ جو چیز واقعی دلچسپی کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ مقاطع نے کس طرح

لوگوں کی ذہنیت کو متاثر کیا۔ یہاں پر ایک اینٹی کنزیومر سوسائٹی اور دنیا کی سب سے زیادہ کنزمپشن اورئی اینڈ سوسائٹی کے درمیان مقابلہ ہے۔ کتاب اب اس مرحلے میں ہے کہ میرا یہ خیال کہ یہ ایک سیدھی سادی چھوٹی سی صحافتی تحریر ہوگی غلط ہو گیا ہے، یہ ایک، طویل، پیچ در پیچ کتاب بن گئی ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میری ساری کتابیں ایسی ہی ہیں اور پھر اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ حقیقی کیریبیئن دنیا کے تاریخی حالات،'' تنہائی کے سو برس'' کی طرح ہی فینٹاسٹک ہیں۔

سوال: کیا آپ کے دل میں کوئی دور دراز کی خواہش یا ادیب کی حیثیت سے کوئی ملال ہے؟

گارسیا: میرا خیال ہے اس کا جواب بھی وہی ہے جو میں نے تمہیں شہرت کے سلسلے میں دیا۔ اگلے دن مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا میں نوبیل انعام میں دلچسپی رکھتا ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ میرے لیے مکمل تباہی کا باعث ہوگا۔ یہ تسلیم کیا جانا کہ میں اس کے قابل ہوں صحیح ہے۔ لیکن اس کا ملنا بہت بری بات ہوگا۔ اس سے شہرت کا سارا معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جائے گا۔ زندگی سے مجھے صرف ایک شکایت ہے اور وہ یہ کہ میری کوئی بیٹی نہیں۔

سوال: کیا کسی پراجیکٹ پر آپ بات کرنا چاہیں گے۔

گارسیا: مجھے پختہ یقین ہے کہ میں اپنی زندگی کی عظیم ترین کتاب لکھنے والا ہوں۔ کب - کہاں - کیسے - اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔ جب میں اس طرح سے محسوس کرتا ہوں - اور اب میں یہ کافی عرصے سے محسوس کر رہا ہوں - تو میں بالکل چپ رہتا ہوں۔ تاکہ جب یہ آئے تو اسے گرفت میں لاسکوں۔

☆☆☆

(مشمولہ: ادبِ لطیف''، لاہور، جلد ۴۸، شمارہ ۸۔۷، ۱۹۸۲ء)

گارسیا مارکیز سے مکالمہ

مارلائز سائمنز / راشد مفتی

گیبرئیل گارسیا مارکیز کی نئی تخلیق "وبا کے دنوں میں محبت" (Love in the Time of Crolera) دو ایسے افراد کی کہانی ہے جن کی محبت جوانی میں ناکام رہ کر اس وقت پھلتی پھولتی ہے، جب وہ تقریباً اسّی برس کے ہو جاتے ہیں۔

مارکیز نہ صرف پیدائشی بلکہ ادبی تحریک کے حوالے سے بھی کولمبین ہیں۔ گو وہ عمر کی چھٹی دہائی میں جلد ہی قدم رکھنے والے ہیں لیکن ہمیشہ کی طرح مصروف، توانائی سے بھرپور اور خوش طبع نظر آتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے اوائل میں کولمبیا کی حکومت اور بائیں بازو کے گوریلوں میں مصالحت کرانے کے لیے وہاں بڑے پیانے پر جاری تشدد کی وجہ سے وہ کولمبیا واپس نہیں گئے۔ ان دنوں وہ اور ان کی بیوی مرسیڈزا اپنا وقت میکسیکو سٹی میں گزارتے ہیں (جہاں وہ پچھلے کئی برس سے مستقلاً رہتے ہیں) اور ہوانا آتے جاتے رہتے ہیں جہاں مارکیز نے "فاؤنڈیشن آف نیو لیٹن سنیما" نامی ادارہ کھول رکھا ہے۔ فلم اس انعام یافتہ ادیب کا پرانا شوق ہے اور ٹیلی وژن کے ڈرامائی امکانات بھی انہیں گرویدہ رکھتے ہیں۔

گو عام طور پر انہیں بائیں بازو کی سیاست کا عملی آدمی سمجھا جاتا ہے لیکن دوستوں کے نزدیک وہ فقط ایک ایسے غیر قدامت پسند قصہ گو ہیں، جو جربہ سازی اور عمومیت پسندی پر معترض ہے اور زندگی سے اسی غیر متوقع حکائی انداز میں نمٹنا پسند کرتا ہے جو اس کی اصل ہے۔ حال ہی میں (ستمبر ۱۹۸۸ء) ہم نے ان سے میکسیکو سٹی میں گفتگو کی جو ادب وفن کے دوسرے مسائل کے علاوہ ان کی تازہ تخلیق پر بھی محیط تھی۔ میں نے ان سے ان کی غیر معمولی تخلیق کے بارے میں

پوچھا:

سائنز: آپ نے ابھی ایک ڈرامہ مکمل کیا ہے اور فلموں کی کہانیاں لکھنے کے علاوہ فلموں کا ایک ادارہ بھی چلا رہے ہیں۔ کیا آپ اپنی زندگی کی سمت تبدیل کر رہے ہیں؟

مارکیز: جی نہیں! میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ اسے مکمل کر رہا ہوں کہ ایک اور شروع کر سکوں۔ لیکن اس سے پہلے میں نے اتنے بہت سے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو کبھی اتنا مکمل محسوس نہیں کیا، زندگی کے اتنے عروج پر نہیں پایا۔ میں لکھ رہا ہوں۔ میری چھ مختلف کہانیاں مکمل ہوتی جا رہی ہیں۔ میں سینما فاونڈیشن بھی چلا رہا ہوں اور اس سال میرا ڈراما ارجنٹینا اور برازیل میں دکھایا جائے گا۔ بلاشبہ میں طویل عرصے تک کٹھن حالات سے نبرد آزما رہا ہوں۔ میری زندگی کے ابتدائی چالیس سال اسی کشاکش سے عبارت ہیں۔ میں بے روزگاری کا شکار رہا۔ میں مسائل سے دوچار تھا۔ میں ابھی ادیب یا کچھ اور نہیں بن پایا تھا۔ جذباتی اور نفسیاتی طور پر وہ ایک مشکل دور تھا۔ میں اپنے آپ کو محسوس کرتا تھا میرا کہیں شمار ہی نہیں تھا۔ پھر ''تنہائی کے سو سال'' کے ساتھ ہی حالات بدل گئے، اور اب سارے کام اس طرح چل رہے ہیں کہ مجھے کسی پر تکیہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب بھی مجھے ہر قسم کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ہر صبح مجھے ورزش کے لیے سائیکل چلانی پڑتی ہے۔ میں مستقل طور پر پرہیزی کھانے کھاتا ہوں۔ اپنی نصف زندگی میں جو کچھ کھانا چاہتا تھا غربت کی وجہ سے نہیں کھا سکا اور بقیہ نصف زندگی اس وجہ سے کہ میں پرہیز پر ہوں۔

سائنز: آپ کی تازہ تخلیق ''وبا کے دنوں میں محبت'' میں اسلوب اور موضوع دونوں بہت مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے عشقیہ کہانی لکھی؟

مارکیز: میں سمجھتا ہوں ڈھلتی ہوئی عمر نے مجھے احساس دلایا ہے کہ احساسات اور جذبات ہی۔۔۔ یعنی جو کچھ دل میں ہوتا ہے۔۔۔ سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

لیکن ایک طرح سے میری ساری کتابیں ہی محبت سے متعلق ہیں۔ ''تنہائی کے سو سال'' میں ایک کے بعد ایک عشقیہ داستان ہے۔ ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' محبت کا ایک ہولناک ڈراما ہے، میں سمجھتا ہوں کہ محبت ہر کہیں ہے۔ اس بار یہ زیادہ شدید ہے کیونکہ دو محبتیں مل کے آگے بڑھ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نوعمری میں ''وبا کے دنوں میں محبت'' نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس ناول میں زندگی بھر کا عملی تجربہ ہے۔ بلکہ بہت سے چھوٹے تجربے ہیں۔ اپنے علاوہ دوسروں کے بھی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ایسے نقطہ ہائے نظر ہیں جن سے میں پہلے واقف ہی

نہیں تھا، اس سال میں ساٹھ برس کا ہو جاؤں گا۔ انسان اس عمر کو پہنچ کر ہر معاملے میں زیادہ متین ہو جاتا ہے۔

سائمنز: اور زیادہ فراغ دل بھی، کیونکہ مذکورہ ناول بہت زیادہ عمومی ہے۔

مارکیز: چلی کے ایک پادری نے مجھے بتایا ہے کہ اس سے زیادہ مسیحی کتاب اس نے کبھی نہیں پڑھی۔

سائمنز: اور اسلوب؟ کیا آپ اسے اپنی ابتدائی تخلیقات سے انحراف سمجھتے ہیں؟

مارکیز: میں ہر کتاب میں ایک مختلف راہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ آدمی اسلوب کا انتخاب نہیں کرتا۔ ہاں، غور و فکر سے جاننے کی کوشش کی جا سکتی ہے کہ ایک خاص موضوع کے لیے سب سے بہتر اسلوب کیا ہوگا۔ اسلوب کا تعین موضوع سے ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے مزاج سے ہوتا ہے۔ اگر میں ایسا اسلوب اختیار کروں جو موزوں نہ ہو تو بات نہیں بنے گی۔ نقاد اس پر طرح طرح کے نظریئے پیش کریں گے اور وہ کچھ دیکھ لیں گے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔ میں صرف اپنے لوگوں کے طرزِ زندگی یعنی کریبیئن طرزِ زندگی سے اثر لیتا ہوں۔ آپ میری کوئی کتاب اٹھا لیں۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ کس سطر کے پیچھے کون سی حقیقت یا کون سا واقعہ ہے۔

سائمنز: ''تنہائی کے سو سال'' میں بے خوابی کی وبا تھی اور آپ کی ایک دوسری کہانی میں ایک وبا نے سارے پرندوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ آپ نے ''وبا کے دنوں میں محبت'' لکھی ہے۔ آخر بات کیا ہے، آپ وباؤں میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں؟

مارکیز: گزشتہ صدی کے اختتام پر کارٹاگینا میں واقعی ایک بہت بڑی وبا آئی تھی۔ وباؤں میں میری دلچسپی ہمیشہ سے رہی ہے۔ ''آڈی پس ریکس'' سے ابتدا کرتے ہوئے میں نے وباؤں کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ ڈینیئل ڈیفو کی کتاب ''اے جرنل آف پلیگ'' میری پسندیدہ کتابوں میں ہے۔ وبائیں غیر مادی خطرات کی طرح ہوتی ہے، لوگوں کو اچانک آ لیتی ہیں۔ وباؤں میں تقدیر کی سی خاصیت ہوتی ہے اور یہ بڑے پیمانے پر موت کی مظہر ہوتی ہیں تاہم جو بات مجھے عجیب لگتی ہے، وہ یہ کہ بڑی وباؤں نے ہمیشہ بڑی بے اعتدالیاں پیدا کی ہیں۔ لوگوں کو اور جینے پر اُکسایا ہے۔ وباؤں کی یہی مابعد الطبیعاتی جہت ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں نے دوسرے ادبی حوالوں سے بھی استفادہ کیا ہے جیسے کامیو کی ''دی پلیگ'' ایلیسا نہ رومانزونی کی کتاب ''دی بی ٹروتھڈ'' میں بھی ایک وبا ہی ہے۔ میں ہمیشہ ایسی کتابوں کی تلاش میں رہتا ہوں

جو اس موضوع سے بحث کرتی ہوں جس پر میں لکھ رہا ہوں ۔ میں ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ مشابہت سے بچ سکوں، ان کتابوں سے نقل کرنے کے لیے نہیں بلکہ انہیں کسی نہ کسی طرح کام میں لانے کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ سب لکھنے والے ایسا ہی کرتے ہیں ۔ ہر خیال کے پیچھے ادب کی ہزار سالہ تاریخ ہوتی ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ آدمی ادب میں کہاں کھڑا ہے اور اس کا راستہ کیا ہے، اس بات کو جتنا سمجھا جائے کم ہے۔

سائمنز: ''وبا کے دنوں میں محبت کی تخلیق کس طرح ہوئی ؟

مارکیز: محبت میں اس کے دو ماخذ ہیں جو ایک دوسرے سے مل گئے ہیں ۔ ایک تو میرے ماں باپ کا معاشقہ ہے جو فرمینا ڈازا اور فلورینٹینو ریزا کی جوانی کے معاشقے سے مشابہ ہے۔ میرے باپ اراکاٹاکا (کولمبیا) میں ٹیلی گراف آپریٹر تھے۔ وہ وائلن بجاتے تھے ۔ میری ماں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی خوب صورت لڑکی تھی۔ ماں باپ آزاد خیال ہونے کے باوجود اس رشتے کے اس لیے مخالف تھے کہ میرے باپ ماں غریب تھے ۔ کہانی کا یہ سارا حصہ میرے ماں باپ سے متعلق ہے۔ ان کا اسکول جانا ، خطوط ، نظمیں ، میرے باپ کا راتوں کو وائلن بجانا ، تار کے ذریعے اطلاع ملنے پر میری ماں کا اندرون ملک جانا ۔ یہ ساری باتیں مستند ہیں ۔ ماں کا واپس آنا اور ہر ایک کا یہ سمجھنا کہ وہ میرے باپ کو بھول چکی ہیں ، یہ بھی درست ہے ۔ یہ ساری باتیں اسی طرح ہیں جس طرح میرے ماں باپ نے بتائی ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے ماں باپ کی شادی ہو گئی تھی اور جونہی ان کی شادی ہوئی وہ ادبی شخصیتوں کے طور پر غیر دلچسپ ہو گئے ۔

سائمنز :اور دوسرا ماخذ؟

مارکیز:اس سے پہلے میں نے میکسیکو کے ایک اخبار میں دو معمر امریکیوں کے بارے میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ وہ مرد و زن تھے اور ہر سال اکاپلکو میں ملا کرتے تھے۔ وہ ایک ہوٹل میں قیام کرتے ۔ گو ان کی عمر اسی کے قریب تھی لیکن ان کی آمد و رفت جاری تھی۔ ایک دن وہ کشتی میں سیر کرنے گئے تو کشتی بان نے انہیں لوٹنے کی غرض سے پتوار سے قتل کر دیا۔ اس طرح موت نے ان کے خفیہ رومان کی داستان مشتہر کر دی ۔ مجھ پر اس واقعے کا گہرا اثر ہوا۔ میں ہمیشہ اپنے ماں باپ کی کہانی لکھنے کے بارے میں سوچا کرتا تھا لیکن کہانی کا سرا میرے ہاتھ میں نہیں آتا تھا۔ ادبی تخلیق کے دوران کچھ ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو یکسر ناقابلِ فہم ہوتی ہیں ۔ سو ایک دن یہ دونوں کہانیاں میرے ذہن میں آ گئیں ۔ نوجوانوں کی محبت مجھے ماں باپ سے ملی تھی۔ بوڑھوں کا پیار میں نے معاشرے سے لیا۔

سائمنز: ''تو آپ کی اکثر کہانیوں کی وجہِ تخلیق ذہن میں آنے والا محض ایک عکس ہوتا ہے؟''

مارکیز: سچی بات تو یہ ہے کہ میں کہانی کے لمحۂ تخلیق کو گرفت میں لانے کا اتنا متمنی ہوں کہ میں نے سینما فاؤنڈیشن میں ''ہاؤ ٹو ٹیل اے اسٹوری'' نامی ایک ورکشاپ قائم کی ہے۔ میں نے لاطینی امریکہ کے مختلف ملکوں سے دس طالب علم اکھٹے کیے ہیں۔ ہم ایک گول میز کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور چھ ہفتے تک روزانہ چار گھنٹے کسی خیال کے بغیر کہانی لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم بار بار بحث سے آغاز کرتے ہیں۔ شروع میں صرف اختلافات ہی سامنے آتے تھے۔۔۔ وینزویلا کا طالب علم کچھ کہتا ہے اور ارجنٹائن کا کچھ۔ پھر اچانک ایک خیال ظاہر ہو کر سب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور کہانی کی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اب بھی نہیں جانتے کہ خیال کیسے پیدا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ ہمیں اچانک آلیتا ہے۔ میرے ہاں معاملہ کسی خیال یا تصور سے نہیں بلکہ ہمیشہ عکس سے شروع ہوا ہے۔ ''وبا کے دنوں میں محبت'' کی وجہِ تخلیق کشتی کے تختے پر ناچتے ہوئے کا عکس تھا۔

سائمنز: جب ایک بار کوئی عکس ذہن میں آجائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟

مارکیز: عکس میرے ذہن میں نشو و نما پاتا ہے تاوقتیکہ پوری کہانی اس طرح متشکل ہو جاتی ہے جس طرح حقیقی زندگی میں ہوتی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے آپ سے یہ مشکل ترین سوال پوچھنا پڑتا ہے کہ میں اس سے کیسے اخذ کروں؟ اس کتاب کے لیے موزوں ترین ساخت کیا ہوگی؟ میں ہمیشہ موزوں ساخت کا آرزومند رہا ہوں۔ ادب میں موزوں ترین ساخت کی ایک مثال سوفوکلیز کا ڈراما ''آڈی پس ریکس'' ہے۔ ایک اور مثال انگریز ادیب ولیم جیکبز کی کہانی ''منکیز پا'' ہے۔

جب میں کہانی اور ساخت کے بارے میں مطمئن ہو جاتا ہوں تو لکھنا شروع کرتا ہوں۔ لیکن صرف اس شرط پر کہ مجھے ہر کردار کے لیے موزوں نام مل جائیں۔ کرداروں کو موزوں نام نہ ملیں تو ان میں جان نہیں پڑتی۔ میرا خیال تو یہی ہے۔ میں ایک بار لکھنے بیٹھ جاؤں تو عام طور پر مجھے کوئی تذبذب نہیں ہوتا۔ میں اگلی صبح کام میں لانے کے لیے چند یادداشتیں ایک آدھ لفظ یا فقرے کو تو کہیں استعمال کر سکتا ہوں لیکن ڈھیر ساری یادداشتوں کے ساتھ کام کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ یہ بات میں نے نوعمری ہی میں دریافت کر لی تھی۔ میں ایسے لکھنے والوں کو بھی جانتا ہوں جن کے پاس یادداشتوں سے بھرے پلندے ہیں جو اپنی یادداشتوں ہی کے بارے میں سوچتے رہ جاتے ہیں اور اپنی کتابیں کبھی نہیں لکھ پاتے۔

سائمنز: آپ نے ہمیشہ کہا ہے کہ آپ خود کو صحافی بھی اس قدر سمجھتے ہیں جس قدر فکشن لکھنے والا ادیب۔ کچھ ادیبوں کا خیال ہے کہ صحافت میں دریافت کی مسرت چھاپنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ فکشن میں یہ چیز محض لکھنے سے میسر آتی ہے۔ آپ اتفاق کرتے ہیں؟

مارکیز: مسرتیں تو یقیناً دونوں میں ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں صحافت کو ایک ادبی صنف سمجھتا ہوں۔ دانشور بھلے اتفاق نہ کریں لیکن مجھے اپنی رائے پر اعتماد ہے۔ صحافت فکشن نہ ہوتے ہوئے بھی ایک صنف ہے، اظہارِ حقائق کا ایک ذریعہ ہے۔ گو دونوں کے مواقع مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک تجربے کا سوال ہے وہ صحافت و ادب میں یکساں ہے۔ فکشن میں اگر آپ یہ محسوس کریں کہ کوئی ایسا خیال مل گیا ہے جو آپ کی تحریر میں سما سکتا ہے تو یہ ایسا ہی جذبہ ہے جیسا کوئی صحافی کسی خبر تک پہنچنے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ ایسے لمحے بالکل غیر متوقع طور پر آتے ہیں اور ان کے جلو میں غیر معمولی مسرت ہوتی ہے۔ جس طرح صحافی خبر کی بو سونگھ لیتا ہے بالکل اسی طرح ادیب کو بھی الہام ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات کہ ابھی اسے بنانا سنوارنا ہوتا ہے لیکن وہ جان لیتا ہے کہ کہانی اس کی گرفت میں ہے۔ یہ تقریباً ایک طرح کی جبلت ہے۔ صحافی جان لیتا ہے کہ یہ خبر ہے یا نہیں۔ ادیب جان لیتا ہے کہ یہ ادب ہے یا نہیں، شاعری ہے یا نہیں۔ اس کے بعد لکھنے کا عمل تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ دونوں ایک جیسی بہت سی تکنیکیں استعمال کرتے ہیں۔

سائمنز: لیکن آپ کی صحافت لگے بندھے ضابطوں کی پابندی نہیں کرتی؟

مارکیز: بات یہ ہے کہ میری صحافت معلوماتی نہیں ہوتی، لہٰذا میں اپنی ترجیحات خود متعین کرتا ہوں اور اسی مزاج کو برقرار رکھتا ہوں۔ جو ادب کا خاصا ہے۔ اب یہ میری بدقسمتی ہے کہ لوگ میری صحافت میں یقین نہیں رکھتے، اسے من گھڑت سمجھتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں صحافت میں کچھ گھڑتا ہوں نہ فکشن میں۔ فکشن میں حقیقت کو جوڑنا توڑنا پڑتا ہے کہ فکشن کا مقصد ہی یہ ہے۔ صحافت میں میں اپنے مزاج سے ہم آہنگ موضوع کا انتخاب کر سکتا ہوں کیونکہ اب میں پیشے کے تقاضوں سے آزاد ہوں۔

سائمنز: کیا آپ کو اپنی کوئی ایسی صحافتی تحریر یاد ہے جس سے آپ کو خاص لگاؤ محسوس ہوتا ہو؟

مارکیز: ہاں، جب میں ''ایل ایسکپیڈور'' نامی اخبار میں کام کرتا تھا اس وقت کی ایک چھوٹی سی تحریر ہے۔ ''دی مسٹری آف لاسٹ لیٹرز'' میں بگوٹا میں ٹرام میں جا رہا تھا، یکا یک میری نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر ''ہاؤس آف لاسٹ لیٹرز'' تحریر تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ مجھے بتایا گیا

کہ ایسے تمام خطوط جو غلط پتوں یا کسی اور وجہ سے تقسیم نہ ہو سکتے ہوں اس مکان میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اس مکان میں ایک بوڑھا آدمی رہتا ہے جس نے اپنی ساری زندگی ان خطوط کی درست ترسیل کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ بعض اوقات اسے کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ اگر درست پتہ تلاش نہیں ہو سکتا تھا تو خط جلا دیا جاتا تھا، لیکن کھولا کبھی نہیں جاتا تھا۔ ایک خط پر یہ پتہ درج تھا۔ ''اس عورت کے لیے جو ہر بدھ کی شام پانچ بجے ڈی لاس ارماس چرچ جاتی ہے۔'' سو وہ مردِ ضعیف وہاں گیا۔ اسے سات عورتیں ملیں۔ اس نے باری باری ہر ایک سے استفسار کیا اور جب مطلوبہ عورت مل گئی تو کسی امکانی غلطی سے بچنے کے لیے اس نے عدالت سے حکم لے کر وہ خط کھولا، بہر حال اس کا اندازہ درست نکلا۔ میں یہ تحریر کبھی نہیں بھولوں گا کہ اس میں صحافت اور ادب دونوں کا امتزاج ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں آج تک دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر پاتا ہوں۔

سائمنز: فاونڈیشن کے ذریعے آپ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

مارکیز: میں چاہتا ہوں کہ لاطینی امریکہ میں فنکارانہ ذریعۂ اظہار کی حیثیت سے فلمسازی کی بھی وہی قدر ہو جو ہمارے ادب کی ہے۔ ہمارا ادب اعلیٰ درجے کا ہے لیکن اسے شناخت حاصل کرنے میں بہت وقت لگا ہے۔ بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑی ہے اور بعض اوقات تو یہ مرحلہ اب بھی مشکل ہے۔

سائمنز: بہر حال ادب نے تو اب جڑ پکڑ لی ہے!

مارکیز: آپ کو پتہ ہے اس کا آغاز اس وقت ہوا جب ہم نے مقامی قارئین کو تسخیر کر لیا۔ جب ہماری تحریر لاطینی امریکہ میں پڑھی جانے لگی لیکن ہم نے ہمیشہ اس کے برعکس صورت کو اہم جانا تھا۔ جب ہم کوئی کتاب چھاپتے ہیں تو ہمیں اس کے بکنے کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ ہم تو بس چاہتے تھے کہ اس کا ترجمہ کروالیں۔ گو ہمیں اس کا انجام بھی معلوم ہوتا تھا۔ کتاب کا ترجمہ ہو جاتا تھا اور ماہرین ایک آدھ تنقیدی مضمون لکھ دیتے تھے۔ لیکن کتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یونیورسٹیوں کے ہسپانوی شعبے میں دفن ہو جاتی تھی، بہر حال جب ہم لاطینی امریکہ میں پڑھے جانے لگے تو صورتِ حال یکسر بدل گئی بالکل یہی صورتِ حال فلموں کے ساتھ ہے۔ اب لاطینی امریکہ میں اچھی فلمیں بن رہی ہیں اور یہ کام بہت بڑے سرمائے سے نہیں ہو رہا ہے۔ یہ کام ہم اپنے وسائل اور اپنے طریقوں سے کر رہے ہیں۔ ہماری فلمیں بین الاقوامی میلوں میں دکھائی جا رہی ہیں اور انعامات کے لیے نامزد ہو رہی ہیں۔ لیکن انہیں ابھی سے ہی ناظرین کو گرفت میں لینا ہے۔

مشکل بڑے تقسیم کاروں کے ساتھ ہے۔ انہیں غیر معروف فلموں کے لیے بہت سی رقم لگانی پڑتی ہے جس کے بدلے میں انہیں کچھ نہیں ملتا لیکن جس دن ہماری فلموں نے مالی اعتبار سے کامیابی حاصل کر لی سارا منظر بدل جائے گا۔ یہی کچھ ہم نے ادب میں دیکھا ہے اور آنے والے دنوں میں یہی کچھ فلموں میں دیکھیں گے۔

سائمنز: آپ سیاست کو اتنی اہمیت دیتے ہیں لیکن کتابوں کے ذریعے اپنے سیاسی نظریات کا پرچار نہیں کرتے؟

مارکیز: میں نہیں سمجھتا ہوں کہ ادب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔ لیکن کسی کے نہ چاہنے کے باوجود بھی اس کا نظریاتی موقف اس کی تحریروں سے ناگزیر طور پر منعکس ہو جاتا ہے اور قارئین پر اثر ڈالتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری کتابوں نے لاطینی امریکہ پر اس لحاظ سے سیاسی اثر ڈالا ہے کہ وہ لاطینی امریکہ کا تشخص ابھارتی ہیں اور لاطینی امریکیوں کو اپنی ثقافت سے زیادہ باخبر کرتی ہیں۔ اگلے روز ایک امریکی نے مجھ سے پوچھا کہ سینما فاؤنڈیشن کے پسِ پشت حقیقی سیاسی مقصد کیا ہے۔ میں نے اسے جواب دیا، مسئلہ یہ نہیں کہ اس کے پیچھے کیا مقاصد ہیں، بلکہ یہ کہ اس کے آگے کیا ہے۔ سینما فاؤنڈیشن کا مقصد لاطینی امریکی سینما کے بارے میں آگہی کا فروغ ہے اور یہ مقصد بنیادی طور پر سیاسی ہے۔ بلاشبہ ہمارا منصوبہ صرف فلم سازی سے متعلق ہے لیکن اس کے نتائج سیاسی ہوں گے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ سیاست صرف انتخابات کا نام ہے اور سیاست بس وہی کچھ ہے جو حکومتیں کرتی ہیں لیکن لاطینی امریکہ کا تشخص ابھارنے کے لیے ادب، سینما، مصوری اور موسیقی بھی لازمی ہیں۔

سائمنز: آپ کے نزدیک یہ بات فنکارانہ صلاحیت کو سیاست کی تحویل میں دے دینے سے مختلف ہے؟

مارکیز: میں تو کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ ٹھہریئے، میں آپ کو واضح کر دوں۔ فن ہمیشہ سیاست کی خدمت پر مامور ہوتا ہے اور اس نظریئے یا تصور کی ترجمانی کرتا ہے جو ادیب یا فنکار دنیا کے بارے میں رکھتا ہے لیکن فن کو حکومت کی خدمت پر کبھی مامور نہیں ہونا چاہیے۔

سائمنز: لاطینی امریکہ کے بارے میں آپ کا تصور کیا ہے؟

مارکیز: میں چاہتا ہوں کہ لاطینی امریکہ متحد، خود مختار اور جمہوری ہو۔

سائمنز: یورپی مفہوم میں؟

مارکیز: اس مفہوم میں کہ اس کے مفادات اور نقطہ ہائے نظر ایک ہوں۔

سائمنز: آپ اسی وجہ سے سائمن بولیوار کے متعلق لکھ رہے ہیں؟

مارکیز: نہیں، یہ وجہ نہیں۔ سائمن بولیوار کو میں نے اس لیے موضوع بنایا کہ مجھے اس کی شخصیت سے دلچسپی ہے۔ وہ حقیقت میں کیا تھا، یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ ہیرو کی طرح مقدس ہو گیا ہے۔ میں اسے ایک کریبیئن سمجھتا ہوں جسے رومانیت نے متاثر اور متشکل کیا تھا، ذرا سوچو تو، کس قدر دھماکہ خیز بات ہے لیکن سائمن بولیوار کے خیالات آج کے مسائل سے متعلق ہیں۔ لاطینی امریکہ کے بارے میں اس کا تصور ایک خودمختار اور متحدہ وحدت کا تھا جو اس کے نزدیک دنیا بھر میں سب سے بڑی اور طاقتور بن سکتی تھی۔ اس بارے میں اس کا ایک بہت خوب صورت فقرہ ہے: "ہم اپنی نوعیت کی واحد انسانی نسل ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی شخص تھا لیکن اس کے باوجود عبرت ناک شکست سے دوچار ہوا۔ اسے جن طاقتوں نے نیچا دکھایا وہ آج بھی موجود ہیں یعنی زمیندار اور مقامی روائتی طاقتور گروہ جو اپنے اپنے مفادات اور مراعات کو بچانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اس کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا تھا لیکن اس کا یہ خواب کہ لاطینی امریکہ متحد اور خودمختار ہو، آج بھی زندہ ہے۔ آپ نے غور کیا، میں مختلف الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔ حقیقت میں مجھے سیاسی گفتگو سے نفرت ہے۔ بطور مثال "عوام" جیسے الفاظ! ہمیں مردہ زبان کے خلاف جدوجہد کرنی ہے۔ صرف مارکسیوں کی صورت ہی میں نہیں جنھوں نے زبان کو سب سے زیادہ حنوط کیا ہے، بلکہ آزاد خیالوں کی طرح بھی۔ ایسا ہی ایک اور لفظ "جمہوریت" ہے۔ روسی کہتے ہیں ہم جمہوری ہیں۔ امریکی کہتے ہیں ہم جمہوری ہیں۔ ایلسلواڈور بھی یہی کہتا ہے اور میکسیکو بھی ایک آدھ انتخاب کروالیتا ہے خود کو جمہوری کہنے لگتا ہے۔ ایک اور لفظ "آزادی" ہے۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے معانی بہت محدود ہو گئے ہیں۔ یہ مردہ ہو گئے ہیں۔ یہ اس حقیقت کا اظہار نہیں کرتے جس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میں ہمیشہ ایسے الفاظ کی تلاش کرتا ہوں جو کھوکھلے نہ ہوں۔

آپ کو معلوم ہے میری زندگی میں سب سے بڑی کمی کیا رہی ہے۔ ایسی کمی جس کی تلافی ناممکن ہے یعنی یہ کہ میں ثانوی زبان کی حیثیت سے انگریزی اچھی طرح نہیں بول سکتا۔ کاش میں انگریزی بول سکتا۔۔۔

سائمنز: لکھنے کے بارے میں آپ کا اگلا منصوبہ کیا ہے؟

مارکیز: میں "سائمن بولیوار" کو مکمل کروں گا۔ مجھے چند ماہ اور چاہئیں۔ اس کے بعد میں اپنی آپ بیتی لکھوں گا۔ عام طور پر لوگ آپ بیتی اس وقت لکھتے ہیں جب کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ میں آہستہ آہستہ لکھنا شروع کروں گا اور پھر تادیر لکھتا رہوں گا۔ میری آپ بیتی عام آپ بیتی

نہیں ہوگی۔ ہر بار جب میں چار سو صفحے لکھوں گا تو ایک جلد چھپوا دوں گا جن کی تعداد چھ تک ہو سکتی ہے۔



(مشمولہ: امر بیل، (نوبل کہانی نمبر)، لاہور، جلد ۸، شمارہ ۲۔۳، فروری تا مارچ ۲۰۰۵ء)

آکیرا کرسوا اور گیبرئیل گارسیا مارکیز کے درمیان گفتگو

ترجمہ: راجا ریاض الرحمٰن

فلم کو فنون لطیفہ (Art) میں جگہ دلوانے میں دو نام بڑے اہم ہیں یعنی سویڈن کے فلم ڈائریکٹر انگمار برگمان (Ingmar Bergman) (۲۰۰۷ء۔ ۱۹۱۸ء) اور جاپانی فلم ڈائریکٹر آکیرا کرسوا (Akira Kurorawa) (۱۹۹۸ء۔۱۹۱۰ء) کرسوا نے لاتعداد فلمیں ڈائریکٹ کیں لیکن اس کی اصل شہرت Rashomon (۱۹۵۰ء) کی وجہ سے ہے۔ یہ فلم جاپانی افسانہ نگار Rysnusko Akhtagawa کی اسی عنوان کی کہانی پر مبنی ہے جس میں ایک ہی واقعہ (قتل) تین چار مختلف کرداروں کی زبان سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح اصل حقیقت بیان کے پردے میں چھپ جاتی ہے۔ مصر کے نوبل انعام یافتہ مصنف نجیب محفوظ نے اپنے ناول Marimar کے لیے یہ تکنیک Rashomon ہی سے مستعار لی ہے۔ کرسوا سے مندرجہ ذیل انٹرویو مشہور ناول نگار گیبرئیل گارسیا مارکیز نے ۱۹۹۱ء میں لاس اینجلس ٹائمز کے لیے کیا تھا۔ اس وقت کرسوا کی عمر ۸۱ سال تھی۔ مارکیز سے پاکستانی قارئین بخوبی واقف ہیں۔ One Hundred Years of Solitude سے بھلا کون نا آشنا ہوگا۔

(نوٹ: انٹرویو کا وہ حصہ جس کا تعلق سیاست سے ہے، حذف کر دیا گیا ہے۔)

گیبرئیل گارسیا مارکیز: میں نہیں چاہتا کہ اس گفتگو کو احباب ایک اخباری انٹرویو سمجھیں لیکن مجھے آپ کے اور آپ کے کام کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا بہت تجسس ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ اپنا سکرپٹ کیسے تحریر کرتے ہیں اور یہ دو وجہ سے ہے۔ اول تو یہ کہ میں خود بھی ایک سکرپٹ لکھنے والا ہوں۔ دوم یہ کہ آپ نے کئی ادبی شہ پاروں کو فلمی سکرپٹ میں ڈھالا ہے۔

اگر چہ میں اپنے ناولوں کے فلمی سکرپٹ جو تیار ہو چکے، اس یا آئندہ تیار کیے جائیں گے، خاصا مشکوک ہوں۔

آکیرا کرسوا: جب مجھے کوئی خیال سوجھ جائے جسے میں فلمی سکرپٹ کا روپ دینا چاہتا ہوں تو میں کاغذ پنسل لے کر ہوٹل کے کسی کمرے میں بند ہو جاتا ہوں۔ اس موقع پر مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس خیال کا پلاٹ تا انجام کیسا ہونا چاہیے۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پلاٹ کا آغاز کس سیشن سے کرنا چاہیے تو پھر میں خیال کے فطری بہاؤ پر بھروسہ کرتا ہوں۔

مارکیز: پہلی چیز جو آپ کے دماغ میں آتی ہے، وہ کوئی خیال ہوتا ہے یا تمثال؟

کرسوا: مجھے صحیح علم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ پہلی چیز بکھری ہوئی لاتعداد تمثال ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس جاپان میں عام طور پر سکرپٹ رائٹرز منظر بہ منظر ایک مکمل پلاٹ کا خاکہ تیار کرنے کے بعد اسے تحریر کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ صحیح طریقہ نہیں ہے کیونکہ ہم خدا نہیں ہیں۔

مارکیز: کیا آپ شکیسپیئر، گورکی یا دوستوفسکی کے شہ پاروں کو فلمی سکرپٹ میں منتقل کرتے ہوئے وجدان پر بھروسہ کرتے ہیں؟

کرسوا: وہ فلم ڈائریکٹر جو جز و وقتی یہ کام کرتے ہیں شاید یہ نہیں جانتے کہ ادبی تمثیلوں کو سینمائی تمثیلوں میں منتقل کرنا انتہائی دشوار عمل ہے۔ مثال کے طور پر ایک جاسوسی ناول میں ایک لاش پڑی کے قریب دکھائی گئی ہے۔ ایک نوجوان ڈائریکٹر کا اصرار تھا کہ فلم میں بھی ہو بہو ایسا ہی دکھانا چاہیے لیکن میں نے اسے باور کرایا کہ ایسا ضروری نہیں ہے۔ تم ایسا اس لیے سوچ رہے ہو کہ تم نے یہ جاسوسی ناول پڑھ رکھا ہے لیکن جن لوگوں نے یہ ناول نہیں پڑھا، ان کے لیے جگہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ نوجوان ڈائریکٹر ادب کی طلسماتی طاقت کے زیر اثر یہ بھول گیا تھا کہ سینمائی تمثال کا اظہار مختلف انداز میں ہونا ضروری ہے۔

مارکیز: کیا آپ کو حقیقی زندگی سے کوئی ایسی تمثیل یاد ہے جس کا فلم پر اظہار نا ممکن ہو؟

کرسوا: جی ہاں! ایک قصبہ Llidochi جہاں کانکنی ہو رہی تھی، جہاں میں اپنی نوجوانی کے دنوں میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر اس کی فلم بندی اس لیے کرنا چاہتا تھا کہ اس مقام کی فضا غیر مانوس اور پر کشش تھی لیکن فلمائی گئی تصویریں جلد بازی کا خمیازہ تھیں کیونکہ جو ہم دیکھ رہے تھے، وہ فلم میں منعکس نہ ہو سکی کہ لوگوں کی زندگی بہت خطرے میں ہے اور بچے اور عورتیں ایک کربناک زندگی گزار رہے ہیں۔ جب کوئی ننگی آنکھ سے لینڈ سکیپ کو دیکھتا ہے تو اس میں اپنے جذبات کی آمیزش کرتا ہے لیکن کیمرے کی آنکھ جذبات سے عاری ہوتی ہے۔

مارکیز: حقیقت یہ کہ بہت کم ناول نگار اپنے ناولوں کی فلم بندی سے مطمئن رہے، آپ کا اس حوالے سے کیا تجربہ ہے؟

کرسوا: پہلے ایک سوال پوچھنے کی اجازت دیجیے۔ کیا آپ نے میری فلم ''سرخ ریش'' دیکھی ہے؟

مارکیز: میں نے یہ فلم بیس سال میں چھ مرتبہ دیکھی ہے اور اپنے گھرانے میں اس وقت تک اس کا تذکرہ کرتا رہا جب تک میرے بچے خود اسے دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ آپ کی فلموں میں یہ میری اور میرے خاندان کی پسندیدہ فلم ہے بلکہ سینما تاریخ میں بھی یہ میری پسندیدہ فلم ہے۔

کرسوا: میرے فلمی کیریئر میں ''سرخ ریش'' ایک حوالے کا مقام رکھتی ہے۔ اس سے پہلے کی تمام فلمیں ایک الگ مقام رکھتی ہیں اور بعد کی والی فلمیں الگ۔ یہ فلم میرے ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔

مارکیز: یہ تو ظاہر ہے مزید یہ کہ اس فلم میں دو منظر ایسے ہیں جو آپ کے کل کام کے مقابلے میں شدید کہلائے جا سکتے ہیں۔ ایک عبادت گزار جھینگر والا منظر اور دوسرا ہاسپٹل کے احاطے میں کراٹے کی لڑائی والا۔

کرسوا: ہاں! لیکن میں آپ کو یہ بتلا دینا چاہتا ہوں، ناول کا خالق شوگوار ویا موتو ہمیشہ سے اپنے ناولوں کو فلمائے جانے کا مخالف رہا ہے۔ ''سرخ ریش'' کو اس نے میری وجہ سے مستثنٰی کیا کیونکہ میں ایسا کرنے کے لیے بے رحمی کی حد تک مُصر تھا اور میں اس میں کامیاب ہو گیا لیکن جب وہ فلم دیکھ چکا تو اس نے میری جانب دیکھا اور کہا یہ میرے ناول سے زیادہ دلچسپ ہے۔

مارکیز: اس کی پسندیدگی کی وجہ کیا تھی؟

کرسوا: وہ سینما کی موروثی خصوصیات سے کماحقہ واقف تھا۔ البتہ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ ناول کے مرکزی کردار کی فلم بندی میں بہت احتیاط کی جائے۔ وہ جو ایک مکمل ناکام عورت کی صورت عیاں نہیں تھا۔

مارکیز: میرے خیال میں ایسا ہے کہ کئی دفعہ اپنے ناول پر مبنی فلمیں دیکھ کر ناول نگار کہتے ہیں، میرے ناول کا یہ حصہ بہت اچھا پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ وہ حصہ ہے جو فلم ڈائریکٹر نے اضافے کے طور پر شامل کر دیا ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ درحقیقت یہ ٹکڑا وہ ہوتا ہے جو وہ تحریر کرنا چاہتے تھے لیکن تحریر نہیں کر پائے تھے اور اسے ڈائریکٹر کے وجدان نے اسے سکرین پر لا دکھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر جذبات کا ملغوبہ ہوتے ہیں، آپ کی

موجودہ فلم کی طرف آتے ہیں۔ کیا سمندری طوفان کا فلمانہ دشوار کام ہے؟

کرسوا: نہیں! زیادہ مشکل کام جانوروں کی اداکاری ہے جیسے سمندری سانپ یا گلاب کھانے والی چیونٹیاں، پالتو سانپ لوگوں کے عادی ہوتے ہیں اور انہیں دیکھ کر بھاگتے نہیں ہیں اور بام مچھلی کا سا رویہ رکھتے ہیں۔ اصل مسئلہ بڑے جنگلی سانپ کو گرفت میں لانا تھا جس سے وہ مسلسل فرار ہونے کی کوشش کرتا رہا اور خوفناک بھی تھا لیکن اس نے اپنا ناول اچھی طرح نبھالیا جہاں تک چیونٹیوں کا تعلق ہے، اصل مسئلہ وہ تھا گلاب کی جھاڑیوں پر ایک قطار میں اوپر چڑھنا۔ یہ اس کام کے لیے تیار نہ تھیں، یہاں تک کہ ہم نے جھاڑی کے پورے تنے پر شہد کا چھڑکاؤ کیا تب جا کر کامیابی ہوئی۔ دشواریاں بہت تھیں لیکن ہم نے ان سے سیکھا بہت کچھ۔



(مشمولہ: فنون، لاہور، شمارہ نمبر ۱۳۲، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء)

''ادب بڑھئی گری سے زیادہ کچھ نہیں۔!''

پیٹر ایچ اسٹون/ قاسم ندیم

''تنہائی کے سو سال'' کو جب میں نے پہلی بار لکھا تو اسے میں نے کہانی ہی کہا تھا مگر اس کہانی سے میں مطمئن نہیں تھا''

(مارکیز)

مارکیز کہتے ہیں: جب بوگوٹا میں ''ایپک ناڈور'' میں کام کر رہا تھا۔ اس وقت میں عام طور پر ایک ہفتے میں دو تین کہانیاں تحریر کر لیتا تھا۔ ہر روز تین اداریے قلم بند کر لیا کرتا تھا اور فلموں پر تبصرے کا کام تو تھا ہی۔ رات کو جب سب چلے جاتے تھے۔ اپنا ناول مکمل کرنے میں جت جاتا تھا۔ ٹائپ رائٹر جب خاموش ہو جاتا تو سناٹا مجھے نگل نہیں پاتا تھا۔ اور میں لکھ نہیں پاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں آج کل بہت کم ہوتا ہے۔--- اچھے خاصے کام کے دنوں میں صبح نو سے دوپہر تین بجے تک کام کر کے شاید--- بہت ہوا تو چار یا پانچ سطروں کا ایک پیراگراف پورا کرتا ہوں۔ اور دوسرے دن اکثر اسے پھاڑ دیتا ہوں۔

یقیناً ایسا ہوتا ہے اور ایک بڑے لکھنے والے کے ساتھ تو اکثر ہوتا ہے۔ پیٹر اسٹون کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے مارکیز کی یہ گفتگو اس کی ذاتی زندگی اور فنی باریکیوں سے آگہی دیتی ہے۔ قاسم ندیم نے انتہائی رواں طریقے سے اس کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔

☆☆☆

پیٹر ایچ اسٹون: ٹیپ ریکارڈ کا استعمال آپ کو کیسا لگتا ہے؟

گارسیا مارکیز: جیسے ہی پتہ چلتا ہے کہ انٹرویو ٹیپ کیا جارہا ہے اسی وقت انٹرویو دینے والے کا اندازِ تکلم بدل جاتا ہے۔ میرے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ میں فوراً سنبھل جاتا ہوں اور اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میرا خیال ہے ایک صحافی کے طور پر انٹرویو ٹیپ کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر کا استعمال کس طرح کیا جائے اس کی ہمیں مکمل جانکاری نہیں ہے۔ میرا تو یہ ماننا ہے کہ سب سے آسان طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ صحافی تفصیلی گفتگو کرے۔ اس کے بعد اس نے جس طرح سمجھا یا محسوس کیا ہے اسے لفظی جامہ پہنا کر قلمبند کر لے۔ ٹیپ ریکارڈر دورانِ گفتگو عدم دلچسپی کا سبب بھی بن جاتا ہے کیونکہ وہ انٹرویو دینے والے کی بے خیالی اور گھبراہٹ کے لمحات کو بھی ریکارڈ کر لیتا ہے اور بعد میں اس کی یاد بھی دلا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے میں جب بھی ٹیپ ریکارڈر کو دیکھتا ہوں تو فوراً ہوشیار ہو جاتا ہوں کہ مجھے انٹرویو میں شریک ہونا ہے۔ اور جہاں ٹیپ ریکارڈر کا استعمال نہیں کیا جاتا وہاں میں کھل کر اپنی دھن میں گفتگو کرتا ہوں۔ آپ کے سوال سے میں جھجک رہا ہوں کہ آپ اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ بات چیت کے دوران اس کی ضرورت ہے۔

پٹیر ایچ اسٹون: کچھ بھی ہو، میرا اتنا کچھ کہنے کا اصل مقصد آپ کو مطمئن کرنا تھا۔ کیا آپ نے خود کسی انٹرویو کے دوران ٹیپ ریکارڈ استعمال کیا؟

گارسیا مارکیز: ایک صحافی کے طور پر کبھی نہیں۔ میرے پاس ایک بہترین ٹیپ ریکارڈر ہے۔ میں اس سے محض گیت سنتا ہوں۔ مگر بطورِ صحافی میں نے کوئی انٹرویو ریکارڈ نہیں کیا۔

پٹیر ایچ اسٹون: مگر ایک شکستہ کشتی کے ملاح سے ایک بے حد اہم گفتگو کی بات میں نے سنی ہے۔

گارسیا مارکیز: وہ گفتگو سوال و جواب کے روپ میں نہیں تھی۔ ملاح نے مجھے اپنے کارناموں کے بارے میں بتایا تھا۔ ان واقعات کو گفتگو کے انداز میں میں نے قلمبند کیا تھا۔ اخبار میں وہ تخلیق دو ہفتوں تک سلسلہ وار شائع ہوئی تھی۔ تب اس تخلیق پر اسی ملاح نے دستخط کیے تھے، میں نے نہیں۔ تقریباً بیس سال بعد اس کی دوبارہ اشاعت ہوئی۔ قارئین نے محسوس کیا کہ یہ میری تخلیق ہے تب تک میں نے ''تنہائی کے سو سال'' ختم نہیں کیا تھا۔

پٹیر ایچ اسٹون: چونکہ ہم نے صحافت کو لے کر بات چیت شروع کی تھی اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے۔۔۔۔۔۔۔۔ اتنے دنوں تک ناول لکھنے کے بعد دوبارہ صحافی بن کر کام کرنا آپ کو کیسا لگے گا؟ کیا اب آپ کی سوچ اور نظریے میں فرق آ سکتا ہے؟

گارسیا مارکیز: میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ صحافت میرا اصل پیشہ ہے۔ صحافت کی جو باتیں پہلے میں پسند کرتا تھا وہ ہے کام کی حالت۔ دراصل ایک ناول نگار کی حیثیت سے مجھے جو پسند ہے اور میری فکر کے مطابق ہے، اسی موضوع کا ہی انتخاب کرسکتا ہوں۔ کچھ بھی ہو صحافت کے لیے میں ہمیشہ بے چین رہتا ہوں۔

پٹیر ایچ اسٹون: آپ کی رائے میں سب سے اہم صحافتی تخلیقات کون سی ہیں؟

گارسیا مارکیز: ''جان ہیر سایو ہیروشیما'' ایک بے مثال تخلیق ہے۔

پٹیر ایچ اسٹون: فی الحال آپ کس واقعہ کے بارے میں سوچ رہے ہیں جس پر بطور خاص آپ لکھنا چاہتے ہیں؟

گارسیا مارکیز: بے شمار موضوعات ہیں۔ دراصل میں نے لکھا بھی بہت ہے۔ پرتگال، کیوبا، انگولا، ویت نام کے بارے میں بھی میں نے لکھا ہے۔ پولینڈ کے بارے میں لکھنے کی آرزو ہے۔ میرا خیال ہے جو کچھ وہاں ہو رہا ہے اس کی حقیقی منظرکشی میں کرسکوں تو بے حد اہم دستاویز ہوگی۔ مگر پولینڈ میں ابھی شدید سردی کا موسم ہے اور میں ایک آرام پسند صحافی ہوں۔

پٹیر ایچ اسٹون: کیا آپ سوچتے ہیں کہ جو صحافت میں ممکن نہیں ہے وہ ناول میں تحریر کرنا ممکن ہے؟

گارسیا مارکیز: نہیں، مجھے نہیں لگتا کہ دونوں میں کوئی فرق ہے۔ موضوعات اور ذرائع دونوں میں یکساں ہیں۔ زبان و بیان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ڈینیل ڈی فو کا'' داجرنل آف دا پلیگ ائیر'' ایک مشہور ناول ہے اور ''ہیروشیما'' صحافت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

پٹیر ایچ اسٹون: تخیل اور حقیقت کے درمیان توازن رکھنے میں ایک صحافی اور ایک ناول نگار کے فرائض کیا علیحدہ ہوتے ہیں؟

گارسیا مارکیز: صحافت میں لغو بیانی پوری تخلیق کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کے برخلاف تخیلی کہانی میں ایمانداری ہی پوری تخلیق کو علیحدہ شناخت عطا کرتی ہے۔ صرف یہی ایک فرق ہے۔ ایک ناول نگار بذاتِ خود جو کچھ سوچتا ہے اگر اسے وہ قابلِ اعتماد بنا کر پیش کرسکے تو وہ بے حد اہم ہوتا ہے۔

پٹیر ایچ اسٹون: کئی سال پہلے کی بات چیت میں، آپ جب صحافی تھے اس وقت جتنی تیزی سے لکھ سکتے تھے، اسے یاد کر کے کیا آپ کو ڈر لگتا ہے؟

گارسیا مارکیز: صحافت اور ناول نگاری اب مجھے مشکل ترین کام لگتا ہے۔ میں جب اخبار

میں کام کرتا تھا لکھتے وقت جن لفظوں کا استعمال کرتا تھا ان کے بارے میں سوچتا نہیں تھا۔ مگر اب سوچتا ہوں۔ جب بوگوٹا میں ''امپیکٹ ناڈور'' میں کام کر رہا تھا اس وقت میں عام طور پر ایک ہفتے میں دو تین کہانیاں تحریر کر لیتا تھا۔ ہر روز تین اداریے قلمبند کر لیا کرتا تھا اور فلموں پر تبصرے کا کام تو تھا ہی۔ رات کو جب سب چلے جاتے تھے، اپنا ناول مکمل کرنے میں جٹ جاتا تھا۔ منی ٹائپ رائٹر جب خاموش ہو جاتا تو سناٹا مجھے نگل نہیں پاتا تھا۔ اور میں لکھ نہیں پاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں آج کل بہت کم ہوتا ہے۔ اچھے خاصے کام کے دنوں میں صبح نو سے دوپہر تین بجے تک کام کر کے شاید۔۔۔۔ بہت ہوا تو چار یا پانچ سطروں کا ایک پیراگراف پورا کرتا ہوں اور دوسرے دن اکثر اسے پھاڑ دیتا ہوں۔

پیٹر ایچ اسٹون: آپ میں یہ تبدیلی کس طرح رونما ہوئی؟ آپ کی مشہور تخلیقات کے سبب یا یہ کسی طرح کی سیاسی مقابلہ آرائی کا سبب ہے؟

گارسیا مارکیز: دونوں سے ہی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بہت زیادہ لوگوں کے لیے لکھ رہا ہوں جو کہ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ اس خیال سے ہی ایک ذمہ داری کا احساس اُجاگر ہوا جو ادب اور سیاست دونوں سے ہی جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خودداری سے بھی جڑا ہوا ہے۔ پہلے کے کام کے مقابلے میں آج کا کام غیر معیاری ہو، ایسا میں نہیں چاہتا۔

پیٹر ایچ اسٹون: آپ نے لکھنا کیسے شروع کیا؟

گارسیا مارکیز: مصوری، یعنی کارٹون سے۔ پڑھنا لکھنا سیکھنے سے پہلے ہی میں طرح طرح کے کارٹون بناتا تھا۔ اسکول میں، گھر میں بھی، مزید بات یہ ہے کہ میں اب سمجھ پاتا ہوں کہ جب میں اسکول میں تھا تبھی مصنف کے طور پر مشہور ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں نے اس وقت تک کچھ نہیں لکھا تھا۔ اگر کوئی پمفلٹ یا درخواست لکھنے کا کام ہوتا تو مجھے ہی وہ کام سونپ دیا جاتا تھا۔ کیونکہ مجھے مصنف مانا جاتا تھا۔ میں نے جب کالج میں داخلہ لیا تب میرے اندر، اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ ادب کی پرکھ تھی۔ بوگوٹا یونیورسٹی، میں میرے کئی نئے دوست بنے۔ انہوں نے ہی ہم عصر ادب سے مجھے متعارف کروایا۔ ایک رات میرے ایک دوست نے مجھے فرانز کافکا کے افسانوں کا مجموعہ مطالعے کے لیے دیا۔ ''میٹا مارفیسس'' کا مطالعہ شروع کیا تو اس کی پہلی سطر نے ہی مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی پہلی سطر کچھ اس طرح تھی۔

''دوسرے دن صبح گریگری سامسا، نے بے چین خوابیدہ حالت سے جاگ کر خود کو بستر کے اوپر پڑا ہوا ایک بہت بڑا کیڑا محسوس کیا۔'' اس سطر کو پڑھنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ میں ابھی

تک ایسے کسی تخلیق کار کو نہیں جانتا جو اس طرح لکھ سکتا ہے۔اس طرح کی تخلیقات سے اگر میں پہلے ہی متعارف ہوتا تو میں بہت پہلے ہی لکھنا شروع کر دیتا۔ وہ افسانے مکمل طور پر انٹلیکچوئل افسانے تھے، کیونکہ میں اپنے تجربات کی بنیاد پر لکھتا تھا، ادب اور زندگی کے مابین جو ربط ہوتا ہے اسے کبھی تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ میری کہانیاں بوگوٹا کے ایل ایس پیکٹاڈور اخبار کے ادبی صفحے پر شائع ہوتی تھیں۔ان کہانیوں کو کافی سراہا گیا۔شاید اس لیے کہ اس وقت کولمبیا میں کوئی انٹلیکچوئل کہانی نہیں لکھتا تھا۔اس وقت جو لکھا جاتا تھا وہ دیہی زندگی یا سماجی زندگی کو مدِ نظر رکھ کر لکھا جاتا تھا۔میں نے جب کہانیاں لکھیں تو انہیں جوائس سے متاثر مانا گیا۔

پیٹر ایچ اسٹون: آپ نے جوائس کو پڑھا تھا؟

گارسیا مارکیز:اس وقت تک میں نے جوائس کو نہیں پڑھا تھا۔اسی لیے میں نے یولیسس، پڑھنا شروع کیا۔اس وقت صرف اسپینی زبان میں یہ موجود تھا، میں نے اس کا مطالعہ کیا۔اس کے بعد انگریزی اور فرانسیسی میں 'یولیسس' کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ اسپینی میں جو ترجمہ کیا گیا تھا وہ بے حد کمزور تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔اظہارِ ذات کی مہارت حاصل کی ،جو میری تخلیقات کے لیے از حد ضروری تھی۔ بعد میں میں نے جوائس سے بہتر انداز میں ''ورجینیا وولف'' کو قلمبند کرتے ہوئے استعمال کیا تھا۔

پیٹر ایچ اسٹون:ابتدا میں کن تخلیق کاروں سے واقعی متاثر رہے؟ چند ایک کے بارے میں بتائیے؟

گارسیا مارکیز:جن تخلیق کاروں نے واقعی مجھے انٹلیکچوئل کہانی لکھنے کے لیے اکسایا وہ سبھی امریکہ کے بھولے بسرے ادیب ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ادب میں زندگی کی زیریں لہریں موجود تھیں جو میری کہانی میں مفقود تھیں۔اس کے بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا جو اہمیت کا حامل تھا۔۹ اپریل ۱۹۴۸ء کو بوگوٹا میں ایک سیاسی رہنما ''نیتان'' کو گولی ماردی گئی تو وہاں کے عوام نے سڑک پر جمع ہو کر چیخنا شروع کیا۔اس واقعہ کی جب مجھے خبر ہوئی اس وقت پین سن میں میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں دوڑ کر جائے وقوعہ پر پہنچا، اسی وقت نیتان کو ٹیکسی کے ذریعے ہسپتال لے جایا گیا تھا۔لوٹتے وقت میں نے دیکھا تو لوگ احتجاجی مظاہرے کر رہے تھے۔ دکانیں لوٹنا، گھر جلانا وغیرہ۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا میں کس ملک میں رہ رہا ہوں؟ اور میری کہانیوں کے ساتھ اس سے کتنی مطابقت ہے اس بارے میں میں اس دن دوپہر میں ہی جان سکا۔ بعد میں میں کیریبین جانے پر مجبور ہوا۔ جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ میں نے محسوس کیا

کہ اسی زندگی کا میں عادی ہوں۔ اور اپنی تحریر میں بھی اسے ہی تھام کر رکھنا چاہتا ہوں۔
۱۹۵۰-۵۱ء میں مزید ایک واقعہ رونما ہوا، جس نے میرے ادبی رجحان کو متاثر کیا۔ میری ماں نے مجھے اپنے ساتھ ''آرا کاٹکا'' چلنے اور گھر فروخت کرنے کا مشورہ دیا۔ ''آرا کاٹکا'' میں میں پیدا ہوا تھا اور اس گھر میں بچپن کے چند سال بتائے تھے۔ ''آرا کاٹکا'' کے گھر میں میں داخل ہو کر حیرت زدہ رہ گیا تھا کیونکہ اس وقت میں بائیس سالہ نوجوان تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں میں نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا، تب سے کبھی بھی یہاں نہیں آیا تھا۔ مجھے لگا کہ اس گھر کا لفظی خاکہ ذہن میں تیار کرنا ہے۔ ہر ایک نظریے سے مکان، کمروں، لوگ، یادیں سب کچھ ادب میں ظاہر کیا جا چکا ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اس دوران میں نے ''فاکنر'' کو پڑھا تھا یا نہیں۔ مگر فاکنر کی جو تجرباتی مہارت میں نے دیکھی اس کے بعد میں مطمئن تھا کہ وہ میری تحریر کو نئی سمت عطا کرے گا۔ جیسا کہ فاکنر نے میری مدد کی ہے، کیونکہ اس سے مجھے ادبی قدر و منزل عطا ہوئی ہے۔ اسی طرح صحافت نے کہانی لکھنے میں میری مدد کی ہے کیونکہ اس کے ذریعے میں سچائی سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے عمل پیرا ہوں۔

پٹیر ایچ اسٹون: 'لیف اسٹرم' سے تنہائی کے سو سال لکھنے تک جس اسٹائل کو آپ نے دھیرے دھیرے فروغ دیا اس کی توضیح آپ کس طرح کریں گے؟

گارسیا مارکیز: میں نے طے کیا تھا کہ 'لیف اسٹرم'' لکھنے کے بعد اپنے گاؤں اور بچپن کو لے کر ہی لکھوں گا۔ ملک کے سیاسی حقائق کا سامنا کرنا یا اسے کہانیوں میں ڈھالنا ایک طرح کی آزادی تھی۔ میرے دل میں ایک غلط نظریہ قائم تھا کہ جو سیاسی حالات رونما ہو رہے ہیں ان کا سامنا کر کے میں نے خود کو محدود کر لیا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ادب اور سیاست سے متعلق بحث ہو رہی تھی۔ میں نے دونوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ فاکنر سے پہلے ''وُلف'' نے مجھے متاثر کیا اور اب ہیمنگوے نے بھی۔ میری ان تخلیقات کا محور ایک دوسرا گاؤں ہے۔ یہ ایک ایسا گاؤں ہے جہاں جادو نہیں ہے۔ یہ ہے صحافتی ادب مگر جیسے ہی میرا ناول ''ڈی ایول آور ''، مکمل ہوا میں نے پھر تحقیق کی، نتیجہ یہ نکلا کہ میری سوچ غلط ہے۔ میرے بچپن سے متعلق لکھی گئی تخلیقات بے حد سیاسی بن گئی ہیں۔ میں نے جس سنجیدگی سے سوچا ہے اس سے بھی زیادہ ملک کے حقائق پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ''دی ایول آور'' کے بعد تقریباً پانچ سال تک میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ میرے ذہن میں پنپتا رہتا تھا اور اس سے متعلق میں مطمئن نہیں تھا۔ ایک دن اچانک میں نے اس گُر کو کھوج لیا جس کا استعمال میں نے ''تنہائی کے

سو سال'' کے اوراق میں کیا ہے۔ بالکل دادی کے کہانی سنانے والے انداز میں میں نے یہ کہانی لکھی ہے۔ دادی کی کہانی میں ایک عجیب سا مقصد پوشیدہ رہتا تھا۔ حالانکہ وہ اسے پوری طرح حقیقی روپ دیتی تھیں۔ ان اٹھارہ مہینوں تک اسے بلا ناغہ لکھتا رہا۔

پٹیر ایچ اسٹون: دادی کس طرح کی عجیب وغریب کہانیاں سناتی تھیں؟

گارسیا مارکیز: کہانی سناتے وقت دادی کا ہوء بھاؤ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ وہ کہانی سناتے وقت اپنے چہرے کو پر تاثر بنا لیتی تھیں۔ سبھی کو حیرت ہوتی تھی۔ ''تنہائی کے سو سال'' کو جب میں نے پہلی بار لکھا تو اسے میں نے کہانی ہی کہا تھا مگر اس کہانی سے میں مطمئن نہیں تھا۔ کیوں کہ دادی نے جس انداز سے کہانی سنائی تھی، اس کی میں پوری طرح عکاسی نہیں کر سکا تھا۔ تب میں نے طے کیا کہ اس انداز میں پوری طرح عکاسی کرنے کے بعد ہی میں اسے لکھوں گا۔

پٹیر ایچ اسٹون: لگتا ہے اس حالت میں یا اس کیفیت کو پانے میں آپ کی صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ اتنی باریک بینی سے عجیب وغریب واقعات کی عکاسی کرتے ہیں کہ وہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں؟

گارسیا مارکیز: یہ صحافت کا ہی کمال ہے، جس کا استعمال ادب میں بھی کیا جاتا ہے۔ مان لیجیے آپ نے کہا: ''ایسا ہاتھی بھی ہے جو آسمان میں اڑتا ہے،'' لوگ آپ کی بات پر یقین نہیں کریں گے۔ اگر آپ نے کہا: ''آسمان پر ۴۲۵ ہاتھی رہتے ہیں'' تو لوگ یقین بھی کر سکتے ہیں۔ ''تنہائی کے سو سال'' اس طرح کے واقعات سے پُر ہے۔ دادی اسی طرز کا استعمال کرتی تھیں۔ مجھے اس کہانی کی یاد آتی ہے جس میں ایک کردار ہمیشہ پیلی تتلیوں سے گھرا رہتا تھا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا، ایک الیکٹریشن ہمارے گھر آتا تھا۔ میرے دل میں اس کے بارے میں ہمیشہ تجسس رہتا تھا، کیونکہ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے تختے والا جھولا لاتا تھا جس کے سہارے وہ بجلی کے کھمبے پر لٹک جاتا تھا اور ہوا میں تیرتا رہتا تھا۔ دادی بتاتیں کہ وہ جب بھی گھر کے آس پاس آتا تو اپنے گھر لوٹتے وقت تتلیوں کا ایک جھنڈ چھوڑ جاتا تھا۔ میں جب اس کہانی کو لکھنے لگا تو مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں یہ نہ کہوں کہ تتلیوں کا رنگ پیلا تھا تو لوگ یقین نہیں کریں گے۔ ''ریمی دی یودی بیوٹی'' کے جنت جانے کے بارے میں جب لکھ رہا تھا تو کہانی کو قابلِ اعتماد بنانے کے لیے کافی دقت آ رہی تھی۔ میں ایک دن باغیچے میں گیا، دیکھا، ہمارے گھر دھونے کی ملازمہ دھوپ میں چادر سکھانے کے لیے اسے پھیلا رہی ہے۔ اس وقت بہت تیز ہوا چل رہی تھی اور وہ عورت ہوا سے باتیں کر رہی تھی کہ وہ چادروں کو اڑا کر نہ لے جائے۔ میں نے محسوس کیا ''ریمی دی یودی بیوٹی''

کے بدلے اگر میں چادروں کا استعمال کروں تو جنت کی حقیقت کا رنگ بھر سکتا ہے اور کہانی کو پر اعتماد بنایا جا سکتا ہے اور مہارت کو بروئے کار لا کر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

پٹیر ایچ اسٹون: تنہائی کے سو سال میں ــــــ

گارسیا مارکیز: اوڈیس سے شروع ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ وبائی امراض کے بارے میں غور وفکر کرتا تھا۔ زمانہ وسطی میں جو وبائیں پھیلی تھیں میں نے ان کے بارے میں کافی مطالعہ کیا۔ ڈینئیل ڈفو کی کتاب ''دی پلیگ ائیرس'' میری پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے۔ ڈفو کو پسند کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہے وہ ایک ایسے صحافی ہیں جن کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے پورے واقعات ہماری نظروں میں سما جاتے ہیں۔ بہت دنوں تک میں سوچتا تھا کہ ڈفو نے لندن میں پھیلنے والے پلیگ کو جیسا دیکھا ہو گا ویسا ہی لکھ ڈالا ہو گا۔ مگر بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ محض ایک ناول ہے۔ کیونکہ لندن میں جب پلیگ پھیلا تھا اس وقت ڈفو کی عمر سات سال کی تھی۔ وبا کے بارے میں، میں نے بیسیوں بار سوچا۔ ''ایول آور'' میں پمفلٹ ہی وبا ہے۔ برسوں تک میں سوچتا رہا کہ کولمبیا کے سیاسی حالات کس وبا سے کم نہیں ہیں۔ ''تنہائی کے سو سال'' سے قبل میں نے ''دی نیئر آفٹر'' کہانی میں تمام پرندوں کے ختم ہو جانے کے لیے ''وبا'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ''تنہائی کے سو سال ــــ'' میں بے خوابی کی وبا کا لفظ میں نے غور وفکر کے بعد استعمال کیا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ ''نیند کی وبا'' کی ضد ہے۔ اصل میں ادب بڑھئی گری سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

پٹیر ایچ اسٹون: اس کو اگر مزید وضاحت سے پیش کریں تو بہتر ہو گا۔

گارسیا مارکیز: دونوں ہی مشکل ترین کام ہیں۔ لکھنے کا معاملہ ایک میز بنانے کے جیسا ہے۔ دونوں ہی عوامل حقیقی ہیں۔ میز تیار کرنے میں لکڑی کو تراشنا پڑتا ہے، چھیلنا پڑتا ہے۔ دونوں ہی کاموں میں چالاکی اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سخت محنت درکار ہوتی ہے۔ میں ایسا سمجھتا ہوں اور کہتا بھی رہتا ہوں۔ میں نے خود کبھی بڑھئی کا کام نہیں کیا پھر بھی اس کام کو ہی میں سب سے زیادہ اعتقاد بھری نظر سے دیکھتا ہوں۔ کیونکہ اپنے لیے کام کرنے والے کبھی نہیں ملتے۔

پٹیر ایچ اسٹون: ''تنہائی کے سو سال'' میں آپ نے پھلوں میں کیلے کے معاملے کو اٹھایا ہے۔ یونائیٹڈ فوڈ کمپنی کے کام کاج سے یہ معاملہ کتنا بڑا ہوا ہے۔''

گارسیا مارکیز: کیلے کے بارے میں جن واقعات کی میں نے عکاسی کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ جو واقعات تاریخی اعتبار سے منظور شدہ نہیں ہیں ان پر کئی تجربات کرنے پڑے۔ جیسے اسکوائر میں قتل عام ہوا تھا وہ پوری طرح سچ ہے۔ مگر دستاویزوں کو بنیاد بنا کر جب میں نے اس

موضوع پر لکھنا چاہا اس وقت حقیقی طور پر کتنے لوگ مارے گئے تھے اس کا پتہ نہیں چلا۔ میں نے جو تعداد لکھی وہ تین سو تھی جو بڑھا چڑھا کر لکھی گئی تھی۔ مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد تھا کہ کیلوں سے لدی ہوئی ایک لمبی ٹرین اسٹیشن سے آگے چلی جارہی ہے، جسے میں دیر تک دیکھتا رہا۔ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے اس میں تین سو لاشیں لدی ہوئی ہوں۔ جنہیں سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ آج کل ایوان میں اور اخبارات میں تین سو انسانوں کی موت کے بارے میں بحث کس قدر نارمل انداز سے ہوتی ہے۔ یہ واقعی تعجب کا باعث ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہماری نصف تاریخ اسی ڈھرے پر لکھی گئی ہے۔ ''دی ایٹم آف پیٹریا ٹک'' کا تانا شاہ کہتا ہے'' معاملہ اس پل سچ ہے یا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مستقبل میں کسی وقت یہ سچ ہو جائے گا۔ عام آدمی اقتدار کے بجائے ادیبوں پر زیادہ اعتماد کرتا ہے۔

پٹیر ایچ اسٹون: اس سے ادیبوں کو زیادہ قوت ملتی ہے، ہے ناں؟

گارسیا مارکیز: ہاں اور یہ محسوس بھی کرسکتا ہوں۔ اس سے احساس ذمہ داری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دراصل میری تمنا رہی ہے کہ ایسی صحافت سے وابستہ رہوں جو حقیقت پر مبنی ہو مگر سننے میں پریوں کی کہانی جیسی لگے۔ جتنے دن بیت رہے ہیں اتنے ہی پرانے دنوں کی یاد آرہی ہے۔ اسی قدر یہ خیال دل میں جڑ پکڑتا جارہا ہے کہ ادب اور صحافت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

پٹیر ایچ اسٹون: ''دی ایٹم آف دی پیٹریا ٹک'' میں ایک ملک اپنا ارض وصول کرنے کے لیے سمندر پر دعویٰ کرتا ہے۔ اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

گارسیا مارکیز: ہاں، ایسا واقعہ ہوا تھا۔ یہ ہوا تھا اور کئی بار ہوگا۔ ''دی ایٹم آف دی پیٹریا'' ایک مکمل تاریخی کتاب لے۔ حقیقی واقعات سے ممکنات کی تخلیق کرنا ہی ناول نگار کا کام ہے۔ ایک مستقبل جاننے والے کا کام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ بہت سے لوگ یہ مانتے ہیں کہ میں تخلیقی کہانی کار ہوں۔ حقیقتاً میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں جو محسوس کرتا ہوں ان حقائق کو تحریر کے ذریعے ظاہر کرتا ہوں۔

پٹیر ایچ اسٹون: ادب اور صحافت کے رشتے سے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں؟

گارسیا مارکیز: ادیب کی تنہائی ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہے۔ ادیب کی سچائیوں کو وہ نئی شکل عطا کرتی ہے۔ سچائیوں کو پیش کرتے ہوئے ادیب بالکل تنہا رہ جاتا ہے۔ ریت کے محل میں بود و باش اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے برخلاف صحافت ایک نہایت ہی عمدہ کام ہے اسی لیے

میں نے ہمیشہ ہی صحافت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ وہ مجھے زندگی کے ساتھ بطورِ خاص سیاسی حالات سے باخبر رکھتی ہے۔ ''تنہائی کے سو سال'' مکمل کرنے کے بعد جس اکیلے پن کے لیے میں خوف زدہ تھا، وہ ادیب کا اکیلا پن نہیں ہے۔ بلکہ ایک انسان کا اکیلا پن ہے۔ جو اقتدار کے اکیلے پن سے بے حد ملتا جلتا ہے۔ میرے دوستوں نے اس سے مجھے محفوظ رکھا۔

پیٹر ایچ اسٹون: کس طرح؟

گارسیا مارکیز: میں زندگی بھر ایک دوست کے ساتھ دوستی قائم کرنے پر قادر ہوں۔ پرانے دوستوں کے ساتھ روابط ختم نہیں ہوئے اور وہی مجھے زمین کے آس پاس واپس لائے ہیں۔ ان کے پاؤں زمین سے جڑے رہتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مشہور نہیں ہے۔

پیٹر ایچ اسٹون: تخلیقی عمل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

گارسیا مارکیز: ہیمنگوے کی ایک بات مجھے بہت متاثر کرتی ہے۔ تخلیقی عمل ان کے نزدیک سکے بازی کی طرح تھا۔ فوکنر شراب پینے کے لیے مشہور تھے۔ میں نے ان کے جتنے بھی انٹرویو لیے تھے انہوں نے ہر بار یہی کیا تھا کہ نشے کی حالت میں ایک سطر بھی لکھنا ناممکن ہے۔ ہیمنگوے نے بھی یہی بات دہرائی ہے۔ کئی عقل سے کورے قارئین نے مجھ سے پوچھا کہ اپنی کچھ تخلیقات کو قلمبند کرتے وقت کیا میں نشہ کرتا تھا؟ مگر اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ادب یا نشہ آور چیزوں کی جانکاری نہیں رکھتے۔ ایک اچھا ادیب بننے کے لیے ذہن کو اور جسم کو توانا رکھنا ضروری ہے۔ میں اس طرح کی باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا کہ جس قدر ادیب ناتواں اور مفلس ہوگا اس کی تخلیقات بے حد جاندار ہوں گی۔

پیٹر ایچ اسٹون: آپ لکھنے کا کام کب کرتے ہیں؟ کیا کوئی طے شدہ وقت میں کام کرتے ہیں؟

گارسیا مارکیز: جب میں ایک پیشہ ور صحافی تھا اس وقت روز مرہ کے کاموں میں کئی مسائل حائل ہوتے تھے۔ ایک صحافی کے لیے کام کا وقت رات ہوتی ہے۔ جب میں نے مکمل طور پر لکھنے کا کام شروع کیا تب میری عمر چالیس سال سے زائد تھی۔ تب میں بلا ناغہ صبح نو بجے سے دوپہر دو بجے تک لکھتا تھا میرا لڑکا اس وقت اسکول سے واپس آتا تھا۔ چونکہ میں سخت محنت کا عادی تھا اس لیے صبح کام کرنے کے بعد خود کو مجرم تصور کرتا تھا۔ اس لیے میں نے شام کو بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ مگر جو کام شام کو کرتا تھا اسے دوسرے دن صبح دوبارہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد طے کر لیا کہ نو بجے سے دوپہر ڈھائی بجے تک ہی کام کروں گا۔ شام کو میں طے شدہ انٹرویو ہی لیا کرتا تھا۔ میری

تخلیقات پر فاکنر کے اثرات مرتب ہوئے ہیں اس طرح نقاد کہتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اتفاق ہے۔ 'آرا کاٹکا' کا سفر مکمل ہونے کے بعد میں نے اپنا ''لیف اسٹرم'' پورا کیا۔ ''آرا کاٹکا'' کے سفر کے دوران میرے اندر کچھ وقوع پذیر ہوا تھا۔ میں نے جانا کہ بچپن کے واقعات میں بہت سی قدریں شامل ہیں جنہیں میں فنکارانہ سطح پر سمجھ پایا ہوں۔ جوں ہی میں نے ''لیف اسٹرم'' مکمل کیا میں مطمئن ہو گیا کہ میں ایک ادیب بننا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے کوئی روک نہیں سکے گا۔ جو کام میرے لیے ابھی باقی ہے وہ ہے دنیا کے عظیم ادیب کے طور پر خود کو منوانا۔ یہ سبھی واقعات ۱۹۵۳ء میں رونما ہوئے۔ مگر اپنی لکھی ہوئی آٹھ کتابوں میں سے جن پانچ کا کاپی رائٹ استعمال کرنے کا مجھے موقع ملا وہ سبھی ۱۹۶۷ء کے بعد کی ہیں۔

پیٹر ایچ اسٹون: اپنا بچپن سارے تجربات سے انکار کر کے انٹلیکچوئل تخلیقات قلمبند کرنے کا رجحان جیسا آپ کا تھا، ویسا ہی کبھی نئے ادیبوں میں موجود ہوتا ہے؟

گارسیا مارکیز: معاملہ کچھ مختلف ہے۔ مگر نئے ادیبوں کو کچھ پیغام مجھے دینا ہو تو میں کہوں گا، جس واقعہ کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق ہو، اسی کو لکھو، دیکھا یہ گیا ہے کہ جس واقعے کو رونما ہوتے ہوئے اس نے دیکھا ہے اور جس کا تعلق اس کی ذات سے ہے اسے قلمبند کرنا بہت ہی آسان ہے۔ پابلو نیرودا نے اپنی نظم کے ایک مصرعے میں کہا ہے: ''خدا مجھے تخلیقی جذبات سے اسی وقت آزاد کرتا ہے، جب میں گاتا ہوں، جب میں سوچتا ہوں، میری تعریف و توصیف میرے تخیل کے لیے کی جاتی ہے۔ میں حیرت زدہ ہو جاتا ہوں، جب کہ سچائی یہ ہے کہ میری تخلیقات میں ایسی کوئی سطر نہیں ہوتی جس کی کہ حقیقی بنیاد نہ ہو۔'' اصل میں دقت یہ ہے کہ کیریبین حقیقت کے ساتھ تخیل کا گہرا تعلق ہے یا بہت مطابقت ہے۔

پیٹر ایچ اسٹون: اس وقت آپ کس کے لیے لکھ رہے ہیں؟ آپ کے سامعین اور ناظرین کون ہیں؟

گارسیا مارکیز: 'لیف اسٹرم' میرے ان تمام دوستوں کے لیے جنہوں نے مجھے کتاب ادھار دے کر یا دوسرے طریقے سے مدد کی تھی، اور میری تحریروں کے لیے پر جوش تھے، لکھا گیا تھا۔ عام طور پر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جو بھی لکھتے ہیں وہ کسی نہ کسی انسان کے لیے ہی لکھتے ہیں۔ میں جب لکھتا ہوں ہمیشہ یہ سوچ کر لکھتا ہوں کہ میرے کسی دوست کو میری تخلیق کا یہ حصہ پسند آئے گا۔ یعنی لکھتے وقت سوچ کسی نہ کسی شخص پر مرکوز رہتی ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ ہر ایک کتاب دوستوں کے لیے لکھی گئی۔ ''تنہائی کے سو سال'' لکھنے کے بعد میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے قارئین جو لاکھوں کی

تعداد میں ہیں، انہیں میں اب بھی نہیں سمجھ پایا ہوں۔ میری اس پریشانی نے مجھ پر سکتہ طاری کر دیا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے جیسے ہزاروں نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں مگر آپ نہیں جانتے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔

پیٹر ایچ اسٹون: اپنی تخلیقی کہانیوں پر صحافت کے اثرات کے بارے میں کچھ کہیں؟

گارسیا مارکیز: مجھے لگتا ہے کہ اثرات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ کہانی نے میری صحافت میں اعانت کی مجھے ایسے ماحول میں ہی کام کرنا پسند آتا تھا جہاں کام کی حدت موجود ہو۔ کسی دوسرے مکان میں یا دوسرے سے ادھار لی ہوئی ٹائپ رائٹر پر لکھ نہیں سکتا تھا۔ اس طرح کی باتیں طرح طرح کے مسائل پیدا کرتی تھیں۔ دورانِ سفر میں کام نہیں کر پاتا تھا۔ حالانکہ کام کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے ہوتے ہیں۔ اسی لیے جو شرائط خود پر عائد کی جائیں وہ بے حد مشکل ہوتی ہیں۔ اس کیفیت پر میرے دوستوں نے کافی اعتراض کیا ہے۔ مگر کچھ بھی کہے، میرا اس بات پر پورا یقین ہے کہ تخلیقی عمل دریا کے بہاؤ کی طرح ہے جو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ سارے حیلے بہانے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پہلا پیراگراف لکھنا ہی سب سے مشکل کام ہے۔ پہلا پیراگراف قلمبند کرنے میں کتنا بہت وقت لگتا ہے اور جیسے ہی یہ ختم ہوتا ہے، اس کے بعد والا حصہ بہت ہی آسانی سے قلمبند ہو جاتا ہے۔ کم از کم میرے اپنے تئیں پوری کتاب کیا کہنے جا رہی ہے، یہ پہلے پیراگراف سے واضح ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کہانیوں کا ترتیب دینا ناول لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہر کہانی لکھنے سے پہلے نئے سرے سے ابتدا کرنا پڑتی ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ: کہانی گھر، لاہور، جلد ۸، شمارہ ۱، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء)

نوبیل خطبہ

لاطینی امریکا کا گوشۂ تنہائی

(گیبریئل گارسیا مارکیز کا نوبیل خطبہ)

گارسیا مارکیز/ باقر نقوی

فلورنس سے تعلق رکھنے والا ایک ملاح 'انتونیو پیگا فیٹا' نے، جو 'میگالان' کے ہمراہ دنیا کے گرد پہلے بحری سفر پر گیا تھا، جنوبی امریکا کے زمینی علاقے پر سے گزرنے کے بعد ایک اتنا بے کم وکاست احوال لکھا تھا کہ اُس پر سرابِ خیال سے گزرنے کا گمان ہوتا تھا۔ اس احوال میں اس نے لکھا تھا کہ اس نے ایسے سُور دیکھے جن کے نافے ان کے کولھوں پر تھے، بغیر پنجوں کی ایسی چڑیاں دیکھیں جو اپنے نر کی پشت پر انڈے دیتی تھیں، ان سے بڑھ کر ایسا پرندہ دیکھا جس کی چونچ چمچوں جیسی اور جو ہئیت میں ایسے آبی پرندے پیلیکن (Pelican) سے ملتی جلتی تھی جو زبان سے محروم تھا۔ اُس نے ایک ایسی ناجائز مخلوق بھی دیکھی جس کے کان بیلوں کی طرح، جسم اونٹوں جیسا، ٹانگیں ہرنوں جیسی، جس کی ہنہناہٹ گھوڑوں جیسی تھی۔ اس نے بیان کیا کہ جب ان کا ایک مقامی انسان سے سامنا ہوا اور انھوں نے اس کو آئینہ دکھایا تو دیو جیسی قامت رکھنے والا انسان آئینے میں اپنا ہی نقش دیکھ کر ہوش وحواس کھو بیٹھا۔

متحیر کر دینے والی ایک مختصر سی کتاب، جو اُس وقت بھی اپنے اندر موجود دور کے ناولوں کے تخم رکھتی تھی، بلا شبہ اُس دور کی حقیقتوں پر چکرا دینے والی کیفیات سے پُر ہے۔ انڈیز (Indies) کے سفری روز ناموں پر مبنی بے شمار کتابیں ملتی ہیں۔ 'ایل دورادو' (El Dorado) جیسی سرابی (خیالی) سرزمین جس کی تلاش میں ایک مخلوق سرگرداں رہی، نقشہ نگاروں کی فنتاسی کے طفیل ایک عرصے تک جگہ بدل بدل کر مختلف نقشوں کی زینت بنتی رہی ہے۔ ابدی حیات دینے

والے چشمے کی تلاش میں Alvar Nunez Cabeza de Vaca جیسی دیو مالائی شخصیت کی سربراہی میں چھ سو افراد پر مشتمل ایک فریب خوردہ قافلہ، سفر کے دوران جس کے ارکان ایک دوسرے کو ہڑپ کرتے رہے، شمالی میکسیکو میں آٹھ برس تک خاک چھانتا رہا۔ آخر میں سے صرف پانچ افراد زندہ واپس لوٹے۔ اس دور کے ناقابلِ وضاحت واقعات میں سے ایک واقعہ اُن گیارہ ہزار خچروں کا ہے جن میں سے ہر ایک پر ایک سو پاؤنڈ سونا بار تھا اور جو، Cuzco سے Atahualpa کی رہائی کے لیے تاوان کے طور پر ادا کرنے کے لیے روانہ کیے گئے تھے مگر وہ منزل مقصود پر نہیں پہنچے۔ نوآبادیاتی دور میں Cartagena de Indias کے کچھار پر (دریائی مٹی سے وجود میں آئی ہوئی زمین جس میں سونا پایا جاتا ہو) پالی ہوئی مرغیاں فروخت کی جاتی تھیں جن کے دیے ہوئے انڈوں کی زردیوں میں سونے کے چھوٹے چھوٹے ڈلے ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک سونے کا لالچی زمین دار کچھ برس پہلے تک ہمارے پیچھے لگا رہا تھا۔ پچھلی صدی کے آخر تک ایک جرمن مشن کو خاکنائے پناما میں زیرِ آب ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ بنانے پر مقرر کیا گیا تھا۔ اس مشن کے اراکین کا خیال تھا کہ یہ منصوبہ قابلِ عمل ہو سکتا ہے بہ شرطے کہ آہن کے بجائے سونے سے بنی ہوئی ریلوے لائنیں بچھائی جائیں اس لیے کہ اس علاقے میں آہن کی قلت تھی۔ ہم ہسپانوی سلطنت کے غلبے سے تو آزاد ہو گئے مگر ہسپانویوں کے پاگل پن نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ تین بار میکسیکو کے آمر حکمران بننے والے General Antonio Lopez de Santana نے pastry War میں کٹ جانے والی اپنی داہنی ٹانگ کا بہت دھوم دھام سے جنازہ اٹھوایا تھا۔ General Gabriel Garcia Moreno نے 'ایکوے ڈور' پر سولہ برس تک مطلق العنان بادشاہ کیطرح حکومت کی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی لاش کو وردی اور سارے تمغوں کے ساتھ کرسی صدارت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ 'ایل سیلوے ڈور' کے 'تھیو صوفیانہ' جابر حکمران Maximiliano Hernandez General Martinez نے، جس نے تیس ہزار دیہاتیوں کو ایک وحشیانہ قتل عام میں تہ تیغ کروا دیا تھا، اپنے طعام میں زہر کا سراغ لگانے کے لیے ایک شاقول متحرک (pendulum) ایجاد کروایا تھا اور اپنی عملداری کی تمام شاہراؤں پر جلنے والے چراغ دانوں پر سرخ کاغذ چڑھوا دیے تھے تاکہ سرخ بخار کی وبا کو شکست دی جا سکے۔ Teguucigalpa کے مرکزی چوک میں General Francisco Moraz'n کے نام سے جو مجسمہ ایستادہ کیا گیا ہے وہ دراصل Marshal Ney کا ہے اور اس کو پیرس کے ایک پرانے مجسموں کے گودام

سے خریدا گیا تھا۔

اس کے بعد سے خوش خلق ۔کبھی کبھی بد خلق بھی ۔ یورپیوں کو لاطینی امریکہ میں (بے انتہا وسیع مملکت کے کھدیڑے ہوئے مرد اور عورتیں جن کی کبھی نہ ختم ہونے والی سرکشی ، روایات میں مدغم ہوگئی تھی) اٹھنے والے غیر دنیوی جزر و مد نے بھی بڑی قوت سے ضرب لگائی اور ہمیں ایک لمحے کا بھی اطمینان نصیب نہیں ہو سکا ہے۔

گیارہ برس قبل ہمارے وقت کے سر آوردہ شاعروں میں سے ایک شاعر، چلی کے 'پابلو نرودا' نے ایسے ہی اجلاس کے سامعین سے آگہی افروز خطاب کیا تھا۔ اس کے بعد سے نیک ،اور کبھی کبھی بد، خواہشات رکھنے والے یورپی لوگوں پر، آسیب زدہ مردوں اور معروف خواتین کی اتھاہ مملکت لاطینی امریکا ، سے آنے والی پُر اسرار بشارتوں کا نزول ہو رہا ہے، جن کی کبھی نہ ختم ہونے والی ضد اس کو دھندلا رہی ہے۔ ہمیں ایک لمحے کا سکون میسر نہیں رہا۔ ایک باہمت صدر جو جلتے ہوئے محل میں محصور ہوا، تنہا پوری ایک فوج سے جنگ کرتے ہوئے مر گیا۔ ہوائی جہازوں کے دو پُراسرار حادثوں میں ، جن کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا ہے ، بڑے جگرے والے ایک صدر کی جان گئی اور اس طرح جمہوریت کا ایک سپاہی موت کی آغوش میں چلا گیا جس نے اپنے عوام کے وقار کو بحال کیا تھا۔ پانچ جنگیں ہوئیں اور سترہ فوجی بغاوتیں ، جن کے نتیجے میں ایک شیطانی خصلتوں والے آمر کا ظہور ہوا، جس نے ہمارے زمانے میں خدا کے نام پر لاطینی امریکا کا پہلا فرقہ ورانہ قتل عام کیا۔ اس دوران ایک برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی دو کروڑ لاطینی امریکی بچے موت کی آغوش میں سُلا دیے گئے ۔ ۱۹۷۰ء سے اب تک یورپ میں پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد اس سے کہیں کم ہے۔ اُپسالا شہر کی پوری آبادی سے زیادہ یعنی ایک لاکھ بیس ہزار انسان ، استبداد کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئے ۔ بے شمار حاملہ عورتوں نے ارجنٹائن کے قید خانوں میں بچے جنے ، اور کسی کو علم نہیں کہ ان میں سے کتنے چوری چھپے گود لے لیے گئے یا فوجی حکومت کے حکم پر یتیم خانوں میں بھیج دیے گئے ۔چوں کہ وہ (آمر) حالات کو بدلنا چاہتے تھے، پورے براعظم میں تقریباً دو لاکھ مرد اور عورتیں موت کی نیند سلا دیے گئے اور ایک لاکھ سے زیادہ افراد صرف مرکزی امریکا کے بدقسمت ملکوں ، نکاراگوا، ایل سلواڈور اور گوئٹے مالا میں اپنی جانوں سے گئے ۔ اگر ایسا ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ہوا ہوتا تو چار برس میں، نسبتاً چھبیس لاکھ افراد مر گئے ہوتے ۔

روایتی طور پر مہمان نواز ملک چلی سے دس لاکھ افراد، یعنی ملک کی دس فی صد آبادی، فرار

ہو کر دوسرے ملکوں میں پناہ گزین ہوئی۔ پچیس لاکھ افراد پر مشتمل آبادی والے ایک چھوٹے سے ملک 'یوروگوائے' سے، جس کو اس براعظم کا سب سے زیادہ مہذب ملک سمجھا جاتا ہے، پانچ شہریوں میں سے ایک فرد ترکِ وطن کر گیا۔ ۱۹۷۹ء سے ایل سلواڈور کی خانہ جنگی نے گزرنے والے ہر بیس منٹ میں ایک پناہ گزین بنایا۔ اگر ان تمام، از خود یا جبراً ترکِ وطن کرنے والے، افراد کو کسی ایک سرزمین پر آباد کیا جاتا تو اُس کی آبادی ناروے سے زیادہ ہوتی۔

میرا خیال ہے کہ یہ صرف شاعرانہ اظہار ہی نہیں، حقیقت سے کہیں زیادہ بڑی حقیقت ہے کہ ان ہی وجوہ کی بنا پر سویڈش اکادمی کی توجہ اس (لاطینی امریکا) کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ کاغذ پر تحریر کردہ حقیقت ہی نہیں، وہ حقیقت جو ہم میں زندہ رہتی ہے اور ہر لمحہ ہماری بے شمار اموات کا فیصلہ کرتی ہے، ہماری غم زدگی اور حسن سے لبریز، تخلیقی بھوک کے لیے غذا کا کام کرتی ہے۔ جس کا یہ چلتا پھرتا، یادِ رفتہ کا متوالا، کولمبیائی، قسمت سے اس اعزاز کے لیے چنا گیا ہے۔ شاعر ہو یا فقیر، موسیقار ہو یا پیشین گو، جنگجو ہو یا بدمعاش، بے لگام حقیقتوں کی تمام مخلوق، ہم سب ،کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو قابلِ یقین بنانے کے لیے آپس میں ابلاغ کے لیے مروجہ طریقوں کے استعمال سے اجتناب کرتے رہے ہیں۔ تو دوستو، یہی ہمارے گوشۂ تنہائی کا عقدۂ لاینحل ہے۔

اور اگر یہی مشکلات، جن کے نچوڑ کے ہم سب حصے دار ہیں، ہمیں روکتی ہیں، تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ دنیا کے اس طرف کی ذہانت کو، جو اپنی تہذیب کے بارے میں غور و فکر میں بہت ارفع ہے، اپنے اندازِ فکر اور سوچ کی وضاحت کا کوئی قابلِ قبول طریقہ وضع کرنا چاہیے تھا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ وہ ہمیں اُسی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کرتے ہیں جس کو وہ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی کی کٹھنائیاں سب کے لیے ایک جیسی نہیں ہوتیں، اور یہ بھی کہ ہمارے اپنے عرفان کی تلاش خود ہمارے لیے بھی اتنی ہی وقت طلب اور خوں آشام ہے جتنی کہ اُن کے لیے تھی۔ ہماری حقیقتوں کی وضاحت ان نقوش کو پُر کرنے سے جو ہمارے اپنے نہیں ہیں، ہم کو اور بھی بے گانہ، اور بھی بے راہ رو، اور بھی تنہا بنا دیتی ہے۔ قابلِ احترام یورپ شاید اور بھی ادراک پذیر ہو جاتا اگر اس نے ہم کو اپنے ماضی کے آئینے کی معرفت سے دیکھنے کی کوشش کی ہوتی۔ اگر اس نے صرف پلٹ کر اتنا دیکھ لیا ہوتا کہ لندن شہر کو پہلی بار اپنی فصیل بنانے میں تین سو برس اور ایک بشپ حاصل کرنے میں مزید تین سو برس لگ گئے تھے، کہ (وسطی اٹلی کے ایک قدیم ملک) 'ایڑوریا' کے ایک فرمانروا کی مہربانیوں سے قبل، روم بیس

صدیوں کی غیر یقینی کی دھند میں ٹھوکریں کھاتا پھرا تھا، اور یہ بھی کہ آج کا پر امن سوئٹزر لینڈ، جو آج معتدل مزے کے پنیر اور جذبات سے عاری گھڑیوں سے ہماری مدارات کرتا ہے، سولھویں صدی کے آخر تک قسمت کے سپاہی کے روپ میں یورپ کو خون میں نہلاتا رہا تھا۔ نشاۃ الثانیہ کے دورِ عروج میں بھی، سامراجی فوجوں میں شامل کرائے کے بارہ ہزار برچھی بردار سپاہیوں نے روم کو تاخت وتاراج کیا اور اس کے آٹھ ہزار باسیوں کو تہِ تیغ کر دیا تھا۔

اس منزل Tonio Kroger کے التباس کی تجسیم کرنا میرا مقصد نہیں جس کے 'پارسا شمال اور شہوت زدہ جنوب' کے اتحاد کے تصور، کو ترپن برس قبل 'ٹامس مان' نے اسی قسم کی ایک تقریب میں اُٹھا کر اعزاز بخشا تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ دوربین یورپی جو، یہاں بھی ایک مزید انصاف پسند اور زم خو وطن کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، ہماری کہیں بہتر طریقے سے مدد کر سکتے ہیں، اگر وہ ہماری طرف دیکھنے کے اپنے انداز پر نظرِ ثانی کر لیں۔ محض ہمارے خوابوں سے یک جہتی ہمارے گوشۂ تنہائی کو کم نہیں کرے گی جب تک کہ اُس کو، اُن تمام لوگوں کے لیے، جائز مدد کے ٹھوس عمل میں تبدیل نہ کر دیا جائے جو دنیا کی تقسیم میں اپنے طور پر زندہ رہنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

لاطینی امریکا کی نہ یہ خواہش ہے اور نہ اس کا کوئی جواز ہے کہ اس کو اس کی اپنی مرضی کے بغیر گروی رکھ دیا جائے، نہ اس کو یہ خوش فہمی ہے کہ اس کی اپنی آزادی اور انفرادیت مغرب کی اُمنگ بن جائے۔ اس کے باوجود، ایسا لگتا ہے گویا، بحری سفر کے ضمن میں ہونے والی ترقی نے، جس نے یورپ اور متحدہ امریکا کے درمیان فاصلوں کو کم کر دیا ہے، ہماری تہذیبی دور افتادگی کو بڑھا دیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیں دی جانے والی ادبی انفرادیت نے، مشکل سماجی تبدیلیوں کی ہماری کوششوں کو، بدظنی سے، اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ ایسا کیوں سوچا جاتا ہے کہ ترقی پسند یورپی باشندے اپنے ملکوں کے لیے جس قسم کے سماجی انصاف کے خواہاں ہیں ویسے ہی ہدف، متفاوت حالات رکھنے والے لاطینی امریکا کے لیے، موزوں نہیں ہوں گے؟ نہیں! ہماری تاریخ میں موجود بے پایاں تشدد اور درد، ایک عرصے پر محیط ناانصافیوں اور ناقابلِ بیان تلخیوں کا نتیجہ ہے، ہمارے اپنے اندر کی تین ہزار جمیعتوں کی سازش کا نتیجہ نہیں۔ مگر بہت سے یورپی دانش ور، اُن پرانے لوگوں جیسے طفلانہ انداز میں سوچتے ہیں جو عنفوانِ شباب کی اپنی ثمر بار زیادتیوں کو بھول جاتے ہیں، گویا کسی اور شدنی امر کا حصول ناممکن ہے، سوائے اس کے کہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر رہ کر ہی زندہ رہا جائے۔ تو میرے دوستو! یہ ہے ہمارے گوشۂ تنہائی کا درجہ۔

اس کے باوجود، جبر، لوٹ مار اور بے وفائیوں کا جواب ہم زندگی سے دیتے ہیں ۔ نہ سیلاب اور نہ وبا، نہ قحط اور نہ دریاؤں کا کناروں سے اُبال، نہ صدیوں چلنے والی ابدی جنگیں موت کے مقابلے میں زندگی کی مسلسل برتری کو زیر کر سکے ہیں ۔ ایسی برتری جو نمو پذیر ہے اور ترقی پذیر بھی ۔ ہر برس اموات سے چوہتر ملین زیادہ پیدائشیں ہوتی ہیں، جو نیویارک کی آبادی کی سات گنا ہوتی ہیں ۔ ان میں زیادہ تر پیدائشیں سب سے کم وسائل رکھنے والے ملکوں میں ہوتی ہیں، بلاشبہ ان میں لاطینی امریکا کے ممالک بھی شامل ہیں ۔ اس کے برعکس دنیا کے سب سے زیادہ خوشحال ملکوں نے اتنی طاقت مجتمع کر رکھی ہے کہ، مثال کے طور پر، نہ صرف یہ کہ وہ پوری دنیا کی موجودہ آبادی کو سو بار تباہ کر سکتے ہیں بلکہ ہر اس ذی روح کو ایک ساتھ موت کی نیند سُلا سکتے ہیں جس نے روزِ ازل سے آج تک اس بدقسمت کرۂ ارض پر سانس لی ہو۔

آج ہی کی طرح ایک دن، میرے مربی، ولیم فاکنر نے کہا تھا، ”میں نسلِ انسانی کے اختتام کو مسترد کرتا ہوں ۔“ میں اس مقام پر، جو اُس دن اُس کا تھا، ایستادہ ہونے کے لائق نہیں ہوں گا اگر میں پوری طرح واقف نہیں ہوں کہ بتیس برس قبل جس ہیبت ناک المیے کے محض تصور کو بھی اس نے ماننے سے انکار کر دیا تھا، انسانیت کی ابتدا کے بعد وہ امکان، پہلی بار، ایک سادہ سے سائنسی امکان سے زیادہ نہیں ۔ اس نوع کی تعجب انگیز حقیقت کے پیشِ نظر، جو پورے دورِ انسانیت میں ایک 'یوٹوپیا' رہی ہوگی، ہم، تمام کہانیاں خلق کرنے والے، جو ہر بات پر یقین کر لیا کرتے ہیں، یہ سوچنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہمارے لیے اس یوٹوپیا کا مدِ مقابل خلق کرنے کی کوشش کرنے میں ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، یعنی ایک نئی، زیادہ رقبے والی خیالی جنت جس میں کسی کو اس بات کا حق نہیں ہوگا کہ وہ کسی کی موت کا فیصلہ کر سکے، جہاں محبت سچ ثابت ہوگی، خوشیاں ممکن ہوں گی اور صدیوں کی گوشۂ تنہائی پر مجبور رہنے والی قوموں کو، آخر کار، اور ابد لا آباد تک کے لیے، زمین پر (آزادی سے زندہ رہنے کا) دوسرا موقع میسر ہوگا۔



(مشمولہ: ”نوبیل ادبیات“ از باقر نقوی، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹ء)

تخلیقات

ناولٹ

بادِ بے مہر

(معصوم ارنڈیرا اور اس کی بے رحم دادی کی ناقابلِ یقین کہانی)

ترجمہ: عبدالوحید رانا

وہ صبح معصوم ارنڈیرا کے لئے بادِ بے مہر کے تند بگولوں کی صورت نمودار ہوئی اور صحرائی طوفان نے سفید حویلی کی بنیادیں تک ہلا ڈالیں!

ان کے لئے ایسے بگولے ایک معمول تھے۔ ایسا تو روز ہوتا تھا۔ رومن طرز کے غسل خانے میں محوِ غسل بوڑھی اور ننھی لڑکی نے وحشی ہواؤں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بوڑھی دادی غسل کے ٹب میں لیٹی ایک بڑی سفید وہیل مچھلی کی طرح نظر آتی تھی۔ توانا اور بے رحم۔ ارنڈیرا ابھی صرف چودہ برس کی تھی۔ وہ نازک گھبرائی ہوئی اور بے زبان لڑکی تھی۔ اور انہماک سے چالاک اطوار کی بوڑھی کو عطر بیز اور پھولوں سے اٹے پانی سے غسل کروا رہی تھی۔ دادی نہانے کے ساتھ ساتھ بھاری آواز میں باتیں بھی کر رہی تھی۔

''رات میں نے خواب دیکھا کہ ہمیں کہیں سے خط آنے والا ہے۔''

''ارنڈیرا نے دھیمی آواز میں دریافت کیا۔''

''خواب میں وہ کیا دن تھا دادی''

''جمعرات! ہاں بالکل جمعرات تھی۔''

لڑکی نے آہ بھری۔

''اماں یہ براشگون ہے، لیکن پھر بھی خط کبھی نہیں آئے گا''

غسل کے بعد دادی کو خواب گاہ تک جانے کے لیے نازک ارنڈیرا کی مدد درکار تھی۔ وہ لڑھکتی ہوئی اس حسین کمرے میں داخل ہوئی جو وجاہت کے اعتبار سے کسی نواب زادی کی خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ ابھی دادی کی تیاری کا کٹھن مرحلہ باقی تھا۔ لڑکی نے بوڑھی عورت کو بناؤ سنگار کے طویل عمل کے بعد حویلی کے عقب میں واقع باغ کے ایک گوشے میں بٹھا دیا، جہاں وہ قدیم طرز کے گراموفون پر اپنی پسندیدہ موسیقی سن سکتی تھی۔

ارنڈیرا کی دن کی مصروفیات کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا تھا۔

یہ حویلی جس میں ارنڈیرا اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ خاموش زندگی گزار رہی تھی، تاریک اور ویران تھی۔ حویلی عظیم الحبثہ پیانو اور سنگِ سفید پر کندہ فرشتوں کی شبیہوں، قدیم طرز کے فرنیچر، پتھر کے مجسموں، شیشے کے جھاڑ اور بہت سی دیوار گیر گھڑیوں سے مرصع تھی۔ یہ مکان آبادی سے دور صحرا کے بیچ تنہا کھڑا تھا۔ اس کے بعد ایک مقام ایسا تھا جہاں بربادی اور موت تھی اور صحرائی بھیڑیوں کی لاتعداد لاشیں تھیں۔ یہیں سے وہ ہوا چلی تھی جس نے سب کچھ اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔

بوڑھی عورت کا خاوند ایک نامور سمگلر تھا اور اسکا نام اماویز تھا۔ جس کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام اماویز تھا۔ ارنڈیرا اسی اماویز کی اولاد تھی، یہ ایک پناہ گزین خاندان تھا۔ جس کی ہجرت کا راز کسی کو معلوم نہ تھا۔

صحرا کے انڈین باشندے جو کہانی سناتے ہیں اس کے مطابق ارنڈیرا کا باپ اس کی ماں کو ایک طوائف کے گھر سے اٹھا کر لایا تھا، جس کے لیے اسے ایک آدمی کو اپنے چاقو کی تیز دھار سے قتل بھی کرنا پڑا۔ جس کے بعد یہ طویل اور ویران صحرا اس بدقسمت عورت کا مقدر بن گیا۔ بعد کی کہانی وہ یوں سناتے ہیں کہ جب باپ صحرائی بخار سے مر گیا اور بیٹا ایک عورت کے تنازعے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو بوڑھی عورت نے گھر کے دالان میں ان کی قبریں بنائیں، اور اس لق و دق صحرا میں ننھی ارنڈیرا کی پرورش کی، جواب چودہ برس کی ہو چکی تھی۔

دن سست روی سے گزر رہا تھا۔ لڑکی نے گھڑیال کی چابی بھری۔ صحن میں صحرائی پھولوں کو پانی دیا اور دالان میں بنی ہوئی اپنے باپ اور دادا کی قبروں پر پانی چھڑکنے لگی۔ وحشی طوفان کی شدت سے پناہ مانگنے کا یہ طریقہ اس نے اپنی دادی سے سیکھا تھا۔ وہ بے خبر تھی اور نہیں جانتی تھی کہ آج کا طوفان بادِ بے مہر کی طرح اس کی قسمت کو برباد کرنے پر تلا ہوا تھا۔

دن بھر کی مشقت سے نڈھال ارنڈیرا نے آخری مرتبہ باورچی خانے کا چکر لگایا اور چولہے

پر رکھے ہوئے پانی کو دیکھ کر پیالے میں سوپ تیار کرنے لگی۔ ابھی پانی ابلنے میں چند لمحے باقی تھے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں پھر نہیں کھولا اور آہستہ سے سوپ میں چمچ ہلانے لگی۔ وہ سو رہی تھی، یا شاید جاگ رہی تھی۔

اسی حالت میں بھوک سے بے تاب دادی کے آگے گرم سوپ کی پلیٹ رکھ کر وہ مڑنے لگی تو بوڑھی نے کرخت آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''لڑکی''

ارنڈیرا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''جی۔ دادی''

''تم شاید سو رہی ہو۔''

ارنڈیرا نے بے تاثر آواز میں جواب دیا۔

نہیں دادی یہ میری عادت ہے۔ میں سب کام وقت پر ختم کرلوں گی۔''

اس شب جب ارنڈیرا نے تھکا دینے والے دن کا اختتام کیا تو صحرائی بگولے مکان میں داخل ہونے کے لیے دیواروں سے دست و گریباں تھے۔ دوسرے کمرے میں دادی بوڑھے پیانو پر بچھڑے ہوئے دنوں کو دہراتے دہراتے تھک چکی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کے نشان ابھی تازہ تھے۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے اس نے بلند آواز سے ارنڈیرا کو آخری ہدایات جاری کیں۔ اور آنکھیں بند کر کے ان دنوں کے بارے میں سوچنے لگی جب صبح اور شام کے موسم خوشگوار ہوتے تھے۔ وہ ادھ سوئی آواز میں انڈیرا کو یاد دہانی کروانے لگی۔

''لڑکی۔ کپڑے استری کرلو، تاکہ سکون سے کام نمٹا کر سو سکو۔ پھولوں کو پانی دے دو، قالین صاف کرلو تاکہ کل کے کام کا بوجھ ہلکا ہو سکے اور ہاں اگر میرے شوہر اماویز اور تمہارے باپ اماویز دروازہ کھٹکھٹائیں تو کہنا وہ لوٹ جائیں دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے۔''

ارنڈیرا نے سب سوالوں کا جواب صرف ایک جملے میں دیا۔

''اچھا دادی، ٹھیک ہے۔''

دادی اور ارنڈیرا کا یہ معمول کا مکالمہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وہ نڈھال ہو کر بستر پر نہ گر گئی اور گھر میں صرف دادی کے خوفناک خراٹے اور دیواروں سے سر ٹکراتی ہوا کا شور باقی رہ گیا۔

ارنڈیرا کی خواب گاہ میں موم بتی روشن تھی جب بادِ بے مہر آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئی

اور موم بتی کا شعلہ چمک کر خوبصورت پردوں پر جھپٹا۔ پل بھر میں آگ اور ہوا گھر کے کونے کونے میں پھیل گئے۔

صبح صادق کے وقت طوفان تھم گیا اور بارش ہوئی۔ صحرا میں خاکستر حویلی کے نشانات اور راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا۔ ارنڈیرا ماویز کی قبروں کے درمیان بیٹھی رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی۔

جب صحرا کے باشندے ملبے کی تلاشی لے چکے اور دادی نے اطمینان کر لیا کہ اب اس کے پاس اماویز کی قبروں ارنڈیرا اور راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا تو اس نے مہر خاموشی کو توڑا۔

''میری بچی، زندگی شاید اتنی طویل نہیں کہ تم نقصان کا کفارہ ادا کر سکو لیکن تم کو ایسا کرنا ہی ہوگا۔''

ارنڈیرا جو معصوم تھی اور خاموش تھی، اس روز نہایت خاموشی سے اس عظیم نقصان کے بوجھ کو اپنے نازک بدن پر اٹھائے صحرا میں نکل پڑی۔

یہ کفارے کا پہلا روز تھا۔

بارش کے شور میں وہ گاؤں کے رنڈوے دکاندار کے پاس پہنچیں جو اس صحرائی علاقے میں کم سن دوشیزاؤں کے دام لگانے کا ماہر تھا۔ دکاندار نے شاطر نظروں سے لڑکی کا جائزہ لیا، کچھ دیر سوچا پھر بولا۔

''یہ بہت چھوٹی ہے شاید ابھی بالغ بھی نہیں ہوئی۔''

اس نے ارنڈیرا کا جسم ایک فیتے سے ماپا اور مشین پر اسکا وزن کیا۔

''اس کی قیمت ۹۰ پیسو بنتی ہے، میں سو دے سکتا ہوں۔''

''سو پیسو؟'' وہ چیخ پڑی۔

''بالکل نئی اور کم عمر لڑکی کے سو پیسو، مجھے تم سے اتنی کم قیمت کی ہرگز توقع نہ تھی۔

''ٹھیک ہے، میں ایک سو پچاس دے دوں گا۔'' دکاندار بولا۔

''تم جانتے ہو۔ اس لڑکی کی وجہ سے مجھے دس لاکھ پیسو کا نقصان ہوا ہے۔'' دادی نے دکاندار کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اور اس قیمت پر تو یہ رقم واپس لینے میں مجھے سو سال لگیں گے۔

''تم ٹھیک کہتی ہو خاتون! لیکن اس لڑکی کی واحد خوبی اس کی کم عمری ہے۔ یہ تمہاری خوش

قسمتی ہے۔"

دادی کو محسوس ہوا کہ اس دنیا میں وہ تنہا رہ گئی ہے۔ اور صحرائی بگولے اس بارش میں بھی اسے اپنی زد میں لئے ہوئے ہیں، وہ ناکام لوٹنا نہیں چاہتی تھی۔

چنانچہ سودا دو سو پچاس پیسو میں طے ہو گیا۔

جب دادی نے ارنڈیرا کا ہاتھ تھام کر اسے عقبی کمرے میں دکاندار کے ساتھ روانہ کر دیا تو لڑکی کی چال میں وہی حیرت موجود تھی جو اس عمر میں پہلی مرتبہ سکول جاتے وقت بچوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔

"میں اس جگہ تمہارا انتظار کروں گی، میری بچی"

"اچھا دادی ٹھیک ہے۔"

عقبی کمرہ تاریک تھا۔ وہاں ایک بڑا سا لکڑی کا تخت بچھا تھا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی، لیکن پیلے چہرے والے مرد نے درشتی سے اس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ "خاموش رہو!" اور پھر اس اندھیرے میں بارش کے شور کے نیچے۔ ارنڈیرا نے دادی کے نقصان کی پہلی قسط ادا کی۔

جب گاؤں کا ہر مرد اور صحرا کا ہر مسافر، ارنڈیرا کی محبت کے دام چکا کر فارغ ہو گیا تو ایک دوپہر دادی نے صحرا کے اس غیر منافع بخش علاقے کو خیر باد کہنے کا پروگرام بنایا۔

وہ دولت مند سمگلروں کی تلاش میں دوسرے علاقوں کا سفر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ وہ بے حساب پیسے کے مالک ہیں، یقیناً ارنڈیرا سمگروں کے پاس رہ کر بہت جلد اس کا قرضہ بے باق کر سکتی تھی۔ انہوں نے یہ سفر ایک کھلے ٹرک میں طے کیا جس پر چاولوں کی بوریاں لدی تھیں۔ ان کی کل متاع کپڑے کے چند تھیلے، خاندانی مسہری کا جلا ہوا پشت گیر، اور دو ٹرک تھے۔ جن میں بوڑھی عورت کے مردہ شوہر اور بیٹے کی ہڈیاں بھری تھیں۔ دادی نے صحرا کی تیز دھوپ سے بچنے کے لیے سر پر چھتری تان رکھی تھی۔

دن گرم تھا اور سفر تکلیف دہ، مٹی اور پسینے میں لتھڑی بڑھیا کا طنطنہ اس حالت بھی قائم تھا۔ وہ نخوت سے چاول کی بوریوں سے پشت لگائے ٹرک کے ٹائروں سے اٹھتی ریت کو دیکھ رہی تھی۔

اور بوریوں کے پیچھے ترپال پر ارنڈیرا ٹرک کے لوڈر کو سفر کے دام چکا رہی تھی۔ یہ سودا بیس پیسو میں طے ہوا تھا۔ لوڈر ایک بجھا ہوا نرم طبیعت اور شفاف آدمی تھا۔ وہ رنڈوے دکاندار کے برعکس نرمی سے سفری اخراجات کی وصولی کر رہا تھا۔

جب ٹرک قصبے میں داخل ہوا تو ارنڈیرا اور لوڈر رضامندی اور سپردگی کے ایک طویل عمل کے بعد ترپال پر لیٹے اپنی سانسیں درست کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے ٹرک روک دیا اور کھڑکی سے گردن نکال کر چلایا۔

''اماں! آبادی شروع ہو چکی ہے۔''

بڑھیا نے حیرت سے اجڑی ہوئی گلیوں اور ویران سڑکوں پر نگاہ دوڑائی، لیکن اس بے پناہ صحرا اور اس اداس شہر میں کوئی فرق محسوس نہ کر سکی۔

''یہ شہر تو دکھائی نہیں پڑتا۔''

''ہاں یہ مشن کا علاقہ ہے۔''

''میں خیرات لینے نہیں آئی مجھے سمگلروں کی تلاش ہے، وہ کہاں ہوتے ہیں۔'' بڑھیا نے ناگواری سے ڈرائیور کی بات کا جواب دیا۔''

ارنڈیرا ترپال پر لیٹی دادی اور ڈرائیور کی گفتگو سن رہی تھی۔ دو چاولوں کی بوریوں میں انگلیاں کھبونے کے بے معنی عمل میں مصروف تھی کہ ایک دم اس کا ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ یہ ایک پھٹی ہوئی بوری میں سے جھانکتا ہوا ہار تھا۔ اس نے ہار کو باہر کھینچ لیا اس کے سرے پر ایک اصلی ہیرا جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

ارنڈیرا ششدر نگاہوں سے اپنی ہتھیلی پر پڑے لاجواب ہیرے کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی زنجیر مادہ سانپ کی طرح اس کی پوروں پر بکھری پڑی تھی۔

ڈرائیور کی آواز پھر ابھری۔

''اماں پاگل مت بنو! سمگلروں کی کہانیاں ہر آدمی سناتا ہے، انہیں دیکھا آج تک کسی نے نہیں ہے۔''

''بے شک لیکن مجھے یقین ہے۔ وہ اسی صحرا میں اپنا کاروبار کرتے ہیں۔'' دادی نے وثوق سے کہا۔

''اچھا تو پھر تلاش کرو، شاید وہ تمہیں مل جائیں۔''

ڈرائیور نے بے زاری سے جواب دیا۔

لوڈر نے دیکھ لیا کہ لڑکی نے بوری سے ہار نکال لیا ہے، وہ تیزی سے جھپٹا اور ہار اس سے چھین لیا۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہوا۔

بڑھیا نے بالآخر اسی افلاس زدہ شہر میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا اور ارنڈیرا کو آواز دی۔ لوڈر

نے سامان اتار کر سڑک پر رکھ دیا تھا۔

ارنڈیرا نے آخری مرتبہ بڑے خلوص سے جس میں مختصر رفاقت کا خوش گوار تاثر شامل تھا، لوڈر کا بوسہ لیا۔

ڈرائیور اور لوڈر مل کر بھاری ٹرنک نیچے اتارنے لگے۔

''اماں! اس میں شاید تم کسی مردے کو بھر لائی ہو۔''

ڈرائیور نے شوخی سے بولا۔

''ہاں! یہ عظیم اماویز کی ہڈیاں ہیں۔ ان کو احترام سے اٹھاؤ۔''

بڑھیا کے لہجے میں رعونت تھی۔

ڈرائیور نے ایک نظر آسمان پر ڈالی، جہاں سورج برہم تھا۔ پھر بڑھیا سے مخاطب ہوا۔

''اماں! جلدی کرو۔ پچاس پیسو''

بڑھیا نے لوڈر کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارا نوکر راستے میں سب کچھ وصول کر چکا ہے۔''

ایک لمحے کے لیے ڈرائیور اور لوڈر کی نگاہیں ملیں پھر وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

لوڈر چند ثانیے بڑھیا کی طرف دیکھتا رہا، کچھ جھجکا اور بولا۔

''ارنڈیرا میرے ساتھ جائے گی، اگر تم اجازت دو تو، یقین کرو میرے دل میں اس کا بڑا احترام ہے۔''

''دادی میں نے اس سے کچھ نہیں کہا'' لڑکی گھبرا کر بولی۔

''ہاں ہاں! یہ میرا اپنا ارادہ ہے'' لوڈر جلدی سے بولا۔ بڑھیا نے گہری نظر نوجوان کے سراپے پر ڈالی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن کیا تم جانتے ہو اس لڑکی کی وجہ سے میں ایک عظیم الشان حویلی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں جس کی قیمت ۸ لاکھ بہتر ہزار تین سو بہتر پیسو بنتی ہے۔ تم اگر یہ رقم ادا کر دو تو ارنڈیرا ابھی تمہارے ساتھ جا سکتی ہے۔''

ٹرک سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور لوڈر نے تاسف سے بڑھیا سے کہا ''یقین کرو اماں اگر میرے پاس یہ رقم ہوتی تو میں ابھی ادا کر دیتا، ارنڈیرا اس سے بہت بڑھ کر ہے۔'' بڑھیا نے لڑکے کے فیصلے پر اطمینان کا سانس لیا اور نرمی سے بولی ''فکر مت کرو میرے بچے! جب تم یہ رقم

اکٹھی کرلو تو واپس آ جانا، اس وقت تو یہی بہتر ہے کہ تم اپنا سفر جاری رکھو!''

دور جاتے ہوئے ٹرک کے غبار میں ارنڈیرا نے ایک ہاتھ لہراتا دیکھا جو نوجوان لوڈر کا تھا۔

چند لمحے بعد وہاں سناٹا چھا گیا اور سورج کچھ اور غیظ وغضب سے آگ برسانے لگا۔ ویرانے میں بڑھیا اور لڑکی نے جست کی چادروں اور جلی ہوئی دریوں سے ایک خیمہ نما جھگی کھڑی کی اور فرش پر تباہ شدہ حویلی کے ملبے میں سے نکالے ہوئے قالین بچھا کر سونے کی تیاری کرنے لگیں۔

رات آئی اور گزر گئی جب خیمے کی باریک چھت سے چھن کر آنے والی سورج کی کرنیں ان کے چہرے جھلسانے لگیں تو وہ جاگ اٹھیں۔

دادی نے دن کا آغاز بڑے اہتمام سے کیا۔ سب سے پہلا مرحلہ ارنڈیرا کو تیار کرنے کا تھا۔

لڑکی کے چہرے پر سوگوار حسن کا تاثر پیدا کرنے کے لیے بڑھیا نے عمر کا وہ بیش قیمت تجربہ اور لازوال مہارت صرف کی جو کبھی اس کی اپنی ذات کے سنگار کے لیے مخصوص تھے۔

بڑھیا نے ارنڈیرا کی انگلیوں میں لمبے مصنوعی ناخن لگائے اور اس کے بالوں میں بیش قیمت ربن باندھے جو تتلی کی طرح لڑکی کے سوگوار چہرے پر اڑتا پھر رہا تھا۔

''تم بے مثال ہو، میری بچی'' اس نے تعریفی نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔ تم نہیں جانتی، مرد بڑے احمق ہوتے ہیں، عورت کی انہی باتوں پر ان کی جان نکل جاتی ہے۔''

وہ دو خچر تھے جو صحرا میں دور سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

بڑھیا نے ہدایات جاری کیں اور ارنڈیرا کسی ناتجربہ کار اداکاروں کی طرح قالین پر تکیئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ جیسے ابھی پردہ اٹھے گا اور اسے وہ کچھ کرنا ہوگا جو وہ کرنا نہیں چاہتی۔

بڑھیا خیمے کے باہر ایک پتھر پر چھتری کھول کر بیٹھ گئی اور منتظر نگاہوں سے ان سیاہ دھبوں کو دیکھنے لگی جو اب واضح ہوتے جا رہے تھے۔ یہ ڈاکیا تھا، ایک خچر پر سوار دوسرے پر ڈاک کے تھیلے لدے ہوئے تھے۔ وہ خاکی وردی اور سر پر بھاری ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ صحرا کی گرم ہواؤں نے بیس سال کے اس لڑکے کو تھکا کر وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

ڈاکیے نے خیمے کے قریب سے گزرتے وقت ہاتھ اٹھا کر بڑھیا کو سلام کیا، بڑھیا نے ہاتھ کی جنبش سے خیمے کے اندر اشارہ کیا جہاں ارنڈیرا تکیئے سے ٹیک لگائے، اپنے سوگوار سنگھار اور زرق برق لباس سمیت موجود تھی۔

وہ ٹھٹکا اور رک گیا۔

''کیا تمہیں یہ لڑکی پسند ہے'' بڑھیا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

''جو بھوکا ہو اس کے لیے خوراک سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے۔''

''پچاس پیسو'' دادی نے قیمت بتائی۔

''اماں اس رقم سے میں پورا ایک مہینہ گزار سکتا ہوں۔''

''لڑکے محبت روٹی کی طرح انسان کی پہلی ضرورت ہے۔''

''ہاں لیکن اس سے پیٹ کب بھرتا ہے'' لڑکا بحث کرنے کے موڈ میں تھا۔

دادی نے تکرار کرنا مناسب نہیں سمجھا وہ پہلا گاہک واپس کرنا نہیں چاہتی تھی، چنانچہ ایک معاہدہ طے پا گیا۔ ارنڈیرا کے قرب کے عوض ڈاکیئے کو یہ خبر قرب و جوار کے علاقوں تک پہنچانی تھی کہ سڑک کے کنارے ایک خیمے میں حسین ارنڈیرا گاہکوں کی منتظر ہے۔

ارنڈیرا اس اتفاقیہ دوست کا استقبال کرنے کو اٹھ کھڑی ہوئی جوان چند لمحوں کی قربت کی عوض اس کی آمد کا نقارچی بننے کو تیار تھا۔ بڑھیا نے پردہ کھینچ دیا اور پیٹھ موڑ لی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ صحرا کے دور افتادہ علاقوں سے لوگ آنے شروع ہوئے، پھر جوئے کی میزیں آئیں، خوانچے والے آگئے، اور سب کے بعد سائیکل پر سوار ایک فوٹو گرافر بھی آ گیا۔ اس کے پاس پرانی طرز کے کیمرے کے علاوہ، جھیل اور جنگلی جانوروں کی تصویروں والی بڑی سی ایک سکرین بھی تھی۔ یوں یہ بازار مکمل ہو گیا تھا جس میں بڑھیا خود کو کچھ اجنبی سا محسوس کرتی۔ اس کا کام بس اس قدر ہی رہ گیا تھا کہ خیمے کے سامنے اپنے تخت پر بیٹھی گاہکوں کے درمیان نظم و ضبط قائم رکھے اور خیمے کے اندر داخل ہونے والوں سے پیشگی رقم کی وصولی کرے۔

ابتدا میں بڑھیا نے اس صحرائی غرور کو قائم رکھا جس نے سفید حویلی میں جنم لیا تھا اور وہ اصولوں کے معاملے میں سختی سے کام لیتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس نے حالات کا صحیح اندازہ لگایا اور نقد رقم کے علاوہ گھریلو اشیاء، زیوارات، تمغے اور ہر وہ چیز قبول کرنے لگی جس کے بارے میں اسے اطمینان ہو جاتا کہ وہ اصلی سونا ہے۔

جب کاروبار چل نکلا اور بڑھیا نے ایک گدھا اور ڈولی خرید لی تو اسکا جی اس چھوٹے قصبے سے اکتا گیا۔ وہ کسی خوشحال اور بڑے شہر کا رخ کرنا چاہتی تھی جہاں کم مدت میں وہ اپنا نقصان پورا کر سکتی۔ وہ وقت کی رفتار سے مطمئن نہیں تھی۔

قافلے کے آگے ایک گدھا تھا، جس کی پشت پر ڈولی میں سوار بڑھیا سورج کی شعاعوں سے محفوظ بیٹھی اس شہر کی بابت سوچ رہی تھی جسے اس نے ابھی نہیں دیکھا تھا۔ ارنڈیرا کے ہاتھ

میں پرانا چھاتا تھا جو بڑے بڑے سوراخوں اور کپڑے کی چند دھجیوں سے بنایا گیا تھا۔ پیچھے چار انڈین ملازم، بڑھیا کا شاہانہ تخت، فرشتوں کی شبیہیں، خیمہ اور عظیم امادیز کی ہڈیوں سے بھرے صندوق اٹھائے رواں دواں تھے۔ سائیکل پر سوار فوٹو گرافر کیمرے اور سکرین سمیت ان کے ہمراہ تھا۔

حویلی کی تباہی کو چھ ماہ گزر گئے تھے، اب بڑھیا نقصان اور اس کے بعد آمدن کا صحیح اندازہ کر سکتی تھی۔

''ارنڈیرا!! اگر حالات اسی طرح سازگار رہے، تو تم میرا نقصان صرف ۸ سال، سات ماہ اور گیارہ دن میں پورا کر دو گی'' اس نے انگلیوں پر حساب لگا کر بتایا۔

''لیکن میری بچی! اس میں وہ اخراجات شامل مت کرنا جو سفر کے دوران ہمیں انڈین ملازمین پر کرنے پڑتے ہیں۔'' ارنڈیرا جو گدھے کے ساتھ ساتھ چھاتہ تانے پیدل چل رہی تھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔

صحرا کی دھول اور آسمانی آگ میں وحشت تھی۔

''دادی میرا بدن اب میری بات نہیں سنتا۔''

''سونے کی کوشش کرو لڑکی، سفر ابھی طویل ہے۔''

ارنڈیرا آنکھیں موندے گرم ریت پر خواب کی حالت میں چلتی رہی۔

وہ چھوٹا سا ٹرک تھا جس میں پنجروں میں بند لاتعداد پرندے بھرے ہوئے تھے۔ اگلی سیٹ پر گلہری رنگ کی مونچھوں والا ایک ولندیزی کسان بیٹھا تھا۔ ساتھ والی نشست پر اس کا بیٹا اولیس تھا۔ لڑکے کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور آنکھیں اداس تھیں۔ اسکا چہرہ دلکش اور معصوم تھا۔

ولندیزی نے ٹرک روک لیا۔ سامنے خیمہ تھا جس کے آگے مقامی چھاؤنی کے سپاہی قطار میں بیٹھے شراب کی ایک بوتل سے باری باری گھونٹ لے رہے تھے اور اپنی باری کے منتظر تھے۔

وہ ولندیزی زبان میں بڑبڑایا۔

''خدا جانے یہاں کون سی نعمت فروخت ہو رہی ہے۔ جوان احمقوں کو قطار میں بٹھایا گیا ہے۔''

''ایک لڑکی، یہ اس کے گاہک ہیں، اس کا نام ارنڈیرا ہے۔'' لڑکے نے سادگی سے وضاحت کی۔

''تم کیسے جانتے ہو'' ولندیزی نے نظریں لڑکے کی طرف موڑ لیں۔

''صحرا میں ہر شخص کو اسکا علم ہے'' وہ لا پرواہی سے بولا۔ وہ ہوٹل کے سامنے رک گئے۔ جب ولندیزی ٹرک سے اتر کر اندر چلا گیا تو لڑکے نے سیٹ پر رکھے بریف کیس کو کھولا اور نوٹوں کی ایک گڈی جیب میں ڈالی اور اطمینان سے نیچے اتر آیا۔

اس رات اولیس بھی خیمے کے سامنے لمبی قطار میں بیٹھا اپنی باری کا منتظر تھا۔ نوعمر رنگروٹ شراب کے نشے میں دھت مفت کی موسیقی پر بے ہنگم قسم کا رقص کر رہے تھے۔ فوٹو گرافر تیزی سے تصویریں بنانے میں مشغول تھا اور بڑھیا خیمے کے دروازے پر بیٹھی دن بھر کی کمائی کو سلیقے سے گود میں رکھی ٹوکری میں الگ الگ گڈیاں بنا کر رکھ رہی تھی۔

ابھی بارہ سپاہی باقی تھے۔ سول گاہکوں کی لائن بھی رات کو طویل ہو جاتی تھی اس قطار کے آخر میں اولیس بیٹھا تھا۔ اب خوفناک چہرے والے سپاہی کی باری تھی۔ بڑھیا نے اسے راستے میں روک لیا۔

''نہیں بچے! حسین ارنڈیرا تمہارے نصیب میں نہیں، تم واپس چلے جاؤ'' بڑھیا نے اگلے آدمی کو اشارہ کیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا'' وہ غرایا۔

''تم پر بد روحوں کا سایہ ہے، ایسے چہروں والے یہاں نہیں آسکتے۔'' وہ دوسرے آدمی سے مخاطب ہوئی۔

''اچھے لڑکے! جاؤ شاباش، اب تمہاری باری ہے، دیکھو زیادہ وقت مت لگانا، قوم کو تمہاری ضرورت ہے۔''

سپاہی خیمے میں داخل ہو گیا اور چند ثانیے بعد واپس لوٹ آیا، ارنڈیرا بڑھیا سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ رقم کی ٹوکری بازو میں لٹکائے اندر چلی گئی۔

سامنے فوجی کوٹ پر دراز برہنہ ارنڈیرا کا کمزور وجود دہشت سے کانپ رہا تھا۔ سپاہیوں کے متعفن پسینے میں لتھڑی لڑکی قابلِ رحم حالت میں تھی۔

''دادی، میں مر رہی ہوں۔'' اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ برآمد ہوئی۔ بڑھیا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کیا کہ اسے بخار نہیں ہے۔

''بچی! صرف دس سپاہی باقی ہیں'' وہ تسلی دینے کے انداز میں بولی۔ ارنڈیرا خوف سے لرز گئی۔ اس کے سینے سے سسکیاں اٹھنے لگیں۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بڑھیا صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کر چکی تھی۔ اس نے ارنڈیرا کے کندھے پر ہاتھ رکھ

دیا۔

''مسئلہ یہ ہے میری ننھی روح کہ تم کمزور بہت ہو، اس لیے جلدی تھک جاتی ہو۔ جاؤ اچھی طرح غسل کرو تاکہ تمہارا خون صحیح حالت میں آسکے'' وہ خیمے سے نکل گئی۔

سپاہی اب تک دروازے پر کھڑا تھا۔ بڑھیا نے رقم واپس اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''اچھا لڑکو! آج کا دن ختم، کل صبح نو بجے تک خدا حافظ'' وہ اس سپاہی کی طرف مڑی جو ابھی چند لمحے پہلے ارنڈیرا کے قرب سے محروم رہ گیا تھا۔

''تم صبح جلدی آنا، میں تمہیں لائن میں پہلا نمبر دوں گی'' قطار میں بیٹھے رنگروٹ اور دیہاتی غصے میں چیخنے لگے۔ وہ بڑھیا کو گندی گالیاں دے رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ جہاندیدہ بڑھیا خوش مزاجی سے معاملہ ختم کرنا چاہتی تھی لیکن تماش بین بھپرے ہوئے تھے ان کے چہروں پر نامراد جسموں کی آلائشیں پھنکارتی پھر رہی تھیں۔

وہ اب سخت لہجے میں ان سے مخاطب ہوئی۔

''تم کیا سمجھتے ہو، وہ نازک لڑکی فولاد کی بنی ہوئی ہے۔ کاش تم اس کی جگہ ہوتے، وحشی، بے حیا، کمینے کہیں کے'' وہ بھپری ہوئی تھی۔ ہجوم چھٹنا شروع ہوا۔ اور وہاں صرف ایک شخص باقی رہ گیا۔ وہ اولیس تھا۔

بڑھیا نے حیرت سے ملگجے اندھیرے میں اس کے تابناک چہرے کی طرف دیکھا۔

''تم، تمہارے پر کہاں گئے، ننھے فرشتے'' وہ نرمی سے بولی۔

''میرے دادا کے کندھوں پر خوبصورت پر تھے، لوگوں کو اس کا یقین نہیں آتا لیکن یہ سچ ہے'' اولیس معصومیت سے بولا۔

''مجھے پتہ ہے! اب تم جاؤ، کل صبح آؤ تو پروں سمیت آنا'' وہ واپس مڑ گئی۔ آہستہ آہستہ سرد ہوتی ریت پر اولیس یکا و تنہا کھڑا خیمے کی طرف دیکھتا رہا۔

غسل کے بعد ارنڈیرا کو احساس ہوا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ وہ سونے سے پہلے اپنے لمبے بال سکھا رہی تھی، اس کی آنکھوں کے آنسو، ابھی تک بالوں میں سے گرتے پانی کے ساتھ قطرہ قطرہ زمین پر ٹپک رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دادی کے خراٹوں کی آواز مختصر سے خیمے میں ہر طرف پھیل گئی۔

ارنڈیرا ابھی سوئی نہیں تھی کہ اس کے بستر کے قریب خیمے کا کپڑا اٹھا کر حیران آنکھوں والا اولیس برآمد ہوا۔ لڑکی نے اسے واہمہ سمجھ کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ لیکن وہ بستر کے قریب اپنے

روشن چہرے سمیت موجود تھا۔ ارنڈیرا نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں اور سرگوشی میں بولی ''کون ہو تم''۔

''میرا نام اولیس ہے'' وہ آہستہ سے بولا اور جیب سے نوٹ نکال کر لڑکی کے سینے پر رکھ دیئے۔ ارنڈیرا نے رقم اسے واپس تھما دی۔

''تمہیں قطار میں اپنا نمبر لینا چاہیے تھا۔ اب صبح تک انتظار کرو۔ اس وقت تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرے کلیجے کو مل رہا ہے'' وہ نیم غنودگی کے عالم میں باتیں کر رہی تھی جیسے کوئی تھکی ہوئی بچی رات کو اپنا سبق دہراتی ہے۔

یکا یک وہ سہم گئی۔ دادی نے نیند میں بڑبڑانا شروع کر دیا تھا۔

''یہ بیس سال پرانی بات ہے۔ جب بارش ہوئی تھی، وہ بڑا ہولناک طوفان تھا، بارش اور سمندر نے مل کر بستی پر حملہ کر دیا تھا۔ اور صبح ہمارا گھر سمندری سیپوں اور مچھلیوں سے بھر گیا تھا۔ تمہارے دادا، اماڈیز نے ایک روشن شعاع دیکھی تھی جو ہوا کے سینے پر تیر رہی تھی۔''

اولیس پلنگ کی اوٹ میں ہو گیا۔ ارنڈیرا نرمی سے مسکرائی ''گھبراؤ مت، دادی یونہی بولا کرتی ہے، اطمینان رکھو، اگر آتش فشاں بھی پھٹ جائے اور زمین اچھلنے لگے تب بھی وہ اسی طرح سوتی رہے گی۔''

بہت دنوں بعد آج اس کے لبوں پر شدید، گہرا اور پر خلوص تبسم نمودار ہوا۔ وہ آہستگی سے بستر کی غلیظ چادر سمیٹنے لگی۔ اس نے لڑکے کو اشارہ کیا کہ وہ صاف چادر بچھانے میں اس کی مدد کرے۔

نئی اور شفاف چادر کو بستر پر بچھاتے ہوئے اولیس نے کئی مرتبہ ارنڈیرا کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔

''میں تمہیں دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ لوگ کہتے ہیں تم بہت حسین ہو، واقعی وہ سچ کہتے ہیں'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''لیکن میں تو آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہی ہوں۔'' ارنڈیرا دکھ سے بولی۔

''میری ماں کہتی ہے جو لوگ صحرا میں مرتے ہیں کبھی جنت میں نہیں جاتے۔ انکا ٹھکانہ سمندر ہوتا ہے۔'' اولیس بولا۔ ارنڈیرا نے سفید، بے داغ چادر کو درست کیا۔ ''میں نے کبھی سمندر نہیں دیکھا۔''

''وہ بھی صحرا ہوتا ہے، پانی سے بھرا ہوا''

''کیا لوگ اس پر چلتے ہیں'' وہ حیرانی سے بولی۔

''میرا باپ ایک ایسے آدمی کو جانتا ہے، جو سمندر پر چل سکتا تھا لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔'' اویس نے دادی کی طرف دیکھا۔ ارنڈیرا کی آنکھوں میں استعجاب تھا لیکن وہ سونا چاہتی تھی۔

''اگر تم کل صبح سویرے آجاؤ تو تمہیں لائن میں پہلی جگہ مل سکتی ہے۔''

''میں اس سے پہلے اپنے باپ کے ساتھ یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''کیا تم واپس نہیں آؤ گے۔''

''کسے پتہ ہے'' ہم تو راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلے تھے۔''

پھر ارنڈیرا نے جیسے فیصلہ کر لیا۔

''ٹھیک ہے، رقم نکالو''

وہ بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن اویس کھڑا رہا۔ وہ ہلکے ہلکے خوف سے کپکپا رہا تھا۔ اس کا ارادہ متزلزل ہونا شروع ہو گیا۔ ارنڈیرا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اپنی طرف کھینچا۔ اسے معصوم لڑکے کی بیچارگی کا احساس ہوا۔ وہ ایسے خوف سے آگاہ تھی۔

''کیا یہ تمہارا پہلا موقع ہے۔''

لڑکا چپ رہا اور شرمندگی سے مسکرا دیا۔ اس کی گردن جھک گئی۔

پہلی مرتبہ ارنڈیرا کے اندر ایک عورت نے سر اٹھایا۔

''گھبراؤ مت، پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر یہ معمول بن جاتا ہے۔''

اس نے اویس کو اپنے پہلو میں لٹا لیا، اس کے انداز میں پوری عورت کا خلوص تھا اور محبت کا برتاؤ۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''اویس''

''یہ غیر ملکیوں والا نام ہے۔''

''نہیں! یہ ملاحوں کا نام ہوتا ہے۔''

''تمہارے جسم میں کندن کی چمک ہے، لیکن اس میں پھولوں کی مہک ہے'' اس نے اویس کے دہکتے ہوئے ہونٹ اپنے سینے پر محسوس کیے۔

"شاید میرے جسم میں نارنگیوں کی خوشبو ہے" وہ جلتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اس لئے کہ ہم لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے پرندوں کا بیوپار کرتے ہیں مگر وہ حقیقت ہم سمگلر ہیں اور نارنگیاں سرحد پار پہنچاتے ہیں۔"

"لیکن نارنگیاں تو کوئی غیر قانونی چیز نہیں" ارنڈیرا حیرانی سے بولی۔

"بے شک، لیکن ان نارنگیوں میں ہر ایک کی قیمت پچاس ہزار پیسو ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تمہاری اسی سادگی پر مجھے پیار آتا ہے، تم بڑی معصومیت سے احمقانہ باتیں کرتے ہو۔"

وہ اپنے لہجے کی بے ساختگی پر حیران ہوئی۔ اولیس کی بے حد سادگی نے اسے چند لمحوں میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

اس گرم صحرائی رات میں ارنڈیرا کی ویران زندگی میں خوشی کا پہلا پھول کھلا۔

چند قدم پرے بڑھیا پرانا قصہ پھر دہرا رہی تھی۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب اوائل مارچ میں وہ تمہیں گھر لائے، تم سوت میں لپٹی چھپکلی کی طرح نظر آتی تھیں۔ تمہارا باپ، اماڈیز کس قدر خوش تھا۔ اس شام پھولوں سے لدے بیس چھکڑے منگوائے گئے۔ گلیاں پھولوں سے بھر دی گئیں اور تمہیں یاد ہے، پیلے پھولوں میں لپٹا گاؤں سنہری سمندر دکھائی دیتا تھا" وہ جوش سے چلا رہی تھی اس کی آواز میں تیزی تھی اور چیخیں تھیں۔

اولیس اس شب بڑھیا کی آواز سے بے خبر دہکتے ہوئے انگارے کی طرح چٹختا رہا۔ ارنڈیرا اس کی شریانوں میں دوڑتے لہو میں تیزاب کی طرح گھل کر طوفان مچا رہی تھی۔ اس وسیع صحرا میں گڑے مختصر خیمے کے اندر ارنڈیرا کسی سے عورت بنی اور اس نے پہلی مرتبہ کسی مرد کے لیے اپنے بدن کا قفل کھولا۔

وہ اصلاحی جماعت کے پادری تھے جو صحرا کے عین وسط میں، تیز بگولوں کے درمیان ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے۔ ہوا میں تندی تھی۔ اس طوفان میں وہ مشکل سے ریت پر قدم جمائے ہوئے تھے۔ ان کی بے ترتیب داڑھیاں گرد و غبار میں اٹی ہوئی تھیں۔ عقب میں اصلاحی مرکز کی وسیع پتھریلی عمارت تھی جس کی سفید دیواروں میں دبدبہ تھا۔

ایک نوجوان جو جماعت کا لیڈر تھا زور سے چلایا۔

''رک جاؤ، اس لکیر سے آگے قدم مت بڑھاؤ۔''

چار انڈین جنہوں نے کندھے پر لکڑی کی ڈولی اٹھا رکھی تھی رک گئے۔ گرد اور پسینے میں لتھڑی بڑھیا نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور ڈولی سے سر نکال کر بولی'' یہ صحرا تمہاری ملکیت نہیں ہے۔'' ایک نوجوان آگے بڑھا۔

''یہ خدا کی ملکیت ہے۔ لیکن تم اپنے ناپاک کاروبار سے اس کی مقدس قانون کی توہین کر رہی ہو۔''

سر پر چھاتہ تانے ارنڈیرا، اس کے پیچھے سائیکل سمیت فوٹو گرافر اور سر پر سامان کے تھیلے اٹھائے چاروں انڈین مزدور خاموش کھڑے تھے۔ بڑھیا نے فوراً اصلاحی جماعت کی طاقت کا اندازہ کر لیا، وہ ان کے اختیارات سے باخبر تھی۔

''میرے بیٹو! مجھے تمہارا یہ انداز سمجھ میں نہیں آیا'' وہ شائستگی سے مخاطب ہوئی۔

پادری نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ابھی نابالغ ہے۔''

''لیکن یہ میری پوتی ہے۔''

''یہ اس سے بھی برا ہے، اسے ہماری تحویل میں رہنا ہو گا۔ اور ہمیں اس کا طریقہ بھی معلوم ہے۔'' مشنری غصے سے بولا۔

''اچھی بات ہے۔ میں واپس جاتی ہوں۔ لیکن جلد ہی تمہیں مجھے گزرنے کا رستہ دینا ہو گا۔''

اس واقع کے تین روز بعد بڑھیا اور ارنڈیرا اپنے خیمے میں محو خواب تھیں کہ چھ ہٹے کٹے انڈین اندر داخل ہوئے۔ بغیر آواز پیدا کئے انہوں نے ارنڈیرا کو ایک مچھر دانی میں لپیٹا اور کسی قسم کا شور کئے بغیر گہری نیند میں ڈوبی بڑھیا کو اکیلا چھوڑ گئے۔

اگلے چند روز میں بڑھیا نے لڑکی کی بازیابی کے لئے ہر جتن کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ وہ علاقے کے حاکم کے پاس گئی جو ایک فوجی افسر تھا اور شفاف آسمان پر اڑتے آوارہ بادلوں کو اپنی بندوق سے نشانہ بنا رہا تھا۔ وہ دراصل کالے بادلوں کو بندوق کی گولی سے بارش برسانے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔

لیکن یہ سب لاحاصل تھا۔ وہ سخت جھنجھلایا ہوا تھا جب بڑھیا نے اپنی درخواست پیش کی۔

''میں کچھ نہیں کر سکتا، پادری اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ وہ لڑکی اس وقت تک گرجے

میں رہے جب تک کہ وہ بالغ نہیں ہو جاتی یا اس کی شادی نہیں ہو جاتی'' وہ بولا۔

''تو پھر انہوں نے تمہیں میئر کیوں بنا رکھا ہے'' بڑھیا نے غصے سے پوچھا۔

''تاکہ میں ان کے لئے بارش کا انتظام کر سکوں'' وہ تحمل سے بولا۔ اس نے آسمان کو دیکھا، بادلوں کے ٹکڑے دور جا چکے تھے۔ اب وہ بڑھیا کی طرف متوجہ ہوا۔

''اس کام کے لئے تمہیں ایک ضمانتی کی ضرورت ہے، جو تمہارے اچھے چال چلن کی ضمانت دے سکے! کیا تم سینٹر اونساموساینچیز سے واقف ہو۔''

تپتے سورج میں جھلستی بڑھیا نے نفی میں گردن ہلائی۔

''میں ایک غریب عورت ہوں، اس وسیع صحرا میں میرا کوئی نہیں۔''

میئر نے ہمدردی سے بڑھیا کو دیکھا۔

''پھر وقت ضائع مت کرو، اماں! کیوں اس جہنم کی گرمی میں سڑتی ہو۔''

وہ ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ اس نے گرجے کے سامنے اپنا خیمہ نصب کیا اور سوچ میں کھو گئی۔ بڑھیا کی حالت اس تنہا سپاہی کی سی تھی جو کسی ناقابلِ شکست شہر کے محاصرہ کے لئے آیا ہو۔

آگ برساتی دوپہر میں فوٹو گرافر اپنا ساز و سامان سائیکل کے کیرئیر پر رکھے اسے الوداع کہنے آیا۔ بڑھیا نے گرجے کی عمارت کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

دیکھتے رہو! کون شکست مانتا ہے، میں یا وہ۔''

''وہ گزشتہ تین سو سال سے یہاں ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ بہر حال، خاتون۔ الوداع! میں جا رہا ہوں۔''

اس وقت بڑھیا نے پہلی مرتبہ سائیکل کی طرف دیکھا ''تم کہاں جاؤ گے۔''

''ہوا جدھر لے جائے، یہ دنیا بڑی وسیع ہے۔'' اور وہ چلا گیا۔

''نادان! دنیا اتنی بھی بڑی نہیں جتنا تم سمجھتے ہو، چیزیں گھوم پھر کر اکثر واپس آ جاتی ہیں'' وہ بڑبڑانے لگی۔

بڑھیا نے اسی عالم میں بہت سی پتھریلی دوپہریں اور وحشی راتیں گزار دیں۔

ایک رات بڑھیا نے بے آواز ٹرکوں کا قافلہ دیکھا جو اس کے خیمے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ان کی نقل و حرکت بڑی مشکوک تھی۔ مدہم بلبوں کی روشنی میں وہ ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں بڑے پراسرار انداز میں چل رہے تھے۔

بڑھیا کو انہیں پہچاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ایسے ہی ٹرک اس کے شوہر اماویز کے پاس

بھی تھے۔ وہ تیزی سے خیمے کے باہر آ گئی۔ قافلے کا آخری ٹرک ہلکی سی آواز کے ساتھ رک گیا۔ ایک آدمی کیبن سے نکل کر جلدی سے پیچھے آیا اور ٹارچ کی روشنی میں سامان کا جائزہ لینے لگا۔

بڑھیا حیران رہ گئی وہ ہو بہو امادیز کا ہمشکل تھا۔ ماتھے پر لٹ جھکائے اور چھاتی پر کارتوسوں کی پیٹی باندھے وہ تیزی سے واپس مڑا تو سامنے بڑھیا نے اس کا راستہ روک لیا۔

''تم مجھے پہچانتے ہو! میں کون ہوں'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

سرچ لائٹ بڑھیا کے چہرے پر پھیل گئی۔ اور چالاک آنکھوں نے اس کا چند سیکنڈ تک جائزہ لیا۔ پھر روشنی گل ہوگئی۔

''ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ تم صحرا کی کوئی لازوال دوشیزہ البتہ نہیں'' وہ غصے سے بولا۔ بڑھیا مسکرائی اس کی آواز مترنم تھی۔

''میں عظیم امادیز کی بیوی اور اس کے بیٹے کی ماں ہوں۔''

''پھر یقیناً تم عالم بالا سے تشریف لائی ہو، مسئلہ کیا ہے'' اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم میری پوتی، امادیز کی پوتی اور اس کے بیٹے امادیز کی بیٹی کی رہائی میں میری مدد کرو جسے مشن والے اغوا کر کے لے گئے ہیں۔''

''افسوس ہے خاتون! تم نے غلط دروازے پر دستک دی ہے، ہم خدا کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے'' ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ٹرک آگے بڑھ گیا۔ صبح تک بڑھیا کرب کے عالم میں بستر پر پہلو بدلتی رہی۔ اس کی آنکھ ایک پل کو نہ لگ سکی۔ وہ اس کشادہ حویلی کے متعلق سوچتی رہی۔ جہاں سرخ پھول تھے اور وہ خوش اور مطمئن تھی۔ اس کا دل ڈوبنا شروع ہوتا تو وہ ماضی کو یاد کرنے لگتی۔

گرجے میں صبح کی گھنٹیاں بجیں تو اسے احساس ہوا کہ دن نکل آیا ہے۔ ''شاید، مجھے یقین ہے۔'' وہ سوچنے لگی ''ارنڈیرا اس وقت گرجے کی بے رحم دیواروں کے پرے فرار ہونے کی ترکیب سوچ رہی ہوگی'' اس کا دل کچھ مطمئن سا ہوگیا۔ اور وہ اٹھ کر باہر سورج کی کرنوں میں بھیگی گرجے کی عمارت کو دیکھنے لگی۔

انہوں نے ارنڈیرا کے خوبصورت بال کاٹ دیئے تھے۔ اور اب اس کا سر کانٹے دار برش کی طرح نظر آتا تھا۔ وہ راہباؤں والی لمبی اور کھردری عبا پہنے دن بھر برش اور بالٹی لئے گرجے کی سیڑھیوں پر سفیدی کرتی۔

یہ تکلیف دہ کام صبح سے شام تک پُر تھکن یکسانیت سے جاری رہتا۔ مشن کی وسیع عمارت

میں زندگی اپنے ان گنت چہروں سمیت اس کے سامنے تھی۔ وہ یہاں اکیلی نہیں تھی۔ اس جیسی بے شمار لڑکیاں صحرا کے سینے پر منجمد اس عمارت میں موجود تھیں۔ ارنڈیرا سمجھ چکی تھی کہ مشن شیطان کے نہیں بلکہ صحرا کے خلاف سپر انداز تھا۔ مشن کی دنیا میں طرح طرح کے لوگ رہتے تھے۔ یہاں صحرا کے انڈین اور مدقوق راہباؤں سے لے کر سور اور بکریاں اور موت کے منظر سے محظوظ ہونے والی عورتیں، سب موجود تھے۔

اس ہمہ رنگ، لیکن افسردہ ماحول میں ارنڈیرا خوف اور زندگی کے شور کے درمیان سائے کی طرح بھٹکتی پھر رہی تھی۔ لیکن چپ تھی اور حیران تھی۔ ایک روز وہ بالٹی میں چونا گھول رہی تھی جب ستار کی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز صحرا کے شعلہ رنگ آفتاب سے زیادہ روشن تھی۔ وہ آواز کی سمت چل پڑی۔ عمارت کا یہ حصہ اس کے لئے اجنبی تھا۔ کشادہ ہال کے وسط میں پیانو پر ایک حسین راہبہ بیٹھی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی سنسان دوپہر اسی طرح گزر گئی۔ کھانے کی گھنٹی بجی تو وہ پلٹ آئی۔ اس شام جب ارنڈیرا نے سفیدی کا کام ختم کیا اور آنے جانے والوں کی آوازیں معدوم ہوگئیں تو اس نے خاموشی کی مہر کو توڑا، جسے کوئی نہ سن سکا "میں یہاں خوش ہوں۔" یہ بڑھیا کی خوش فہمیوں کا اختتام تھا کہ ارنڈیرا جلد فرار ہو کر اس سے آملے گی۔

بڑھیا تندہی سے ارنڈیرا کی بازیابی کے لئے کوششیں کر رہی تھی۔ کامیابی کی کوئی صورت دکھائی نہ پڑتی تھی۔ اسی اثناء میں تہوار کا دن آپہنچا۔ انہی دنوں مشن کے رضا کار ٹرکوں پر سوار صحرا کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔

اور ان باج گزار جسموں والی کنیزوں کو تلاش کر رہے تھے۔ جن کے شکموں میں اپنے آقاؤں کی ہوس کے کیڑے جوان ہو رہے تھے۔

بڑھیا بہت دنوں سے ٹرکوں پر لدی حاملہ لڑکیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جنہیں رضا کار صحرا کے عفریت سے چھڑا لائے تھے۔ اور اب ان کی شادیاں ہونے والی تھیں۔ پھر تہوار والے دن اسے موقع مل گیا۔

ایک ہجوم تہوار کے مقام کی طرف رواں دواں تھا۔ بے بس حاملہ لڑکیوں نے اپنے چہرے نقابوں میں چھپا رکھے تھے۔ اور ان کے ہاتھ شفاف کپڑوں والے مردوں نے تھام رکھے تھے۔ چند لمحے بعد اجتماعی شادی کی تقریب ہونے والی تھی۔

جلوس کے آخر میں معصوم چال والا ایک لڑکا تھا جس نے ایسٹر کی شمع تھام رکھی تھی۔ بڑھیا نے لڑکے کو آواز دی۔

''لڑکے! ذرا میری بات سنو'' اس کی آواز میں اپنائیت تھی۔ ''تم یہاں کب لئے آئے ہو۔''

لڑکا بے زاری سے رک گیا۔ وہ ہاتھ میں تھامی شمع کی وجہ سے کچھ الجھن محسوس کر رہا تھا۔

''پادری آج میری بخشش کی دعا کریں گے۔''

''وہ تمہیں کتنے پیسو دیتے ہیں۔''

بڑھیا نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور بیس پیسو کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''یہ تمہاری بخشش کی خوشی میں نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ تم شادی کر لو۔''

''کس سے'' وہ تعجب سے بولا۔

''میری پوتی سے''

چنانچہ ارنڈیرا کی شادی اس اجنبی سے ہو گئی۔ جسے اس کی دادی نے صرف بیس پیسو میں خریدا تھا۔ بے یقین امید کی حالت میں اس نے خود کو بڑی مشکل سے شورزدہ زمین پر گرنے سے بچایا۔

میدان میں دو سو کنواریوں کے جسموں سے اٹھنے والا تعفن اور ساکت سورج کی آگ پھیلی جا رہی تھی۔ با آواز بلند لاطینی زبان میں سینٹ پال کی تقریر پڑھی جانے لگی۔

مشن کے رضا کاروں نے بے بسی سے ارنڈیرا کی طرف دیکھا جو لحظہ لحظہ اندیشوں کے سمندر میں ڈوب رہی تھی وہ اسے مشن میں رکھنے کی یقین دہانی کے سوا کچھ پیش کرنے سے معذور تھے۔

مقدس دن کے ہنگامے ختم ہوئے تو اپنے نئے شوہر شہر کے فوجی میئر اور بے حس بڑھیا کے نرغے میں ارنڈیرا نے خود کو پھر اس سحر کی گرفت میں پایا جو روزِ اول سے اس کا مقدر تھا۔ جب نئی زندگی کے بارے میں اس کی مرضی پوچھی گئی تو ارنڈیرا نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بڑے اعتماد سے کہا۔

''میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

پھر اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا۔

''لیکن اس کے ساتھ نہیں، اپنی دادی کے ساتھ۔''

اولیس کی پوری شام ایک نارنگی چرانے کی کوشش میں ضائع ہو گئی لیکن اپنی ماں اور باپ کی

کڑی نگرانی کے باعث اس نے یہ ارادہ اگلے دن تک کے لئے ملتوی کر دیا۔

وہ اپنے باپ کے ہمراہ نارنگی کے پودوں کی شاخیں کاٹ رہا تھا اور اس کی ماں باغ کے کونے میں کرسی پر بیٹھی اپنی چابک دست نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک توانا اور بھرپور عورت تھی جو قبائلی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے اطوار میں دبدبہ اور شان تھی۔

جب وہ درخت کاٹنے کے اوزار لئے گھر میں داخل ہوا تو اس کی ماں کی دوا کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ میز کی طرف بڑھا اور اطمینان سے پانی کا گلاس اٹھا کر ماں کو تھما دیا۔ پانی کا رنگ سرخ ہو چکا تھا پھر اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دوا کی شیشی اٹھائی۔ دوا کا رنگ گہرا سبز ہو گیا۔ ماں غور سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ جاگ رہی ہے اور یہ سب حقیقت میں وقوع پذیر ہوا ہے تو ہوشیار عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''یہ سب تمہارے ساتھ کب سے ہو رہا ہے۔''

اس نے قبائلی زبان میں پوچھا۔

''جب سے ہم صحرا سے واپس آئے ہیں، لیکن ایسا صرف شیشے کی چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے'' اولیس نے جواب دیا، اور پھر اس نے شیشے کے برتنوں کو باری باری اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا، جن کے رنگ تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔

''ایسا تو صرف اس وقت ہوتا ہے۔ جب کوئی محبت میں گرفتار ہو جائے، کون ہے وہ؟'' جہاندیدہ ماں متفکر ہو گئی۔

اولیس چپ رہا۔ اس کا باپ کمرے کے باہر نارنگیوں کی ٹوکری اٹھائے گزرا تو ذرا ٹھہر گیا۔ ولندیزی میں وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں'' وہ قبائلی زبان سے واقف نہیں تھا۔

''کوئی خاص نہیں'' اولیس نے آہستہ سے کہا۔

جب اولیس کا باپ وہاں سے چلا گیا تو وہ پھر اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئی ''تمہارا باپ کیا پوچھ رہا تھا۔''

''کوئی خاص نہیں۔''

ماں لڑکے کی حالت سے جلد از جلد آگاہ ہونا چاہتی تھی۔

''تم مجھے بتاؤ! وہ کون ہے''

''وہ کوئی بھی نہیں ہے۔'' اولیس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا، جہاں اس کا باپ

اپنے دفتر میں نارنگیوں کو ترتیب سے تجوری میں رکھ رہا تھا۔

''تم نے تو بہت دنوں سے روٹی نہیں کھائی۔''

''مجھے پسند نہیں۔''

ماں حیرت سے چیخ پڑی۔

''تم جھوٹ بولتے ہو، جو لوگ محبت میں گرفتار ہو جائیں روٹی نہیں کھا سکتے۔'' اس کی آواز میں یقین تھا اور لہجے میں تندی۔

''مجھے بتاؤ وہ کون ہے'' یہ بہت ہے، ورنہ مجھے تمہارے علاج کے لیے ایک خاص غسل کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

اولیس نے اپنی نگاہیں تجوری سے ہٹا لیں اور ماں کی طرف دیکھا، اس کا باپ نارنگیوں کو بند کر کے چابی جیب میں ڈال چکا تھا۔

''اماں یہ سچ ہے، وہ کوئی بھی نہیں۔ تم پاپا سے اس کی تصدیق کر سکتی ہو۔''

ولندیزی بغل میں انجیل مقدس دبائے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مطمئن تھا اور ملاحوں والا پائپ اس کے دانتوں تلے دبا ہوا تھا۔

عورت نے ہسپانوی میں اپنے شوہر سے پوچھا۔

''تم صحرا میں کس سے ملے تھے۔''

وہ کمرے کے آخری سرے کی طرف بڑھا جہاں کرسیاں رکھی تھیں۔

''کسی سے بھی نہیں، اگر یقین نہیں آتا تو اولیس سے تصدیق کر لو۔'' وہ بلند آواز سے انجیل مقدس کا ورد کرنے لگا۔

اولیس آدھی رات تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر فیصلے کی گھڑی آ پہنچی اور اس کا ذہن صاف ہو گیا۔

پرندوں سے بھرا ٹرک جب درختوں کے گنج سے آگے نکل آیا تو اولیس نے جیب سے وہ تین نارنگیاں نکالیں جنہیں وہ اس شام چرانے میں ناکام رہا تھا۔ صبح صادق سے پہلے وہ صحرا عبور کر آیا تھا۔

راستے کے سارے قصبوں میں وہ ارنڈیرا کے متعلق پوچھتا رہا تھا۔ لیکن کسی کو اس کا پتہ معلوم نہ تھا۔ آخر کار اسے اطلاع ملی کہ وہ سینیٹر سانچیز کی انتخابی گاڑی میں سفر کرتی پائی گئی ہے۔ اور اس وقت نیوا کاستلا میں مقیم ہے۔

اویس کو وہاں بھی ناکامی ہوئی جب اسے پتہ چلا کہ اب وہ سینیٹر کے ہمراہ نہیں کیونکہ اس عرصے میں بڑھیا نے سینیٹر سے اچھے چال چلن کا ضمانت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ وہ صحرا میں کھلے بندوں اپنا دھندہ دوبارہ شروع کر چکی تھی۔

تیسرے دن اویس کی ملاقات ڈاک کے ہرکارے سے ہوئی جس کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ بڑھیا لڑکی سمیت سمندر کی طرف نکل چکی ہے اور اب اس کا ارادہ اروبا کے جزیرے کو جانے کا تھا۔

وہ دوپہر تک سفر کرتا رہا۔ فیصلے کی طنابوں کو دیکھ کر اویس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ فوٹو گرافر اپنے کیمرے اور بائیسیکل سمیت واپس آ چکا تھا۔ دنیا واقعی اتنی وسیع نہیں تھی جتنی کہ وہ سمجھتا رہا تھا۔ سازندوں کا ایک گروہ خیمے کے باہر اپنی باری کے منتظر تماش بینوں کا دل بہلانے کے لئے تیز دھنیں بجا رہا تھا۔ وہ قطار میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

خیمے کی دنیا بہت بدل گئی تھی۔ بڑھیا کا پلنگ اپنی آن بان کے ساتھ کئی چادر سمیت موجود تھا۔ فرشتے کی شبیہ اور عظیم امادیز کی ہڈیوں والا صندوق پرانی جگہ پر رکھے تھے۔ شیر کی ٹانگوں والے غسل کے ٹب کے قریب اپنے لئے بستر پر بچپن کی معصوم حیرت چہرے پر سجائے برہنہ ارنڈیرا موجود تھی۔

ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ سو رہی تھی۔

وہ آہستگی سے اس کے قریب جا کر رک گیا۔

''آندرعا'' وہ اسی نام سے اب تک اسے یاد کرتا رہا تھا۔

ارنڈیرا جاگ اٹھی۔ اس نے اویس کو دیکھ کر جلدی سے اپنا عریاں بدن چادر میں چھپا لیا۔

''میری طرف مت دیکھو! میری حالت قابل نفرت ہے۔''

''تم نارنگیوں سے بھی بڑھ کر رنگین ہو'' اس نے ایک نارنگی اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی ''دیکھو!''

ارنڈیرا نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ اویس کے ہاتھوں میں اس کے بدن کا رنگ چمک رہا تھا۔

''بس! اب تم چلے جاؤ'' وہ سسکتے ہوئے بولی!

''میں صرف تمہیں نارنگیاں دکھانے آیا تھا، دیکھو!'' اویس نے نارنگی کا پیٹ چاک کر دیا اور ارنڈیرا نے دیکھا، چھلکے کے اندر ایک اصلی ہیرا جگمگا رہا تھا۔

''یہ وہ نارنگیاں ہیں جنہیں ہم سرحد پار لے جاتے ہیں۔ اور ایسی صرف تین نارنگیاں ہوں تو ہم دونوں دنیا کی سیر کو نکل سکتے ہیں۔''

ارنڈیرا کی آنکھوں میں استعجاب ابھرا۔ وہ بول رہا تھا۔

''اس کے علاوہ میرے پاس ایک ٹرک بھی موجود ہے'' اس نے رک کر گریبان میں ہاتھ ڈالا۔

''اور یہ پستول ہے۔''

''میں مزید دس سال یہاں سے نہیں نکل سکتی'' ارنڈیرا نے تاسف سے کہا۔

''تم چلو گی، آج ہی رات! جب سفید وہیل سو جائے تو میں الو کی آواز نکال کر تمہیں پکاروں گا۔''

اس نے الو کی آواز نکال کر اسے سمجھایا۔

ارنڈیرا کی اداس آنکھیں مسکرانے لگیں۔

''وہ میری دادی ہے'' ارنڈیرا بولی۔

''کون الو!''

''نہیں سفید وہیل''

ان کا قہقہہ خیمے میں گونجا اور ارنڈیرا پھر سنجیدہ ہو گئی۔

''تمہیں پتہ ہے، کوئی بھی اپنی دادی کے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔''

''یہ سب بے کار باتیں ہیں'' وہ بولا۔

''وہ ہمیں ہر صورت میں تلاش کر لے گی، وہ خواب میں سب کچھ دیکھ سکتی ہے'' ارنڈیرا کی آواز میں خوف تھا۔

''جب اسے تمہارے فرار کا خواب آئے گا تو ہم اس وقت تک سرحد پار کر چکے ہوں گے۔ ہم سمگلروں کی طرح چھپ کر جائیں گے۔'' اولیس نے اعتماد سے کہا اور کسی فلمی ہیرو کی طرح جیب سے پستول نکال کر ہوا میں لہرا دیا۔ وہ ارنڈیرا کو ہر صورت اپنے منصوبے کی کامیابی کے بارے میں مطمئن کرنا چاہتا تھا۔

ارنڈیرا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پیغام تھا۔ اس نے اولیس کا بوسہ لیا۔ خیمے سے باہر جانے کا اشارہ پا کر اولیس نے سرگوشی کے عالم میں پھر دہرایا۔

''یقین رکھو ارنڈیرا، ہم کل سمندری سفر پر روانہ ہو چکے ہوں گے۔''

اس رات اریندیرا اپنی دادی کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی جب بادِ بے مہر نے خاموشی سے خیمے کی دیواروں پر دستک دی۔

بڑھیا کے قریب سازندوں کا لیڈر اور انڈین ملازمین کھڑے تھے۔ وہ ادائیگی کے منتظر تھے۔ بڑھیا نے اطمینان سے رقم شمار کی اور انڈین ملازمین کے نمائندہ سے مخاطب ہوئی۔

"تمہارا ایک ہفتہ کا معاوضہ بیس پیسو بنتا ہے، ذرا حساب تو کرو! آٹھ پیسو کھانے کے تین پیسو کا پانی، پچاس سینٹ کی نئی قمیض، یہ آٹھ سو پچاس ہوئے۔"

بوڑھے انڈین نے رقم گنی، اور شکریہ ادا کر کے باہر چلا گیا۔ سازندوں کا لیڈر آگے بڑھا۔ پھر فوٹو گرافر کا نمبر آیا۔

"اچھا لڑکے تم بتاؤ، کیا تم موسیقاروں کے معاوضے میں اپنا حصہ ادا کرو گے۔"

"گانے بجانے کا میری تصویروں سے کوئی تعلق نہیں" اس نے بڑھیا کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ اور احتیاط سے کیمرے کے شیشے صاف کرتا رہا۔

"لیکن موسیقی کی وجہ سے لوگوں کو تصویر بنوانے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔" بڑھیا نے جرح کی

-

"تصویریں بچھڑے ہوئے لوگوں کی یاد دلاتی ہیں۔ اس لئے وہ آنکھیں بند کر کے میرے پاس چلے آتے ہیں" فوٹو گرافر کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"خیر خیر، مختصر بات یہ ہے کہ سینیٹر سانچیز کی مہربانی سے یہ کام چل رہا ہے۔ اور سازندوں کا بھی ہماری کامیابی میں بڑا حصہ ہے" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ وہ غراتے ہوئے بولی۔

"اگر تم اپنا حصہ ادا کر دو تو بہتر ہے، ورنہ تمہیں اجازت ہے، جہاں چاہو جا کر قسمت آزمائی کر سکتے ہو، یہ صرف اس مجبور لڑکی کی ذمہ داری نہیں کہ سارے اخراجات تنہا برداشت کرتی پھرے۔"

فوٹو گرافر نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا، خاتون، میں جاتا ہوں، میں فنکار ہوں اور دنیا وسیع ہے۔"

بڑھیا سازندے کی طرف مڑی۔

"دو سو چون نغمے، پچاس سنٹ کے حساب سے کل رقم ایک سو چھبن پیسو ہوئی اس میں اتوار اور تعطیلات کا دس منٹ فی گیت اضافہ بھی شامل ہے۔"

اس کو رقم پر اعتراض تھا۔

"خاتون! یہ ایک سو اسی پیسو بنتے ہیں" آپ کو تو پتہ ہے۔ غمگین گیتوں کا معاوضہ زیادہ ہوتا ہے۔"

بڑھیا بحث سے اکتا گئی تھی۔

"فی الحال تم یہ رکھو اور اگلے ہفتے سے تم صرف خوشی کے گیت سناؤ، ہمارا حساب ٹھیک رہے گا۔"

سازندہ بڑھیا کی منطق سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن اس نے رقم قبول کر لی۔ اس لمحے ہوائے تند کے جھونکوں نے خیمے کی طنابیں ہلا کر رکھ دیں۔ باہر اداس اور شفاف آسمان کے نیچے کسی الو کے بولنے کی آواز آئی۔ کشمکش کے عالم میں ارنڈیرا نے جب رقم کا تھیلا بستر کے نیچے رکھا تو دادی نے اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ محسوس کی۔

"گھبراؤ مت بچی، طوفانی راتوں میں الو بولا ہی کرتے ہیں۔"

فوٹو گرافر اپنے کیمرے سمیت خیمے سے نکلا تو بڑھیا نے اسے روک لیا۔

"آج صحرا میں موت بڑی بے لحاظ ہوگی، تم رک سکتے ہو، اس لئے کہ میں اب بھی تمہیں پسند کرتی ہوں"

"لیکن میں سازندوں کو ایک پائی بھی ادا نہیں کروں گا" وہ اب تک ناراض تھا۔

نہیں، یہ تم پھر غلط بات کہتے ہو" بڑھیا نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"یاد رکھو خاتون! تمہیں کسی سے بھی محبت نہیں ہے۔" وہ زور سے بولا۔

بڑھیا زرد ہوگئی اور غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا۔

"بدذات کمینے، دفع ہو جاؤ"

اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ ارنڈیرا نے دادی کو بستر پر لٹا دیا، لیکن وہ مستقل فوٹو گرافر کو کوس رہی تھی۔

"حرامزادہ! اسے کسی کے جذبات کا خیال نہیں۔"

ارنڈیرا نے بڑھیا کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا الو کی آواز صحرا میں وقفوں سے گونج رہی تھی اور وہ بے یقینی اور گومگو کی حالت میں ریزہ ریزہ ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب بڑھیا کچھ پر سکون ہوئی تو اس نے وہی پرانا ہدایت نامہ دہرانا شروع کیا جسے ارنڈیرا اماویز کی حویلی سے سنتی آئی تھی۔ وہ حسب عادت "اچھا دادی، ٹھیک ہے" کہتی رہی اور بڑھیا کے خراٹے بپھری ہوئی صحرائی آندھی کے ساتھ ساتھ ہوتے چلے گئے۔

ارنڈیرا نے دو موم بتیاں امادیز کی یاد میں جلائیں اور بڑھیا کی طرف دیکھا۔ وہ نیند میں ہذیان بکنا شروع ہو گئی تھی۔ اسے سکون محسوس ہوا۔

''دادی اب نہیں جاگے گی۔''

بگولے خیمے کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ اس دفعہ بھی بے خبر تھی۔ اسے بادِ بے مہر کی آمد کا کبھی علم نہ ہو سکا۔

الو کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ خیمے کے باہر فوٹو گرافر اپنا سامان سائیکل کے کیریئر پر باندھ رہا تھا۔ وہ خوف سے لرز گئی۔

''وہ مسکرایا''

''مجھے کچھ پتہ نہیں، میں نے کچھ نہیں دیکھا، اور میں سازندوں کو ایک کوڑی ادا نہ کروں گا''

ارنڈیرا کا دل تشکر اور احسان مندی سے بھر گیا۔ اس نے ہرنی کی طرح زقند بھری اور صحرا میں گم ہو گئی۔

بڑھیا نے سینیٹر سانچیز کا خط مقامی حاکم کے سامنے رکھ دیا۔ اولیس کا باپ دروازے پر اسکا منتظر تھا۔

''یہ سین؟ سینیٹر سانچیز کا سفارشی خط ہے۔''

بغیر کسی توقف کے مقامی حاکم نے جو علاقے کا کمانڈر تھا۔ اپنے آدمیوں کو احکامات جاری کرنے شروع کیے۔ چند منٹ بعد وہ فوجی ٹرک میں سرحد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آندھی نے صحرائی راستے کے سب نشان مٹا ڈالے تھے۔ کمانڈر اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔

ٹرک کے پچھلے حصے میں ولندیزی اور بڑھیا سوار تھے، ان کے ساتھ رائفل بردار سپاہیوں کا جتھا تھا۔

قصبے کے قریب ٹرکوں کا ایک قافلہ رکا ہوا تھا۔ کمانڈر نے ان سے اولیس کے بارے میں دریافت کیا۔

''ہم تمہارے مخبر نہیں ہیں۔ ہم لوگ سمگلر ہیں'' پہلے ٹرک کا ڈرائیور غراتے ہوئے بولا۔

کمانڈر نے اپنے اردگرد پھنکارتی ہوئی مشین گنوں کی نالیاں محسوس کیں۔

وہ مسکرایا ''تمہیں کم از کم دن دیہاڑے تو اس قسم کا کام نہیں کرنا چاہیے'' قافلے کے آخری ٹرک کے بمپر پر لکھا تھا۔

''ارنڈیرا میں تمہیں اب بھی یاد کرتا ہوں''

وہ شمال کی جانب سفر کر رہے تھے، ہوا خشک تھی اور سورج برہم۔ سب سے پہلے بڑھیا کی نظر فوٹو گرافر پر پڑی۔ وہ سڑک پر تیز قدموں سے سائیکل چلاتا جا رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے اس نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ بڑھیا چیخی۔

''روکو روکو! یہ بھی انکا ساتھی ہے۔''

کمانڈر نے ٹرک رکوایا اور ایک سپاہی کو فوٹو گرافر کو پکڑنے کا حکم دیا۔ ''اسے یہیں روکو، ہم ابھی واپس آتے ہیں''

بڑھیا نے ٹرک کے پچھلے حصے سے دیکھا۔ فوٹو گرافر نے سپاہی کی آواز نہیں سنی تھی ہوا تیز تھی اور وہ انہماک سے شمال کی جانب بڑھ رہا تھا، ٹرک کے پیچھے پیچھے۔

پھر ایک فائر ہوا اور مرنے سے پہلے فوٹو گرافر کے چہرے پر حیرت زدہ اذیت نمودار ہوئی وہ یہ تک نہ دیکھ سکا کہ گولی کدھر سے آئی تھی۔

دوپہر سے پہلے پرندوں کا ایک غول نظر آیا۔ ولندیزی نے اپنے پرندوں کو پہچانے میں بالکل دیر نہیں کی اور ڈرائیور نے ٹرک کی سمت تبدیل کر لی۔ گھنٹے بھر کے بعد سڑک کے افق پر اولیس کا ٹرک نظر آیا۔

فوجی ٹرک کو دیکھ کر اولیس نے گاڑی کی رفتار تیز کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بہت مشکل تھا۔

ارنڈیرا جو اولیس کے کندھے سے سر ٹکائے سو رہی تھی، جاگ اٹھی۔ اس نے تعاقب کرتے ٹرک دیکھے اور ایک معصوم عزم کے ساتھ اولیس کے جیب سے پستول نکال لیا۔

''بے کار ہے۔ یہ سر فرانسس کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔''

ارنڈیرا نے پستول کی لبلبی دبائی اور مایوس ہو کر اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ چند لحوں بعد فوجی ٹرک ان سے آگے نکل گیا اور پھر کچھ دور جا کر سڑک کے بیچ میں رک گیا۔ آگے جانے کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔

یہ اسی زمانے کا قصہ ہے جب میں پہلی مرتبہ اولیس اور ارنڈیرا کی تابناک محبت سے آشنا ہوا۔ لیکن میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا بس اتنا کافی ہے کہ رفائل اسکالون کے گیت میں ان کا تذکرہ سن کر میں نے یہ کہانی لکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں شہر شہر، انسائیکلوپیڈیا اور طب کی کتابیں بیچنے کا کام کرتا تھا۔ الوادو کاپیڈ ابھی میری طرح قریہ قریہ گھوم کر بیئر بنانے کے آلات بیچا کرتا تھا۔ وہی مجھے اپنے

ٹرک پر بٹھا کر صحرا کے قصبوں اور گاؤں سے گزرتا سرحد تک لے آیا۔

وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن ہم نے سارا راستہ بیئر پینے اور ہنسنے میں گزار دیا۔

اس سرحدی شہر میں وہ سفری قحبہ خانہ موجود تھا جس کے باہر کینوس کے اشتہاروں میں ارنڈیرا کے حسن و جمال کا ذکر موجود تھا۔ اور باہر ایک طویل قطار میں انواع و اقسام کے لوگ بیٹھے ارنڈیرا کے بے مثال قرب کے منتظر تھے۔

یہ شہر بھانت بھانت کے لوگوں سے آباد تھا۔ دنیا جہاں کے لوگ آ کر یہاں بس گئے تھے۔ شہر ناقابلِ فہم آوازوں اور جھلسا دینے والی گرمی کی گرفت میں تھا۔ انسانوں کے ہجوم میں ایک میز لئے بالکمان بیٹھا تھا اور تماشائیوں کو دعوت دے رہا تھا۔ کہ وہ اسے زہریلے سانپ سے ڈسوا کر اس تریاق کا کرشمہ دیکھیں جو اس نے خود تیار کیا ہے۔ وہیں وہ عورت بھی تھی جو اپنے والدین کی نافرمانی کے جرم میں مکڑی بنا دی گئی تھی، اور اسے صرف پچاس سنٹ کے عوض چھو کر دیکھا جا سکتا تھا اور جو قسمت کا حال درست بتاتی تھی۔ وہاں عالم بالا سے آئی ہوئی ایسی ہستیاں بھی موجود تھیں جو ہلاکت اور بربادی کی چمگادڑ کی آمد سے لوگوں کو مطلع کر رہی تھیں کہ دنیا میں قیامت کے آثار ہیں جن کا حال صرف وہی جانتے ہیں۔

پر پیچ گلیوں میں سے گزر کر ایک راستہ شہر کے قحبہ خانہ کو جاتا تھا یہ سارا علاقہ کسبیوں کے لئے مخصوص تھا۔ عورتیں اکتا دینے والی دوپہر میں مکانوں کی بالکونیوں پر کھڑی جمائیاں لے رہی تھیں۔ ان کے کمروں کی طرف آنے والے راستوں پر سناٹا کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ انتظار کی سیڑھیوں پر اونگھتے اونگھتے تھک گئی تھیں۔

ایک عورت نے بالکنی سے نیچے جھانکا جہاں ارنڈیرا کے خیمے کے سامنے لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہ زور سے چیخی۔

''ادھر آ جاؤ، وہاں کیا ہے جو ہمارے پاس نہیں''

''سینیٹر کا سفارشی خط'' کوئی شرارت سے بولا اور بہت سے قہقہے بلند ہوئے۔ وہ سب بالکنی پر اکٹھی ہو گئیں نیچے شور اٹھ رہا تھا۔

''یہ لائن کئی دنوں سے اتنی ہی لمبی ہے ذرا سوچو تو ہر آدمی کے پچاس پیسو'' ان میں سے ایک بولی۔ پہلی عورت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''میں ابھی جا کر دیکھتی ہوں کہ اس سات ماہ کی لونڈیا کے پاس کونسا پھول ہے، جو ہمارے بدن پر نہیں کھلتا۔''

وہ سب اس کے پیچھے ارنڈیرا کے خیمے کی طرف بڑھیں اور شور مچاتی اندر داخل ہو گئیں۔ انہوں نے وہاں موجود تماش بینوں کو دھکے مار مار کر باہر نکال دیا اور ارنڈیرا کو بستر سمیت سروں پر اٹھا کر باہر بازار میں نکل آئیں۔

بڑھیا اس اچانک یلغار سے بوکھلا گئی تھی۔ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اٹھا اور وہ بد حواسی میں سر پیٹنے لگی۔

''غنڈہ گری، یہ کھلی بد معاشی ہے، فاحشاؤں نے میرا گھر لوٹ لیا'' وہ لائن میں بیٹھے گاہکوں کی طرف مڑی۔''

''نامرادو، چپ بیٹھے ہو اور معصوم بچی پر اتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے، دفع ہو جاؤ یہاں سے، مردود، بے غیرت''

وہ چلاتی رہی اور لوگوں کو مدد کے لئے پکارتی رہی لیکن اس کی آواز ہجوم کے شور میں دب کر رہ گئی۔

ارنڈیرا بے بسی سے اپنی تضحیک کا یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں بڑھیا نے ایک زنجیر باندھ رکھی تھی جس کا دوسرا سرا پلنگ کے پائے سے بندھا تھا اور چابی بڑھیا کی جیب میں تھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک برہنہ بدن لڑکی جس کے پیر میں زنجیر بندھی تھی، کسبیوں کے جلوس کے سروں پر لاچار بیٹھی وحشی سورج کی سرخ کرنوں میں تماشا گاہ کی طرف جا رہی ہے۔''

شہر کی گلیوں اور بازاروں کا چکر کاٹنے کے بعد بالآخر عورتوں نے اس کا پلنگ چوک میں رکھ دیا۔ وہ شرمندگی اور ندامت سے چپ چاپ شہر کے بڑے چوک میں کھڑی دادی کا انتظار کرتی رہی اس کی آنکھ سے اس روز کوئی آنسو نہ گرا پھر کسی نے اس کے سہمے ہوئے بدن پر کپڑا ڈال دیا۔

یہ وہ موقع تھا جب میں نے ارنڈیرا کو پہلی بار دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بڑھیا کو یہاں قانون کا تحفظ حاصل ہے۔ اس واقعہ کے بعد میری معلومات کے مطابق وہ کسی ساحلی شہر کی طرف روانہ ہو گئیں کہ اب یہاں رکنا بڑھیا کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ اس فلاس زدہ شہر کے لوگ آہستہ آہستہ قلاش ہونا شروع ہو گئے تھے۔

بڑھیا کا قافلہ اپنی روایتی شان سے صحرا میں سفر کر رہا تھا۔ اس بار ان کے ہمراہ بیل گاڑیاں بھی تھیں جن پر تباہ شدہ حویلی کا شاندار ماضی لدا ہوا تھا۔ بڑھیا ڈولی میں سوار تھی۔ اس کا بدن کچھ اور موٹا ہو چکا تھا۔ اور پیٹ پر وہ تھیلا بندھا تھا جس میں سونے کی سلاخیں تھیں اس کے ساتھ زرق برق لباس میں ارنڈیرا تھی۔ اس کے پاؤں میں اب بھی زنجیر بندھی تھی۔

"تمہیں بددل نہیں ہونا چاہیے، تم نے شہزادیوں کا لباس زیب تن کر رکھا ہے، تمہارا بستر بے مثال ہے، اور انڈین ملازمین کی ایک فوج خدمت کے لئے موجود ہے، کیا یہ ایک شاندار زندگی نہیں ہے" بڑھیا اسے سمجھا رہی تھی۔

"جی دادی" ارنڈیرا نے جواب دیا۔

"جب میں باقی نہیں رہوں گی، تم ان بے حس مردوں کے رحم و کرم پر نہیں ہو گی۔ کسی بڑے شہر میں تمہارا عالی شان گھر ہو گا، تم آزاد اور خوش گوار زندگی گزار سکو گی۔"

یہ مستقبل کا ان دیکھا اور نیا تصور تھا جو بڑھیا نے ارنڈیرا کی سوئی ہوئی آنکھوں میں اتارنے کی کوشش کی لیکن اس طویل عرصے میں ان کے درمیان رقم سے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ارنڈیرا کے ذمے قرض کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لئے بڑھیا نے اخراجات میں بے تحاشا اضافہ کی شکایت کرنا شروع کر دی تھی۔ ارنڈیرا نے کبھی اس معاملے پر بات نہیں کی وہ چپ چاپ اس اذیت ناک زندگی کے بوجھ تلے دبی رہی۔ صحرا، قصبے، شہر اور گاؤں اس کے سامنے ہر جگہ زندگی کا ایک ہی رخ تھا! خیمہ اور پر تشدد دوپہروں میں گاہکوں کی قطار۔

ایک شام ہوا میں اجنبی سی مہک ابھری تو بڑھیا نے سرخوشی کے عالم میں ارنڈیرا کو مخاطب کیا۔

"یہ سمندری ہوا کی خوشبو ہے، جلاوطنی کے بے شمار سالوں کے بعد آج پھر میں نے اسے محسوس کیا ہے۔"

"جی دادی"

انہوں نے خیمہ وہیں نصب کر لیا۔ رات بڑھیا نے صحرا میں امادیز کے ہمراہ گزاری زندگی کو دہرایا اور صبح جب سمندری شور سے اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سامنے ان دیکھے مستقبل کا دلفریب منظر تھا۔ وہ نہاتے ہوئے بھی اسی خوش کن تصور کی بابت بولتی رہی۔

"تم ایک باوقار خاتون ہو گی، باصلاحیت، قابل تعظیم، لوگ تمہاری عزت کریں گے، جہازوں کے کپتان تمہیں نیک خواہشات سے بھرا کارڈ بھیجا کریں گے اور تم حکومت کرو گی۔"

ارنڈیرا اس کی باتیں نہیں سن رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے بڑھیا کے جسم پر صابن مل رہی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ٹیوب پکڑے اس پر پانی ڈال رہی تھی۔ خوشبودار پانی کی بوچھار بڑھیا کے جسم پر گری تو وہ پھر شروع ہوئی۔

"تمہارے عظیم الشان گھر کی تعریفیں دنیا بھر میں ہوں گی، یہ صدارتی محل سے زیادہ اہم

جگہ ہوگی ،اس لئے کہ قوم کی قسمت کے فیصلے تمہارے گھر پر ہوا کریں گے اور معاملات حکومت تم طے کروگی ۔''

ایک دم ٹیوب میں پانی آنا بند ہو گیا۔ارنڈیرا نے خیمے سے باہر جا کر دیکھا کہ معاملہ کیا ہے ،انڈین جو ٹیوب میں پانی ڈالنے پر مامور تھا بولا:

''پانی ختم ہو گیا تھا۔مزید پانی گرم ہو رہا ہے۔''

ارنڈیرا نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ابلتے ہوئے پانی کا برتن اٹھا کر ٹیوب کے منہ پر لے آئی ۔دفعتاً بڑھیا کی چیخ سنائی دی۔

''ارنڈیرا'' بڑھیا اس کی غیر حاضری سے گھبرا اٹھی تھی۔

''آئی دادی، میں پانی گرم کر رہی ہوں'' وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے منصوبے پر عمل نہ کر سکی۔

اس رات بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے بڑی شدت سے اولیس کو یاد کیا۔آواز اس کے سینے سے اٹھی لیکن لبوں تک نہ پہنچ سکی ''اولیس!''

اولیس کی آنکھ کھل گئی۔قریب ہی کہیں ارنڈیرا کی آواز گونج رہی تھی۔

چند لمحے بعد وہ کپڑوں کا تھیلا اٹھائے کمرے سے باہر نکل آیا۔راہداری عبور کرتے ہوئے اسے باپ کی آواز سنائی دی۔

''کہاں جا رہے ہو''

''باہر کھلی دنیا میں'' اس نے جواب دیا۔

''اس دفعہ میں تمہیں نہیں روکوں گا'' تم جاؤ لیکن یاد رکھو، ہر جگہ تمہارے باپ کی بددعا تمہارے ساتھ رہے گی۔''

''میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔''

ولندیزی نے حیرت سے اپنے بیٹے کو دیکھا اور پھر ہلکے سے غرور سے مسکرایا جب وہ گیٹ بند کر رہا تھا۔تو اس کی بیوی عقب میں کھڑی تھی۔

''وہ واپس آئے گا، تمہاری توقع سے بھی پہلے'' وہ مطمئن لہجے میں بولا۔

''تم احمق ہو! وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا'' انڈین عورت زیر لب بڑبڑائی۔

اولیس نے کسی سے ارنڈیرا کا پتہ نہیں پوچھا۔وہ شیشے کی عمارتوں والے ساحلی شہر میں اسے

آسانی سے تلاش کر سکتا تھا۔ اس نے چمکتی کرنوں میں عمارتوں کو ستاروں کی طرح جھلملاتے دیکھا ور بادبانی جہازوں کی آوازوں میں گھرے شہر میں ارنڈیرا کا خیمہ ڈھونڈ نکالا۔

ارنڈیرا زنجیر سے بندھی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اولیس کو پکارنے کے بعد کا سکون ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ اسی حالت میں رات کا پہلا پہر بیت گیا۔ جب ارنڈیرا کی آنکھ کھلی تو وہ اس وقت بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ ارنڈیرا نے اسے اپنے سینے میں چھپا لیا اس رات وہ اپنی بے نام خوشیوں کا استقبال خاموشی سے کرنا چاہتے تھے۔ خیمے کے دوسرے سرے پر بڑھیا کی کہانی جاری تھی۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب یونانی جہاز ساحل پر لنگر انداز ہوئے، وہ دیوانے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے، انہوں نے عورتوں کو خوشیاں دیں، لیکن ان کی جیبیں خالی تھیں۔ وہ سمندری جانوروں کا تحفہ ساتھ لائے تھے جو ہمارے دالانوں میں بیمار آدمیوں کی طرح کراہتے پھرتے تھے۔''

بڑھیا نے انگڑائی لی اور اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

''پھر وہ آیا، توانا، لمبا تڑنگا، خوبصورت، اسکا نام امادیز تھا۔''

اولیس جس نے اب تک بڑھیا کی بڑبڑاہٹ پر توجہ نہیں دی تھی گھبرا کر ارنڈیرا سے الگ ہو گیا۔

''گھبراؤ مت! یہ اس کی عادت ہے، کہانی کے اسی حصے میں یہ ہمیشہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے''

ارنڈیرا نے آہستہ سے کہا۔ اولیس نے اس کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

''میں ملاحوں کے ساتھ گیت گا رہی تھی جب ایسا لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو سب نے یہی سمجھا اور بھاگ گئے صرف وہ شامیانے کے نیچے تنہا رہ گیا، مجھے یوں لگا، ہم گا رہے ہیں، دالان میں خرگوش بھی میرے ہم آواز ہو گئے، اور ہر شے نے اس شب گیت گائے'' بڑھیا زور زور سے گیت کے بول دہرانے لگی، خدایا مجھے میری معصومیت لوٹا دے، تاکہ میں اس کی محبت کو روز اول کی طرح محسوس کر سکوں۔''

اولیس کو پہلی بار بڑھیا کی بڑبڑاہٹ میں دلچسپی ہوئی وہ بول رہی تھی۔

''ہاں وہ کھڑا تھا، کندھے پر آدم خوروں کو مارنے والی بندوق رکھے، مجھے اپنے چہرے پر اس کی گرم آنکھیں گھورتی محسوس ہوئیں، وہ کہہ رہا تھا'' میں نے تم سے خوش نظر، پرتحسین اور حسین عورت کہیں اور نہیں دیکھی، جو روئے زمین پر تم سب سے بڑھ کر ہو؟'' وہ پھر لیٹ گئی اور تکیے پر

سرٹکا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

طویل خاموشی کے بعد ارنڈیرا اپنی آواز میں کوئی تاثر پیدا کئے بغیر بولی۔

''اولیس! کیا تم دادی کو قتل کرنے کی ہمت کر سکتے ہو۔''

کچھ دیر اولیس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ کیا جواب دے!

''کیا پتہ! تم ایسا کر سکتی ہو!'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔ اس لئے کہ وہ میری دادی ہے'' ارنڈیرا کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اولیس نے سوئی ہوئی بڑھیا کی طرف لمحے بھر کو دیکھا اور بولا۔

''تمہاری خاطر، میں یہ کام کر سکتا ہوں۔''

اولیس جب چوہے مار زہر کورس بھری کے جام، اور خوش ذائقہ کریم میں اچھی طرح پھینٹ چکا تو اس نے قریب رکھا ہوا کیک اٹھایا۔ چھری کی مدد سے اس پر اپنے تیار کردہ محلول کی تہیں جمائیں اور پھر بہتر موم بتیاں اس پر سجا دیں۔ سالگرہ کا کیک تیار ہو چکا تھا۔

بڑھیا غصے سے کانپنے لگی۔

''تم! مردود، شیطان، تمہیں یہاں قدم دھرنے کی جرات کیسے ہوئی۔''

''میں اپنی خطاؤں کی معافی مانگنے حاضر ہوا ہوں، آج آپ کی سالگرہ کا مبارک دن بھی ہے'' وہ خجالت زدہ لہجے میں بولا۔

تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ بڑھیا نے ہتھیار ڈال دیئے۔

کھانے کی میز سجا دی گئی۔ اولیس بڑھیا کے دائیں طرف بیٹھا تھا۔ ارنڈیرا نے کیک ان کے سامنے رکھ دیا۔ بڑھیا نے چھری سے کیک کے دو ٹکڑے کیے۔

''جس شخص میں اعتراف گناہ کی ہمت موجود ہو، وہ آدھی جنت اسی دنیا میں حاصل کر لیتا ہے، میں اس خوشی کے موقع پر تمہیں اپنے ہاتھ سے کیک کا یہ ٹکڑا پیش کرتی ہوں۔''

''میں میٹھی چیزیں نہیں کھاتا، آپ کھایئے'' اولیس مودب لہجے میں بولا۔ بڑھیا نے ٹکڑا ارنڈیرا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ باورچی خانے کی طرف گئی اور اسے نالی میں پھینک دیا۔

بڑھیا نے اطمینان سے کیک ختم کیا اور اولیس کی طرف پیار سے دیکھا وہ اتنا زہر کھا چکی تھی جو چوہوں کی پوری نسل کو ختم کرنے کے لئے کافی تھا۔ اولیس اور ارنڈیرا بے چینی سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ اس کی موت کا دلفریب منظر دیکھنے کے منتظر تھے لیکن بڑھیا کی آواز ہمیشہ سے بڑھ کر توانا اور شوخ تھی۔ وہ نصف شب تک پیانو بجاتی رہی پھر نڈھال ہو کر بستر

پر لیٹ گئی۔ اس کے خراٹے خیمے کی تنگ فضا میں ابھرے اور وہ نیند میں کہانی سنانے لگی۔

"میں دیوانی ہو گئی تھی! میرے خدا، میں دیوانی ہو گئی تھی۔ میں نے خواب گاہ کے دروازے پر دو سلاخیں گاڑ دیں تاکہ وہ اندر نہ داخل ہو سکے، دروازے کے سامنے سنگھار میز اور کرسیاں رکھ دیں، لیکن اس نے اپنی انگشتری سے ہلکی سی دستک دی تو یہ سارے محافظ خود بخود راہ سے ہٹ گئے۔"

ارنڈیرا اور اولیس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، بڑھیا کی آواز میں گرج تھی اور انداز ڈرامائی تھا۔

"مجھے محسوس ہوا جیسے میں خوف کے گہرے پاتال میں ڈوب رہی ہوں۔ میں دروازے کا قفل کھولے بغیر چاہتی تھی کہ وہ کھل جائے، وہ اندر داخل ہوئے بغیر میرے پاس آ جائے کبھی واپس نہ جانے کے لئے، تاکہ اس کے اندر آنے کا خدشہ ہی نہ رہے۔ کاش میں کبھی قتل نہ کر سکوں "وہ رات بھر بے چینی کی کیفیت میں ڈرامہ دہراتی رہی اور صبح صادق کے وقت اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

"میں نے اسے خبردار کیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا، میں اسے رات بھر خبردار کرتی رہی اور وہ ہنستا رہا، پھر اس نے کرب کے عالم میں آنکھیں کھول دیں" آہ، شہزادی، خدا حافظ شہزادی" اس کی آواز لبوں کی بجائے اس گھاؤ سے آ رہی تھی جو میرے خنجر نے اس کی گردن پر ڈالا تھا"

خوف سے اولیس کا سانس رکنے لگا، اس نے ارنڈیرا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا" قاتل بڑھیا" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ارنڈیرا نے کوئی دھیان نہ دیا۔ گھڑیال نے پانچ بجائے تو اس نے اولیس کو جانے کا اشارہ کیا۔

"اب تم جاؤ، وہ جاگنے والی ہے۔"

"میرے خدا! اس عورت میں ہاتھی سے زیادہ طاقت ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے" وہ حیرت سے بولا۔

ارنڈیرا کی آنکھوں میں تلوار سے زیادہ تیزی تھی۔

"بات صرف اتنی ہے کہ تم کسی کو قتل کرنے کے لئے سب سے زیادہ غیر موزوں انسان ہو"

ارنڈیرا کے لہجے میں جو زہر تھا اولیس نے اسے شدت سے محسوس کیا، وہ تیزی سے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ارنڈیرا نے سوئی ہوئی بڑھیا کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں نفرت تھی اور احساسِ شکست تھا۔ جب پرندے صبح کی ہوا میں آسمان پر تیرنے لگے اور سورج کی کرنیں خیمے کی چھت پر آ کر گریں تو بڑھیا نے آنکھیں کھول دیں۔

''خدا تم پر رحمت نازل کرے، میری بچی''

آج کے دن کی سب سے اہم بات روز کے معمولات میں حیرت انگیز تبدیلی تھی۔ بڑھیا نے حکم دیا کہ ارنڈیرا گیارہ بجے سے پہلے دھندہ شروع نہیں کرے گی۔ اس نے لڑکی کو ہدایت کی کہ وہ اسے اچھی طرح تیار کرے۔

''مجھے اس سے پہلے تصویر کھچوانے کا اتنا شوق کبھی نہیں تھا'' وہ اشتیاق سے بولی۔

ارنڈیرا نے بڑھیا کے بالوں میں کنگھا کرنا شروع کیا۔ وہ اہتمام سے اس کے بال سنوار رہی تھی کہ بالوں کا ایک گچھا کنگھی میں پھنس کر علیحدہ ہو گیا۔ بڑھیا نے غور سے کنگھی کو دیکھا اور بالوں کا ایک اور گچھا سر سے نوچ لیا۔ پھر وہ دیوانگی کے عالم میں اپنا سر نوچنے لگی۔ اس نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگی۔ وہ چیختی رہی اور بال نوچتی رہی حتیٰ کہ اس کا سر چھلے ہوئے ناریل کی طرح شفاف ہو گیا۔

ارنڈیرا کو بہت دنوں تک اولیس کی کوئی خبر نہ ملی۔ ایک شب اس نے خیمے کے باہر الو کے بولنے کی آواز سنی۔ بڑھیا یادوں کے ہجوم میں گھری پیانو پر غمگین دھنیں بجا رہی تھی۔ وہ آنے والے وقت سے بے خبر گئے زمانے کی بازگشت میں محو تھی۔

ارنڈیرا نے ننھا سا شعلہ دیکھا جو پیانو کے تاروں سے نکلتا ہوا تاریکی میں لحہ لحہ نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ خیمے سے نکلی اور اندھیرے میں آواز کی سمت سرپٹ دوڑنے لگی۔ اولیس جھاڑیوں میں انڈیرا کا منتظر تھا۔

''اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لو'' وہ سرگوشی میں بولا۔

بہت دیر تک کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ خیمے کے اندر سے شعلے اٹھتے نظر آئے اور چند لمحوں کے بعد اسی سرعت سے بجھ بھی گئے۔

ارنڈیرا امید اور خوف کے ملے جلے تاثر کے ساتھ خیمے کے اندر داخل ہو گئی دادی اپنے سارے جاہ و جلال سمیت زندہ سلامت موجود تھی اور ایک کمبل کی مدد سے آگ بجھانے میں مصروف تھی۔

''یہ کسی شیطان صفت انسان کا کام ہے پیانو اس طرح آگ نہیں پکڑ سکتا'' وہ ارنڈیرا سے

مخاطب ہوئی۔

اس نے آگ کی وجوہات پر ہر طرح سے غور کیا لیکن ارنڈیرا کا مودب رویہ اور ہمیشہ کی طرح لاتعلق انداز اسے گڑبڑا کر رکھ دیتا۔ وہ کوشش کے باوجود ارنڈیرا کے رویے میں کوئی تبدیلی محسوس نہ کرسکی، نہ ہی وہ کسی طرح اولیس کی وہاں موجودگی کو ثابت کرسکی۔

''رات میں نے عجیب خواب دیکھا'' ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے بڑھیا نے ارنڈیرا کو بتایا

''میں نے سفید خیمے میں ایک مور دیکھا ہے۔''

''مور لمبی عمر کا نشان ہے، یہ اچھا شگون ہے'' ارنڈیرا نے وقفے کے بعد جواب دیا۔

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے، لیکن میری بچی، افسوس کہ ہم پھر وہیں آ گئے جہاں سے ہم نے ابتدا کی تھی، ہمیں پھر سے ابتداء کرنا ہوگی''

ارنڈیرا خاموش رہی۔ وہ اٹھ کر خیمے کے عقب میں بنے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی جہاں چائے کا پانی ابل رہا تھا۔

چولھے کے قریب اسے وہی، حیرت میں بھیگی، اداس، آنکھیں نظر آئیں جو اس کے اندر تلاطم برپا کردیا کرتی تھیں۔

ارنڈیرا تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

''تم اب تک میرے لئے فقط اتنا کرسکے ہو کہ مجھ پر قرض کا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا ہے۔''

اولیس کی آنکھوں میں تجسس ابھرا اور وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ارنڈیرا اس کی موجودگی سے بے نیاز انڈے پھینٹنے میں مصروف تھی۔ وہ منتظر تھا لیکن ارنڈیرا جیسے بجھ گئی تھی وہ کچھ نہ بولی۔ اولیس نے ایک نظر باورچی خانے کا جائزہ لیا اور چپ چاپ آگے بڑھ کر گوشت کاٹنے کا بڑا چھرا اٹھا لیا۔

ارنڈیرا نے کچھ نہ کیا لیکن جب اولیس خیمے کی جانب بڑھ رہا تھا، وہ آہستہ سے بولی۔

''محتاط رہنا! وہ خبردار ہو چکی ہے، اس نے خواب میں سفید خیمے میں مور دیکھا ہے، جو موت کی علامت ہے''

بڑھیا نے اولیس کو خیمے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ وہ اپنے محافظوں کو پکارنے کی بجائے اولیس سے مخاطب ہوئی ''لڑکے'' تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟''

اولیس تیزی سے آگے بڑھا اور تیز دھار چھرا بڑھیا کے سینے میں گھونپ دیا۔ بڑھیا آخری

کوشش کے طور پر اس پر گرفت کرنے کو آگے بڑھی۔

''نامراد، کتے کی اولاد، مجھے بہت دیر میں خبر ہوئی کہ موت میرے قریب ہی منڈلاتی پھر رہی ہے'' اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔

اولیس نے نفرت اور حقارت سے بڑھیا کی طرف دیکھا اور خنجر کے پے در پے کئی وار کر ڈالے۔

خون کی بوچھاڑ اس کے چہرے پر پڑی۔ پھر بڑھیا نے مزاحمت کی ایک کوشش اور کی۔ لیکن گہرے سبز اور چکنے خون میں لتھڑے اولیس نے خنجر اس کی پسلیوں میں داخل کر دیا۔ ارنڈیرا خیمے میں داخل ہوئی تو بڑھیا اور اولیس کی کشمکش جاری تھی۔ وہ بے حسی سے یہ سب دیکھتی رہی۔ بڑھیا نے اپنی بڑی بڑی ٹانگوں میں اولیس کو دبوچ رکھا تھا اور بازوؤں سے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بڑھیا کا ناریل جیسا سر اس کے اپنے گہرے سبز اور چکنے خون میں بھیگا ہوا تھا۔ اولیس بڑھیا کی گرفت سے نکلا اور اس نے ایک زوردار وار سے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ سبز خون فوارے کی طرح ابلا اور جھاگ اڑاتا اولیس کے سارے بدن پر پھیل گیا۔ بڑھیا نے ہولناک چیخ ماری، اس کا بدن زور سے تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ اولیس نے آخری وار اس کی گردن پر کیا اور الگ ہو گیا۔

ارنڈیرا نے جھک کر بڑھیا کا مردہ چہرہ دیکھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ ختم ہو چکی ہے تو اس کے چہرے پر سنجیدگی نمودار ہوئی، ایسی سنجیدگی جو اس کی بیس سالہ بے مہر زندگی نے اس سے چھین رکھی تھی۔

اس نے تیزی سے بڑھیا کی واسکٹ سے سونے کی سلاخیں نکالیں اور خیمے کو آخری بار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا۔ اولیس لاش کے پاس تنہا بیٹھا تھا۔ اس کا بدن بڑھیا کے تڑپتے ہوئے زندہ، پرشور خون میں بھیگا ہوا تھا۔

ارنڈیرا کو خیمے سے نکلتے دیکھ کر اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا وہ گھسٹتا ہوا خیمے کے دروازے تک آ پہنچا۔ ارنڈیرا ساحل کے ساتھ ساتھ شہر سے دور بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے آخری مرتبہ ارنڈیرا کو پکارا اب اس کی آواز میں محبت کرنے والے مرد کی پکار نہیں تھی۔ وہ کسی بچے کی طرح چیختا رہا جس کی ماں ویران راستے پر اسے تنہا چھوڑ گئی ہو۔ وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اولیس کو یاد آنے لگا وہ ایک عورت کو قتل کر چکا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو گیا۔ انڈین محافظوں نے اسے تھوڑی ہی دیر بعد پکڑ لیا۔ ساحل پر گرتے ہوئے اولیس کی آنکھیں دہشت اور تنہائی کے شدید

احساس سے بھیگ گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ارنڈیرا نے اس کی آواز نہیں سنی۔ وہ ہوا کے ساتھ ساتھ بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کی رفتار میں وحشی ہرنی کی تیزی تھی اور ساری آوازیں بہت پیچھے کہیں چھوڑ آئی تھی۔

وہ بھاگتی گئی شہر کے سارے آثار ختم ہو گئے، سمندر کی وسیع دنیا معدوم ہو گئی اور سامنے لق ودق صحرا نظر آنے لگا۔ وہ سونے کی سلاخیں سینے سے لگائے، بغیر رکے دوڑتی رہی، برہم سورج کے ساتھ ساتھ، طوفانی بگولوں کے ہمراہ کہیں نہ رکنے کے لئے۔

کوئی نہیں جانتا کہ بادِ بے مہر پھر چلی یا نہیں اس لئے کہ ارنڈیرا جب صحرا میں گئی تو پھر اسکا نشان کبھی نہ مل سکا۔



(مشمولہ ''ادبیات''، (بین الاقوامی ادب نمبر ۵)، جلد ۱۱، شمارہ نمبر ۴۵-۴۳، اسلام آباد، بہار تا گرما ۱۹۹۸ء)

افسانے

(گیبریئل گارسیا مارکیز کی آٹھ کہانیوں پر مشتمل مجموعہ Big Mama's Funeral کا مکمل ترجمہ انتخاب کے اس حصے میں پیش کیا جا رہا ہے (پہلی آٹھ کہانیاں اسی مجموعہ کی ہیں) جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا اور انگریزی مجموعے No One Writes to the Colonel میں شامل ہے۔)

منگل کے دن کا قیلولہ

ترجمہ: فاروق حسن

ریل گاڑی ریتیلے پتھروں کی مرتعش سرنگ میں سے برآمد ہوئی اور کیلوں کے لاانتہا ہی اور متناسب کاشت کیے ہوئے باغوں میں سے گزرنے لگی۔ ہوا زیادہ بوجھل ہوگئی اور اب انھیں سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ دھوئیں کا ایک دم گھونٹنے والا جھونکا گاڑی کے ڈبے کے اندر داخل ہوا۔ گاڑی کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی تنگ سڑک پر کچے کیلوں سے لدی بیل گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ سڑک کے پرے غیر مزروعہ زمین پر، غیر یکساں فاصلوں پر قائم، دفتروں کی بجلی کے پنکھوں سے آراستہ عمارتیں، سرخ اینٹوں کے مکان اور جنگلے دکھائی دینے لگے تھے جن میں میزیں اور چھوٹی چھوٹی سفید کرسیاں گرد آلود کھجور کے پودوں اور گلاب کی

جھاڑیوں کے درمیان چبوتروں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ابھی صبح کے گیارہ بجے تھے اور گرمی شروع نہیں ہوئی تھی۔

''بہتر ہے کہ کھڑکی بند کر دو'' عورت نے کہا۔ ''تمہارے بالوں میں کالک بھر جائے گی۔''
لڑکی نے کوشش کی مگر زنگ کی وجہ سے کھڑکی ہل نہ سکی۔

گاڑی کے تیسرے درجے کے ڈبے میں صرف یہی دونوں مسافر تھیں۔ گاڑی کا دھواں لگا تار ڈبے کے اندر آرہا تھا، اس لیے لڑکی کھڑکی کے پاس سے اُٹھ گئی۔ اپنا اسباب، جس میں کھانے کے سامان والی پلاسٹک کی تھیلی تھی اور اخبار کے کاغذوں میں لپٹا ہوا ایک گل دستہ، اس نے وہیں نشست پر رہنے دیا اور خود کھڑکی سے دور، اپنی ماں کے سامنے والی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں سادہ اور غریبانہ ماتمی لباس پہنے ہوئے تھیں۔

لڑکی بارہ سال کی تھی اور پہلی بار ریل گاڑی کا سفر کر رہی تھی۔ عورت اتنی عمر رسیدہ تھی کہ اس کی ماں نہ لگتی تھی، اس کے پپوٹوں پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں، اس کا جسم مختصر، نرم اور بے ڈھب تھا اور لباس کسی پادری کے چغے کی وضع کا تھا۔ وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کی ٹیک مضبوطی سے کرسی کی پشت کے ساتھ لگا کر بالکل سیدھی بیٹھی تھی اور گود میں اس نے چمک دار نقلی چمڑے کا دستی تھیلا دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ تھیلے کا چمڑا کئی جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے متقی لوگوں کی سی استقامت تھی جو غربت اور تنگ دستی کے عادی ہوں۔

بارہ بجے تک گرمی شدید ہو چکی تھی۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر جس کے ساتھ کوئی قصبہ نہ تھا، پانی لینے کے لیے دس منٹ ٹھہری۔ باہر باغوں کی پراسرار خاموشی میں سائے زیادہ گہرے لگ رہے تھے۔ ڈبے کے اندر رُکی ہوئی ہوا میں کچے چمڑے کی سی بو تھی۔ گاڑی نے رفتار نہ پکڑی۔ وہ دو باہم مشابہ اسٹیشنوں پر رُکی جن کے اردگرد شوخ رنگوں والے لکڑی کے بنے گھر تھے۔ عورت سر جھکا کر اونگھنے لگی۔ لڑکی نے اپنے جوتے اُتار دیے۔ پھر وہ غسل خانے میں جا کر گل دستے پر پانی چھڑکنے لگی۔

جب وہ اپنی نشست پر واپس آئی تو اس کی ماں کھانا کھانے کے لیے اس کی منتظر تھی۔ اس نے پنیر کا ٹکڑا، مکئی کی آدھی روٹی اور ایک بسکٹ لڑکی کو دیا اور اپنے لیے بھی اتنی ہی مقدار میں کھانا پلاسٹک کی تھیلی میں سے نکالا۔ جس وقت وہ دونوں کھانا کھا رہی تھیں، گاڑی نے آہستہ رفتار سے لوہے کا ایک پُل پار کیا اور ایک قصبے میں سے گزری جو کہ پہلے دو قصبوں جیسا ہی تھا، صرف اس کے چوک میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ شدید دھوپ میں ایک بینڈ شگفتہ سی دُھن بجا رہا تھا۔ قصبے

کے دوسرے سرے پر جہاں باغ ختم ہوتے تھے، زمین خشک سالی کے سبب تڑخ چکی تھی۔

عورت نے کھانا ختم کیا۔ ''جوتے پہن لو'' اس نے کہا۔ لڑکی نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جہاں سے گاڑی کی رفتار تیز ہونا شروع ہوئی تھی۔ وہاں بے آباد زمین کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تاہم اس نے بسکٹ کا ٹکڑا تھیلی میں رکھ دیا اور جلدی سے جوتے پہن لیے۔ عورت نے اس کے ہاتھ میں کنگھی تھما دی۔ ''اپنے بال بھی ٹھیک کر لو۔'' اس نے کہا۔

جس وقت لڑکی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی، گاڑی نے سیٹی بجانا شروع کر دی۔ عورت نے اپنی گردن پر سے پسینہ پونچھا اور انگلیوں سے چہرے پر لگی چکنائی کو صاف کیا۔ جب لڑکی بال سنوارنے سے فارغ ہوئی، گاڑی کسی قصبے کے مضافات میں سے گزر رہی تھی۔ یہ قصبہ پہلے تمام قصبوں سے بڑا تھا مگر ان سب سے زیادہ اداس بھی دکھائی دے رہا تھا۔

''اگر تمہیں کچھ اور کرنا ہے تو ابھی کر لو'' عورت نے کہا ''بعد میں خواہ پیاس سے تمہارا دم نکل رہا ہو کسی کے گھر پانی کا گھونٹ تک نہیں پینا اور یاد رکھو رونا نہیں ہے۔''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ خشک اور گرم ہوا کا جھونکا، گاڑی کی سیٹی اور پرانے ڈبوں کی کھٹکھٹ کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ عورت نے پلاسٹک کی تھیلی میں کھانے کی چیزیں رکھ کر، اسے تہہ کر کے، اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ ایک لمحے کے لیے قصبے کا مکمل عکس، اگست کے اس روشن منگل کے دن، کھڑکی کے شیشے میں ابھر رہا۔ لڑکی نے گل دستے کو اخبار کے گیلے کاغذوں میں لپیٹا اور کھڑکی سے تھوڑی دور کھڑی ہو کر اپنی ماں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ماں جواباً مسکرائی۔ گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ ہونے لگی اور تھوڑی دیر بعد رک گئی۔

اسٹیشن پر کوئی نہ تھا۔ سڑک کی دوسری جانب بادام کے درختوں کے سائے میں صرف بلیر ڈہال کھلا تھا۔ سارا قصبہ گرمی میں تیر رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر انھوں نے ویران اسٹیشن کو عبور کیا۔ اسٹیشن کے فرش کی ٹائلیں درمیان میں گھاس اگنے سے پھٹ رہی تھیں۔ وہ دونوں دوسری جانب سڑک کی سایہ دار سمت میں چلی گئیں۔

اس وقت تقریباً دو بجے کا عمل تھا اور غنودگی کے بوجھ تلے دبا ہوا قصبہ قیلولہ کر رہا تھا۔ دکانیں، دفتر، اسکول، سب گیارہ بجے بند ہو جاتے تھے اور چار بجے سے پہلے، جب گاڑی واپس جاتی تھی، نہیں کھلتے تھے۔ صرف اسٹیشن کے سامنے والا ہوٹل، اپنے بلیر ڈہال اور شراب خانے سمیت اور چوک کے ایک کونے میں واقع تار گھر دوپہر میں کھلے رہتے تھے۔ قصبے کے گھر، جن میں سے زیادہ تر بنانا کمپنی کے ماڈل کے مطابق ایک ہی وضع کے بنے ہوئے تھے، اندر سے بند

تھے اور ان کے پردے گرے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض گھروں کے اندر اتنی گرمی ہوتی تھی کہ گھر کے باسی باہر آنگن میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ باقی لوگ اپنی کرسیاں بادام کے درختوں کے سائے میں دیوار کے ساتھ ٹکا کر سڑک پر ہی قیلولہ کرلیا کرتے تھے۔

بادام کے درختوں کے پُر حفاظت سائے میں چلتے چلتے اور قیلولے میں خلل ڈالے بغیر، عورت اور لڑکی قصبے میں داخل ہوئیں۔ وہ سیدھی پادری کے گھر گئیں۔ عورت نے اپنے ناخن سے گھر کے باہر لوہے کے جنگلے کو کھرچا، پھر ایک لمحہ انتظار کرنے کے بعد دوبارہ یہی عمل دُہرایا۔ اندر بجلی کا پنکھا گھوں گھوں کر رہا تھا اور ماں بیٹی اندر سے آنے والی قدموں کی آہٹ کو بھی نہ سن سکیں۔ انھوں نے بہ مشکل دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ اور اس کے فوراً بعد کی محتاط آواز سنی، جو جنگلے کے قریب سے آئی تھی اور جس نے دریافت کیا تھا: ''کون ہے؟''

عورت نے جنگلے کے درمیان میں سے گھر کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔

''مجھے پادری سے ملنا ہے'' اس نے کہا۔

''وہ آرام کررہے ہیں۔''

''معاملہ بہت ہنگامی نوعیت کا ہے۔'' عورت کی آواز میں ٹھہراؤ والا عزم تھا۔

دروازہ آواز پیدا کیے بغیر تھوڑا سا کھلا اور اندر سے بڑی عمر کی ایک فربہ عورت باہر آئی جس کے چہرے کی جلد پیلی اور سر کے بال فولاد کے رنگ کے تھے۔ موٹے شیشوں والی عینک کے عقب میں اس کی آنکھیں بہت چھوٹی لگ رہی تھیں۔

''اندر آجاؤ'' اس نے کہا اور دروازہ پورا کھول دیا۔

وہ کمرے کے اندر داخل ہوگئیں۔ اندر پرانے پھولوں کی بو بسی ہوئی تھی۔ وہ عورت انھیں ایک لکڑی کی بنچ کی طرف لے گئی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی تو بیٹھ گئی، مگر ماں، غیر حاضر سی، دونوں ہاتھوں میں تھیلے کو تھامے کھڑی رہی۔ بجلی کے پنکھے کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ گھر کے اندر کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر دروازے میں گھر والی عورت پھر نمودار ہوئی۔ ''وہ کہہ رہے ہیں کہ تین بجے کے بعد آنا'' اس نے دبی زبان سے کہا۔ ''ابھی پانچ منٹ پہلے وہ سونے کے لیے لیٹے ہیں۔''

''گاڑی ساڑھے تین بجے واپس چلی جاتی ہے۔'' عورت نے کہا۔

یہ جواب مختصر تھا، لیکن وثوق اور خود اعتمادی سے دیا گیا تھا اور جواب دیتے وقت عورت کا

لہجہ خوشگوار اور دھیما تھا۔ گھر والی عورت پہلی بار مسکرائی۔

"ٹھیک ہے،" اس نے کہا۔

جب کمرے کے دوسرے سرے پر دروازہ پھر بند ہو گیا تو عورت اپنی بیٹی کے نزدیک بیٹھ گئی۔ انتظار کا تنگ سا کمرہ غریبانہ، مگر نہایت صاف ستھرا تھا۔ لکڑی کے ایک کٹہرے نے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ کٹہرے کے دوسری جانب ایک سادہ سی میز تھی جس کے موی میز پوش کے اوپر ایک قدیم طرز کا ٹائپ رائٹر گل دان کے نزدیک رکھا تھا۔ ذرا دور مسیحی حلقے کے تمام کوائف رکھے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی غیر شادی شدہ عورت نے اس دفتر کا انتظام سنبھال رکھا ہو۔

سامنے والا دروازہ کھلا اور پادری اپنی عینک کے شیشے رومال سے صاف کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عینک پہن لینے پر ہی اس کی مشابہت سے ظاہر ہوا کہ دروازہ کھولنے والی عورت اس کی بہن تھی۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"قبرستان کی کنجیاں" عورت نے جواب دیا۔

لڑکی گود میں گل دستہ سنبھالے بیٹھی تھی اور بینچ کے نیچے اس کے پیر ایک دوسرے کو قطع کر رہے تھے۔ پادری نے اس کی طرف اور پھر عورت کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی کی لوہے کی جالی میں سے روشن اور بادلوں سے خالی آسمان کو دیکھ کر کہا: "اس گرمی میں؟ سورج غروب ہونے کا انتظار کر لیا ہوتا۔"

عورت نے آہستگی سے سر ہلایا۔ پادری کٹہرے کے دوسری جانب چلا گیا۔ وہاں الماری میں سے اس نے ایک کاپی جس پر موی کاغذ چڑھا ہوا تھا، لکڑی کا قلم دان اور سیاہی کی دوات نکالی اور میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر اتنے بال تھے کہ سر پر بالوں کی کمی کی کافی حد تک تلافی ہو رہی تھی۔

"کس کی قبر پر جانا چاہتی ہو؟" پادری نے پوچھا۔

"کارلوس سینٹینو" عورت نے جواب دیا۔

"کس کی؟"

"کارلوس سینٹینو" عورت نے دُہرایا۔

پادری کے پلے اب بھی کچھ نہ پڑا تھا۔

''وہ چور جو پچھلے ہفتے یہاں مارا گیا تھا۔'' عورت نے اسی لہجے میں کہا۔ ''میں اس کی ماں ہوں۔''

پادری نے غور سے عورت کا جائزہ لیا۔ عورت نظریں جما کر پُرسکون اعتماد کے ساتھ اسے دیکھتی رہی، حتیٰ کہ پادری جھینپ گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور لکھنے لگا۔ صفحہ بھرتے بھرتے اس نے عورت سے کہا کہ اپنی شناخت کرائے۔ بغیر حیل و حجت کے، عورت نے وضاحت اور تفصیل سے بات کی جیسے کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہی ہو۔ پادری کا پسینہ بہنا شروع ہو گیا۔ لڑکی نے اپنے بائیں جوتے کا بکوا کھولا اور ایڑی جوتے میں سے نکال کر بنچ کے نیچے لگی ہوئی لکڑی پر رکھ دی۔ پھر دائیں پاؤں کے ساتھ یہی کیا۔

اس واقعے کا آغاز پچھلے ہفتے کے سوموار کو صبح یہاں سے چند بلاک پرے ہوا تھا۔ بیوہ ربیکا نے، جو عورت اگڑم بگڑم چیزوں سے بھرے ہوئے گھر میں تنہا رہتی تھی، اس روز بوندا باندی کی آواز سے بلند، باہر سے کسی کے دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔ وہ اٹھی اور الماری میں سے ڈھونڈ کر ایک قدیم ریوالور نکالا، جسے کرنل اور یلیا نو بوئندیا کے زمانے کے بعد سے کسی نے استعمال نہ کیا تھا۔ ریوالور لے کر اور گھر کی بتیاں جلائے بغیر وہ نشست کے کمرے میں آ گئی۔ اس کا یہ ردِعمل دروازے کے تالے کے کھولے جانے کی آواز کے باعث کم اور اس دہشت کی وجہ سے زیادہ تھا جو اٹھائیس برسوں کی تنہائی نے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ اپنے ذہن میں اس نے نہ صرف دروازے کی جگہ کا بلکہ تالے کی زمین سے اونچائی کا بھی قطعی حساب لگایا اور دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑ کر آنکھیں بند کر کے گھوڑا دبا دیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی آتشیں ہتھیار چلایا تھا۔ دھماکے کے فوراً بعد اسے جست کی چھت پر بارش کی ٹن مَن کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر اسے باہر انگنائی کے سیمنٹ والے فرش پر کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی اور کسی نے آہستہ سے، تلخی کے بغیر، مگر سخت تھکے ہوئے لہجے میں ''ہائے ماں'' کے الفاظ ادا کیا۔ جو شخص اس صبح ربیکا کے گھر کے باہر مُردہ پایا گیا (اس کی ناک کے پرخچے اڑ گئے تھے) اس نے فلالین کی رنگ دار دھاریوں والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کی پتلون روزمرہ والی تھی جسے اس نے پیٹی کی بجائے رسّی سے باندھا ہوا تھا اور وہ ننگے پاؤں تھا۔ قصبے میں اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔

''تو اس کا نام کالوس سینٹینو تھا؟'' پادری نے لکھنے کا کام ختم کر کے کہا۔

''سینٹینو ایالا'' عورت نے کہا۔ ''وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔''

پادری دوبارہ الماری کی طرف چلا گیا۔ الماری کے دروازے کے اندر دو زنگ آلود بڑی

کنجیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے سوچا، جیسے کہ اس کی ماں نے اپنے لڑکپن میں سوچا تھا اور جیسے کہ پادری نے بھی کسی نہ کسی وقت سوچا ہوگا کہ وہ حضرت پطرس کی کنجیاں ہیں۔ پادری نے کنجیوں کو کیل سے اُتارا، انھیں کٹہرے پر رکھی کھلی ہوئی کاپی کے صفحے پر رکھ کر اپنی شہادت کی انگلی سے صفحے پر ایک جگہ پر اشارہ کیا اور عورت سے کہا: ''یہاں دستخط کرو۔''

عورت نے تھیلے کو بغل میں دبا کر اپنا نام اُس جگہ پر گھسیٹ کر لکھنا شروع کر دیا۔ لڑکی نے گل دستہ ہاتھ میں اٹھایا اور پاؤں رگڑتی ہوئی کٹہرے کے پاس آکر ماں کو غور سے دیکھنے لگی۔

پادری نے آہ بھری:

''تم نے کبھی اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش نہیں کی؟''

عورت نے دستخط ختم کرنے کے بعد پادری کو جواب دیا:

''وہ بہت اچھا آدمی تھا۔''

پادری نے پہلے عورت کی طرف اور پھر لڑکی کی جانب دیکھا اور صالح تحیر کے ساتھ باور کیا کہ ماں بیٹی دونوں میں سے کسی کا آنسو بہانے کا ارادہ نہیں ہے۔ عورت نے اسی انداز میں بات جاری رکھی: ''میں نے اسے کہا تھا کہ جو چیز کسی کے کھانے کی ہو اُسے چوری نہ کرے اور اس نے ہمیشہ میرا کہا مانا۔ اس کے برعکس پہلے جب وہ مکّے بازی کیا کرتا تھا، مار کھا کھا کر بے حال ہو جانے کے باعث اس کے تین تین دن بستر پر گزرتے تھے۔''

''اور اسے اپنے دانت بھی تو نکلوانے پڑے تھے'' لڑکی نے اضافہ کیا۔

''ہاں''، عورت نے اتفاق کیا۔ ''ان دنوں میرے ہر نوالے میں اُس مار کا ذائقہ ہوتا تھا جو میرے بیٹے نے ہفتے کی راتوں کو کھائی ہوتی تھی۔''

''خدا کی منشا کو کون جان سکتا ہے!'' پادری نے کہا

مگر یہ اس نے بغیر کسی یقین کے کہا تھا، کچھ تو اس لیے کہ اس کو زندگی کے تجربے نے ذرا شک میں ڈال دیا تھا اور کچھ گرمی بھی بہت زیادہ تھی۔ اس نے انھیں مشورہ دیا کہ سرسام سے بچنے کے لیے اپنے سروں کو ڈھانپ کر باہر جائیں۔ جمائیاں لیتے ہوئے اور تقریباً سوتے سوتے اس نے انھیں کالوس سینٹینو کی قبر تک پہنچنے کا راستہ سمجھایا اور کہا کہ کنجیاں لوٹانے کے لیے واپسی پر انھیں دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں، باہر کے دروازے کے نیچے کنجیاں رکھ دیں اور اگر ممکن ہو تو گرجے کے لیے نذر نیاز بھی وہیں چھوڑ دیں۔ عورت نے بہت توجہ سے پادری کی ہدایات کو سنا، لیکن شکریہ ادا کرتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

سڑک والا دروازہ کھولنے سے بیشتر ہی پادری نے بھانپ لیا تھا کہ کوئی شخص لوہے کے جنگلے سے ناک لگائے گھر کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ باہر بہت سارے بچے جمع ہو گئے تھے۔ جب دروازہ کھلا تو وہ سب اِدھر ادھر ہو گئے۔ عموماً دوپہر کے اس وقت سڑک پر کوئی نہ ہوتا تھا۔ آج نہ صرف وہاں بچے تھے بلکہ بادام کے درختوں کے نیچے بالغوں کے گروہ بھی موجود تھے۔ پادری نے گرمی میں تیرتی ہوئی سڑک کا جائزہ لیا اور ساری بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

''ایک منٹ ٹھہرو'' اس نے عورت کی طرف دیکھے بغیر اس سے کہا۔

پادری کی بہن پرلے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے شب خوابی کے کپڑوں پر کالی جیکٹ پہن رکھی تھی اور بال شانوں پر کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' پادری نے اس سے پوچھا۔

''لوگوں کو پتا چل گیا ہے۔'' اس کی بہن نے سرگوشی کی۔

''بہتر ہوگا کہ تم دونوں انگنائی والے دروازے سے باہر جاؤ'' پادری نے کہا۔

''وہاں بھی وہی حال ہے۔'' پادری کی بہن نے کہا۔'' سب لوگ کھڑکیوں میں سے جھانک رہے ہیں۔''

اس وقت تک بات عورت کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اس نے لوہے کے جنگلے میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ تب اس نے لڑکی کے ہاتھ سے گُل دستہ لے لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

''سورج غروب ہونے تک رک جاؤ۔'' پادری نے مشورہ دیا۔

''تم پگھل جاؤ گی'' پادری کی بہن نے کہا، جو کمرے کے عقب میں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ ''ٹھہرو، میں تمہیں اپنا چھاتا دیے دیتی ہوں۔''

''نہیں، شکریہ'' عورت نے جواب دیا۔ ''ہم یوں ہی ٹھیک ہیں۔''

اس نے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور دروازہ عبور کر کے سڑک پر نکل گئی۔



(مشمولہ: ''ذہن جدید''، دہلی، جلد ۱۵، شمارہ نمبر ۴۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۵ء)

ایک نہ ایک دن

ترجمہ: فاروق حسن

سوموار کی گرم صبح بغیر بارش کے طلوع ہوئی۔ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی، بغیر ڈگری کے دنداں ساز اور یلیوا یسکو بار نے چھ بجے اپنا دفتر کھولا۔ پلاسٹر کے سانچے میں نصب چند نقلی دانت اُس نے شیشے کی الماری میں سے نکالے اور مٹھی بھر اوزاروں کو اُن کی قامت کے مطابق ترتیب دے کر میز پر رکھا، یوں جیسے ان کی نمائش کی جانے والی ہو اور یلیوا یسکو بار نے بے کالر کی قمیض پہن رکھی تھی جس کا گلا سونے کی کیل سے بند تھا اور اُس کی پتلون کو گارٹرز نے اپنی جگہ پر سنبھالا ہوا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ سوکھا ہوا آدمی تھا جو ہر وقت عموداً سیدھا کھڑا رہتا تھا اور اُس کے چہرے پر ایسا تاثر رہتا تھا جیسا عموماً بہرے لوگوں کے چہروں پر ہوتا ہے، حالاں کہ اس تاثر کی اصل صورتِ حال سے مطابقت کم ہی تھی۔

اوزار میز پر ترتیب دینے کے بعد دانتوں کی صفائی کی مشین کو اپنی طرف کھینچ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور نقلی دانتوں کو چمکانے کے کام میں مصروف ہو گیا۔ اُس کا ذہن اپنی اس مصروفیت کے بارے میں ہر طرح کی سوچ سے عاری لگتا تھا، لیکن وہ انہماک اور باقاعدگی سے، ضرورت بے ضرورت، مشین کو پاؤں کے پیڈل سے ہلاتا اور دانتوں کو چمکاتا رہا۔

آٹھ بجے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر اُس نے آسمان کا جائزہ لیا اور پڑوس کے گھر کی چھت پر نصب آڑی چوب پر دو مغموم گدھوں کو بیٹھے سورج کی گرمی میں اپنے پَروں کو سکھاتے دیکھا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ دوپہر کے کھانے کے وقت سے قبل بارش ہونے کا امکان ہے، پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اُس کے گیارہ سالہ بیٹے کی

چیختی ہوئی آواز نے اُس کے انہماک کا تسلسل توڑا:

''پاپا''۔

''ہاں؟''

''باہر قصبے کا میئر آیا ہے، وہ پوچھتا ہے آپ اُس کا ایک دانت نکال دو گے؟''

''اُسے کہہ دو میں موجود نہیں ہوں۔''

وہ سونے کے ایک دانت کو چمکا رہا تھا۔ ہاتھ بھر کے فاصلے پر رکھ کر اور آنکھیں آدھی بند کر کے اُس نے دانت کو غور سے دیکھا۔ اُس کے بیٹے نے انتظار کے کمرے سے دوبارہ آواز لگائی:

''پاپا وہ کہتا ہے آپ موجود ہو، کیوں کہ وہ آپ کی آواز سن سکتا ہے۔''

دنداں ساز دانت کے معائنے میں مصروف رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے دانت کو دوسرے پالش کیے ہوئے دانتوں کے قریب میز پر رکھا اور بیٹے کو جواب دیا:

''تب تو اور بھی بہتر ہے۔''

اُس نے دوبارہ مشین کو چلانا شروع کیا۔ گتے کے ایک ڈبے میں سے، جس میں سب طرح کی نامکمل چیزیں پڑی رہتی تھیں، اُس نے دانتوں کے پُل کا ایک حصہ نکالا اور اُس کے سونے کو چمکانے لگا۔

''پاپا''۔

''ہاں؟''

اُس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''میئر کہتا ہے اگر آپ اس کا دانت نہیں نکالو گے تو وہ آپ کو گولی مار دے گا۔''

کسی قسم کی عجلت دکھائے بغیر اس نے اطمینان سے مشین کے پیڈل کو ہلانا بند کیا اور اُسے پرے دھکیلا۔ تب اُس نے میز کی ایک دراز کو پورا باہر نکالا، وہاں ایک ریوالور پڑا تھا۔ ''ٹھیک ہے'' اُس نے کہا: ''اُسے کہو آ کر گولی مار دے مجھے۔''

کرسی کو دھکیل کر اُس نے دروازے کے سامنے کر دیا اور اپنا ہاتھ میز کی دراز پر ہی رکھا۔ میئر دروازے میں نمودار ہوا۔ اُس کے چہرے کا بایاں حصہ شیو کیا ہوا تھا لیکن اُس کے سوجے ہوئے اور درد کرتے ہوئے دائیں گال پر پانچ دن کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ دنداں ساز نے میئر کی بے حس آنکھوں میں یاس اور بے بسی کی متعدد راتوں کو جھانکتے ہوئے پایا۔ اُس نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے دراز کو بند کر دیا اور نرمی سے بولا:

"بیٹھ جاؤ۔"

"صبح بخیر" میسر نے کہا۔

"صبح بخیر" دنداں ساز نے کہا۔

دانت نکالنے کے اوزار پانی میں اُبل رہے تھے۔ میسر نے اپنا سر کرسی کی پشت کے ساتھ لگا دیا، یوں تھوڑا سا آرام محسوس ہوا۔ اُس کا سانس یخ تھا۔ اُس نے دفتر کا جائزہ لیا۔ نہایت غریبانہ سا انتظام تھا۔ لکڑی کی ایک پرانی کرسی، پیڈل والی مشین اور شیشے کی ایک الماری جس میں سفالی بوتلیں رکھی تھیں۔ کرسی کے مقابل کھڑکی میں شانوں کی اونچائی پر کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔ دنداں ساز کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میسر نے ایڑیاں مضبوطی سے جوڑیں اور منہ کھول دیا۔

اور یلیو ایسکو بار نے اُس کا چہرہ، روشنی کی طرف موڑا اور اُس کے متاثرہ دانت کو دیکھا۔ پھر اُس نے جبڑا انگلیوں کے محتاط دباؤ سے بند کر دیا اور کہا:

"تمہیں بے ہوش کیے بغیر یہ دانت نکالنا پڑے گا!"

"کیوں؟"

"اس لیے کے دانت کے نیچے پیپ بھری ہوئی ہے۔"

میسر نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ٹھیک ہے" اُس نے کہا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ دنداں ساز نے اُس کی مسکراہٹ کا جواب نہ دیا۔ اُبالے ہوئے اوزاروں والا گرم تسلا اُس نے میز پر رکھا اور ایک ٹھنڈی چمٹی سے، کسی عجلت کے بغیر، اوزار باہر نکالے۔ جوتے کی نوک سے اُگال دان کو ہلا کر اُس نے ٹھیک جگہ رکھا اور ہاتھ دھونے کے لیے نلکے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ ان سب کاموں کے دوران میں اُس نے ایک بار بھی میسر کی طرف نہ دیکھا۔ لیکن میسر نے ایک لمحے کے لیے بھی ڈاکٹر کو اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

متاثرہ دانت نچلے جبڑے کی عقل داڑھ تھی۔ دنداں ساز نے اپنے پاؤں پھیلائے اور گرم زنبور سے دانت کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میسر نے اپنی تمام قوت سے دونوں ہاتھوں سے کرسی کے بازوؤں کو جکڑا اور پاؤں اکڑا کر بیٹھ گیا۔ اُسے اپنے گردوں میں یخ آلود خلا کی موجودگی کا احساس ہوا، لیکن اُس نے آواز نہ نکالی۔ دنداں ساز فقط اپنی کلائی کو حرکت دے رہا تھا۔ کسی کینے کے بغیر، بلکہ ایک ترشی آمیز ملائمت سے اُس نے میسر سے کہا:

"ہمارے بیس آدمیوں کے قتل کا حساب تم اب چکاؤ گے۔"

میسر نے اپنے جبڑے میں ہڈی کی کڑکڑاہٹ کو محسوس کیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے

لگے۔ لیکن جب تک دانت منہ سے باہر نہ آ گیا اُس نے سانس تک نہ لیا۔ آنسوؤں کے عقب سے اُس نے دانت کو دیکھا۔ اُسے یہ دانت اپنی ساری تکلیف سے اس قدر غیر متعلق لگا کہ وہ پچھلی پانچ راتوں کی اذیت کو سمجھنے میں ناکام رہا۔

پسینے میں شرابور، کانپتا ہوا، وہ اُگال دان کے اوپر جھکا رہا۔ اُس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور پتلون کی جیب سے رومال نکالنے کی کوشش کی۔ دنداں ساز نے صاف کپڑا اُس کی طرف بڑھایا۔

''اپنے آنسو صاف کرو'' اُس نے کہا۔

میئر نے آنسو پونچھے۔ وہ کانپ رہا تھا۔ جب تک دنداں ساز ہاتھ دھوتا رہا، میئر بوسیدہ چھت کو دیکھتا رہا جس پر گرد آلود جالے لگے ہوئے تھے جن میں مکڑیوں کے انڈے اور مردہ کیڑے مکوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دنداں ساز ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آیا۔ ''گھر جا کر آرام کرو'' وہ بولا ''اور نمک کے پانی کے غرارے کرتے رہو۔''

میئر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے تقریباً فوجیوں کے سے سرسری انداز میں دنداں ساز کو سلیوٹ کیا اور دروازے کی طرف چلا۔ چلتے ہوئے اُس نے اپنی ٹانگوں کو جھٹک کر سیدھا کیا اور کوٹ کے بٹن بند کیے۔

''بل بھجوا دینا'' اُس نے کہا۔

''کس کے نام؟ تمہارے یا ٹاؤن کمیٹی کے؟''

میئر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کلینک کا دروازہ بند کیا۔ جالی کے دروازے کے باہر سے اُس کی آواز آئی: ''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سالی ایک ہی بات ہے۔''



(مشمولہ: ''ذہن جدید''، دہلی، جلد ۱۵، شمارہ نمبر ۴۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۵ء)

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

ترجمہ: فاروق حسن

داماد سونور کے تڑکے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی بیوی آنا، چھ ماہ کی حاملہ، کپڑے اور جوتے پہنے بستر میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تیل کا لیمپ بجھنے کے قریب تھا۔ داماسو کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی لحہ لحہ کر کے ساری رات اس کا انتظار کرتی رہی ہے، بلکہ اب بھی، جب وہ اس کے سامنے موجود ہے، وہ انتظار کیے جا رہی ہے۔ اس نے انگلی سے آنا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنا کی خوف زدہ آنکھیں سُرخ کپڑے کے اس بنڈل پر مرکوز تھیں جو داماسو نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے اور وہ یک لخت کانپنے لگی۔ داماسو نے خاموشی مگر درشتی کے ساتھ اس کو قمیض سے پکڑ لیا۔ داماسو کے پاس سے کڑوی سی بُو آ رہی تھی۔

داماسو نے آنا کو تقریباً ہوا میں اٹھا لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس کے جسم کا سارا بوجھ آگے کو جھک گیا اور وہ اپنے خاوند کی سرخ دھاریوں والی قمیض سے چمٹ کر ہاتھ اس کی کمر کے گرد لے جا کر اسے گُردوں کے قریب سے پکڑ کر رونے لگی اور اس وقت تک روتی رہی جب تک اسے قرار نہ آ گیا۔

''میں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی'' اس نے کہا: ''ایک دم دروازہ کُھلا اور کسی نے تمہیں خون میں تربتر اندر دھکیل دیا۔''

کچھ کہے بغیر داماسو نے اسے ہاتھ کے فاصلے پر روکے رکھا۔ پھر اس نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور بنڈل اس کی گود میں رکھ کر باہر صحن میں پیشاب کرنے چلا گیا۔ آنا نے ڈوری کو کھولا اور

دیکھا، بنڈل کے اندر بلیرڈ کی تین گیندیں تھیں۔ دو سفید اور ایک سرخ اور تینوں کثرتِ استعمال سے بدرنگ سی ہو رہی تھیں۔

داماسو جب کمرے میں واپس آیا تو وہ بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی۔

''اور ان کا کیا فائدہ ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

داماسو نے کندھے اُچکائے۔ ''بلیرڈ کھیلنے کے کام آئیں گی۔''

اس نے بنڈل کو دوبارہ ڈوری سے باندھا اور دوسری چیزوں، ٹارچ، چاقو اور...... ساختہ کنجی کے ہمراہ ٹرنک کی تہ میں رکھ دیا۔ آنا کپڑے تبدیل کیے بغیر دیوار کی جانب منہ کر کے بستر میں لیٹ گئی۔ داماسو نے صرف اپنی پتلون اتاری۔ بستر میں لیٹ کر سگریٹ پیتے ہوئے وہ صبحِ کاذب کی بکھری ہوئی سرسراہٹ میں اپنی مہم کے خدوخال کا جائزہ لینے لگا، یہاں تک کہ اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ابھی جاگ رہی ہے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بولی۔

آنا کی آواز، جو عموماً دھیمی ہوتی تھی، غصے اور عناد کی بدولت اس وقت بھاری ہو گئی تھی۔ داماسو نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ٹکڑے کو فرش پر مسل کر بجھا دیا۔

''وہاں کچھ اور تھا ہی نہیں'' داماسو نے آہ بھری۔ ''میں تقریباً گھنٹہ بھر اندر رہا۔''

''اگر تمہیں کوئی گولی مار دیتا تو؟'' اُس نے پوچھا۔

داماسو خوف سے کانپ اُٹھا۔ ''لعنت وہ تم پر'' اُس نے اپنی مٹھی کو پلنگ کے ڈنڈے پر مارتے ہوئے کہا۔ وہ نیچے فرش پر سگریٹ اور دیا سلائی تلاش کرنے لگا۔

''تم گدھوں کی طرح بے حس ہو۔'' آنا نے کہا۔ ''اتنا تو سوچا ہوتا کہ میں یہاں سو نہیں پا رہی۔ سڑک پر کوئی آواز آتی تھی تو لگتا تھا جیسے ابھی کوئی تمہاری لاش لے کر اندر داخل ہوگا۔'' اس نے آہ بھر کر اضافہ کیا۔

''اور اس سارے عذاب سے حاصل کیا ہوا؟ بلیرڈ کی تین گیندیں!''

''دراز میں صرف پچیس سینٹ کا سکہ پڑا تھا۔''

''تو پھر کچھ بھی لے کر نہ آتے۔''

''مشکل کام تو اندر داخل ہونے کا تھا'' داماسو نے کہا۔ ''وہاں سے بالکل خالی ہاتھ لوٹ آتا۔''

''کچھ اور اٹھا لاتے!''

''وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا'' داماسو نے کہا۔

''جتنی چیزیں بلیرڈ ہال میں ہوتی ہیں اور کہاں ہوتی ہوں گی!''

''ہاں، لگتا یہی ہے'' داماسو نے کہا۔''لیکن ایک بار اندر داخل ہو کر تلاش کرنا اور ہر چیز کو دیکھنا شروع کرو تو پتا چلتا ہے کہ وہاں کوئی ٹکے کے مول چیز بھی نہیں۔''

وہ دیر تک خاموش لیٹی رہی۔ داماسو کو لگا جیسے وہ آنکھیں کھولے اپنی یادداشت کے اندھیرے میں کسی قیمتی چیز کو تلاش کر رہی ہو۔

''ہاں شاید!'' وہ بولی۔

داماسو نے سگریٹ سلگا لیا۔ رات کی پی ہوئی شراب کا نشہ لہر کے بعد لہر بن کر اُس کے جسم سے زائل ہو رہا تھا اور اسے دوبارہ اپنے اعضا کے وزن، حجم اور فرائض منصبی کا احساس ہونے لگا تھا۔''وہاں ایک بلی تھی'' آخر اس نے کہا۔''ایک بہت بڑی سفید بلی'' آنا نے بستر میں کروٹ لی، اپنا پھولا ہوا پیٹ اپنے خاوند کے پیٹ کے ساتھ لگا دیا اور ٹانگ اس کے گھٹنوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے پاس سے پیاز کی بو آ رہی تھی۔

''بہت ڈر لگا تھا'' آنا نے پوچھا۔

''مجھے؟''

''ہاں تمھیں'' آنا نے کہا۔''سنا ہے مردوں کو بھی ڈر لگتا ہے۔''

اُسے احساس ہوا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ وہ بھی مسکرا دیا۔''ہاں، تھوڑا سا۔'' اس نے کہا۔'' مجھے اتنے زور کا پیشاب آ رہا تھا کہ برداشت کرنا مشکل تھا۔''

آنا نے اسے چوما مگر اس نے جواباً کچھ نہ کیا۔ تب، اس احساس کے باوجود کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے لگا ہے، جو خطرے سے خالی بات نہ تھی، تاہم بغیر کسی تاسف کے اس نے تمام واقعہ تفصیل کے ساتھ آنا کو سنایا، یوں جیسے کسی پرانے سفر کی یاد تازہ کر رہا ہو۔

طویل خاموشی کے بعد آنا نے کہا:''تھا تو پاگل پن ہی!''

''بس شروع کرنے کی ہمت چاہیے'' داماسو نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا:''اور پھر پہلی کوشش کے لحاظ سے معاملہ بُرا تو نہیں رہا۔''

سورج کی تپش دیر سے شروع ہوئی۔ آنا، داماسو کے بیدار ہونے سے بہت پہلے جاگ چکی تھی۔ داماسو نے چند منٹ کے لیے اپنا سر صحن میں لگے نلکے کی ٹونٹی کے نیچے ٹکائے رکھا حتیٰ کہ

پانی کی دھار سے وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اس کا کمرہ بہت سارے ایک جیسے مگر الگ الگ کمروں میں سے ایک تھا۔ صحن میں جو تمام کمروں کا مشترکہ تھا، کپڑے سکھانے کی رسی بندھی ہوئی تھی۔ عقبی دیوار کے پاس والے حصے میں، جسے ٹین کی ایک چادر صحن سے الگ کرتی تھی، آنا نے کھانا پکانے اور استریاں گرم کرنے کے لیے ایک سفری چولھا اور کھانا کھانے اور کپڑے استری کرنے کے لیے ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کو قریب آتا دیکھ کر اس نے استری کیے ہوئے کپڑے ایک طرف رکھ دیے اور استریاں چولھے پر سے اتار دیں تاکہ کافی گرم کر سکے۔ آنا اپنے خاوند سے عمر میں بڑی تھی، اس کی جلد کی رنگت پیلی تھی اور حرکات و سکنات میں ایسے لوگوں کی سی نرمروی اور اہلیت تھی جن کا حقیقت سے روزانہ واسطہ رہتا ہو۔

سر درد کی دھند میں سے اسے احساس ہوا کہ آنا نظروں ہی نظروں میں اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت تک داماسو نے صحن میں دوسرے لوگوں کی آواز کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

''ان سب نے صبح سے اور کوئی بات ہی نہیں کی'' آنا اسے کافی دیتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''مرد لوگ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں گئے ہیں۔''

داماسو نے خود دیکھا، صحن میں سے مرد اور بچے غائب تھے۔ کافی پیتے ہوئے وہ خاموشی سے اُن عورتوں کی گفتگو سننے اور سمجھنے کی کوشش میں لگا رہا جو رسی پر کپڑے لٹکا رہی تھیں۔ آخر اس نے سگریٹ نکالا اور باورچی خانے میں سے باہر نکل آیا۔

''تیریسا!'' اس نے پکارا۔

جسم کے ساتھ چپکے ہوئے گیلے کپڑے پہنے ایک لڑکی نے اس کی آواز کا جواب دیا۔ ''ذرا احتیاط سے بات کرنا'' آنا نے سرگوشی کی۔ لڑکی چل کر داماسو کے قریب آئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' داماسو نے پوچھا۔

''رات کو بلیرڈ ہال میں چوری ہوئی ہے۔ چور سب کچھ لے گئے۔''

لڑکی کو جیسے تمام تفصیلات کا علم تھا۔ اس نے وضاحت سے بتایا کہ چوروں نے رات کس طرح ہال میں سے یکے بعد دیگرے ساری چیزیں اکھاڑیں، حتیٰ کہ بلیرڈ کھیلنے کی بھاری میز بھی۔ وہ اتنے تیقن سے بات کر رہی تھی کہ خود داماسو کو لگا جیسے اُسے ہر بات کا صحیح علم ہو۔

''لعنت ہے!'' باورچی خانے میں لوٹتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

آنا دانت بھینچ کر گنگنانے لگی۔ داماسو اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش میں کرسی دیوار کے

ساتھ لگا کر بیٹھ گیا۔ تین ماہ قبل جب وہ بیس برس کا ہوا تھا، اس کی لکیر جیسی مونچھ کی بدولت جس کی نگہداشت وہ نہ صرف ایثار کے پوشیدہ جذبے کے تحت بلکہ کچھ کچھ شفقت سے کرتا تھا، اس کا چیچک کے داغوں سے بھرا چہرہ قدرے پختہ لگنے لگا تھا۔ تب سے اس نے خود کو بالغ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آج صبح جب کہ کل رات کے واقعے کی یاد اس کے سر درد کی دلدل میں تیرتی پھر رہی تھی، اسے یہ بھی معلوم نہ ہو پا رہا تھا کہ بلوغت تو کجا، وہ زندگی کے کس مقام سے اپنے آپ کو زندہ تصور کرنا شروع کرے۔

استری ختم کرنے کے بعد آنا نے کپڑوں کو ایک جیسی قامت کے دو ڈھیریوں میں بانٹا اور باہر جانے کی لیے تیار ہونے لگی۔

''زیادہ دیر نہ لگانا۔'' داماسو نے کہا۔

''نہیں، روز سے زیادہ نہیں۔''

وہ اس کے پیچھے کمرے میں آیا۔ ''تمہارے چار خانے والی قمیض وہاں رکھی ہے'' آنا نے کہا۔ ''بہتر ہو گا کہ آج دھاریوں والی قمیض نہ پہنو۔'' آنا نے اپنے خاوند کی بلی جیسی شفاف آنکھوں میں دیکھا۔ ''کیا پتا کل کسی کی نظر تم پر پڑ گئی ہو!''

داماسو نے ہتھیلیوں کا پسینہ پتلون پر رگڑ کر صاف کیا۔ ''نہیں، مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔''

''پکا پتا تو نہیں۔'' آنا نے دُہرایا۔ وہ دونوں بازوؤں پر کپڑوں کا ایک ایک بنڈل اٹھائے ہوئے تھی۔

''ویسے بھی تمہیں آج باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ کچھ دیر رُکو، میں باہر کا چکر لگا کر آتی ہوں، جیسے مجھے کسی بات سے کوئی غرض نہیں۔''

قصبے میں لوگوں کی زبانوں پر کسی اور بات کا ذکر ہی نہ تھا۔ آنا کو بار بار اسی ایک واقعے کی مختلف بلکہ ایک دوسرے کی تردید کرتی ہوئی تفصیلات سُننی پڑیں۔ لوگوں کے دھلے ہوئے کپڑے ان کے حوالے کرنے کے بعد وہ ہر سنیچر کی طرح مارکیٹ جانے کی بجائے سیدھی چوک کی جانب ہوئی۔

بلیرڈ ہال کے سامنے اس کے خیال کے برعکس کم لوگ تھے۔ کچھ لوگ بادام کے درخت کے نیچے کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ شامیوں نے دوپہر کے کھانے کے بعد دستر خوان اٹھا دیا تھا اور دکانیں اپنے کینوس کے سائبانوں کے نیچے اونگھتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ایک شخص ہوٹل کے ملاقات کے کمرے میں جھولنے والی کرسی میں ٹانگیں پھیلائے اور منہ کھولے سو رہا تھا۔ دوپہر کی

گرمی میں ہر چیز مفلوج سی لگتی تھی۔

آنا بلیرڈ ہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتی گئی اور جب وہ گودی کے مقابل زمین کے خالی قطعے پر سے گزر رہی تھی تو اسے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ تب اسے وہ بات یاد آئی جو داماسو نے اسے بتائی تھی اور یہ وہ بات تھی جس کا علم تو سب کو ہوگا مگر یہ بلیرڈ ہال کے گاہکوں کے سوا کسی کے ذہن میں نہ رہی ہوگی، بلیرڈ ہال کا عقبی دروازہ زمین کے ایک خالی قطعے پر کھلتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بازو پھولے ہوئے پیٹ کے اوپر باندھے لوگوں سے باتوں میں لگ گئی، اس کی نظریں اس دروازے پر گڑی تھیں جسے رات کو توڑا گیا تھا۔ تالا تو اپنی جگہ موجود تھا لیکن ایک طرف کا کنڈا ایسے اُکھیڑ لیا گیا تھا جیسے کسی کا دانت نکالا جاتا ہے۔ کچھ دیر تک آنا اس نقصان کا جائزہ لیتی رہی جو اُس تنہا اور معمولی کوشش کے نتیجے میں ہوا تھا اور ترحم کے احساس کے ساتھ اسے اپنے خاوند کا خیال آیا۔

'کون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

اُس میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

لوگوں نے جواب دیا''کسی کو معلوم نہیں۔ سنا ہے کوئی اجنبی تھا۔''

''ہاں، اجنبی ہی ہوسکتا ہے'' اس کے عقب میں کھڑی ایک عورت بولی۔'' اس قصبے میں تو کوئی چور نہیں ہے۔ یہاں تو ہر کوئی دوسرے کو جانتا ہے۔''

آنا نے مُڑ کر اسے دیکھا۔'' ہاں، یہ تو ہے'' اس نے کہا اور ہلکے سے مسکرائی۔ وہ پسینے میں تر بتر تھی۔ اس کے نزدیک ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا جس کی گردن کی پشت پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں

''کیا وہ سب کچھ لے گئے؟'' آنا نے پوچھا۔

'' دوسو پیسو اور بلیرڈ کی گیندیں'' بوڑھے نے جواب دیا۔ وہ قدرے غیر معمولی دل چسپی سے آنا کو دیکھ رہا تھا۔'' آئندہ سے ہمیں آنکھیں کھول کر سونے کی عادت ڈالنی پڑے گی۔''

آنا نے نظریں پھیر لیں۔'' ہاں، یہ تو ہے'' اس نے دوسری بار کہا۔ سر کے اوپر رومال باندھ کر وہ چل پڑی۔ چلتے وقت وہ ذہن سے یہ خیال نکالنے سے قاصر رہی کہ وہ بوڑھا اُسے گھورے جا رہا ہے۔

خالی قطعے پر جمع لوگ پندرہ منٹ تک تو باتمیز انداز میں بات چیت کرتے رہے، جیسے دروازے کے عقب میں کسی کا جنازہ رکھا ہو۔ پھر وہ سب اضطراب کے عالم میں واپس مڑ کر

چوک کی جانب چل دیے۔

بلیرڈ ہال کا مالک، قصبے کے میئر اور دو پولیس والوں کے ساتھ، ہال کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ٹھگنا اور گول مٹول آدمی تھا، اس کی پتلون پیٹ کے دباؤ کے باعث اپنی جگہ پر ٹکی ہوئی تھی اور یہ عینک ایسی تھی جیسے عموماً بچے تاروں سے بنا لیا کرتے ہیں، لیکن وہ قصبے کا بے حد معزز آدمی گردانا جاتا تھا۔

ہجوم نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی آنا اُس کا بیان سنتی رہی، حتیٰ کہ ہجوم آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ تب، گرمی سے مضمحل، وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی، جس کے گرد اس کے شور مچاتے ہوئے پڑوسی جمع تھے۔

بستر میں دراز داماسو سو بار اس سوال پر غور کر چکا تھا کہ پچھلی رات آنا نے سگریٹ پیے بغیر اتنی دیر تک اس کا انتظار کیسے کر لیا تھا۔ اسے مسکراتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوتے اور سر پر سے پسینے میں بھیگا رومال اتارتے دیکھ کر اس نے تقریباً ان پیا سگریٹ کچے فرش پر بجھا کر سگریٹ کے اور بہت سے بجھے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان ڈال دیا اور بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔

''تو کیا پتا چلا؟''

آنا بستر کے نزدیک گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

''پتا یہ چلا کہ تم چوری کرنے کے علاوہ جھوٹ بھی بولتے ہو'' اس نے کہا۔

''کیسے؟''

''ایسے کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ دراز میں کچھ بھی نہیں تھا۔''

داماسو کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''کچھ تھا ہی نہیں۔''

''وہاں دو سو پچیس تھے'' آنا نے کہا۔

''بالکل جھوٹ'' وہ دروازے سے بولا۔ وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ رازدارانہ لہجے میں بات کرنے لگا۔ ''صرف پچیس سینٹ تھے۔''

اس نے آنا کو اپنی بات کا یقین دلا دیا۔ ''روک بہت بدمعاش آدمی ہے۔'' داماسو نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ''اس کی خواہش یہ ہے کہ میں جا کر اس کا جبڑا توڑ دوں۔'' آنا زور سے ہنس پڑی۔

''بے وقوف مت بنو۔''

داماسو بھی ہنسنے لگا۔ جس وقت وہ شیو بنا رہا تھا، آنا نے اسے وہ تمام باتیں بتائیں جو وہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ پولیس والے کسی اجنبی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ''کہتے ہیں وہ جمعرات کو قصبے میں وارد ہوا تھا ور کل رات گودی کے اردگرد گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا'' وہ بولی۔ ''لیکن اب پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔'' داماسو اس اجنبی کے بارے میں سوچنے لگا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا، ایک لمحے کے لیے اسے یقین ہو گیا کہ وہ اجنبی ہی اصل مشتبہ کردار ہے۔

''شاید وہ قصبے سے چلا ہی گیا ہو'' آنا نے کہا۔

ہمیشہ کی طرح داماسو کو تیار ہونے میں تین گھنٹے لگے۔ اولین کام نفاست سے مونچھوں کی مناسب حد تک تراش کا تھا۔ پھر صحن میں نلکے کے نیچے غسل۔ آنا اسی دل چسپی کے ساتھ جس میں اُس رات سے لے کر جب اس نے پہلی بار داماسو کو دیکھا تھا، آج تک کسی چیز کے باعث کوئی کمی نہیں آئی تھی، اس کے بالوں میں کنگھی کرنے کے دشوار اور پُر مشقت عمل کا نظروں سے قدم بہ قدم تعاقب کرتی رہی۔ آنا نے جب اسے گھر سے باہر جانے سے قبل سرخ چار خانے والی قمیص پہنے، آئینے میں اپنا معائنہ کرتے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ خود عمر رسیدہ اور ناقص ہو چکی ہو۔ داماسو نے کسی مشاق باکسر کی سی چستی کے ساتھ آنا کو دو چار جھوٹ موٹ کے مکے لگانے کی ادا دکھائی۔ آنا نے اسے کلائیوں سے پکڑ لیا۔

''پاس خرچ کے لیے بھی کچھ ہے؟''

''ارے میں امیر آدمی ہوں'' داماسو نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔ ''میرے پاس دو سو پیسو ہیں۔''

آنا نے دیوار کی طرف منہ کر کے اپنی چولی میں سے کچھ مڑے ہوئے نوٹ نکالے اور ان میں سے ایک پیسو کا نوٹ داماسو کو تھماتے ہوئے بولی ''یہ رکھ لو، بڑے آئے ویلنٹینو!!''

اس رات داماسو اپنے چند دوستوں کے ہمراہ چوک میں تھا۔ اتوار کے روز گردونواح کے دیہات سے جو لوگ مال اسباب فروخت کرنے قصبے کے بازار میں آتے تھے، وہ آلو کے قتلے اور لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے اسٹالوں کے درمیان اپنے سائبان نصب کر رہے تھے۔ شام کے اوائل ہی سے ان کے خراٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ داماسو کے دوستوں کو بلیرڈ ہال میں چوری کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا ریڈیو پر بیس بال کے مقابلوں کی کمنٹری کے نہ سن پانے کا تھا۔ بلیرڈ ہال بند ہونے کی وجہ سے وہ کمنٹری سے محروم ہو گئے تھے۔ بیس بال کے بارے میں باتیں کرتے

کرتے وہ سینما ہال میں چلے گئے، انھوں نے یہ بھی دریافت نہ کیا اور نہ ان میں سے کسی کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ کون سی فلم چل رہی ہے۔

کانتن فلاس کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ بالکنی کی پہلی قطار میں بیٹھا داماسو بے شرمی سے ہنسے جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے جذبات سے صحت یاب ہو رہا ہو۔ وہ جون کی ایک خوش کن رات تھی اور فلم کے لمبے خاموش وقفوں میں، جب پروجیکٹر کی دودھیا شعاع کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، بغیر چھت کے اس ہال میں ستاروں کی خاموشی اپنا بوجھ ڈالتی محسوس ہونے لگتی۔

اچانک اسکرین پر ہلتے ہوئے نقش مدھم ہو کر تھم گئے اور آرکسٹر کے عقب سے شور سنائی دیا۔ بتیوں کے اچانک جل اٹھنے کی چکا چوند میں داماسو کو یوں لگا جیسے اس کی چوری کا راز فاش ہو گیا ہو اور اس پر سرِ عام الزام لگایا جا رہا ہو۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن یک دم اس نے دیکھا آرکسٹرا کے قریب سامعین جیسے مفلوج سے ہو گئے تھے اور پولیس کا ایک سپاہی کسی شخص کو اپنی مٹھی کے گرد لپٹی ہوئی پیٹی کے تانبے کے وزنی بکوے سے بے رحمی کے ساتھ مارے جا رہا تھا۔ مار کھانے والا ایک دیو قامت کالا تھا۔ عورتوں نے چیخ پکار شروع کر دی اور پولیس والا جو کالے کو پیٹ رہا تھا، عورتوں کی چیخوں سے بلند آواز میں چلایا: ''یہ چور ہے! چور!'' کالے نے لڑھک کر کرسیوں کی دو قطاروں کے درمیان رینگنا شروع کر دیا لیکن پولیس نے اس کا تعاقب نہ چھوڑا اور دو سپاہی اس کے پیچھے بھاگتے اور اس کے گردن پر ضربیں لگاتے رہے، حتیٰ کہ وہ اسے کمر سے قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

تب اس سپاہی نے جو اسے پیٹی سے مار رہا تھا، اس کی کلائیاں کمر کے پیچھے رسی سے باندھ دیں اور تین سپاہی اسے دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف لے گئے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ داماسو کو تب ہی پتا چلا جب وہ اس کے قریب سے گزرے۔ کالے آدمی کی قمیض پھٹ چکی تھی اور اس کا چہرہ دھول، پسینے اور خون کے آمیزے سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا اور پولیس والوں کو قاتل اور خونی کے القاب سے پکار رہا تھا۔ تب پروجیکٹر دوبارہ چلا دیا گیا اور فلم جاری ہو گئی۔

داماسو دوبارہ نہیں ہنسا۔ اس نے باقی کی فلم ٹکڑوں میں دیکھی جن کا ایک دوسرے سے کم ہی تعلق تھا اور وہ لگاتار سگریٹ پھونکتا رہا۔ یہاں تک کہ ہال کی بتیاں جلا دی گئیں اور حاضرین نے ایک دوسرے کی جانب یوں دیکھا جیسے حقیقت سے خوف زدہ ہوں۔ ''اچھی فلم تھی۔'' کسی نے، جو داماسو کے قریب تھا، کہا۔ داماسو نے اسے مڑ کر نہ دیکھا۔

''کاتن فلاس اچھا ایکٹر ہے'' اس نے جواب دیا۔

لوگوں کی رو کے ساتھ بہتے بہتے وہ دروازے تک آ گیا۔ چھابڑیوں پر خورد ونوش کا سامان بیچنے والے گھروں کو جا رہے تھے۔ گیارہ کے بعد کا عمل تھا لیکن بازار میں بہت سے لوگ کھڑے اس انتظار میں تھے کہ فلم دیکھنے والے باہر آئیں تا کہ ان سے کالے کی گرفتاری کی تفصیل دریافت کی جا سکے۔

اس رات کمرے میں داخل ہوتے وقت داماسو اتنا محتاط تھا کہ آنا کو جو آدھی سوئی ہوئی تھی، اس کی موجودگی کا پتا اس وقت چلا جب وہ بستر میں لیٹ کر دوسرا سگریٹ پی رہا تھا۔

''کھانا چولھے پر رکھا ہے۔'' وہ بولی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' داماسو نے جواب دیا۔

آنا نے آہ بھری اور بیدار ہوئے بغیر کہا ''میں خواب دیکھ رہی تھی کہ نورا مکھن سے پتلیاں بنا رہی ہے'' پھر یک دم اسے احساس ہوا کہ وہ سونے کی نیت سے نہیں لیٹی تھی تاہم سو گئی تھی۔ وہ بستر میں پلٹی، چہرہ داماسو کی جانب موڑا اور خیرہ ہو کر اپنی آنکھیں ملنے لگی۔

''وہ اجنبی پکڑا گیا ہے'' آنا نے کہا۔

داماسو نے بولنے سے قبل ذرا توقف کیا۔

''کس نے خبر دی ہے؟''

''انھوں نے اسے سینما ہال میں سے پکڑا ہے'' وہ بولی۔ ''سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں ۔''

آنا نے اجنبی کی گرفتاری کی غلط سلط روداد داماسو کو سنائی۔ داماسو نے اس کی تصحیح کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

''ہائے بے چارہ!'' آنا نے آہ بھری۔

''بے چارہ؟'' داماسو غصے میں آتے ہوئے بولا۔ ''تمھارا دل تب خوش ہوتا اگر اُس کی جگہ میں شکنجے میں ہوتا؟''

آنا اس کی طبیعت کے اُتار چڑھاؤ سے خوب واقف تھی، اس لیے خاموش رہی۔ پو پھٹے تک وہ اسے بستر میں لیٹے، سگریٹ پیتے اور دمے کے مریضوں کی طرح سانس لیتے محسوس کرتی رہی۔ ایک بار اسے لگا جیسے وہ بستر سے نکلا اور کسی غیر واضح تلاش میں جس میں وہ بصارت سے زیادہ حسِ لامسہ سے کام لیتا معلوم ہو رہا تھا، کمرے کی تمام چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا، پھر

پندرہ منٹ سے زیادہ دیر تک بستر کے نیچے کی زمین کھرچتا رہا۔ پھر آنا نے اندھیرے میں اسے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ہر کام حتی الامکان خاموشی سے کر رہا تھا، یہ جانے بغیر کہ آنا، اس سارے عمل کے دوران اسے یہ احساس دلا کر کہ وہ سو رہی ہے، اس کی لگاتار مدد کر رہی تھی۔ آنا کے ذہن میں کوئی قدیم، خوابیدہ حس بیدار ہوئی اور وہ جان گئی کہ داماسو پچھلی رات فلم دیکھنے گیا ہوا تھا اور یہ بھی سمجھ گئی کہ اس نے گیندیں ابھی ابھی بستر کے نیچے کیوں دفن کی ہیں۔

سوموار کو جب بلیرڈ ہال کھلا تو پرجوش گاہکوں کے ایک ہجوم نے اس پر ہلا بول دیا۔ بلیرڈ کی میز جامنی کپڑے سے ڈھکی رکھی تھی جیسے وہ منظر کسی بلیرڈ ہال کا نہیں بلکہ جنازہ گاہ کا ہو۔ دیوار پر ایک اعلان چسپاں تھا ''گیندیں ختم، بلیرڈ ہضم''۔ لوگوں نے اندر آ کر اس اعلان کو یوں پڑھا جیسے وہ اخبار کی کوئی خبر ہو۔ چند ایک تو اس کے سامنے کھڑے کافی دیر تک ناقابلِ فہم عقیدت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے رہے۔

داماسو بلیرڈ ہال میں داخل ہونے والے اولین گاہکوں میں سے تھا۔ اپنی زندگی کا ایک حصہ وہ ان بنچوں پر بیٹھے گزار چکا تھا جو ہال میں تماشائیوں کے لیے مخصوص تھیں اور دروازہ کھلتے ہی وہ وہاں موجود تھا۔ آج ہال میں موجود ہونا البتہ اتنا ہی مشکل، لیکن اتنا ہی غیر ارادی کام تھا جتنا تعزیت کے لیے کہیں جانا۔ اس نے کاؤنٹر کی دوسری جانب کھڑے مالک کی کمر تھپتھپائی اور کہا: ''کتنی اذیت کی بات ہے، روک!''

مالک نے افسردگی سے سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر دکھی سی مسکراہٹ تھی۔ آہ بھر کر اس نے جواب دیا ''ہاں بھئی وہ تو ہے۔'' اور وہ دوبارہ گاہکوں کو مشروبات فراہم کرنے میں لگ گیا، جب کہ داماسو کونے میں دھرے اسٹول پر کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا جامنی کفن میں لپٹی بلیرڈ کی میز کے بارے میں سوچ بچار کرتا رہا۔

''کیسی عجیب بات ہے'' اس نے کہا۔

''ہاں'' ایک اور شخص نے، جو داماسو کے برابر والے اسٹول پر بیٹھا تھا، اس سے اتفاق کیا۔ ''لگتا ہے جیسے یہ ماتم کا ہفتہ ہو۔''

جب گاہکوں کی اکثریت دوپہر کے کھانے کے لیے گھر جا چکی تو داماسو نے ریکارڈوں کی مشین میں چونّی ڈالی اور میکسیکو کے ایک گیت کا انتخاب کیا جس کی جگہ اسے مشین کے کارڈ پر زبانی یاد تھی۔ روک میز کرسیاں اٹھا اٹھا کر ہال کی پچھلی دیواروں کے ساتھ رکھنے لگا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' داماسو نے پوچھا۔

"تاش کے لیے میزیں لگا رہا ہوں" رَوک نے کہا۔ "جب تک نئی گیندیں نہیں آتیں کچھ دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کرسی اٹھائے رک رک کر چلتا ہوا وہ کسی نئے نئے رنڈوے کی طرح لگ رہا تھا۔

"کب آ رہی ہیں گیندیں؟" داماسو نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ایک مہینہ لگ جائے گا۔"

"اس وقت تک تو پرانی گیندیں بھی برآمد ہو چکی ہوں گی" داماسو نے کہا۔

رَوک نے چھوٹی چھوٹی میزوں کی قطاروں کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ "نہیں، وہ نہیں ملیں گی" اس نے ماتھے کا پسینہ آستین سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کالے کو ہفتے کے دن سے بھوکا پیاسا رکھا ہوا ہے مگر وہ بتا کر ہی نہیں دیتا کہ گیندیں کہاں ہیں۔" اس نے پسینے سے دھندلے عینک کے شیشوں میں سے داماسو کو غور سے دیکھا۔

"مجھے یقین ہے اس نے دریا میں پھینک دی ہیں۔"

داماسو نے دانتوں میں اپنے ہونٹ دبا لیے۔

"اور دو سو پیسو؟"

"وہ بھی" رَوک نے کہا۔ "اس کے پاس سے صرف تیس ہی برآمد ہوئے ہیں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ داماسو شاید کبھی بھی اس احساس کی وضاحت نہ کر پاتا کہ اس ایک نظر نے جیسے ان دونوں کے درمیان ایک مجرمانہ سا تعلق قائم کر دیا۔

اس دوپہر آنا نے غسل خانے کی کھڑکی میں سے داماسو کو مکے بازوں کی طرح ناچتے ہوئے گھر لوٹتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے کے اندر آ گئی۔

"سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے" داماسو نے کہا۔ "بڈھے نے صبر شکر کر کے نئی گندوں کا آرڈر بھی دے دیا ہے۔ اب صرف اس وقت تک انتظار کرنے کی ضرورت ہے جب تک لوگ یہ قصہ بھول نہیں جاتے۔"

"اور کالے کا کیا بنے گا؟"

"کیا بنے گا؟" داماسو نے کندھے اچکائے۔ "اگر اس کے پاس سے گیندیں برآمد نہ ہوئیں تو اسے رہا کرنے کے سوا کیا چارہ رہ جائے گا؟"

کھانے کے بعد وہ دونوں گھر کے سامنے والے دروازے کے آگے بیٹھ کر ہمسایوں سے باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ سینما ہال کا لاؤڈ اسپیکر بند ہو گیا۔ بستر میں دراز ہوتے وقت داماسو

پُر جوش تھا۔

''ابھی ابھی مجھے ایک نہایت زبردست کام کا خیال آیا ہے۔'' اس نے کہا۔

آنا کو لگا جیسے وہ سورج غروب ہونے کے وقت سے اسی کام کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا۔

''میں ایک قصبے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک سفر کرتا رہوں گا۔'' داماسو نے بات جاری رکھی۔

''اور ایک سے بلیرڈ کی گیندیں چرا کر دوسرے میں بیچتا جاؤں گا۔ ہر قصبے میں بلیرڈ ہال تو ہوتا ہی ہے۔''

''کیسی گولی؟'' اس نے کہا۔ ''وہ سب تو فلموں میں ہوتا ہے۔'' کمرے کے درمیان میں کھڑا وہ اپنے ہی جوش و جذبے سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ آنا کپڑے بدلنے لگی۔ وہ بظاہر لاتعلقی سے، لیکن دراصل گہری ہمدردانہ توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''میں سوٹوں کی ایک پوری قطار خریدوں گا۔'' داماسو نے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پھیلی ہوئی ایک خیالی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے وہاں تک اور پچاس جوڑی جوتے۔''

''اگر خدا کو منظور ہوا تو'' آنا نے کہا۔

داماسو سنجیدگی سے آنا کو دیکھنے لگا۔

''تمہیں میرے معاملات سے کوئی دل چسپی نہیں'' اس نے کہا۔

''ان کا میرے حالات سے دور کا بھی واسطہ نہیں'' آنا نے جواب دیا۔ اس نے لیمپ بجھا دیا، دیوار کے ساتھ لگ کر بستر پر لیٹ گئی اور واضح تلخی سے بولی۔ ''جب تم تیس برس کے ہو گے تو میں سینتالیس کی ہو جاؤں گی۔''

''فضول باتیں مت کرو'' داماسو نے کہا۔

وہ اپنی جیبوں میں دیا سلائی ڈھونڈ رہا تھا۔ ''تمہیں لوگوں کے کپڑوں سے کشتی لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' اس نے قدرے چکرا کر کہا۔ آنا نے اس کے لیے ماچس کی تیلی جلائی اور اس وقت تک شعلے کو جلتا دیکھتی رہی جب تک وہ بجھ نہ گیا۔ تب اس نے تیلی زمین پر پھینک دی۔ داماسو بستر میں لیٹا، باتیں کرتا رہا۔

''پتا ہے بلیرڈ کی گیندیں کس چیز سے بنتی ہیں؟''

آنا نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ہاتھی دانت سے'' وہ کہتا رہا۔ ''اور پتا ہے وہ دنیا میں اتنی کم ہیں کہ انھیں منگوانے میں ایک مہینہ لگتا ہے۔''

''سو جاؤ'' آنا نے قطع کلامی کی۔ ''مجھے صبح پانچ بجے اٹھنا ہے۔''

داماسو اب اپنے روزمرہ کے معمول کی جانب لوٹ چکا تھا۔ تمام دن وہ بستر میں لیٹے لیٹے گزارتا اور قیلولے کے بعد باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگتا۔ رات کو وہ بلیرڈ ہال میں بیٹھ کر بیس بال کی کمنٹری سنا کرتا۔ جتنے جوش وخروش سے وہ نت نئے منصوبے سوچتا تھا اتنے ہی جوش و خروش سے انھیں فراموش بھی کر دیا کرتا تھا۔

سنیچر کے دن اس نے اپنی بیوی سے پوچھا ''تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟''

''گیارہ پیسو ہیں'' اس نے کہا اور نرمی کے ساتھ اضافہ کیا۔ ''مکان کا کرایہ۔''

''میں تمہارے ساتھ ایک سودا کرتا ہوں۔''

''کیا؟''

''وہ رقم مجھے ادھار دے دو۔''

''ہمیں کرایہ ادا کرنا ہے۔''

''بعد میں دے دیں گے۔''

آنا نے نفی میں سر ہلایا۔ داماسو نے اس کی کلائی دبوچ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔ وہ میز کے پاس بیٹھی تھی، جہاں ابھی دونوں نے ناشتہ ختم کیا تھا۔

''چند دنوں کی بات ہے'' اس نے پریشان ملائمت سے اس کا بازو تھپتھپایا۔ ''گیندیں بک جائیں گی تو ریل پیل ہو جائے گی۔''

آنا راضی نہ ہوئی۔

اس رات داماسو اسے فلم دکھانے لے گیا اور سارا وقت اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھے رہا حتیٰ کہ اُس وقت بھی جب وہ وقفے کے دوران میں اپنے دوستوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ فلم بھی انھوں نے توجہ سے نہ دیکھی۔ فلم ختم ہوئی داماسو بے تاب سا تھا۔

آنا نے کندھے اچکائے۔

''جو بھی پہلا شخص مجھے نظر آیا میں اُس کا بھیجا نکال دوں گا'' فلم سے باہر آنے والے مجمعے میں داماسو اسے پیچھے دھکیل رہا تھا۔ ''اور قتل کے جرم میں مجھے جیل بھیج دیا جائے گا۔'' آنا اندر ہی

اندر ہنستی رہی مگر ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اگلی صبح ایک طوفانی رات گزرنے کے بعد داماسو صریحی سرعت سے اور آنا کو خوف زدہ کرنے کی نیت سے باہر جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ غرایا:

''میری واپسی کی توقع نہ رکھنا۔''

آنا خفیف سا ڈر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''خدا کرے تمہارا سفر اچھا کٹے'' اس نے بلند آواز میں دعا دی۔

دروازہ دھڑ سے بند ہونے کے وقت سے داماسو کے لیے اتوار کا خالی اور نہ ختم ہونے والا دن شروع ہوا۔ بڑے بازار میں سجے چمک دار برتن اور رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس عورتیں جو اپنے بچوں کو ہمراہ لیے آٹھ بجے کی عبادت کے لیے گرجے کی طرف روانہ تھیں، چوک کو ایک خوش کن تاثر دے رہی تھیں، لیکن گرمی کے باعث فضا میں گھٹن صبح سویرے ہی شروع ہو چکی تھی۔

داماسو نے سارا دن بلیرڈ ہال میں گزارا۔ صبح کے وقت لوگ گروہوں میں بیٹھے تاش کھیلتے رہے اور دوپہر کے کھانے سے قبل تھوڑی دیر کے لیے ہال میں گاہکوں کا خاصا ہجوم ہو گیا۔ لیکن یہ بات مسلم تھی کہ لوگوں کی نظر میں بلیرڈ ہال کی کشش ختم ہو گئی تھی۔ صرف سورج ڈھلنے پر جب بیس بال کی کمنٹری شروع ہوئی، تب بلیرڈ ہال کی تھوڑی بہت پرانی چہل پہل اور زندگی دوبارہ دیکھنے میں آئی۔

بلیرڈ ہال کے بند ہونے پر داماسو کو احساس ہوا کہ اس کے پاس جانے کو کوئی جگہ نہیں ہے اور چوک میں سے تمام زندگی نچڑ چکی ہے۔ اس نے گھاٹ کے متوازی سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ کہیں دور سے خوش کن موسیقی کی آواز آ رہی تھی، وہ اس جانب بڑھتا گیا۔ سڑک کے اختتام پر ایک بہت وسیع لیکن خالی ناچ گھر تھا، جس کی کاغذ کے پھولوں سے سجاوٹ کی گئی تھی جن کے رنگ اڑ چکے تھے۔ اس کے ہال کے عقب میں لکڑی کے بنے پلیٹ فارم پر ایک بینڈ تھا۔ میک اپ کی دم گھونٹنے والی بو ہوا میں تیر رہی تھی۔

داماسو جا کر کاؤنٹر پر بیٹھ گیا۔ جب گانا ختم ہوا، مجیرے بجانے والا لڑکا ناچنے والوں کے درمیان پھر پھر کر ان سے سکے اکٹھے کرنے لگا۔ ایک لڑکی اپنے ہم رقص کو ہال کے فرش پر اکیلا چھوڑ کر داماسو کی جانب بڑھی۔

''اور جانِ من، کیا خبریں ہیں؟''

داماسو نے بیٹھنے کے لیے اسے اپنے ساتھ کی جگہ پیش کی۔ شراب فروش، چہرے پر پاؤڈر

لگائے اور کان میں کارنیشن کا پھول اُڑسے، ان کے پاس آیا۔ باریک اور تیز آواز میں اس نے پوچھا۔

"کیا پیو گے؟"

لڑکی نے مڑ کر داماسو کی جانب دیکھا۔

"ہم کیا پییں گے؟"

"کچھ نہیں۔"

"چلو میں پلا دیتی ہوں۔"

"نہیں، یہ بات نہیں" داماسو نے کہا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔"

"ہائے" شراب فروش نے آہ بھر کر کہا۔ "اتنی خوب صورت آنکھوں والے بھی بھوکے؟"

داماسو اور وہ لڑکی دونوں اٹھ کر ہال کے دوسرے سرے پر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے لڑکی بہت ہی کم عمر لگ رہی تھی۔ لیکن سرخی پاؤڈر اور بناؤ سنگھار کی وجہ سے اس کی اصل عمر کا پتا لگانا ناممکن تھا۔ کھانا کھانے کے بعد داماسو لڑکی کے پیچھے پیچھے اندھیرے برآمدے کے عقب میں ایک کمرے میں چلا گیا جہاں باہر سوئے ہوئے جانوروں کے سانس لینے کی آواز ان کے کانوں میں آ رہی تھی۔ بستر پر ایک شیر خوار بچہ لیٹا ہوا تھا جس کے جسم پر رنگ برنگے چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے۔ لڑکی نے وہ چیتھڑے اٹھا کر لکڑی کے ایک صندوق میں ڈال دیے اور بچے کو ان کے اوپر لٹا کر صندوق فرش پر رکھ دیا۔

"چوہے اسے کاٹ کھائیں گے۔" داماسو نے کہا۔

"نہیں، وہ اسے نہیں کاٹتے۔"

تب لڑکی نے جو سرخ لباس پہن رکھا تھا اسے اُتار کر دوسرا بڑے بڑے پیلے پھولوں والا لباس پہن لیا جس کا گلا خاص کھلا اور نیچا تھا۔

"اس بچے کا باپ کون ہے؟" داماسو نے دریافت کیا۔

"خدا جانے" کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

داماسو نے دروازے کی چٹخنی چڑھائے جانے کی آواز سنی۔ کپڑے پہنے پہنے بستر پر دراز ہو کر اس نے یکے بعد دیگرے کئی سگریٹ پھونک ڈالے۔ ہال میں بجنے والے ڈھولوں کی دھمک سے بستر کی کمانیاں تک جھنجھنا رہی تھیں۔ اسے پتا نہ چلا کہ اسے کس وقت نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی، موسیقی بند ہو جانے کے سبب کمرہ پہلے کی نسبت بڑا اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔

لڑکی بستر کے قریب کھڑی اپنا لباس اتار رہی تھی۔

''کیا وقت ہوا ہے؟''

''چار بجے ہوں گے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''بچہ رویا تو نہیں؟''

''نہیں، میرے خیال میں تو نہیں'' داماسو نے جواب دیا۔

لڑکی بستر میں اس کے ساتھ بہت ہی قریب لیٹ گئی۔ اس کی قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے وہ ایسی نگاہوں سے جو پوری طرح داماسو پر مرکوز نہ تھیں، اسے گھورتی رہی۔ داماسو کو احساس ہوا کہ لڑکی نے خاصی شراب پی رکھی ہے۔ اس نے بتی بجھانے کی کوشش کی۔

''رہنے دو'' لڑکی نے کہا۔ ''میں تمہاری آنکھوں کو دیکھتے رہنا چاہتی ہوں۔''

تڑکے کے بعد سے کمرہ ایسی آوازوں سے بھر گیا جیسی عموماً دیہاتوں میں آیا کرتی ہیں۔ بچہ رونے لگا۔ لڑکی اسے اٹھا کر بستر میں لے آئی اور دودھ پلانے لگی۔ اس دوران میں وہ ایک سہل سی لوری بھی گنگناتی رہی حتیٰ کہ وہ تینوں دوبارہ سو گئے۔ داماسو کو پتا ہی نہ چلا کہ ساتھ بجے کے قریب لڑکی بیدار ہو کر کمرے سے باہر گئی تھی اور بچے کو کہیں چھوڑ آئی تھی۔

''سب لوگ گھاٹ پر جا رہے ہیں'' لڑکی نے کہا۔

داماسو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ رات بھر میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں سویا۔

''کس لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کالے کو دیکھنے جس نے گیندیں چرائی تھیں'' لڑکی نے کہا۔ ''آج وہ اسے کہیں اور لے جا رہے ہیں۔''

داماسو نے سگریٹ سلگایا۔

''بے چارہ!'' لڑکی نے آہ بھری۔

''بے چارہ کیوں؟'' داماسو نے کہا۔ ''اسے چوری کرنے کو کس نے کہا تھا؟''

لڑکی نے ایک لمحے کو اپنا سر اس کے سینے میں چھپالیا، پھر آہستہ سے بولی: ''کون کہتا ہے؟''

''مجھے پتا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''جس رات بلیرڈ ہال میں چوری ہوئی وہ گلوریا کے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ اس سے اگلے روز بھی وہ شام پڑنے تک اسی کے کمرے میں تھا۔ لیکن پھر پتا چلا کہ اسے سینما ہال میں سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔''

''تو گلوریا نے پولیس کو بتایا کیوں نہیں؟''

''کالے نے بتایا تھا۔ لیکن قصبے کا میئر گلوریا کے کمرے میں آیا، اس کا سارا سامان اُلٹ پلٹ کر دیا اور اسے دھمکی دی کہ اسے بھی شریکِ جرم کے طور پر دھر لیا جائے گا۔ آخر کار بیس پیسو دے کر بے چاری نے اپنی جان چھڑائی۔''

آٹھ بجے داماسو اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہیں رہ جاؤ'' لڑکی نے کہا۔ ''آج دوپہر تمہارے لیے مرغا ذبح کر کے پکاؤں گی۔''

داماسو نے کنگھی کو اپنی پتلون کی جیب میں اڑسنے سے پہلے ہتھیلی پر دو تین بار جھٹکا۔ ''مشکل ہے۔'' اس نے لڑکی کو کلائیوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے ابھی ابھی منہ دھویا تھا اور وہ واقعی بہت کم عمر تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کی وجہ سے اس کے چہرے پر بے بسی کا تاثر تھا۔ وہ بازو داماسو کی کمر کے گرد حمائل کیے کھڑی رہی۔

''نہیں، یہیں رہ جاؤ'' لڑکی نے اصرار کیا۔

''ہمیشہ کے لیے؟''

لڑکی شرما کر داماسو سے الگ ہو گئی۔

''مسخرہ!'' اس نے کہا۔

آنا اس صبح تھکی ہوئی تھی، لیکن قصبے میں پھیلا ہوا جوش و خروش متعدی بیماری کی طرح اسے بھی لگ گیا۔ سابقہ دنوں کی نسبت اس ہفتے کی دھلائی اس نے زیادہ تیزی سے اکٹھی کی اور گھاٹ پر کالے کی روانگی کا منظر دیکھنے کے لیے چل دی۔ لوگوں کا بے صبرا ہجوم دُخانی کشتیوں کے قریب منتظر تھا، جو روانہ ہونے والی تھیں۔ داماسو بھی وہیں تھا۔

آنا نے انگلیوں سے اس کے گردوں کے پاس ٹھوکا دیا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' داماسو نے چونک کر پوچھا۔

''تمہیں خدا حافظ کہنے آئی تھی'' آنا نے کہا۔

داماسو نے نزدیک کے ایک کھمبے کو کس کر مکا لگایا۔

''لعنت ہو تم پر'' اس نے کہا۔

سگریٹ سلگا کر خالی پیکٹ اس نے دریا میں پھینک دیا۔ آنا نے ایک نیا بھرا ہوا پیکٹ اپنی اسکرٹ کے اندر سے نکال کر داماسو کی قمیض کی جیب میں ڈال دیا۔

''مجال ہے جو تم نے زندگی سے کچھ سیکھا ہو'' داماسو نے کہا۔

آنا زور سے ہنسی۔

تھوڑی دیر کے بعد کالے کو لا کر عرشے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اسے چوک کے عین درمیان میں سے لے جایا گیا تھا اور اس کی کلائیاں کمر کے پیچھے رسی سے بندھی ہوئی تھیں جسے پولیس کے ایک سپاہی نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ دو اور سپاہی بندوقیں اٹھائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کالے کا اوپر کا دھڑ ننگا تھا، نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور کسی کمے باز کی طرح اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ وہ منفعل وقار کے ساتھ ہجوم کے مذاق اور فقروں کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بلیرڈ ہال کے دروازے پر جہاں اس تماشے کے دونوں حصے دیکھنے کے لیے زیادہ ہجوم جمع تھا، ہال کا مالک خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے کالے کو گزرتا دیکھ رہا تھا۔ باقی لوگ ایک طرح کے اشتیاق سے اس پر نظر جمائے ہوئے تھے۔

کشتی فوراً ہی روانہ ہوگئی۔ کالا عرشے پر کھڑا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں تیل کے ایک بڑے سے ڈرم کے ساتھ باندھ دیے گئے تھے۔ جب دریا کے درمیان میں پہنچ کر کشتی نے آخری بار سیٹی بجائی اور مڑی تو کالے کی کمر چمک اٹھی۔

''بے چارا'' آنا نے سرگوشی کی۔

''جرائم پیشہ، حرام خور'' آنا کے قریب ہی کسی نے پولیس والوں کو گالی دی۔ ''کسی انسان کا جسم کتنی دیر تک دھوپ کی تپش سہہ سکتا ہے''

داماسو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ آواز ایک بے حد موٹی عورت کی تھی۔ وہ چوک کی طرف چل دیا۔ ''تم زیادہ ہی بکواس کرتی ہو'' اس نے آنا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''چلا چلا کر سب کو ساری کہانی کیوں نہیں سنا دیتیں؟'' وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی بلیرڈ ہال تک آئی۔

''گھر چل کر کپڑے تو تبدیل کر لو'' اس سے جدا ہوتے وقت آنا نے کہا۔ ''فقیروں جیسے لگ رہے ہو۔''

کالے کے واقعے کی بدولت بلیرڈ ہال کے اندر بہت سے جوشیلے لوگ جمع ہوئے تھے۔ رُوک ان سب کو ایک ساتھ مشروبات فراہم کرنے کی کوشش میں کئی میزوں کے آرڈر اکٹھے لے رہا تھا۔ داماسو منتظر رہا کہ کب رُوک اس کے قریب سے گزرے۔

''میری مدد کی ضرورت ہے؟''

داماسو نے پوچھا۔

رُوک نے بیئر کی آدھی درجن بوتلیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ گلاس بوتلوں کے اوپر اوندھے رکھے تھے۔

''خدا تمہارا بھلا کرے'' زدک نے کہا۔

داماسو بوتلیں اٹھا کر مختلف میزوں تک لے گیا اور دوپہر کے کھانے کے وقت تک جب گاہک آخر کار گھروں کو روانہ ہو گئے لوگوں کے آرڈر لیتا اور بوتلیں لاتا لے جاتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا، آنا نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ اس نے پی رکھی ہے۔ اس نے داماسو کا ہاتھ اٹھا کر اپنے پھولے پیٹ پر رکھا۔

''یہاں محسوس کرو'' اس نے کہا۔ ''کچھ حرکت محسوس ہوئی؟''

داماسو نے کسی جذبے یا شوق کا اظہار نہ کیا۔

''اندر وہ لاتیں چلا رہا ہے'' آنا نے کہا۔ ''ساری رات یہی کرتا رہتا ہے۔''

لیکن اس نے کوئی ردعمل نہ دکھایا۔ اپنے آپ میں گم دوسرے روز وہ صبح سویرے ہی گھر سے باہر نکل گیا اور آدھی رات کے بعد لوٹا۔ پورا ہفتہ یوں ہی گزرا۔ جو چند لمحے وہ گھر میں بسر کرتا ان میں بھی بستر میں لیٹا سگریٹ پھونکتا رہتا اور گفتگو سے گریز کرتا۔ آنا نے بھی اپنے کام میں انہماک بڑھا دیا۔ ان دونوں کے تعلق کے آغاز میں بھی ایک موقعے پر اس نے اسی طرح کا رویہ اختیار کر لیا تھا، لیکن تب آنا اسے اچھی طرح نہیں جانتی تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ ایسے حالات میں داماسو کی طرف زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اس وقت داماسو نے اس کے پیٹ پر چڑھ کر اسے اتنی زور زور سے مکے مارے کہ وہ لہولہان ہو گئی تھی۔

اس بار وہ انتظار کرتی رہی۔ رات کو وہ لیمپ کے نزدیک سگریٹوں کا ایک پیکٹ رکھ دیا کرتی، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ داماسو بھوک پیاس برداشت کر سکتا ہے مگر اسے سگریٹ کی طلب کی سہار نہیں۔ بالآخر جولائی کے وسط میں ایک روز داماسو شام پڑتے ہی گھر لوٹ آیا۔ آنا اسے دیکھ کر سخت مضطرب ہوئی۔ اس کے اتنی جلدی گھر واپس آنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہے جس کے بارے میں وہ آنا سے بات کرنا چاہتا ہے۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا لیکن بستر میں داخل ہونے سے پہلے داماسو کھویا کھویا لگ رہا تھا اور نرمی سے باتیں کر رہا تھا۔ یک لخت اس نے کہا:

''میں جانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں؟''

''کہیں بھی۔''

آنا نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ رسالوں کے سرورق جنھیں اس نے خود

رسالوں سے اتار کر دیواروں پر چسپاں کیا تھا، ورجن پر مختلف فلم اسٹاروں کی تصویریں تھیں، اب پھیکے اور بدرنگ ہو چلے تھے۔ اب اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ ان میں سے کتنے مرد بستر پر سے روانہ لگاتار دیکھے جاتے رہنے کی وجہ سے اب غائب ہو چکے ہیں اور جاتے جاتے اپنی تصویروں کے رنگ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔

''مجھ سے اکتا گئے ہو؟'' آنا نے پوچھا۔

''نہیں، یہ بات نہیں۔ اس قصبے سے اکتا گیا ہوں۔''

''باقی تمام قصبے بھی اسی جیسے ہیں۔''

''گیندیں بھی نہیں بیچ سکتا۔''

''گیندوں کی فکر چھوڑو'' آنا نے کہا۔ ''جب تک خدا نے مجھے کپڑوں سے کشتی لڑنے کی طاقت دے رکھی ہے تمہیں کوئی خطرہ مول لیتے پھرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' پھر اس نے نرمی سے اضافہ کیا ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے یہ کام کیا کیوں؟''

بولنے سے پہلے داماسو نے سگریٹ ختم کیا۔

''وہ اتنا آسان کام تھا کہ مجھے تعجب تھا کہ کسی اور کو کیوں نہیں سوجھا'' اس نے کہا۔

''پیسے کی خاطر تو ٹھیک تھا'' آنا نے اعتراف کیا ''لیکن کوئی اور گیندیں چرانے کی حماقت نہ کرنا۔''

''وہ تو میں نے سوچے بغیر ہی کہا تھا'' داماسو نے کہا۔ ''میں واپس آنے لگا تھا جب مجھے گیندیں کاؤنٹر کے پیچھے ایک ڈبے میں رکھی دکھائی دیں اور میں نے سوچا اتنی محنت کے بعد خالی ہاتھ کیوں واپس جاؤں۔''

''یہی تمہاری غلطی تھی'' آنا نے کہا۔

داماسو کو کچھ اطمینان کا احساس ہوا ''اور نئی گیندیں آ ہی نہیں سکتیں'' وہ بولا۔ ''بلکہ اب تو یہ پتا چلا ہے کہ وہ اور بھی مہنگی ہو گئی ہیں اس لیے روک نے آرڈر منسوخ کر دیا ہے۔'' اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور جیسے جیسے وہ باتیں کرتا گیا اسے اپنے دل پر سے تیرہ خیالات کا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے آنا کو بتایا کہ ہال کا مالک بلیرڈ کی میز ہی فروخت کرنے کے درپے ہے۔ میز زیادہ قیمتی نہیں تھی۔ نو آموز کھیلنے والوں کی بے ڈھنگی حرکتوں سے میز کا کپڑا کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور اس پر رنگا رنگ کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔

میز کو مکمل نئے کپڑے کی ضرورت تھی۔ ہال کے گاہکوں کے لیے جو بلیرڈ کھیلتے کھیلتے بوڑھے ہوئے تھے اس دوران میں سوائے بیس بال کی کمنٹری سننے کے اور کوئی شغل نہیں تھا۔

''سو'' داماسو نے اپنا بیان ختم کرتے ہوئے کہا ''نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تمام قصبے کی حق تلفی کی ہے۔''

''اور کچھ حاصل بھی نہیں ہوا۔''

اگلے ہفتے بیس بال کے مقابلے بھی ختم ہو جائیں گے'' داماسو نے کہا۔

''یہ تو اتنی پریشانی کی بات نہیں'' آنا نے کہا۔ ''یہ سوچو کہ اُس بے چارے کالے کا کتنا برا حشر ہوا ہے!''

جب وہ داماسو کے کندھے سے لگی بستر پر دراز تھی، جیسے اس کے ساتھ تعلقات کے اوائل میں کبھی ہوا کرتی تھی، اسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے اس کے سگریٹ ختم کرنے کا انتظار کیا، تب محتاط آواز میں بولی: ''داماسو''

''ہاں، کیا بات ہے؟''

''گیندیں واپس کر دو۔''

اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

''میں خود کئی دن سے یہی سوچ رہا ہوں'' مگر یہ پتا نہیں چل رہا کہ کیسے کروں۔''

انھوں نے طے کیا کہ گیندوں کو کسی ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں لوگوں کا عام گزر ہو۔ مگر پھر آنا نے سوچا کہ اس حرکت سے بلیرڈ ہال کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا مگر کالے کا معاملہ یوں ہی اٹکا رہے گا۔ پولیس والے پتا نہیں گیندوں کی برآمدگی سے کیا مطلب نکالیں اور کالے آدمی کو شک کا ذرا سا بھی فائدہ نہ دیں۔ اور یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ گیندیں کسی ایسے آدمی کے ہاتھ بھی لگ سکتی ہیں جو انھیں واپس کرنے کی بجائے خود بیچ کھانے کا ارادہ کر لے۔

''اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو بہتر یہی ہو گا کہ اسے ٹھیک سے کیا جائے۔'' آنا نے بات مکمل کی۔

انھوں نے فرش کھود کر گیندیں نکالیں۔ آنا نے انھیں اخبار کے کاغذوں میں لپیٹا، ایسے کہ باہر کے کاغذ کی تہوں سے پیکٹ کے اندر ملفوف اشیا کی شکل کا اندازہ نہ کیا جا سکے اور انھیں صندوق کے اندر رکھ دیا۔

''مناسب موقعے کا انتظار ضروری ہے'' آنا نے کہا۔

لیکن اس مناسب موقعے کا انتظار کرتے کرتے ہفتوں گزر گئے۔ بیس اگست کی رات کو، گیندوں کے چوری ہونے کے دو ماہ بعد، جب داماسو نے رُوک کو دیکھا تو وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا پنکھے سے مچھروں کو بھگانے میں مصروف تھا۔ ریڈیو بند ہونے کے بعد اُس کی تنہائی اور زیادہ شدید لگ رہی تھی۔

''میں نے تمہیں کیا بتایا تھا؟'' رُوک نے یوں جیسے اپنی پیش گوئی کے پورا ہونے پر مسرور ہو، داماسو سے کہا۔ ''دیکھ لو، کاروبار کا کباڑا ہو گیا!''

داماسو نے ریکارڈوں کی مشین میں ایک سکہ ڈالا۔ گانے کی اونچی آواز اور مشین کے رنگوں کی نمائش داماسو کی نظر میں گویا اس کی اپنی وفاداری کا پُرشور ثبوت تھے۔ لیکن اس کا تاثر یہ تھا کہ یہ بات رُوک کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور الٹے سیدھے دلائل سے رُوک کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جوں ہی وہ کوئی دلیل دیتا، رُوک جذباتی ہوئے بغیر اور اپنے ہاتھ کے پنکھے کی نکل پچو حرکت کا تواتر قائم رکھے رکھے اس کی دلیل کی دھجیاں اڑا دیتا۔

''کچھ نہیں کیا جا سکتا،'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''بیس بال کے مقابلے قیامت تک تو جاری نہیں رہ سکتے۔''

''ہو سکتا ہے گیندیں برآمد ہو جائیں۔''

''نہیں ہوں گی۔''

''وہ کالا انہیں کھا تو نہیں گیا ہو گا۔''

''پولیس نے ہر جگہ تلاشی لے لی تھی'' رُوک نے زچ کر دینے والے یقین کے ساتھ کہا۔ ''اُس نے انھیں دریا بُرد کر دیا ہے۔''

''معجزہ بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''بدبختی گھونگھے کی رفتار سے چلتی ہے۔ تم معجزوں پر ایمان رکھتے ہو؟''

''ہاں، کبھی کبھار'' داماسو نے کہا۔

جب داماسو وہاں سے روانہ ہوا، اُس وقت تک فلم ختم نہیں ہوئی تھی۔ لاؤڈ سپیکر پر طویل اور ٹوٹے پھوٹے مکالمے تاریک ہوتے ہوئے قصبے میں گونج رہے تھے۔ چند سکونت گاہیں جو ابھی کھلی تھیں، عارضی سی لگ رہی تھیں۔ داماسو نے چند قدم سینما ہال کی طرف اٹھائے لیکن پھر مڑ کر ناچ گھر کی طرف چل دیا۔

ناچ کے ہال میں بینڈ ایک اکیلے گاہک کے لیے، جس کے ساتھ دو عورتیں تھیں، دُھن بجا

رہا تھا۔ باقی سب لوگ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے دیواروں کے ساتھ یوں لگے بیٹھے تھے جیسے ڈاک کا انتظار کر رہے ہوں۔ داماسو بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اس نے شراب فروش لڑکے کو اشارہ کیا کہ اسے ایک بیئر لا دے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے سانس لینے کے لیے رک رک کر بوتل ہی سے بیئر پیتا رہا اور اس شخص کو جو دو عورتوں کے ساتھ فرش پر ناچ رہا تھا، یوں دیکھتا رہا جیسے شیشے کی اوٹ سے دیکھ رہا ہو۔ وہ شخص قد میں ان دونوں عورتوں سے چھوٹا تھا۔

آدھی رات کو وہ تمام عورتیں جو فلم دیکھنے گئی ہوئی تھیں، آ پہنچیں۔ مردوں کا ایک گروہ ان کے تعاقب میں تھا۔ داماسو کی دوست لڑکی جو ان کے ہمراہ تھی، انھیں چھوڑ کر داماسو کے ساتھ آ بیٹھی۔

داماسو نے اس کی جانب نہ دیکھا۔ وہ اب بھی بیئر کی نصف درجن بوتلیں پی چکا تھا اور اس شخص کو گھورے جا رہا تھا جو اب تین عورتوں کے ساتھ ناچ رہا تھا، لیکن ناچ کے دوران ان عورتوں کی نسبت اپنے پاؤں کی پیچیدہ حرکات پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ وہ خوش دکھائی دے رہا تھا کہ اگر اس کے پاس ٹانگوں اور بازوؤں کے ساتھ ساتھ ایک دم بھی ہوتی تو وہ اور زیادہ خوش ہوتا۔

''مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''تو اس کی طرف مت دیکھو'' لڑکی نے کہا۔

لڑکی نے بھی اپنے لیے شراب کا گلاس منگوایا۔ فرش ناچنے والے جوڑوں سے بھرنے لگا، لیکن تین عورتوں کے ساتھ ناچنے والے شخص نے اپنا ناچ جاری رکھا، جیسے وہ ہال میں اکیلا ہو۔ ایک بار ناچ میں مڑتے ہوئے اس کی آنکھیں داماسو سے چار ہوئیں اور وہ اور زیادہ شدومد سے ناچنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس کے خرگوش جیسے دانت نظر آنے لگے۔ داماسو پلک جھپکائے بغیر اسے گھورتا رہا، حتیٰ کہ اس شخص کو بھی سنجیدگی اختیار کرنا پڑی اور اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

''اس کا خیال ہے کہ وہ بہت خوش ہے۔'' داماسو نے کہا۔

''وہ واقعی بہت خوش ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''وہ جب بھی قصبے میں آتا ہے، دوسرے سفری تاجروں کی طرح یہاں کی موسیقی کے تمام اخراجات برداشت کرتا ہے۔''

داماسو نے اپنی نظریں اس شخص کے طرف سے ہٹا کر لڑکی کی طرف کیں۔

''تو تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کہا۔ ''اس کے پاس چلی جاؤ، جہاں تین کے لیے جگہ ہے، چار کے لیے بھی بن جائے گی۔''

داماسو کی بات کا جواب دیے بغیر لڑکی ناچ کے فرش کی طرف دیکھنے لگی اور گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی رہی۔ زرد لباس اس کے شرمیلے پن کو اور نمایاں کر رہا تھا۔

اگلا ناچ داماسو اور لڑکی نے مل کر ناچا۔ جب ناچ ختم ہوا تو داماسو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ ''میں تو بھوک سے مری جا رہی ہوں'' لڑکی بولی۔ اور داماسو کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کاؤنٹر کی جانب لے چلی۔ ''تمہیں بھی تو کھانا کھانا ہے۔'' وہ خوش و خرم آدمی دوسری جانب سے اپنی تین عورتوں کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔

''اے، سنو'' داماسو نے اسے پکارا۔

وہ داماسو کی طرف دیکھ کر رکے بغیر مسکرایا۔ داماسو نے اپنی ساتھی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس آدمی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے تمہارے دانتوں کی نمائش اچھی نہیں لگتی۔''

آدمی کا رنگ سفید پڑ گیا مگر وہ مسکراتا رہا۔

''مجھے خود بھی'' اس نے جواب دیا۔

پیشتر اس کے کہ لڑکی اسے روک سکتی، داماسو نے کس کر ایک مکا اس آدمی کے جبڑے پر لگا دیا۔ وہ آدمی فرش کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ کسی اور گاہک نے مداخلت نہ کی۔ اُن تینوں عورتوں نے داماسو کو کمر سے جکڑ لیا اور چیخنے چلانے لگیں۔ داماسو کی دوست اسے دھکیل کر ہال کی دوسری جانب لے گئی۔ وہ آدمی فرش پر سے اٹھا۔ مکے کی بدولت اُس کا منہ ٹیڑھا ہو رہا تھا۔ وہ بندر کی طرح اچھلتا ہوا فرش کے وسط میں جا پہنچا اور بینڈ کو حکم دیا کہ موسیقی دوبارہ شروع کر دیں۔

دو بجے کے قریب ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ وہ تمام عورتیں جنھیں رات کے لیے گاہک نہیں ملے تھے، اب بیٹھ کر کھانا کھانے لگی تھیں۔ داماسو کی دوست مچھلیوں، تلے ہوئے گوشت اور چاولوں کی ایک قاب لے کر میز پر آئی اور چمچ سے سارے کا سارا کھانا خود کھانے لگی۔ داماسو مدہوش سا بیٹھا اسے تکتا رہا۔ لڑکی نے چمچ میں بھر کر ایک لقمہ اس کی طرف بڑھایا۔

''منہ کھولو۔''

داماسو نے ٹھوڑی جھکا کر سینے پر لگا لی اور نفی میں سر ہلایا۔

''یہ عورتوں کی خوراک ہے مردوں کی نہیں۔''

کھڑے ہونے کے لیے داماسو کو ہاتھوں سے میز کا سہارا لینا پڑا۔ جب اس کا جسمانی توازن درست ہوا، شراب فروش بازو سینے پر باندھے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''نواسی پیسو تمہارے ذمے نکلتے ہیں'' وہ بولا۔ ''شراب مفت کی نہیں تھی۔''

داماسو نے اسے ایک جانب دھکیل دیا۔

''مجھے ہیجڑے اچھے نہیں لگتے۔''

لڑکے نے اسے آستین سے دبوچ لیا، لیکن لڑکی کے اشارہ کرنے پر چھوڑ دیا اور بولا: ''تمہیں ابھی بہت سی چیزوں کا مزہ معلوم نہیں ہے۔''

داماسو لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا۔ دریا کی سطح پر چاند کی پراسرار چمک دیکھ کر اس کے ذہن میں تابندگی کی ایک لکیر سی ابھری، لیکن فوراً ہی غائب بھی ہوگئی۔ قصبے کے دوسرے سرے پر اپنے گھر کے آگے پہنچ کر اپنے دروازے کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ نیند میں چل کر وہاں پہنچا ہے۔ اس نے سر کو دو تین بار جھٹکا اور پریشانی کے عالم میں اسے سرعت سے یہ احساس ہوا کہ اسے اگلا ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھانا ہے۔ دروازے کو اس نے نہایت آہستگی سے دھکیلا تا کہ قبضوں کی چرچراہٹ کی آواز نہ آئے۔

آنا کو احساس ہوا کہ وہ صندوق میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ لیمپ کی روشنی سے بچنے کے لیے اس نے بستر میں اپنا رخ دیوار کی جانب کر لیا، لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند کپڑے نہیں بدل رہا ہے۔ تب جیسے اس کے ذہن میں وجدان کا کوندا لپکا اور وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ داماسو صندوق کے قریب ٹارچ اور گیندوں کا پیکٹ ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔

داماسو نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

آنا بستر میں سے کود کر باہر آئی۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو'' وہ بڑبڑائی اور دروازے کی طرف دوڑی۔ جلدی سے اس نے کنڈی چڑھا دی۔ داماسو نے ٹارچ اپنی پتلون کی جیب میں اُڑسی، ساتھ ہی چھوٹا چاقو اور چند ریتیاں بھی جیب میں رکھیں اور پیکٹ کو بغل میں دبائے دروازے کی جانب بڑھا۔ آنا دروازے سے پیٹھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''میرے جیتے جی تم باہر نہیں جا سکتے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

داماسو نے اسے ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ ''پرے ہٹو'' اس نے کہا۔ آنا نے دروازے کے پاکھے کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ پلکیں جھپکائے بغیر دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ ''تم بالک گدھے ہو'' آنا نے سرگوشی کی۔ ''خدا نے تمہیں خوب صورتی تو دے دی مگر دماغ دیتے وقت سخت کنجوسی سے کام لیا۔'' داماسو نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور اس کی کلائی مروڑنے لگا۔ آنا کا سر جھک گیا۔ بھینچے ہوئے دانتوں کے ساتھ داماسو نے اسے دھمکایا۔ ''میں نے کہا ہے پرے ہٹ جاؤ'' آنا نے سر موڑ کر آنکھ کے کونے سے اسے یوں دیکھا جیسے ہل میں جتا

ہوا بیل دیکھتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے آنا کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچایا جا سکتا اور وہ اپنے خاوند سے زیادہ طاقت ور ہے، لیکن داماسو نے اس کے بالوں کو اتنے بل دیے کہ اُس کا گلا آنسوؤں سے رند گیا۔

''تم بچے کو مار ڈالو گے'' آنا نے کہا۔

کچھ گھسیٹتے اور کچھ بازوؤں میں اٹھائے ہوئے وہ آنا کو بستر تک لے گیا۔ لیکن جب اس نے اُسے چھوڑا تو وہ اس کی کمر پر سوار ہوگئی اور اپنی ٹانگوں سے اسے جکڑ لیا۔ وہ دونوں بستر پر گر گئے۔ دونوں کا سانس پھول رہا تھا۔ ''میں چیخنا شروع کر دوں گی۔'' آنا نے سرگوشی میں کہا۔ ''تم یہاں سے ہلے تو میں چیخنا شروع کر دوں گی۔'' داماسو غصے میں پھنکار رہا تھا۔ اس نے گیندوں کا پیکٹ اٹھا کر آنا کے گھٹنے پر مارا۔ آنا کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی اور اسکی ٹانگوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، لیکن داماسو کو دروازے تک جانے سے روکنے کے لیے وہ اس کی کمر سے چمٹ گئی۔ پھر اس نے التجا اور منت سماجت شروع کر دی۔ ''میں قسم کھاتی ہوں میں کل خود گیندیں وہاں لے جاؤں گی۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''اور وہاں ایسے چھوڑ کر آؤں گی کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا'' دروازے کی جانب گھسٹتے گھسٹتے داماسو اس کے ہاتھوں پر گیندوں کے پیکٹ سے ضربیں لگاتا رہا۔ وہ ایک لحظے کے لیے اپنی گرفت ڈھیلی کرتا تاکہ چوٹ کے درد پر قابو پا سکے، لیکن پھر اس سے چمٹ جاتی اور التجائیں کرنے لگتی۔

''میں یہاں تک کہہ دوں گی کہ گیندیں میں نے چرائی تھیں'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''میری اس حالت میں کوئی مجھے جیل میں نہیں ڈالے گا''

بالآخر داماسو نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ ''سارا قصبہ تمہیں دیکھ لے گا'' آنا نے کہا۔ ''تم اتنے بے وقوف ہو کہ تمہیں یہ بھی پتا نہیں کہ آج پورے چاند کی رات ہے'' پیشتر اس کے کہ وہ چٹخنی کھولتا، آنا نے ایک بار پھر اسے پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر کے اس کی گردن اور چہرے پر مکے مارنے لگی۔ ساتھ ہی وہ چیخ بھی رہی تھی۔ ''وحشی! درندہ!'' جب داماسو نے مکوں کی بوچھاڑ سے اپنا چہرہ بچانا چاہا تو آنا نے لپک کر ایک ہاتھ سے چٹخنی کو قابو میں کر لیا اور دوسرے سے کس کر مکا اس کے سر پر لگایا۔ داماسو جب وار سے بچنے کے لیے جھکا تو چٹخنی اس کے شانے کی ہڈی سے ٹکرا کر یوں گونجی جیسے کھڑکی شیشے سے ٹکرائی ہو۔

''کتیا'' وہ زور سے چیخا۔

اس لمحے اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ کتنا شور کر رہا ہے۔ ہاتھ کی پشت سے اس نے

زور سے آنا کو کنپٹی پر مارا اور اس کے درد سے کراہنے اور پورے جسم کے زور کے ساتھ دیوار سے ٹکرانے کو محسوس کیا، لیکن مڑ کر اسے دیکھے بغیر، دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

درد اور تکلیف سے بے سدھ آنا فرش پر پڑی اپنے پیٹ میں کچھ ہونے کی منتظر رہی۔ دیواروں کی دوسری جانب سے ہمسایوں نے اسے آواز دی جیسے کہیں قبر کے اندر سے بول رہے ہوں۔ اس نے اپنے رونے کی آواز روکنے کی خاطر ہونٹ کاٹ لیے۔ تب وہ فرش سے اٹھی اور کپڑے بدلے۔ اس کے ذہن میں بھی یہ خیال نہ گزرا، جیسے ماضی میں بھی ایک بار ایسے ہی ایک موقع پر نہیں گزرا تھا کہ داماسو ہنوز کمرے کے باہر کھڑا اپنے آپ کو یہ احساس دلانے میں مصروف ہوگا کہ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے اور وہ آنا کے تھوڑی دیر میں چیختے پکارتے ہوئے باہر آنے کا منتظر ہوگا۔ آنا نے پرانی غلطی کا اعادہ کیا اور اپنے خاوند کے پیچھے باہر بھاگنے کی بجائے جوتے کپڑے پہن کر دروازہ بند کیا اور بستر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

دروازہ بند ہو جانے پر داماسو کو اندازہ ہوا کہ وہ واپس نہیں جا سکے گا۔ کتوں کے شوروغوغا نے گلی کے آخر تک اس کا تعاقب کیا مگر اس کے بعد وحشت ناک خاموشی چھا گئی۔ وہ اپنے قدموں کی آواز کے خوف سے فٹ پاتھ پر چلنے سے گریز کر رہا تھا جو اس خوابیدہ قصبے میں مہیب اور انجانی لگ رہی تھی، لیکن بلیرڈ ہال کے عقبی دروازے کے مقابل زمین کے خالی قطعے تک پہنچنے تک اس نے کسی احتیاط کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس بار اسے اپنی ٹارچ استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ دروازہ جہاں سے ٹوٹا تھا صرف وہیں سے ٹھیک کیا گیا تھا۔ اینٹ کے حجم اور شکل کا لکڑی کا ٹکڑا نکال کر ایک نیا ٹکڑا دروازے مین نصب کر کے وہی پرانی کنڈی کے ان قبضوں کے درمیان پھنسا دیا جو نئے نہیں تھے اور قدرے زور سے، لیکن تشدد کے بغیر ریتی کو موڑ کر گیئر کی طرح جھٹکے دینے لگا حتیٰ کہ لکڑی غمگین سی آواز کے سات پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی اور قبضے باہر نکل آئے۔ دروازے کو دھکیلنے سے قبل اس نے اسے تھوڑا سا اونچا اٹھالیا تاکہ اس کے فرش پر رگڑے جانے کی آواز مدھم پڑ جائے۔ دروازہ اس نے صرف آدھا کھولا۔ اپنے جوتے اتار کر گیندوں کے پیکٹ کے ساتھ اندر گھسا دیے اور چاندنی سے روشن کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اس کے عین مقابل بوتلوں اور خالی ڈبوں سے بھرا ہوا ایک نیم تاریک برآمدہ تھا۔ آگے چھت کے شیشے میں سے چھن کر آتی چاندنی میں بلیرڈ کی میز پڑی تھی۔ اس کے بعد الماریوں کی پشت تھی اور سب سے آخر میں، صدر دروازے کے سامنے چھوٹی چھوٹی کرسیوں اور میزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہر چیز، سوائے چاندنی کے سیلاب اور خاموشی

کے خستہ پن کے پچھلی بار کی طرح تھی۔ داماسو اب تک اپنے اعصاب کو قابو میں رکھے ہوئے تھا، لیکن اب آ کر عجیب سحر میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس بار اس نے اکھڑی ہوئی اینٹوں کے بارے میں بھی احتیاط نہ کی۔ کھلے دروازے کے درمیان اس نے اپنے جوتے رکھ دیے اور چاندنی کو عبور کر کے ٹارچ جلائی اور کاونٹر کے عقب میں اُس چھوٹے سے ڈبے کو تلاش کرنے لگا جس میں گیندیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ تمام کام وہ بغیر کسی احتیاط کے کر رہا تھا۔ ٹارچ کی اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی روشنی میں اس نے گرد آلود شیشیاں، گھوڑے کی رکاب اور مہمیز، موٹر کے تیل میں لتھڑی ہوئی گول کر کے رکھی ہوئی ایک قمیض اور آخر کار وہ ڈبہ دیکھا جس میں گیندیں رکھی جاتی تھیں۔ ڈبہ عین اسی جگہ پڑا تھا جہاں پچھلی بار تھا۔ ٹارچ کی روشنی کو حرکت دیتے ہوئے وہ کاونٹر کے آخر تک لے گیا، وہاں وہی بلی تھی۔

بغیر کسی اسرار کے بلی نے اسے ٹارچ کی روشنی کے مقابل دیکھا۔ داماسو نے روشنی کی شعاع اس پر مرکوز رکھی حتیٰ کہ اسے قدرے خوف کے ساتھ یاد آیا کہ دن کے وقت اس نے کبھی بلی کو اس جگہ بیٹھے نہیں دیکھا۔ اس نے شعاع کو جھٹکا دے کر اور بلی کو 'ہش' کہہ کر بھگانے کی کوشش کی مگر اس جانور پر اس حرکت کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ تب یک لخت اس کے ذہن میں ایک خاموش سا دھماکا ہوا اور بلی اس کے ذہن سے یکسر محو ہو گئی۔ جب تک وہ یہ باور کر سکتا کہ کیا واقعہ رونما ہوا ہے، ٹارچ اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور وہ گیندوں کے پیکٹ کو سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ ہال کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ ''خوب''!

اس نے رَوک کی آواز پہچان لی۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے گردوں میں گہری تھکن اتر آئی تھی۔ رَوک کمرے کے عقب سے چلتا ہوا اس کی جانب آیا، وہ زیر جامہ پہنے ہوئے تھا، اس کے ہاتھ میں لوہے کا سریا تھا اور اس کی آنکھیں بجلی کی روشنی سے چندھیائی ہوئی تھیں۔ بوتلوں اور خالی ڈبوں والے برآمدے میں، جہاں سے داماسو گزر کر آیا تھا۔ ایک جھولنے والا بستر لٹکا ہوا تھا، یہ بستر پچھلی بار وہاں موجود نہیں تھا۔

داماسو سے تیس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر رَوک تھوڑا سا اچھلا اور اپنا دفاع کرنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ داماسو نے اپنا ہاتھ، جس میں گیندیں تھیں، کمر کے پیچھے چھپا لیا۔ رَوک نے ناک سکیڑی اور سر آگے نکال کر عینک کے بغیر داماسو کو پہچاننے کی کوشش کی۔

''تم؟'' وہ چلایا۔

داماسو کو لگا جیسے کوئی لامتناہی بات آخر اپنے انجام کو پہنچ گئی ہو۔ رَوک سریے کو جھکا کر چلتا

وادا ماسو کے قریب آیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور نقلی دانتوں کے بغیر اس کا چہرہ کسی عورت کا لگ رہا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں'' داماسو نے جواب دیا۔

اس نے جسم کی خفیف، غیر محسوس سی حرکت سے پہلو بدلا۔

''یہ تمہارے پاس کیا ہے؟''

داماسو ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ''کچھ نہیں'' وہ بولا۔ رُوک کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ کانپنے لگا۔ ''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' وہ چیخ کر بولا اور سریا ہاتھ میں اٹھائے اس کی طرف بڑھا۔ داماسو نے پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ رُوک نے بائیں ہاتھ سے پیکٹ پکڑ لیا اور انگلیوں سے اسے جانچنے لگا۔ وہ اب بھی چوکس تھا۔ تب آخر کار اسے پتا چل گیا۔

''یہ ناممکن ہے!'' اس نے کہا۔

وہ اتنا حیرت زدہ تھا کہ اس نے سریا کاؤنٹر پر رکھ دیا اور تھوڑی دیر کے لیے داماسو کی موجودگی کو بھول کر پیکٹ کو کھولنے میں لگ گیا۔ خاموشی سے وہ گیندوں کو دیکھتا رہا۔

''میں انھیں واپس رکھنے آیا تھا'' داماسو نے کہا۔

''یقیناً'' رُوک بولا۔

داماسو کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ شراب کا اثر اس کے جسم سے یکسر زائل ہو چکا تھا، اس کی زبان پر بجریلی سی گاد باقی تھی اور ذہن میں اکیلے پن کا مبہم احساس تھا۔ ''تو یہ تھا وہ معجزہ!'' رُوک نے گیندوں کو دوبارہ کاغذ میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنے بے وقوف بھی ہو سکتے ہو۔'' جب اس نے سر اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے کا تاثر بدل چکا تھا۔

''اور میرے دو سو پیسو۔''

''دراز خالی تھی'' داماسو نے کہا۔ رُوک نے غور سے، خالی منہ چلاتے ہوئے داماسو کو دیکھا اور مسکرایا۔ ''اچھا وہ دراز خالی تھی'' اس نے کئی بار دوہرایا۔ ''دراز میں کچھ نہیں تھا؟'' اس نے سریا پھر پکڑ لیا۔

''اس واقعے کی اطلاع تو میئر کو فوراً ملنی چاہیے۔''

داماسو نے اپنی ہتھیلیوں کا پسینہ پتلون پر رگڑ کر خشک کیا۔

''تمھیں پتا ہے کہ دراز میں کچھ نہیں تھا۔''

رَوک مسکراتا رہا۔

"وہاں دو سو پیسو تھے۔" اس نے کہا۔ "اور اب وہ رقم تمہاری چمڑی ادھیڑ کر نکالی جائے گی
۔اس لیے نہیں کہ تم نے چوری کی تھی بلکہ اس لیے کہ تم جیسا احمق آج تک پیدا نہیں ہوا۔"

☆☆☆

(مشمولہ: "ذہن جدید"، دہلی، جلد ۱۵، شمارہ ۴۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۵ء)

بالتازار کی حیرت انگیز سہ پہر

ترجمہ: آصف فرخی

پنجرہ تیار ہو چکا تھا۔ بالتازار نے اسے اپنی عادت کے مطابق چھجے سے لٹکا دیا اور جب دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آیا تو لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ دنیا کا خوب صورت ترین پنجرہ ہے۔ پنجرے کو دیکھنے کے لیے اتنے لوگ آئے کہ گھر کے سامنے مجمع لگ گیا اور بالتازار کو اسے نیچے اتار کر دکان بند کرنی پڑی۔

''داڑھی بنالو'' اس کی گھر والی اُرسلا نے کہا۔ ''بالکل کاپوچین لگ رہے ہو!''

''کھانے کے بعد حجامت بنانا بُرا ہوتا ہے'' بالتازار نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر کوئی دو ہفتے کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی اَیال جیسے چھوٹے چھوٹے سخت اور کھردرے بال تھے اور چہرے پر سہمے ہوئے لڑکے کا سا تاثر رہا تھا، نہ اس سے شادی کی تھی نہ کوئی اولاد ہوئی تھی، زندگی نے اسے محتاط تو بنا دیا تھا مگر ڈرایا نہیں تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس نے ابھی ابھی جو پنجرہ مکمل کیا ہے وہ بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کا خوب صورت ترین پنجرہ ہے۔ وہ بچپن سے پنجرے بنانے کا عادی تھا اور یہ پنجرہ اس کے لیے دوسرے پنجروں سے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

''پھر کچھ دیر آرام کرلو'' اُرسلا نے کہا۔ ''اس داڑھی کے ساتھ تو تم کہیں بھی اپنا منہ نہیں دکھا سکتے۔''

آرام کرنے کے دوران کئی دفعہ اسے پڑوسیوں کی خاطر جھولنے سے اتر کر انھیں پنجرہ دکھانا پڑا۔ اُرسلا نے اس وقت تک پنجرے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اس بات پر چڑی ہوئی تھی

کہ اس کے شوہر نے اپنی بڑھئی کی دکان کو نظر انداز کر کے سارا وقت اس پنجرے میں لگا دیا، اور وہ دو ہفتوں سے چین کی نیند نہیں سویا، رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہے، بڑبڑاتا رہتا ہے اور اسے داڑھی مونڈنے کا خیال تک نہ آیا۔ مگر اس کی خفگی پنجرے کو دیکھ کر ہوا ہو گئی۔ بالتازار نیند لے کر اٹھا تو وہ اس کے لیے پتلون اور قمیض پر استری کر چکی تھی، اس نے انھیں جھولنے کے پاس کرسی پر رکھ دیا تھا اور پنجرے کو کھانے کی میز پر لے گئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی پنجرے کو گھور رہی تھی۔

''اس کے کیا دام لگاؤ گے؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''معلوم نہیں'' بالتازار نے جواب دیا۔ ''تیس پیسو مانگوں گا تاکہ بیس تو مل جائیں۔''

''پچاس مانگو!'' اُرسلا نے کہا۔ ''دو ہفتے تم نے اپنی نیندیں حرام کی ہیں اور پھر یہ بڑا بھی بہت ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑا پنجرہ نہیں دیکھا۔''

بالتازار داڑھی مونڈنے لگا۔

''تمہارے خیال میں وہ مجھے اس کے پچاس پیسو دے دیں گے؟''

''جیسے موتیئل صاحب کے لیے تو یہ کوئی بات ہی نہیں اور یہ پنجرہ واقعی اس لائق ہے۔'' اُرسلا نے کہا۔

''تمہیں ساٹھ مانگنے چاہئیں۔''

گھر پر گھٹی گھٹی چھاؤں پھیلی ہوئی تھی۔ اپریل کا پہلا ہفتہ تھا اور ٹڈوں کی چرچراہٹ کی وجہ سے گرمی اور بھی ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ کپڑے بدل کر بالتازار نے صحن کے کواڑ کھول دیے کہ مکان ٹھنڈا ہو جائے اور بچوں کی ٹولی گھر میں گھس آئی۔

پنجرے کی خبر پھیل چکی تھی۔ بوڑھا معالج ڈاکٹر اوکتاویو حیرالدو، زندگی سے مطمئن لیکن اپنے پیشے سے بے زار، اپنی مفلوج بیوی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے اس پنجرے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اندر برآمدے میں جہاں گرم دنوں میں وہ میز بچھالیا کرتے تھے، پھولوں کے بہت سے گملے رکھے ہوئے تھے اور دو پنجرے تھے جن میں سنہری پروں والی کینری چڑیاں پلی ہوئی تھیں۔ اس کی بیوی کو پرندے بہت پسند تھے اور اس حد تک پسند تھے کہ اسے بلّیوں سے نفرت ہو گئی تھی کیوں کہ بلّیاں پرندوں کو کھا جاتی ہیں۔ اُس کے بارے میں سوچتے سوچتے ڈاکٹر حیرالدو دوپہر کے وقت ایک مریض کو دیکھنے گیا اور واپسی میں بالتازار کے گھر کی طرف ہوتا گیا کہ پنجرے کا معائنہ کر لے۔

کھانے کے کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میز پر پنجرہ نمائش کے لیے رکھا ہوا تھا۔

تار کا بنا ہوا بے حد بڑا گنبد، تین منزلیں، راستے، الگ الگ خانے، سونے اور کھانے کے خانے الگ اور چڑیوں کے لیے ایک مخصوص جگہ میں جھولے بھی لگے ہوئے۔ یہ پنجرہ چھوٹے پیمانے پر کسی دیوہیکل برف کے کارخانے کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے بہت غور سے اس کا معائنہ کیا، چھوئے بغیر اور یہ سوچتا رہا کہ جیسا سنا تھا پنجرہ اس سے بھی بہتر تھا۔ اتنا خوب صورت کہ اپنی بیوی کے لیے اس نے کبھی ایسے پنجرے کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

''یہ تو تخیل کی کارفرمائی کا نمونہ ہے'' اس نے کہا۔ اس نے لوگوں کے ہجوم میں بالتازار کو ڈھونڈ نکالا اور مادرانہ شفقت سے بھرپور نظریں اس پر جماتے ہوئے کہا'' تم تو غیر معمولی ماہر تعمیر ثابت ہوئے۔''

بالتازار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''شکریہ'' اس نے کہا۔

''یہ بالکل سچ ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ وہ گول مٹول تھا اور اس کے مٹاپے میں کسی عورت کی سی نزاکت تھی جو اپنی جوانی میں حسین رہی ہو اور اس کے ہاتھ بہت نازک تھے۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی پادری لاطینی بول رہا ہو۔ ''تمہیں اس میں چڑیاں پالنے کی بھی ضرورت نہیں'' اس نے کہا اور پنجرہ حاضرین کی نظروں کے سامنے گھمانے لگا جیسے اس کا نیلام کر رہا ہو۔ ''اسے تو بس پیڑ میں لٹکا دو اور یہ خود بخود چہچہانے لگے گا۔'' اس نے پنجرہ واپس میز پر رکھ دیا، ایک لمحے کو سوچا ، پنجرے کی طرف دیکھا اور کہا: ''ٹھیک ہے، پھر میں اسے لے لوں گا۔''

''یہ بک چکا ہے'' اُرسلا بولی۔

''یہ چیپے مونٹیئل صاحب کے بیٹے کا ہے۔'' بالتازار نے کہا۔ ''اس نے خاص طور پر آرڈر دیا تھا۔''

ڈاکٹر یہ سنتے ہی باادب ہو گیا۔

''اس کا نمونہ اسی نے تمہیں دیا تھا؟''

''نہیں'' بالتازار نے کہا۔ ''اس نے تو یہ کہا تھا کہ اسے بڑا سا پنجرہ چاہیے، ترو پیالیوں کے جوڑے کے لیے۔''

ڈاکٹر نے پنجرے کی طرف دیکھا۔

''مگر یہ ترو پیالیوں کے لیے نہیں ہے۔''

''اور کیا؟ بالکل ہے!'' بالتازار نے میز کے قریب آتے ہوئے کہا۔ بچے اس کو گھیرے

ہوئے تھے۔ ''اس کی پیمائش کا بڑی احتیاط سے حساب لگایا گیا ہے۔'' اس نے انگلی سے مختلف خانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے پنجرے کے گنبد پر انگلیوں کے پوروں سے چوٹ لگائی اور سارے پنجرے میں سُر گونجنے لگے۔

''اس سے زیادہ مضبوط تار مل نہیں سکتا اور ہر جوڑ پر اندر باہر لوہے کا ٹانکا لگایا گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ تو طوطے کے لیے بھی کافی ہوگا۔'' بچوں میں سے کوئی بولا۔

''بالکل!'' بالتازار نے کہا۔

ڈاکٹر نے گھوم کر دیکھا۔

''ٹھیک ہے، لیکن اس نے تمہیں یہ نمونہ تو نہیں دیا تھا'' اس نے کہا۔ ''اس نے تمہیں کوئی ہدایات تو نہیں دی تھیں، سوا اس کے کہ اتنا بڑا پنجرہ بنا دو جو تر و پیالوں کے لیے کافی ہو۔ ٹھیک ہے نا؟''

''ٹھیک ہے۔'' بالتازار نے کہا۔

''بس پھر کوئی مسئلہ نہیں''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ایک چیز ہوئی تر و پیالوں کے لیے بڑا سا پنجرہ۔ اور یہ پنجرہ جو تم نے بنایا ہے وہ دوسری چیز ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ وہی پنجرہ ہے جو تم سے بنانے کے لیے کہا گیا تھا۔''

''یہی تو ہے وہ!'' بالتازار نے پریشان ہو کر کہا۔ ''اسی وجہ سے تو میں نے بنایا تھا۔''

ڈاکٹر نے بے صبری سے ہاتھ ہلا دیا۔

''تم ایک اور بنا لینا'' اُرسلا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ڈاکٹر سے کہنے لگی ''آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟''

''میں نے اپنی بیوی سے آج دوپہر کا وعدہ کیا تھا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے ڈاکٹر صاحب!'' بالتازار بولا۔ ''مگر میں آپ کے ہاتھ ایسی چیز نہیں فروخت کر سکتا جو پہلے ہی بک چکی ہو۔''

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اُچکائے۔ رومال سے گردن کا پسینا پونچھتے ہوئے وہ اس طرح خاموشی کے ساتھ پنجرے کو تکنے لگا جیسے وہ شخص جو ٹکٹکی باندھ کر دُھندلی نظروں سے جہاز کو سمندر میں دور جاتا دیکھ رہا ہو۔

''اُنھوں نے تمھیں اس کے کتنے پیسے دیے ہیں؟''
بالتازار نے جواب دیے بغیر اُرسلا کی طرف دیکھا۔
''ساٹھ پیسو'' وہ بولی۔
ڈاکٹر پنجرے کو دیکھتا رہا۔ ''بہت خوب صورت ہے!'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''حد سے زیادہ خوب صورت۔'' دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت مستعدی سے اپنے آپ کو پنکھا جھلنے اور مسکرانے لگا اور اس واقعے کے تمام نشان اس کی یادداشت سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئے۔

''مونتیئل کے پاس بہت پیسہ ہے۔'' اس نے کہا۔
سچ پوچھو تو حوزے مونتیئل اتنا پیسے والا تھا نہیں جتنا نظر آتا تھا، مگر وہ دولت حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہاں سے چند گلیاں آگے، ساز و سامان سے اَٹے ایک گھر میں، جہاں کسی نے آج تک ایسی بو نہیں سونگھی تھی جو برائے فروخت نہ ہو، وہ پنجرے کی اطلاع سے لاتعلق رہا۔ اس کی بیوی نے جسے موت کا خوف دن رات عذاب میں مبتلا رکھتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد دروازے کھڑکیاں بند کر دیں اور اپنی آنکھیں کمرے کے سائے پر جمائے ہوئے وہ گھنٹے کے لیے لیٹ گئی اور حوزے مونتیئل قیلولہ کرنے لگا۔ اس کی بیوی کو کئی آوازوں کے شور نے چونکا دیا۔ وہ اٹھ کر بڑے کمرے کا دروازہ کھولنے گئی اور دیکھا کہ گھر کے سامنے مجمع لگا ہوا ہے اور مجمعے کے درمیان بالتازار پنجرہ لیے، اُجلے کپڑے پہنے، داڑھی بنائے اور چہرے پر خوش سلیقہ بے باکی کا وہ تاثر لیے کھڑا ہے جو غریب غربا کے چہروں پر اسوقت آ جاتا ہے جب وہ کسی دولت مند کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔
''کیا عمدہ چیز ہے!'' حوزے مونتیئل کی بیوی پکار اُٹھی اور اس کا چہرہ جگمگا اُٹھا۔ اس نے خوشی خوشی بالتازار کو اندر بلا لیا۔ ''میں نے زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔'' لیکن دروازے پر جمع ہونے والی بھیڑ سے چڑ کر یہ بھی کہا: ''اندر لے آؤ اسے، اس سے پہلے کہ یہ لوگ کمرے کو گھڑ دوڑ کی تماشہ گاہ بنا دیں۔''
حوزے مونتیئل کے گھر کے لیے بالتازار اجنبی نہ تھا۔ مختلف موقعوں پر اسے اس کی مہارت اور معاملے کا پکا ہونے کی وجہ سے بڑھئی کے چھوٹے موٹے کام کاج کے لیے یہاں بلایا جا چکا تھا۔ مگر اسے دولت مند لوگوں کے درمیان بے چینی ہوتی تھی۔ وہ ان کے بارے میں سوچا کرتا، ان کی بدصورت جھگڑالو بیویوں کے بارے میں، ان ہولناک بیماریوں کے بارے میں جوان لوگوں کو

لاحق رہتیں اور اس کے اندر رحم کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔ جب وہ ان کے گھروں میں داخل ہوتا تو پیر گھسیٹے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔

''پیپے گھر پر ہے؟''

اس نے پنجرہ کھانے کی میز پر لگا دیا۔

''وہ اسکول گیا ہوا ہے'' حوزے مونتیئل کی بیوی نے کہا۔ ''مگر آتا ہی ہو گا'' اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہنے لگی۔ ''مونتیئل نہا رہا ہے۔''

اصل میں مونتیئل کو نہانے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ جلدی جلدی اپنے بدن پر الکحل ملنے لگا کہ جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اس قدر محتاط تھا کہ بجلی کا پنکھا چلائے بغیر سوتا تھا کہ گھر کی ایک ایک آواز پر کان دھر سکے۔

''ایدیلید ے!'' وہ چلایا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''باہر آ کر دیکھو کیا شاندار چیز ہے!'' اس کی بیوی نے پکار کر کہا۔

حوزے مونتیئل، موٹا تازہ اور جھبرا سا آدمی، گردن پر تولیا ڈالے خواب گاہ کی کھڑکی میں نمودار ہوا۔

''یہ کیا ہے؟''

''پیپے کے لیے پنجرہ'' بالتازار نے کہا۔

مونتیئل کی بیوی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کس کا؟''

''پیپے کا'' بالتازار نے جواب دیا اور پھر حوزے مونتیئل کی طرف مڑ کر کہا: ''پیپے نے اس کا آرڈر دیا تھا؟''

اس لمحے کچھ نہیں ہوا، مگر بالتازار کو یوں لگا جیسے کسی نے اس پر غسل خانے کا دروازہ کھول دیا ہو۔ حوزے مونتیئل خوب گاہ سے زیر جامہ پہنے ہوئے نکلا۔

''پیپے!'' وہ دہاڑا۔

''وہ ابھی نہیں آیا'' اس کی بیوی نے سرگوشی کی۔ وہ دم سادھے کھڑی تھی۔

پیپے دروازے میں نمودار ہوا۔ وہ کوئی بارہ سال کا ہو گا اور اُس کی ویسی ہی مڑی ہوئی گھنی پلکیں اور قابلِ دید انداز تھا جو اُس کی ماں کا تھا۔

''یہاں آؤ!؟؟ حوزے مونتیئل نے اس سے کہا۔ ''اس کا آرڈر تم نے دیا تھا؟''

بچے نے سر جھکا لیا۔ اس کو بالوں سے پکڑ کر حوزے مونتیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''میری بات کا جواب دو۔''

بچے نے کچھ کہے بغیر اپنا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

''مونتیل!'' اس کی بیوی نے سرگوشی کی۔

مونتیل نے بچے کو چھوڑ دیا اور غضب ناک ہو کر بالتازار کی طرف مڑا۔ ''مجھے افسوس ہے بالتازار'' اس نے کہا۔ ''لیکن کام کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ یہ تمہارے ہی دماغ میں آ سکتی تھی کہ نابالغ سے معاہدہ کر لو'' اور یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر سکون لوٹ آیا۔ اس نے پنجرہ اٹھایا اور دیکھے بغیر بالتازار کو پکڑا دیا۔

''اسے فوراً لے جاؤ اور جس کے ہاتھ بیچ سکتے ہو بیچ ڈالو'' اس نے کہا: ''اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری درخواست ہے مجھ سے بحث نہ کرنا۔'' اس نے بالتازار کی پیٹھ تھپتھپائی اور اسے سمجھایا ''ڈاکٹر نے مجھے غصہ کرنے سے منع کیا ہے۔''

بچہ بالکل ساکت کھڑا تھا اور پلک تک نہیں جھپکا رہا تھا کہ بالتازار نے ہاتھ میں پنجرہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بچے کے حلق سے ایک آواز نکلی، کتّے کے غرّانے جیسی اور وہ فرش پر گر کر چیخنے لگا۔

حوزے مونتیل نے کوئی اثر قبول کیے بغیر اسے دیکھا اور ماں اسے چپ کرانے لگی۔ ''اسے اٹھاؤ بھی مت!'' اس نے کہا۔ ''اسے فرش پر اپنا سر پھوڑ لینے دو، پھر اس پر لیموں اور نمک تھوپ دینا تا کہ دل بھر کے رو پیٹ لے۔'' بچہ آنسو بہائے بغیر چلّا رہا تھا اور اس کی ماں اسے کلائیوں سے پکڑے ہوئے تھی۔

''اسے چھوڑ دو!'' حوزے مونتیل نے اصرار کیا۔

بالتازار بچے کو یوں دیکھتا رہا جیسے سگ گزیدہ جانور کی جاں کنی کا عالم دیکھ رہا ہو۔ چار بج رہے تھے۔ اس گھڑی اس کے گھر میں اُرسلا ایک بہت ہی پرانا گیت گا رہی تھی اور پیاز کے چھلکے اُتار رہی تھی۔

''پیپے!'' بالتازار نے کہا۔

وہ مسکراتا ہوا بچے کے پاس آیا اور پنجرہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ بچہ اُچھلا اور پنجرے سے لپٹ گیا۔ جو قد میں تقریباً اس کے برابر تھا۔ وہ اس کے تاروں میں سے بالتازار کو جھانکتا رہا اور

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ اس آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلا تھا۔

''بالتازار!'' حوزے مونتیئل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اسے لے جاؤ۔''

''واپس کر دو!'' اس کی بیوی نے بچے سے کہا۔

''رکھ لو!'' بالتازار نے کہا اور پھر حوزے مونتیئل سے بولا ''بنایا تو میں نے اسی کے لیے تھا۔''

حوزے مونتیئل اس کے پیچھے پیچھے بڑے کمرے میں آ گیا۔

''بے وقوف مت بنو بالتازار!'' اس نے رستہ روک کر کہا۔ ''اپنا یہ ٹیم ٹماق اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤ، میں تمھیں ایک دھیلا بھی دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

''کوئی بات نہیں!'' بالتازار نے کہا۔ ''میں نے یہ خاص طور پر پیپے کو تحفہ دینے کے لیے بنایا تھا۔ میں اس کے دام وصول کرنے کی توقع بھی نہیں رکھتا۔''

جب بالتازار ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا واپس جا رہا تھا تو حوزے مونتیئل کمرے میں کھڑا ہوا چیخ رہا تھا۔ اس کا رنگ اُڑ گیا اور اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔

''احمق!'' وہ چلا رہا تھا۔ ''اپنا یہ کھلونا لے جاؤ یہاں سے۔ ہمیں نہیں ضرورت کہ کوئی ہمارے گھر میں آ کر ہم پر حکم چلائے۔ کتے کے بچے!''

سٹا گھر میں بالتازار کا باقاعدہ استقبال ہوا۔ اب تک اس نے یہی سوچا تھا کہ اس نے پہلے سے بہتر پنجرہ بنایا ہے اور حوزے مونتیئل کے بیٹے کو دے دیا ہے کہ وہ روتا نہ رہے اور ان میں سے کوئی بات بھی بہت اہم نہیں تھی۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ ان سب باتوں کی بہت سے لوگوں کے نزدیک خاصی اہمیت تھی اور وہ کچھ پُرجوش ہو گیا۔

''تو انھوں نے تمھیں پنجرے کے پچاس پیسو دیے؟''

''ساٹھ'' بالتازار نے کہا۔

''تم نے خوب کام کر دکھایا۔'' کسی نے کہا۔ ''تم واحد شخص ہو جو مونتیئل صاحب سے اتنی بڑی رقم وصول کر سکے ہو۔ اس کا جشن منانا چاہیے۔''

انھوں نے اسے بیئر لا کر دی، اور بالتازار نے سب کے لیے ایک ایک گلاس کا آرڈر دے دیا۔ اب چوں کہ یہ پہلی دفعہ تھی جو وہ باہر پینے نکلا تھا تو جھٹ پٹے کے وقت تک بالکل دُھت ہو گیا اور نہایت عظیم الشان منصوبے کی باتیں کرنے لگا جس میں ایک ہزار پنجرے تھے، ساٹھ پیسو کا

ایک، پھر ایک لاکھ پنجرے اور اس کے پاس ساٹھ لاکھ پیسو آ گئے۔'' ہمیں بہت سی چیزیں بنانی ہیں، امیروں کے ہاتھ بیچنے کے لیے، اُن کے مرنے سے پہلے'' نشے میں دُھت وہ کہہ رہا تھا۔ ''وہ سب بیمار ہیں، وہ مر جائیں گے۔ وہ اس قدر مشکل میں ہیں کہ غصہ بھی نہیں کر سکتے۔'' وہ دو گھنٹے سے جُیوک باکس کی موسیقی کے دام ادا کیے جا رہا تھا اور موسیقی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ تم لوگوں نے بالتازار کی صحت، خوش قسمتی اور امیروں کی موت کے لیے جام تجویز کیے اور پی گئے، لیکن کھانے کا وقت آیا تو سب اسے سنّا گھر میں اکیلا چھوڑ گئے۔

اُرسلا آٹھ بجے تک، تلے ہوئے گوشت پر پیاز کے قتلے سجائے، بیٹھی اس کی راہ دیکھتی رہی۔ کسی نے اسے بتایا کہ اس کا شوہر سنّا گھر میں ہے اور خوشی کے مارے بدحواس ہو کر سب کو بیئر خرید کر پلا رہا ہے، مگر اُرسلا نے یقین نہیں کیا کیوں کہ بالتازار نے کبھی نشہ نہیں کیا تھا۔ جب آدھی رات کے قریب وہ بستر میں لیٹ گئی اس وقت بالتازار ایک روشن کمرے میں تھا جہاں چھوٹی چھوٹی میزیں بچھی ہوئی تھیں اور ہر میز کے ساتھ چار کرسیاں اور باہر کھلی رقص گاہ تھی جہاں پلوور پرندے پھدک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر غازہ پھیل گیا تھا اور چوں کہ وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا تو اسے خیال آیا کہ وہ دو عورتوں کے ساتھ ایک ہی بستر میں لیٹ جائے۔ اس نے اتنے پیسے خرچ کیے تھے کہ وہاں سے جانے کے لیے اسے اپنی گھڑی گروی رکھ کر اگلے دن ادائیگی کا وعدہ کرنا پڑا۔ اگلے ہی لمحے گلی میں ڈھیر پڑے پڑے اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے جوتے اتار رہا ہے، مگر اس کا جی نہیں چاہا کہ اپنی زندگی کے حسین ترین خواب سے چونکے۔ صبح پانچ بجے والی عبادت کے گرجے جانے والی عورتوں کو وہاں سے گزرتے ہوئے ہمت نہیں پڑی کہ اس کی طرف دیکھ لیں، اس خیال سے کہ وہ مرا ہوا پڑا ہے۔



(مشمولہ: ''ذہن جدید''، دہلی، جلد ۱۵، شمارہ نمبر ۴۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۵ء)

مونتئیل کی بیوہ

ترجمہ: فاروق حسن

حوزے مونتئیل کے مرنے پر اُس کی بیوی کے سوا، ہر شخص نے ایک پر کینہ اطمینان محسوس کیا۔ لیکن ہر شخص کو یہ باور کرنے میں کئی گھنٹے لگے کہ وہ واقعی مر چکا ہے۔ کئی لوگوں کو تو اُس کی نعش کو گرمی سے تپتے کمرے میں، تربوز کی طرح گول کیے ہوئے کناروں والے پیلے تابوت میں لنن کی چادروں میں لپٹے اور تکیوں کے سہارے لیٹے ہوئے دیکھنے کے بعد بھی اُس کی موت کا یقین نہیں آیا۔ اس کی داڑھی نہایت اچھی طرح شیو کی گئی تھی اور سفید کپڑوں میں ملبوس، چمک دار جوتے پہنے، وہ اتنا صحت مند اور زندہ لگ رہا تھا کہ زندگی بھر نہ لگا تھا۔ یہ شخص وہی جیسے مونتئیل صاحب تھا جو ہر اتوار کو گرجے میں آٹھ بجے صبح کی عبادت کے لیے موجود ہوتا تھا، صرف اس موقعے پر اُس نے ہاتھ میں گھڑ سواری کی چھڑی کی بجائے صلیب تھام رکھی تھی۔ جب اس کے تابوت کا ڈھکنا میخیں ٹھونک کر بند کر دیا تھا اور اسے اس کے ٹیپ ٹاپ والے خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا گیا، تب ہی لوگوں کو مکمل یقین آسکا کہ وہ مرنے کی اداکاری نہیں کر رہا تھا۔

تدفین کے بعد اُس کی بیوی کے سوا ہر ایک کے لیے تعجب کی بات صرف یہ رہ گئی تھی کہ حوزے مونتئیل طبعی موت کیسے مر گیا۔ جب کہ ہر شخص کے دل میں یہی توقع تھی کہ وہ گھات میں بیٹھے کسی شخص کی گولی پُشت پر لگنے سے مرے گا، اس کی بیوی کو یہ یقین تھا کہ مونتئیل کو اُس کی نظروں کے سامنے بوڑھے ہو کر اپنے بستر میں اعترافات کرنے کے بعد آج کل کے زمانے کے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح اذیت کے بغیر موت آئے گی۔ صرف چند تفصیلات میں اس کا خواب پورا نہ ہو سکا تھا۔ حوزے مونتئیل اپنے جھولنے والے بستر میں دو اگست ۱۹۵۱ء کو دوپہر کے

دو بجے برہمی اور غصے کے ایک دورے کے سبب مرا۔ ایسے دوروں کے خطرناک نتائج سے ڈاکٹر اسے پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا۔ اس کی بیوی کو یہ بھی توقع تھی کہ جنازے کو کندھا دینے کے لیے پورا قصبہ اُمڈ آئے گا اور یہ کہ مختلف جگہوں سے آئی ہوئی پھولوں کی چادروں کے لیے اس کا گھر ناکافی ثابت ہوگا۔ لیکن فی الواقع صرف خاندان کے چند لوگ اور مونتیئل کی مذہبی برادری کے ارکان ہی جنازے میں شریک ہوئے اور اُس کی قبر کے لیے پھولوں کی چادریں صرف وہی تھیں جو میونسپل کمیٹی والوں نے بھجوائیں۔ مونتیئل کے بیٹے نے جو جرمنی میں کونسل کے عہدے پر فائز تھا اور دو بیٹیوں نے جو پیرس میں مقیم تھیں، تین تین صفحے کے تار استعمال کر کے وہ تار رقم کیے ہوں گے اور یہ بھی کہ تاروں کی آخری عبارت ترتیب دینے میں انھوں نے کتنے ہی فارم پھاڑ کر پھینکے ہوں گے اور یوں ہر تار میں بیس بیس ڈالر کی قیمت کے الفاظ جمع کیے ہوں گے۔ اُن میں سے کسی نے بھی واپس آنے کی ہامی نہ بھری تھی۔ اُس رات باسٹھ سال کی عمر میں تکیے پر سر رکھ کر اُس شخص کے لیے روتے ہوئے جس نے اُسے خوشی سے ہمکنار کیا تھا، مونتیئل کی بیوہ نے پہلی بار آزردگی کا مزہ چکھا۔ میں اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے گھر میں قید کرلوں گی، وہ سوچ رہی تھی۔ میرے بچوں نے اپنی دانست میں مجھے بھی اپنے باپ کے ساتھ ہی دفن کر دیا ہے۔ میں اس دنیا کے بارے میں کچھ اور جاننا نہیں چاہتی۔

مونتیئل کی بیوہ، نازک، اپنی توہم پرستی کے ہاتھوں لاچار، مگر مخلص عورت تھی۔ اُس کے ماں باپ نے اُس کی شادی بیس برس کی عمر میں اُس پہلے شخص سے کر دی تھی جسے تیس فٹ سے کم فاصلے سے دیکھنے کی اُسے اجازت ملی تھی۔ دنیا کے حقائق سے براہِ راست تعلق قائم کرنے کا اُسے کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اپنے خاوند کا جنازہ اٹھائے جانے کے تین دن بعد اُسے اپنے آپ کو سنبھالنے کی ضرورت کا احساس ہوا، لیکن وہ اپنی زندگی کی سمت کا تعین کرنے سے قاصر تھی۔ اُسے ازسرِ نو جینا شروع کرنا تھا۔

اُن بے شمار رازوں میں جو جوڑے مونتیئل اپنے ساتھ قبر میں لے گیا تھا، گھر میں رکھی تجوری کو کھولنے کی ترکیب بھی تھی۔ قصبے کے میئر نے تجوری کھلوانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ اُس نے حکم دیا کہ تجوری کو صحن میں دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیا جائے اور دو سپاہی تالے پر فائر کریں۔ پوری صبح مونتیئل کی بیوہ اپنے سونے کے کمرے میں لیٹی میئر کے پُرشور احکام کے جواب میں سپاہیوں کی دبی دبی آوازیں سنتی رہی۔

یہ تو حد ہوگئی، اس نے سوچا۔ میں نے پانچ سال خدا سے دعائیں کرنے میں گزارے کہ

قصبے میں گولیاں چلنی بند ہوں اور آج میرے ہی گھر میں گولیاں چل رہی ہیں اور ان گولیوں کے لیے مجھے لوگوں کا شکر گزار بھی ہونا پڑے گا!

اُس روز مونٹیئل کی بیوہ نے اپنے تمام احساسات اور قوتیں مجتمع کر کے موت کو اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کی، مگر اس کی کوشش بار آور نہ ہوئی۔ جب وہ سونے کو تھی، اُس وقت آنگن سے ایک زور دار دھماکے کی آواز نے سارے گھر کو ہلا دیا۔ تجوری کے تالے کو بارود سے اُڑانا پڑا تھا۔

مونٹیئل کی بیوہ نے آہ بھری۔ اکتوبر کا مہینہ اپنی بارشوں اور کیچڑ سمیت طویل ہوتا جا رہا تھا۔ جوزے مونٹیئل کی ابتری کی شکار لیکن لامحدود جائیداد پر موجود، بغیر تحریک اور سمت کے زندگی بسر کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو راہ گم کردہ محسوس کر رہی تھی۔ خاندان کے ایک پرانے اور محنتی دوست، مسٹر کارمائیکل نے جائیداد کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ جب مونٹیئل کی بیوہ نے اُس ٹھوس حقیقت کا سامنا کیا کہ اُس کا خاوند مر چکا ہے، تب وہ خود گھر کی دیکھ بھال کی خاطر سونے کے کمرے سے برآمد ہوئی۔ گھر میں سب نمائشی چیزوں کو اُس نے نکال کر پھینک دیا، فرنیچر پر ماتمی رنگوں کے غلاف چڑھوا دیے اور دیواروں پر آویزاں مرحوم کی تمام تصویروں کے گرد تعزیتی ربن باندھ دیے۔ تدفین کے بعد کے دو ماہ کے وقفے میں اس نے دانتوں سے ناخن کترنے کی نئی عادت ڈال لی تھی۔ ایک روز جب دیر تک رونے سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور سرخ تھیں، اُسے احساس ہوا کہ مسٹر کارمائیکل چھاتا لیے گھر کے اندر داخل ہو رہا ہے۔

''مسٹر کارمائیکل، چھاتا بند کرو۔'' اس نے کہا۔ ''پہلے ہی اس گھر میں کم بدقسمتی ہے کہ تمہارے کھلا چھاتا اندر لے کر آنے کی کسر باقی ہے!''

مسٹر کارمائیکل نے چھاتا ایک کونے میں رکھ دیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ نیگرو تھا جس کی جلد چمک دار اور لباس ہمیشہ سفید ہوتا تھا اور اس نے اپنے جوتوں کے چمڑے پر چاقو سے گھاؤ کر رکھے تھے تاکہ اس کے پوروں کی سوجن کو چمڑے کی رگڑ سے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

''صرف سکھانے کی خاطر چھاتا کھلا رکھا ہے۔''

خاوند کی موت کے بعد پہلی بار اُس کی بیوہ نے کھڑکی کھولی۔

''پہلے ہی اتنی بدقسمتی کا سامنا ہے اور اوپر سے یہ سردی کا موسم!'' اس نے دانتوں سے ناخن کترتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے بارش کبھی بند نہیں ہوگی۔''

''آج یا کل تو مطلع صاف ہونے سے رہا'' جائیداد کے منتظم نے کہا: ''کل رات میرے

پوروں کی سوجن نے مجھے بالکل سونے نہیں دیا۔''

موسم کے بارے میں مسٹر کارمائیکل کے پاؤں کی سوجن کی پیشن گوئیوں کی وہ مکمل طور پر قائل تھی۔ اُس نے کھڑکی کے باہر سنسان چوک کو دیکھا اور اُن بے صدا گھروں کو جن کے دروازے حوزے مونتیئل کا جنازہ دیکھنے کے لیے وا نہیں ہوئے تھے اور اپنی ناخن کترنے کی عادت سے، اپنی بے انتہا زمینوں سے اور اپنے خاوند سے ورثے میں ملے ہوئے متعدد فرائض سے، جنھیں سمجھنے سے وہ قطعی قاصر تھی، ناامیدی محسوس کی۔

''دنیا کا سارا انتظام ہی غلط ہے۔'' وہ سسکی بھر کر بولی۔

اُن دنوں اس کے گھر آنے والے مہمانوں کے پاس یہ سمجھنے کی بہت سی وجوہ تھیں کہ وہ پاگل ہوگئی ہے۔ لیکن اُس کا ذہن اتنی واضح سوچ کے قابل پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ قصبے میں سیاسی استبداد اور خون ریزی سے قبل وہ اکتوبر کی صبحیں اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر، مرے ہوؤں کی روحوں کے لیے دعا کرنے اور یہ سوچنے میں گزارا کرتی تھی کہ اگر خداوند خدا نے اتوار کے دن آرام نہ کیا ہوتا تو شاید اس نے دنیا کی زیادہ بہتر طور پر تکمیل کی ہوتی۔'' اُسے چاہیے تھا کہ اتوار کا دن دنیا کی چھوٹی موٹی غلطیاں اور بے ترتیبیاں درست کرنے میں صرف کرتا'' وہ کہا کرتی: ''کیا مضائقہ تھا۔ بعد میں اس کے پاس ابد تک آرام کرنے کا وقت تھا۔'' اس کے خاوند کی وفات کے بعد صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ اُس وقت اس کے پاس ایسی تیرہ سوچوں کے لیے ٹھوس دلیل موجود ہوا کرتی تھی۔

سو جس زمانے میں ناامیدی مونتیئل کی بیوہ کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی، مسٹر کارمائیکل ڈوبتے ہوئے سفینے کو بچانے کی کوشش میں جُتا ہوا تھا۔ کاروبار اور جائیداد کا انتظام از حد خراب تھا۔ حوزے مونتیئل نے تشدد اور دہشت پسندی کی مدد سے قصبے کی تمام تجارت پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ اُس کے خوف سے آزاد ہونے پر اب سارا قصبہ اس سے انتقام لینے کے در پے تھا۔ گاہکوں کے انتظار میں، جو ہفتوں ادھر کا رُخ نہ کرتے تھے، صحن میں رکھے بڑے بڑے برتنوں میں دودھ پھٹ جاتا، شہد چھتوں میں پڑا پڑا خراب ہو جاتا اور پنیر کے کمرے کی تاریک الماریوں میں رکھے پنیر میں کیڑے رینگنے لگتے۔ حوزے مونتیئل بغیر قمقموں سے روشن مزار میں، نقلی سنگِ مرمر کے بنے فرشتوں کے پروں کے سائے میں لیٹا اب اپنے پچھلے چھ برسوں میں جبر اور قتل و غارت کا حساب چکا رہا تھا۔ ملک کی تاریخ میں کوئی شخص اتنے کم عرصے میں اتنا زیادہ مالدار نہ ہوا تھا۔ جس زمانے میں آمریت کا نامزد کیا ہوا پہلا میئر قصبے میں وارد ہوا، حوزے مونتیئل اپنی آدھی عمر، زیرِ جامے میں

ملبوس، اپنی چاولوں میں مِل کے سامنے بیٹھے گزار چکا تھا اور ہر طرح کی حکومت کا پوشیدہ حامی رہا تھا۔ ایک وقت تھا کہ اسے لوگوں کی نظروں میں ایک خوش قسمت شخص اور ایک اچھے مسیحی کی شہرت حاصل تھی، مثلاً ایک بار اُس نے علانیہ کہا تھا کہ اگر اُسے لاٹری میں انعام مل گیا تو وہ گرجے میں سینٹ جوزف کا قدِ آدم مجسمہ نصب کروائے گا۔ اس اعلان کے دو ہفتے بعد جب اُسے انعام کی بڑی سی رقم وصول ہوئی تو اُس نے اپنا وعدہ مکمل طور پر نبھایا تھا۔ پہلی بار جوتے پہنے ہوئے اسے اُس روز دیکھا گیا تھا جس روز نیا میئر جو کہ نہایت وحشی اور بد طینت پولیس سارجنٹ تھا، قصبے میں آیا۔ نئے میئر کا پہلا کام حکومت کے خلاف ہر طرح کی مزاحمت کا قلع قمع کرنا تھا۔ حوزے مونتیئل نے میئر کا خفیہ مخبر بن کر اپنی زندگی کا دھارا بدلا۔ اس معمولی سے تاجر نے جس کی موٹے آدمیوں کی سی مزاح کی جس نے کبھی کسی کو رنجیدہ نہیں کیا تھا، مخبر بننے کے بعد اپنے دشمنوں کو امیروں اور غریبوں کے دو طبقوں میں بانٹ دیا۔ غریبوں کو تو قصبے کے چوک میں گولی مار دی گئی اور امیروں کو قصبے سے نکل جانے کے لیے چوبیس گھنٹے کا نوٹس دے دیا گیا۔ اس قتل و غارت گری کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کی خاطر حوزے مونتیئل میئر کے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھٹے ہوئے دفتر میں کئی کئی دن مقید رہتا اور اُس کی بیوی قصبے کے مردوں کے لیے دعائے خیر میں مصروف رہتی جب میئر اس کے گھر سے نکل کر باہر جاتا تو وہ اپنے خاوند کا راستہ روکتی۔ ''یہ آدمی قاتل ہے۔'' وہ اُسے بتاتی ''حکومت سے اپنا اثر و رسوخ کام میں لا کر اس سے اس قصبے کی جان چھڑواؤ۔ یہ یہاں ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' حوزے مونتیئل جو اُن دنوں نہایت مصروف آدمی تھا، اپنی بیوی کی طرف دیکھے بغیر اسے جھڑک دیتا۔ ''بے وقوفی کی بات مت کرو۔'' اصل میں مونتیئل کا بنیادی کام غریبوں کا قلع قمع کرنا نہ تھا بلکہ قصبے سے امیروں کا اخراج کروانا تھا۔ چناں چہ جب میئر کی پولیس نے امرا کے دروازے گولیوں سے چھلنی کر دیے اور انھیں چوبیس گھنٹے کا نوٹس دیے دیا تو حوزے مونتیئل نے اُن کی جائیداد، مویشی اور مال اسباب اپنی مرضی سے طے کی ہوئی قیمتوں پر اُن سے خرید لیے۔ ''یہ کیا فضول حرکت ہے'' اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ ''تم ان لوگوں پر احسان کرتے کرتے کہ وہ کسی اور جگہ جا کر بھوکے نہ مریں، خود کو تباہ کر لو گے اور ان میں سے کوئی تمہارا شکر گزار بھی نہ ہو گا۔'' حوزے مونتیئل نے جس کے پاس اُن دنوں مسکرانے کے لیے بھی وقت نہ تھا، اُسے ڈانٹ دیا اور کہا۔ ''تم باورچی خانے میں جا کر اپنا کام کرو اور میرا دماغ مت چاٹو۔'' اس رفتار سے ایک سال کے اندر اندر قصبے سے مخالفت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی بیٹیوں کو پیرس بھجوایا، لڑکے کو جرمنی میں کونسل کی نوکری دلوائی اور خود کو اپنی سلطنت مستحکم کرنے کے

لیے وقف کر دیا۔ لیکن اسے اپنی بے پناہ دولت سے لطف اندوز ہونے کے لیے چھ سال کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔

اس کی پہلی برسی کے بعد اُس کی بیوہ کے گھر کی سیڑھیوں میں صرف اُسی لمحے چرچراہٹ ہوتی جب کوئی شخص بُری خبر لے کر آتا۔ ایسے لوگ عموماً شام کے وقت آیا کرتے۔ ''ایک بار پھر ڈاکا پڑ گیا ہے۔'' وہ کہتے۔ ''کل پچاس بچھیائیں لے کر بھاگ گئے۔'' اپنی جھولنے والی کرسی میں ہلے بغیر مونتیئل کی بیوہ دانتوں سے ناخن کترتی رہتی اور دنیا سے بدظن اور کشیدہ خاطر ہوتی رہتی۔

''حوزے مونتیئل، میں نے تمھیں کیا کہا تھا؟'' وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ ''یہ قصبہ ناشکرے لوگوں کا ہے۔ ابھی قبر میں تمہارا جسم بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور ان لوگوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔''

اس کے گھر کوئی نہیں آتا تھا۔ اُن دنوں میں جب لگاتار بارش ہوتی رہتی تھی، صرف ایک انسان جو باقاعدگی سے اُس کے گھر آتا رہا وہ مسٹر کارمائیکل تھا اور وہ ہمیشہ کھلا چھاتا لیے اندر داخل ہوتا تھا۔ کاروبار کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو رہی تھی۔ مسٹر کارمائیکل حوزے مونتیئل کے بیٹے کو کتنے ہی خط لکھ چکا تھا۔ اُس نے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ قصبے میں واپس آ کر کاروبار کا انتظام سنبھال لے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی صحت کی خرابی کے بارے میں بھی اپنے تاثرات لکھ ڈالے تھے۔ مگر مونتیئل کے بیٹے کی جانب سے اُسے ہمیشہ ٹال مٹول والے جواب ہی موصول ہوئے۔ آخر کار مونتیئل کے بیٹے نے لکھا کہ واقعہ یہ ہے کہ وہ قصبے میں واپس آنے سے خوف زدہ ہے، اسے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی اسے گولی سے اُڑا دے گا۔ تب مسٹر کارمائیکل کو خواب گاہ میں بیوہ کے سامنے جا کر اعتراف کرنا پڑا کہ اس کی مالی حالت تباہ ہو چکی ہے۔

''یہی بہتر ہے'' اُس نے جواب دیا۔ ''میں تو مکھیوں اور پنیر سے تنگ آ چکی ہوں۔ تمہارا بھی جو جی چاہے یہاں سے لے لو اور مجھے چین کی موت مرنے دو۔''

اس کے بعد بیوہ کا دنیا سے تعلق صرف اُن خطوں کے ذریعے قائم رہا جو وہ اپنی بیٹیوں کو ہر ماہ کے اختتام پر لکھا کرتی تھی۔ ''یہ نہایت منحوس جھلسا ہوا، پالا لگا قصبہ ہے۔'' وہ انھیں لکھتی۔ ''تم ہمیشہ کے لیے وہیں رہو اور میرے بارے میں فکر مند نہ ہو۔ میں یہ جان کر مطمئن ہوں کہ تم وہاں خوش ہو۔'' اس کی بیٹیاں باری باری اس کے خطوں کا جواب دیتیں۔ اُن کے خط ہمیشہ مسرت اور

شادمانی سے پُر ہوتے اور صاف محسوس ہوتا کہ وہ خط گرم اور روشن جگہوں میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں اور یوں لگتا جیسے دونوں لڑکیاں جب سوچنے کو رکتی ہوں گی تو انھیں مختلف آئینوں میں اپنے عکس نظر آتے ہوں گے۔ انھیں بھی وطن واپس آنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔

''تہذیب صرف یہیں ہے۔'' وہ اپنی ماں کو لکھتیں۔ ''وہاں تمہارے ملک میں ہمارے لیے ماحول اچھا نہیں ہے۔ کسی ایسے وحشی ملک میں رہنا قطعی ناممکن ہے جہاں لوگ سیاسی وجوہات پر قتل کر دیے جاتے ہوں۔'' ان خطوں کو پڑھ کر مونٹیئل کی بیوہ کو خوشی اور بہتری کا احساس ہوتا اور وہ خطوں کے ہر جملے کے ساتھ رضامندی میں اپنا سر ہلاتی رہتی۔

ایک موقعے پر اس کی بیٹیوں نے اسے پیرس کے قصابوں کے بارے میں لکھا۔ انھوں نے بتایا کہ کیسے گلابی رنگ کے ملائم سور وہاں درازوں میں لیٹے رہتے ہیں اور کیسے انھیں پھولوں کے ہاروں سے سجا کر رکھا جاتا ہے۔ خط کے آخر میں کسی اور نے جس کے لکھنے کا انداز اُس کی بیٹیوں کے انداز سے مختلف تھا، اس جملے کا اضافہ کیا ہوا تھا: ''ذرا غور کریں کہ کارنیشن کا سب سے بڑا اور سب سے خوب صورت پھول سور کے چوتڑوں میں ٹکا ہوا ہوتا ہے۔''

یہ جملہ پڑھ کر مونٹیئل کی بیوہ دو سال کے عرصے میں پہلی دفعہ مسکرائی۔ گھر کی بتیاں جلائے بغیر وہ اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے اس نے بجلی کے پنکھے کا رُخ موڑ کر دیوار کی طرف کر دیا۔ پھر اس نے چھوٹی میز کی دراز میں سے قینچی، پٹی اور اپنی تسبیح نکالی اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر جہاں ناخن کترتے رہنے سے اُسے درد کا احساس ہو رہا تھا۔ پٹی باندھی۔ تب اس نے تسبیح پھیرنا شروع کی لیکن دوسرے ہی منتر پر اس نے تسبیح کو بائیں ہاتھ میں لے لیا کیوں کہ دائیں انگوٹھے پر پٹی کی وجہ سے تسبیح کے دانے اسے محسوس ہی نہ ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کو اس نے دور سے طوفان کی گرج کی آواز سنی لیکن جلد ہی اس کا سر سینے پر جھک گیا اور وہ سو گئی۔ اس کا تسبیح والا ہاتھ ایک طرف گر گیا اور خواب میں اُس نے ''بڑی ماما'' کو دیکھا جو سفید چادر لپیٹے اس کے گھر کے صحن میں بیٹھی تھی، اُس کی کنگھی اُس کی آغوش میں پڑی تھی اور وہ اپنے ناخنوں سے جوئیں مارنے میں مشغول تھی۔ اُس نے بڑی ماما سے پوچھا۔ ''مجھے موت کب آئے گی۔؟''

بڑی ماما نے اپنا سر اُٹھایا۔

''جب تھکن تمہارے بازو میں اُتر آئے گی۔''

☆☆☆

(مشمولہ: ''ذہن جدید''، دہلی، جلد ۱۵، شمارہ نمبر ۴۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۵ء)

سنیچر کے بعد کے دن

ترجمہ: فاروق حسن

ساری مصیبت جولائی میں شروع ہوئی جب ربیکا پر، جو دو غلام گردشوں اور نو خواب گاہوں والے بے انتہا بڑے گھر میں تنہا رہنے والی ایک تلخ مزاج بیوہ تھی، یہ انکشاف ہوا کہ اس کے گھر کی کھڑکیوں کی جالیاں ایسے پھٹی ہوئی ہیں جیسے کسی نے باہر سے ان پر پتھراؤ کیا ہو۔ پہلی بار جب اس نے اپنی خواب گاہ کی جالی ٹوٹی ہوئی دیکھی تو اس نے سوچا کہ آرخے نیدا سے بات کرے جو نہ صرف اس کی ملازمہ تھی بلکہ جب سے ربیکا کے خاوند کا انتقال ہوا تھا، اس کی ہم راز بھی تھی۔ کچھ دیر بعد کمروں کی چیزیں ہلانے جلانے سے (عرصہ دراز سے ربیکا نے گھر کی چیزیں اِدھر اُدھر رکھنے کے سوا کوئی کام نہ کیا تھا) اسے پتا چلا کہ صرف اسی کمرے کی نہیں بلکہ گھر کی تمام کھڑکیوں کی جالیاں پھٹی ہوئی ہیں۔ ربیکا کو اپنے اقتدار کا یک نظری قسم کا احساس تھا، جو شاید اسے اپنے سگڑ دادا سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ جنوبی امریکا کا پیدائشی ہسپانوی تھا جو جنگِ آزادی میں شاہ پرستوں کی جانب سے شریک ہوا تھا اور بعد ازاں نہایت کٹھن سفر طے کر کے صرف اس مقصد سے ہسپانیہ گیا تھا کہ اُس عالی شان محل کا دیدار کر سکے جسے چارلس سوم نے سان الدے فونسو میں تعمیر کیا تھا۔ لہٰذا جب ربیکا کو گھر کی جالیوں کی صورتِ حال کا پتا چلا تو اس نے آرخے نیدا سے بات کرنے کے خیال کو رد کر دیا اور اس کی بجائے وہ اپنی تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپی پہن کر جس پر مخمل کے چھوٹے چھوٹے پھول تھے، ٹاؤن ہال کی طرف روانہ ہو گئی تا کہ اپنے گھر پر حملے کے خلاف شکایت درج کرا سکے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبے کا میئر خود قمیص کے بغیر بالوں بھرے جسم کے ساتھ اپنے وجود کا ٹھوس پن عیاں کرتے ہوئے جو ربیکا کو حیوانی محسوس ہوا،

ٹاؤن ہال کی کھڑکیوں کی جالیاں مرمت کرنے میں مصروف تھا، جو ربیکا کے گھر کی جالیوں کی طرح پھٹی ہوئی تھیں۔

ربیکا کاٹھ کباڑے سے بھرے اس گندے دفتر کے اندر چلی آئی اور جس چیز پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ میز پر مُردہ پرندوں کا ڈھیر تھا، لیکن کچھ گرمی اور کچھ جالیوں کی تباہی پر برہمی کی وجہ سے وہ اتنی بدحواس تھی کہ اسے میز پر پڑے مردہ پرندوں کے ناقابل یقین منظر کو دیکھ کر لرزنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ نہ ہی وہ عہدے اور منصب کی توہین سے دل برداشتہ ہوئی جس کا مالک اس کی آنکھوں کے سامنے سیڑھیوں کے اوپر کھڑا، جالی کا بنڈل اور پیچ کس ہاتھ میں لیے، کھڑکیوں کی جالیاں ٹھیک کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں اپنے مرتبے اور اپنی کھڑکیوں کے نقصان کے سوا کوئی خیال نہ تھا اور اسی انہماک کی بدولت وہ اپنی کھڑکیوں اور ٹاؤن ہال کی کھڑکیوں کے درمیان کسی اشتراک کا تعین نہ کر سکی۔ وہ دروازے سے دو قدم اندر، تمیز دارانہ سنجیدگی سے کھڑی ہوگئی اور پنے چھاتے کے طویل اور مرصع دستے پر وزن ڈالتے ہوئے بولی: ''میں ایک شکایت درج کرانے آئی ہوں۔''

سیڑھیوں کے اوپر کھڑے میسّر نے اپنا گرمی سے تپا ہوا چہرہ موڑا۔ بیوہ کی اس وقت دفتر میں بے وجہ موجودگی پر اس نے کسی جذبے کا اظہار نہ کیا۔ مغمومانہ لاتعلق کے ساتھ ٹوٹی ہوئی جالیوں کو اکھیڑنا جاری رکھتے ہوئے اس نے سیڑھیوں کے اوپر ہی سے پوچھا: ''کیا شکایت ہے؟''

''محلے کے لڑکوں نے میرے گھر کی تمام جالیاں توڑ دی ہیں۔''

میسّر نے ایک بار پھر بیوہ کی طرف دیکھا۔ اس بار اس نے مخمل کے پھولوں سے لے کر پرانی چاندی کے رنگ کے جوتوں تک اس کا احتیاط سے جائزہ لیا جیسے اُسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ جسمانی حرکت کی از حد کفایت کرتے ہوئے اور اپنی نظریں بیوہ پر سے ہٹائے بغیر وہ سیڑھیوں سے اترا۔ نیچے پہنچ کر اُس نے ایک ہاتھ اپنی پتلون کی پیٹی پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے جس میں پیچ کس پکڑا ہوا تھا، ڈیسک کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''سینورا، یہ کارگزاری پرندوں کی ہے۔ لڑکوں کی نہیں۔''

تب آخر کار ربیکا کو ڈیسک پر پڑے مردہ پرندوں، سیڑھیوں کے اوپر کھڑے آدمی اور اپنے گھر کے کمروں کی شکستہ جالیوں کے درمیان تعلق کا احساس ہوا، اور اپنے گھر کی خواب گاہوں میں مردہ پرندوں کے ڈھیر کا سوچ کر وہ کانپ اُٹھی۔

''پرندوں کی؟'' اس نے چیخ کر کہا۔

''جی، پرندوں کی۔'' میسٹر نے اُس سے اتفاق کیا۔ ''تعجب ہے کہ یہ بات اب تک آپ کے مشاہدے میں نہیں آئی، جب کہ پچھلے تین روز سے ہمیں پرندوں کے کھڑکیوں کے اندر گھسنے اور گھروں کے اندر آ کر مرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔''

ٹاؤن ہال سے نکلتے وقت ریبکا شرمندہ سی تھی اور آرخے نیدا سے کچھ ناراض بھی جو شہر کی باقی تمام بکواس گھر میں لے آیا کرتی تھی مگر اس نے ریبکا سے پرندوں کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ اگست سے قبل کی دھوپ سے ریبکا کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس نے اپنا چھاتا کھول لیا۔ سنسان اور دم گھونٹنے والی گلی میں چلتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے تمام گھروں کی خواب گاہوں میں سے مرے ہوئے پرندوں کی تیز اور چبھتی ہوئی سڑانڈ اُٹھ رہی ہے۔

یہ جولائی کا آخر تھا اور قصبے کی تاریخ میں آج تک اتنی شدید گرمی نہ پڑی تھی۔ لیکن قصبے کے باسیوں کو، جو پرندوں کے مرنے سے گھبرائے ہوئے تھے، گرمی کی شدت کا پتا نہ چلا تھا۔ اس عجیب و غریب واقعے نے بستی والوں کے روز کے معمول میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی تھی، تاہم لوگوں کی اکثریت اگست کے اوائل میں اس واقعے کے باعث مخمصے میں تھی۔ اس اکثریت میں قصبے کے روکھے پھیکے پادری، عظمت مآب اینتونی از ابیل کا شمار نہیں تھا جو کاستانیدا ای مونتیرو کی مقدس قربان گاہ سے تعلق رکھتا تھا اور جس نے چورانوے برس کی عمر میں لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ تین بار ابلیس سے مل چکا ہے تاہم ابھی تک اُس نے صرف دو مردہ پرندے دیکھے تھے اور اُن کی موت سے کوئی اہمیت وابستہ نہیں کی تھی۔ پہلا مردہ پرندہ اسے ایک منگل کو، عبادت کے بعد کلیسا کے مخزن میں نظر آیا تھا۔ اس نے سوچا شاید محلے کی کوئی بلی اُسے گھسیٹ کر وہاں لے آئی ہو گی۔ دوسرا اُسے بدھ کے دن اپنے گھر کے دالان میں پڑا ملا تھا، جسے اس نے جوتے کی نوک سے دھکیل کر یہ سوچتے ہوئے کہ بلیاں نہایت فالتو اور غیر ضروری مخلوق ہیں، سڑک کے بیچوں بیچ پھینک دیا تھا۔

لیکن جمعے کے دن جب وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو اس بنچ پر جس پر اس نے بیٹھنے کا ارادہ کیا، اسے تیسرا مردہ پرندہ دکھائی دیا۔ جب وہ پرندے کو چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے لایا اور الٹ پلٹ کر غور سے اس کا معائنہ کیا تو اسے اپنے اندر بجلی کا سا کڑکا محسوس ہوا اور اس نے سخت متعجب ہو کر سوچا خدا رحم کرے، ایک ہفتے میں یہ تیسرا مردہ پرندہ مجھے نظر آیا ہے۔

اس لمحے کے بعد سے اس نے قصبے میں ہونے والے واقعات کا مشاہدہ شروع کیا، لیکن

بہت ہی غیر واضح طریقے سے، اس لیے کہ فادر اینتھونی از ابیل، کچھ تو اپنی عمر کے سبب اور کچھ اس باعث کہ وہ تین بار ابلیس سے ملنے کا بیان دے چکا تھا (جو لوگوں کے خیال میں تھوڑا سا غیر موزوں تھا) اپنے مسیحی حلقے والوں کی نظر میں دماغی طور پر عادتاً غیر حاضر جانا جاتا تھا، باوجود اس کے کہ لوگ اس کی نیکوکاری، امن پسندی اور خوش خلقی کے بھی قائل تھے، اسے احساس ہوا کہ پرندوں کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے لیکن وہ جو کچھ بھی تھا اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کے آئندہ خطبے کا موضوع بن سکے۔ فادر اینتھونی وہ پہلا شخص تھا جسے قصبے میں پھیلی ہوئی بو کا احساس ہوا تھا۔ جمعے کی رات کو وہ خوف زدہ ہو کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ اس کی ہلکی نیند مردہ پرندوں کی جی متلا دینے والی سڑانڈ سے اڑ گئی تھی، لیکن وہ یہ باور نہ کر سکا کہ آیا اس بد بو کو کسی خوابِ بد سے منسوب کرے یا ابلیس سے جس نے اس کی نیند خراب کرنے کے لیے کوئی نیا اور انوکھا حربہ وضع کیا تھا۔ اس نے چاروں طرف سونگھا اور بستر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ تجربہ اس کے خیال میں ایک ڈرامائی وعظ کا موضوع بننے کے لائق تھا کہ ابلیس کس طرح حواس خمسہ میں سے کسی ایک کے ذریعے، لوگوں کے دلوں میں سرایت کرنے کا اہل تھا۔

دوسرے روز عبادت سے قبل جب وہ صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا تو اس نے پہلی بار کسی کو مردہ پرندوں کا ذکر کرتے سنا۔ وہ اپنے خطبے ابلیس، اور ان گناہوں کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا جن کا حسِ سامعہ کے ذریعے ارتکاب کیا جا سکتا ہے، جب اس نے کسی کو کہتے سنا کہ قصبے میں پھیلی بد بو ان مردہ پرندوں کی وجہ سے ہے جو پچھلے ہفتے کے دوران میں اکھٹے کیے گئے ہیں۔ اس کے دماغ میں انجیلی تنبیہات، کریہہ بد بوؤں اور مردہ پرندوں کا ملغوبہ سا بننے لگا، حتیٰ کہ اتوار کے روز خطبے کے دوران اسے خیرات کے موضوع پر ایک طویل پیراگراف فی البدیہہ گھڑنا پڑا جس کا مطلب خود اس پر بھی مکمل طور پر واضح نہ تھا اور یوں ابلیس اور حواس خمسہ کا ربط ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن سے فراموش ہو گیا۔

تاہم اس کی فکر کے کسی دور افتادہ کونے میں یہ تجربات ضرور پوشیدہ رہ گئے ہوں گے۔ یہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہوتا تھا، نہ صرف مذہبی دارالعلوم میں، جہاں وہ ستر سال قبل طالبِ علم رہا تھا، بلکہ اب نوے سال کی عمر پانے کے بعد یہ سب کچھ خاص طرح سے ہو رہا تھا۔ دارالعلوم میں ایک چمکدار سہ پہر کو جب بادل گرجے بغیر موسلا دھار بارش ہوئی تھی، وہ سوفوکلیز کا ایک انتخاب اصل زبان میں پڑھنے میں مشغول تھا۔ جب بارش تھمی تو اس نے کھڑکی سے باہر تھکے ہوئے میدان اور نئی دھلی دھلائی سہ پہر کو دیکھا تھا اور اس لمحے یونانی تھیٹر اور کلاسیکی ادب کو یکسر بھول گیا

تھا۔ ویسے بھی ان دونوں میں اس نے کبھی زیادہ امتیاز نہ کیا تھا بلکہ انھیں عمومی طور پر 'پرانے وقتوں کی قدیم چیزیں' ہی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ تیس چالیس برس بعد ایک بے بارش کی سہ پہر کو کسی نئے قصبے میں جہاں وہ دورے پر گیا ہوا گیا۔ اینٹوں والے چوک کو عبور کرتے ہوئے اس نے بغیر خواہش کے سوفوکلیز کا وہی قطعہ دوہرا دیا تھا جو وہ اس روز دارالعلوم میں پڑھ رہا تھا۔ اسی ہفتے اس نے باتوں کے رسیا اور اثر پذیر ایک بوڑھے نائب پادری سے 'پرانے وقتوں کی قدیم چیزوں' کے بارے میں اس کا دعوٰی تھا کہ وہ اس نے خود ایجاد کیے ہیں، بعدازاں وہی معمے 'کراس ورڈ' کے نام سے خاصے مشہور ہوئے تھے۔

نائب پادری کے ساتھ گفتگو سے اس کا یونانی علوم کے ساتھ پہلے جیسا دلی لگاؤ ایک بار پھر لوٹ آیا تھا۔ اسی سال کرسمس کے موقعے پر اسے ایک خط موصول ہوا تھا اور اگر اس وقت تک اس کے مبالغہ آمیز تخیل، تشریحات کی دلیری اور وعظوں میں بے وقوفی کی مکمل شہرت نہ ہو چکی ہوتی تو اس موقعے پر اسے بشپ کا عہدہ دے دیا گیا ہوتا۔

لیکن اس نے تو اپنے آپ کو ۱۸۸۵ء کی جنگ سے قبل ہی اس قصبے میں زندہ دفن کر دیا تھا اور ان دنوں جب پرندوں نے خواب گاہوں میں مرنا شروع کیا تھا، اس بات کو ایک مدت گزر چکی تھی کہ قصبے والوں نے خصوصاً اس کے ابلیس سے ملاقاتوں کے دعوے کے بعد اس کی جگہ کسی کم عمر پادری کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ اس کے بعد سے انھوں نے اس کی طرف دھیان دینا ہی چھوڑ دیا تھا اور یہ بات اس کی اپنی نظر سے پوشیدہ رہی تھی حالاں کہ اس کی بصارت اب بھی ایسی تیز تھی کہ وہ دعاؤں کی کتاب کے باریک حروف عینک کے بغیر پڑھ سکتا تھا۔

اس کی عادت ہمیشہ سے مخصوص اور معین رہی تھیں۔ چھوٹے قد اور غیر اہم شخصیت، نمایاں اور مضبوط ہڈیوں اور پُرسکون حرکات والے اس شخص کی آواز گفتگو میں آسودگی دینے والی تھی، لیکن خطبے کے دوران ضرورت سے زیادہ ہی آسودگی بہم پہنچایا کرتی تھی۔ وہ دوپہر کے کھانے کے وقت تک صرف اپنی سوتی پتلون میں ملبوس، جس کے پائنچے پنڈلیوں تک مڑے ہوتے تھے، کینوس کی کرسی میں سہل انگاری سے دراز، دن سپنے دیکھا کرتا تھا۔

عبادت میں وعظ کرنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ ہفتے میں دو مرتبہ وہ اعتراف کی کوٹھری میں جا بیٹھتا، لیکن عرصۂ دراز سے کوئی شخص اعتراف کے لیے نہ آیا تھا۔ اس نے محض یہ سمجھا کہ نئے زمانے کے طور طریقوں کے باعث اس کے مسیحی حلقے کے لوگوں کا ایمان کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اسی لیے اس کے حساب سے ابلیس سے اس کی تین بار ملاقات ایسا تجربہ تھا جو وقت اور

زمانے کے عین مطابق تھا۔ تاہم اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لوگ اس کی باتوں پر کم ہی کان دھرتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ خود بھی ان تجربات کا ذکر کرتے وقت زیادہ قابلِ یقین نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے لیے خود اپنے آپ یہ دریافت کر لینا حیران کن بات ہوتی کہ پچھلے پانچ سالوں کے دوران خاص طور پر ان غیر معمولی لمحوں میں جب اس نے پہلے دو مردہ پرندے دیکھے تھے، وہ مردہ رہا تھا۔ اس میں زندگی کی تھوڑی سی رمق اس وقت پیدا ہوئی جب اس نے تیسرا مردہ پرندہ دیکھا، لہٰذا اب پچھلے چند دنوں سے وہ بین کثرت سے اسٹیشن کی بنچ پر پائے گئے پرندے کے بارے میں غور و فکر میں مصروف تھا۔

گرجے سے دس قدم کے فاصلے پر اس کا بغیر جالیوں کا چھوٹا سا گھر تھا، جس کا برآمدہ سڑک کی طرف تھا اور پیچھے دو کمرے تھے جو اس کے دفتر اور خواب گاہ کا کام دیتے تھے۔ کبھی کبھی شاید ایسے لمحوں میں جب اس کا ذہن غیر واضح ہوتا، وہ سوچتا کہ دنیا میں اگر گرمی کا وجود نہ ہوتا تو خوشی کا حصول ممکن تھا اور یہ خیال اس کے ذہن کا الجھا دیتا۔ مابعد الطبیعیات کی دشوار گزار راہوں میں بھٹکنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہر صبح اپنی خواب گاہ میں دروازہ بھیڑے، آنکھیں موندے اور جسم کے پٹھے اکڑائے بیٹھا وہ یہی کیا کرتا تھا۔ تاہم اسے یہ احساس نہ تھا کہ اس کی سوچ اس قدر لطیف ہو چکی ہے کہ پچھلے تین برس سے اپنے مراقبے کے لمحوں میں وہ کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوتا۔

ٹھیک بارہ بجے دوپہر ایک لڑکا ہاتھوں پر خانوں والا طشت اٹھائے، برآمدہ عبور کیا کرتا، جس میں ہمیشہ وہی چیزیں ہوتی تھیں، یعنی ہڈیوں کا سوپ، یکا کا ایک ٹکڑا، اُبلے ہوئے چاول، بغیر پیاز کا گوشت، تلا ہوا کیلا یا مکئی کی روٹی اور تھوڑی سی دال، جسے مقدس قربان گاہ کا ستا نیئیدا ای نوتیرو کے پادری اینتونی ازابیل نے کبھی چکھ کر نہ دیا تھا۔

لڑکا طشت کو اس کرسی کے نزدیک رکھ دیتا جس پر پادری بیٹھا ہوتا تھا، لیکن پادری اپنی آنکھیں اس وقت تک نہ کھولتا جب تک کہ برآمدے میں واپس جاتے ہوئے قدموں کی آواز ختم نہ ہو جاتی۔ اس کی اس عادت کے باعث قصبے میں مشہور ہو چکا تھا کہ پادری دوپہر کے کھانے سے قبل ہی قیلولہ کر لیتا ہے (جو کہ نہایت فضول حرکت سمجھی جاتی تھی)۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ بے چارے پادری کو رات میں بھی ٹھیک سے نیند نہ آتی تھی۔

اس عمر میں اس کی عادتیں کم پیچیدہ بلکہ بالکل غیر مہذب سی ہو گئی تھیں۔ مثلاً وہ دوپہر کا کھانا اپنی کینوس کی کرسی ہی میں بیٹھے بیٹھے کھا لیا کرتا، خوراک کو طشت میں سے باہر بھی نہ نکالتا

اور رکابیاں اور چھری کانٹے بھی استعمال نہ کرتا۔ ایک ہی چمچ سے، جس سے وہ سوپ پیتا تھا، سارا کام چلاتا۔ بعد ازاں وہ اٹھتا، تھوڑا سا پانی سر پر انڈیل کر اپنی سفید عبا پہنتا، جس میں بڑی بڑی چوکور ٹکڑیاں تھیں اور عین اس وقت جب باقی کا قصبہ قیلولے کے لیے لیٹ رہا ہوتا۔ وہ ریلوے اسٹیشن کا رخ کرتا۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ ایک ہی راستے سے، ایک خاص دعا پڑھتا ہوا، آ جا رہا تھا جو اس نے خود ہی اس وقت وضع کی تھی جب ابلیس سے اس کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔

ایک سنیچر کو۔۔۔۔۔ مردہ پرندوں کی بارش شروع ہونے کے نو دن بعد۔۔۔۔۔ جب مقدس قربان گاہ کا پادری اینتھونی از ابیل یوں ہی چلا جا رہا تھا تو ربیکا کے گھر کے عین سامنے ایک مرتا ہوا پرندہ آسمان سے اس کے پیروں میں آ کر گرا۔ اس کے دماغ میں وجدان کا کوندا سا لپکا اور اسے احساس ہوا کہ باقی پرندوں کے برعکس اس مرتے ہوئے پرندے کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ اس نے پرندے کو ہاتھوں میں اٹھایا اور ربیکا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ربیکا اس لمحے، قیلولہ کرنے کی خاطر اپنا شلوکا اتارنے میں مصروف تھی۔

اپنی خواب گاہ میں سے ربیکا نے دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز سنی اور جبلی طور پر جالیوں کی طرف دیکھا۔ پچھلے دو روز سے کوئی پرندہ اس کی خواب گاہ میں داخل نہ ہوا تھا لیکن جالی اب تک پھٹی ہوئی تھی۔ جالیوں کی مرمت کرانا جب تک پرندوں کی یورش جاری تھی۔ پنکھے کی آواز سے اوپر اٹھتی ہوئی دستک کی آواز سنی اور بے صبری سے اسے یاد آیا کہ آرجے نیدا برآمدے کے دوسرے کونے والے کمرے میں قیلولہ کر رہی ہے۔ اس نے اس بابت بالکل غور نہ کیا کہ اس لمحے اپنی موجودگی اس پر مسلط کرنے والا کون شخص ہو سکتا ہے۔ اپنا شلوکا اس نے دوبارہ پہن لیا، جالی کا دروازہ کھول کر تنے ہوئے انداز میں سیدھے چلتے ہوئے پورا برآمدہ طے کیا اور نشـ[illegible] کمرے میں سے گزر کر جس میں مختلف زیبائش اشیا اور فرنیچر کی بھرمار تھی، دروازہ کھولنے سے [illegible] پیتل کی جالی میں سے باہر جھکا نکا۔ باہر کم گو فادر اینتھونی از ابیل آنکھیں بند کیے اور ہاتھوں میں ایک پرندہ اٹھائے کھڑا تھا۔ ابھی اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا کہ پادری نے کہا "اگر اسے تھوڑا سا پانی پلا کر تھالی کے نیچے رکھ دیا جائے تو مجھے یقین ہے یہ اچھا ہو جائے گا۔" اور جب ربیکا نے دروازہ کھولا تو اسے لگا جیسے خوف کے مارے وہ وہیں ڈھیر ہو جائے گی۔

پادری پانچ منٹ سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرا۔ ربیکا کو احساس ہوا جیسے اس کی کسی بات نے پادری کے قیام کو مختصر کر دیا ہو، لیکن دراصل پادری نے خود ہی ملاقات کو مختصر کیا تھا۔ ربیکا اگر اسی لمحے غور کرتی تو اسے احساس ہو جاتا کہ پادری پچھلے تیس برسوں میں، جب سے وہ اس قصبے میں

مقیم تھا، کبھی اس کے گھر میں پانچ منٹ سے زیادہ دیر کے لیے نہ رکا تھا۔ پادری کو اس گھر میں رکھی چیزوں کی فراوانی میں گھر کی مالکہ کی شہرت پرست روح کا عکس صاف دکھائی دیتا تھا، باوجود اس کے کہ جیسا کہ ہر ایک کو معلوم تھا، ربیکا کی بشپ سے دور کی قرابت داری بھی تھی۔ اس کے علاوہ ربیکا کے خاندان کے بارے میں ایک روایت (یا محض ایک کہانی) مشہور تھی جو یقیناً پادری کے خیال میں، کلیسائی محل والوں کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی، حالاں کہ ربیکا کے ایک دور کے عم زاد کرنل اور یلیا نو بوئندیا نے جسے ربیکا خاندانی شفقت سے قطعی عاری سمجھتی تھی، ایک بار قسم کھا کر بیان دیا تھا کہ بشپ نے اس پوری صدی میں قصبے میں اس لیے قدم نہ رکھا تھا کہ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال، یہ خواہ تاریخی واقعہ تھا یا من گھڑت کہانی، حقیقت یہ تھی کہ مقدس قربان گاہ کے پادری انتونی از ابیل کو اس گھر میں ہمیشہ بے آرامی کا احساس ہوا تھا، جس میں تنہا رہنے والی مالکہ نے کبھی خدا ترسی نہیں دکھائی تھی اور جو سال بھر میں صرف ایک بار اعتراف کے لیے گرجے جاتی تھی اور اس اعتراف کے دوران میں بھی ہر اس سوال کا جو اس کے خاوند کی موت کے حیرت ناک حادثے کے بارے میں ہوتا تھا، گول مول جواب دیا کرتی تھی۔ اگر پادری اس موقعے پر اس گھر میں موجود تھا اور ہاتھ میں پرندہ تھامے ربیکا کے پانی کا گلاس لا کر پرندے کو ڈبکی لگوانے کا منتظر تھا تو اس کا باعث چند اتفاقات تھے جن کے لیے وہ ہرگز جواب دہ نہ تھا۔

بیوہ کی واپسی کا انتظار کرتے ہوئے چوبی کام والی آرام کرسی میں دھنسے ہوئے پادری نے اس گھر کی عجیب و غریب سیلن کو محسوس کیا۔ اس لمحے سے بیس برس پہلے ایک دن اس گھر میں پستول چلنے کی آواز گونجی تھی اور حوزے آرکادیو بوئندیا (کرنل اور یلیا نو اور اپنی بیوی کا عم زاد) گولی لگنے سے چکرا کر مہمیزوں اور بکسوؤں کے ڈھیر کے درمیان اپنے اتارے ہوئے چرمی موزوں پر گرا تھا، انھی موزوں پر جن میں اس کے جسم کی گرمی ابھی موجود تھی، اس دن سے اس گھر کو سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہ ہوا تھا۔

ربیکا جب دوبارہ نشست کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے پادری کو آرام کرسی میں بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی دھندلاہٹ تھی کہ وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

''خداوند خدا کو ایک پرندے کی زندگی بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی ایک انسان کی'' پادری نے کہا۔

لیکن یہ کہتے وقت اس کے ذہن میں حوزے آرکادیو بوئندیا کا خیال نہ آیا تھا اور نہ ہی بیوہ

نے یہ سن کر اپنے مرحوم خاوند کو یاد کیا تھا۔ لیکن بیوہ کو پادری کی باتوں پر اعتقاد نہ کرنے کی عادت ہو چکی تھی، خاص طور پر اس وقت سے جب پادری نے گرجے کے منبر پر کھڑے ہو کر ابلیس کے تین بار اس کے سامنے ظاہر ہونے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی بات پر زیادہ دھیان نہ دیتے ہوئے ربیکا نے پرندے کو ہاتھوں میں پکڑا، اسے پانی میں ڈبکی دی اور پھر جھنجھوڑا۔ پادری نے غائر نظر سے دیکھا کہ اس عورت کے طریق کار میں خدا ترسی اور احتیاط کا فقدان تھا اور اسے پرندے کی زندگی کی ذرہ بھر پروا نہ تھی۔

''تمہیں پرندے اچھے نہیں لگتے'' پادری نے نرمی سے مگر اثبات کے لہجے میں کہا۔

بیوہ نے بے صبری اور مخاصمت کے انداز سے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ''ایک وقت ایسا تھا کہ مجھے پرندے پسند تھے'' وہ بولی۔ ''مگر جب سے انھوں نے ہمارے گھروں کے اندر آ کر مرنا شروع کیا ہے مجھے زہر لگنے لگے ہیں۔''

''بہت سے پرندے مر گئے ہیں۔'' پادری کٹر ین سے بولا۔ لیکن کسی شخص کو یہ گمان بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے ہموار لہجے میں بہت چالاکی چھپی ہوئی ہے۔

''سب مر گئے ہیں'' بیوہ نے کہا۔ اور ساتھ ہی ناگواری سے ہاتھ میں تھامے پرندے کو زور سے دبا کر تھالی کے نیچے رکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''مجھے ان کے مرنے کی بھی پروا نہ ہوتی اگر وہ میری جالیاں نہ توڑتے۔''

پادری نے باور کیا کہ اس نے اپنی تمام زندگی میں اس سے زیادہ سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں دیکھا۔ ایک لمحے بعد پرندے کے مختصر سے بے مدافعت جسم کو ہاتھ میں اٹھانے پر اسے پتا چلا کہ اس کی سانس بند ہو چکی ہے۔ اس وقت اس کے ذہن سے سب کچھ فراموش ہو گیا۔ گھر کی سیلن، گھر کی مالکہ کی شہرت پرستی، حوزے آرکادیو بوئندیا کے جسم سے اٹھتی ہوئی بارود کی ناقابلِ برداشت بو۔۔۔ اور اس پر وہ عظیم الشان حقیقت آشکار ہوئی جو اس ہفتے کے آغاز سے اس کے قرب و جوار میں موجود تھی۔ بیوہ نے اسے مردہ پرندہ ہاتھوں میں تھامے اور دہشت دلانے والا اشارہ کرتے ہوئے گھر سے نکلتے دیکھا، لیکن پادری اس وقت ایک حیرت انگیز کشف سے گزر رہا تھا کہ قصبے پر مردہ پرندوں کی بارش ہو رہی ہے اور وہ خود، خداوند خدا کا برگزیدہ اور منتخب خدمت گار جس کا زندگی میں خوشی سے اُسی وقت واسطہ رہا تھا جب گرمی نہ پڑ رہی ہو، قربِ قیامت کے بارے میں سب کچھ فراموش کر چکا ہے۔

اس روز بھی وہ حسبِ سابق ریلوے اسٹیشن پر گیا، مگر اس روز وہ اپنی حرکات سے باخبر نہ

تھا۔ اسے مبہم طور پر احساس تھا کہ دنیا میں کچھ ہو رہا ہے مگر اس کا ذہن گڈ مڈ اور ساکت تھا اور وہ خود حالات کا سامنا کرنے سے قطعی قاصر تھا۔ بینچ پر بیٹھے ہوئے اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آیا قربِ قیامت کے آثار میں مردہ پرندوں کی بارش کا ذکر بھی تھا، لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔ ایک دم سے خیال آیا کہ شاید ربیکا کے گھر میں رکنے کے سبب اس نے دیر کر دی ہو اور گاڑی آ کر چلی گئی ہو، لیکن اس نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے اور گرد آلود شیشے کے اوپر سے گردن اٹھا کر گھنٹے پر نظر ڈالی تو اسے پتا چلا کہ ابھی بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ جب وہ دوبارہ بنچ پر بیٹھا تو اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس وقت اسے یاد آیا کہ آج سنیچر ہے۔ کھجور کے پتوں کے دستی پنکھے سے اپنے آپ کو ہوا کرتے وقت وہ ذہن کی تاریک دھند میں کھویا رہا۔ کچھ دیر وہ اپنی عبا، اپنے جوتوں اور اپنی پادریوں والی لمبی آرام دہ پتلون کے بٹنوں کے بارے میں جھنجھلاہٹ کا شکار رہا۔ تب اس نے گھبرا کر محسوس کیا کہ آج تک اسے اتنی گرمی نہ لگی جتنی اس وقت لگ رہی ہے۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی عبا کے بٹن کھولے، آستین میں سے رومال نکال کر اپنا تپا ہوا چہرہ صاف کیا اور جذبے کی بصیرت والے ایک عارضی لمحے میں سوچا کہ شاید وہ کسی زلزلے کی تہیں کھلنے کا منظر دیکھ رہا ہے۔ یہ عبارت اس نے کہیں پڑھی تھی۔ مگر آسمان بالکل صاف تھا، نیلا اور شفاف آسمان جس میں سے تمام پرندے پُراسرار طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اس نے آسمان کے رنگ اور شفاف پن کو تو دیکھا مگر ایک لمحے کے لیے پرندوں کو بھول گیا۔ اب وہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا، شاید کوئی طوفان آنے والا ہے۔ لیکن آسمان نتھرا ہوا پرسکون اور بے حرکت تھا جیسے وہ کسی اور قصبے کا آسمان ہو جہاں اسے گرمی کا کبھی احساس نہ ہوا ہو، اور جیسے اس کی اپنی آنکھیں کسی اور کی آنکھیں ہوں، جو اس آسمان کو دیکھ رہی ہوں۔ تب اس نے شمال کی جانب نظر دوڑائی اور وہاں کھجور کے پتوں اور زنگ آلود جست کی چھتوں سے پرے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے اوپر، خوشی، آہستگی اور روانی سے اڑتے ہوئے، شکروں کا ایک دھبہ سا دیکھا۔

کسی نامعلوم وجہ سے اس لمحے پادری اُسی کیفیت سے گزرا جس سے ایک اتوار کو دارالعلوم میں اپنے ادنیٰ مدارج حاصل کرنے سے کچھ روز پہلے گزرا تھا۔ ریکٹر نے اسے اپنا ذاتی کتب خانہ استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور وہ روزانہ (خصوصاً اتواروں کو) گھنٹوں وہاں بیٹھا میلی ہوتی ہوئی کتابیں پڑھتا رہتا تھا، جن میں سے پرانی لکڑی کی بو آیا کرتی تھی اور جن میں لاطینی زبان کے چھوٹے چھوٹے خمدار حروف میں ریکٹر نے اپنے ہاتھ سے حاشیہ آرائی کی ہوئی تھی۔ ایک اتوار کو جب وہ صبح سے مطالعے میں مصروف تھا، ریکٹر شام کے وقت کمرے میں داخل

ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ کر برافروختہ سا ہو کر اس نے ایک کارڈ فرش پر سے اٹھالیا جو اُس کتاب میں سے گرا تھا جسے پادری پڑھ رہا تھا۔ پادری نے رتبے میں اپنے سے برتر اس شخص کی ذہنی ابتری کو پوشیدہ لاتعلقی سے دیکھا اور اس دوران میں کارڈ پر لکھی عبارت بھی پڑھ لی۔ کارڈ پر جامنی روشنائی میں صاف اور سیدھے خط میں ایک ہی فقرہ درج تھا" مادام ای ویت آج رات مر گئی"۔ تقریباً نصف صدی کے بعد آج شکروں کے ایک دھبے کو ایک بھولے ہوئے قصبے کے آسمان پر دیکھ کر پادری کو اُس اتوار کو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ریکٹر کی مغموم کیفیت یاد آ گئی جب غروبِ آفتاب کے مقابل ریکٹر کا چہرہ عنابی ہو رہا تھا اور اس کی سانس تیز ہو گئی تھی۔

یادداشت کے اس تعلق سے لرز کر پادری کو اس وقت گرمی کا نہیں بلکہ اس کے برعکس پیروں کے تلوں میں اور زیرِ ناف برف کی کاٹ محسوس ہوئی۔ وہ یہ جانے بغیر دہشت زدہ تھا کہ کس مخصوص وجہ سے دہشت زدہ ہے اور پراگندہ خیالات کے جال میں گرفتار تھا جن میں یہ تمیز کرنا ناممکن تھا کہ کون سا خیال کس خیال سے بڑھ کر کریہہ المنظر ہے، آیا ابلیس کے کیچڑ میں دھنسے ہوئے سموں کا یا آسمان سے مردہ پرندوں کی ڈھیروں ڈھیر بارش کا، اگرچہ وہ خود مقدس قربان گاہ کا فادر اینتھونی از ابیل اس موخر الذکر واقعے سے لاتعلقی محسوس کر رہا تھا۔ تب وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا، اپنا سہما ہوا ہاتھ ہوا میں اوپر اٹھایا جیسے ایسی تہنیت کا بیان شروع کرنے والا ہو جو کالی فضا میں غائب ہو چکی ہو اور حواس باختہ ہو کر چیخا: "گردش زدہ یہودی!"

عین اس وقت ریل کی سیٹی بجی۔ اتنے برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے سیٹی کی آواز سنائی نہ دی۔ اس نے گاڑھے دھوئیں میں لپٹی ریل گاڑی کو اسٹیشن میں داخل ہوتے دیکھا اور زنگ آلود جست کی چادروں پر برستے کوئلے کے ذروں کی آواز سنی۔ لیکن یہ ایک دور افتادہ اور ناقابلِ فہم خواب کی طرح تھا، جس سے وہ اس سہ پہر، چار بجے کے بعد تک بھی، پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا جب وہ اپنے ذہن میں اس متاثر کن وعظ کی نوک پلک سنوار رہا تھا جو اسے اگلے دن اتوار کو کرنا تھا۔ آٹھ گھنٹے بعد اسے ایک عورت کے لیے آخری دعائیں پڑھنے جانا پڑا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ پادری کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس سہ پہر ریل گاڑی سے کون اترا ہے۔ بہت عرصے سے وہ گاڑی کے چار بے رنگ اور بودے ڈبوں کو دیکھتا آ رہا تھا جن میں سے اسے یاد نہیں تھا کہ کوئی شخص پچھلے کئی برسوں میں ٹھہرنے کے لیے یہاں اترا ہو۔ پرانے وقتوں میں معاملہ مختلف تھا جب وہ ساری سہ پہر کیلوں سے بھری گاڑی کو گزرتے دیکھتا رہتا تھا۔ اس گاڑی کے ایک سو چالیس ڈبے ہوتے تھے اور پھلوں سے لدی وہ گاڑی لامتناہی وقت تک گزرتی رہتی تھی حتیٰ

کہ سورج ڈھلتے سے اس کا آخری ڈبا گزرتا جس میں سے ایک آدمی سبز بتی باہر لٹکائے ہوئے ہوتا تھا۔ تب کہیں اسے قصبے کا ریل کی پٹری کی دوسری طرف والا حصہ نظر آتا، جہاں اب بتیاں روشن ہو چکی ہوتیں اور اسے یوں لگتا جیسے گاڑی کو دیکھنے ہی میں وہ کسی دوسرے قصبے میں جا پہنچا ہو۔ شاید اسی وجہ سے اس نے ہر سہ پہر اسٹیشن پر موجود ہونے کی عادت ڈال لی تھی جواب بھی قائم تھی حالاں کہ بعد ازاں انھوں نے کیلے کے باغوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو گولی مار دی تھی اور باغ بھی ختم ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ ایک سو چالیس ڈبوں والی گاڑی بھی اور اسکی جگہ یہ پیلے ڈبوں والی گرد آلود گاڑی رہ گئی تھی جو کسی کو لاتی تھی نہ لے جاتی تھی۔

لیکن اس سنیچر کو بہر حال ایک شخص اس گاڑی سے آیا تھا۔ جب مقدس قربان گاہ کا پادری اینتونی از ابیل اسٹیشن سے باہر نکل رہا تھا تو ایک خاموش سے لڑکے نے جس کے چہرے پر بھوک کے آثار کے سوا کوئی خاص بات نہ تھی، گاڑی کے آخری ڈبے کی کھڑکی میں سے اُسے دیکھا تھا اور عین اسی وقت اسے یہ بھی یاد آیا تھا کہ پچھلی دوپہر سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔ اس نے سوچا اس قصبے میں اگر پادری ہے تو یقیناً کوئی کھانے پینے کی جگہ بھی ہو گی۔ اور وہ گاڑی سے اتر آیا اور سڑک پار کر کے جس پر اگست کے دہکتے سورج کی گرمی سے چھالے پڑے ہوئے تھے، اسٹیشن کے عین سامنے ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس عمارت کے اندر سائے میں کچھ ٹھنڈک تھی اور وہاں سے ایک گھسے ہوئے گرام فون ریکارڈ کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی حسِ شامہ نے جو دو روز کی بھوک سے اور بھی تیز ہو چکی تھی، اسے بتایا کہ یہ ہوٹل ہے اور وہ 'ہوٹل ماکوندہ' کے سائن بورڈ کو دیکھے بغیر اندر چلا گیا، وہ سائن بورڈ جسے پڑھنے کا اسے زندگی میں کوئی اور موقع نہیں ملنے والا تھا۔

ہوٹل کی مالکہ کو پانچ ماہ سے زیادہ کا حمل تھا۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح پیلا تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا اُس کی ماں کا تھا جب وہ اسے کے پیٹ میں تھی۔ لڑکے نے کھانے کا آرڈر دیا اور کہا ''جتنی جلدی ہو سکے!'' لیکن عورت نے جلدی دکھائے بغیر سوپ کا پیالا اس کے آگے رکھا۔ سوپ میں بغیر گوشت کی ایک ہڈی تھی اور کچے کیلے کے کٹے ہوئے چند ٹکڑے تھے۔ اسی وقت گاڑی نے سیٹی دی۔ سوپ کی گرم اور صحت مند بھاپ میں منہمک لڑکے نے ہوٹل سے اسٹیشن تک کے فاصلے کا ذہنی طور پر اندازہ لگایا اور یک دم افراتفری سے پیدا ہونے والے اس ہول کا شکار ہو گیا جس سے وہ لوگ دوچار ہوتے ہیں جن کی گاڑی چھوٹ گئی ہو۔

اس نے دوڑنے کی کوشش کی۔ وہ کرب کی حالت میں دروازے تک پہنچا، لیکن ابھی اس نے دہلیز کے باہر ایک قدم بھی نہ رکھا تھا کہ اسے احساس ہو گیا کہ وہ گاڑی نہ پکڑ سکے گا۔ جب وہ

میز پر واپس آیا تو وہ اپنی بھوک فراموش کر چکا تھا، اس نے گراموفون کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا جو اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسا دم ہلاتے ہوئے کسی کتے کے چہرے پر ہوتا ہے۔ تب سارے دن میں پہلی بار اس نے اپنے سر سے ہیٹ اُتار دیا جو اس کی ماں نے اسے دو ماہ قبل تحفے کے طور پر دیا تھا اور کھانے کے دوران وہ ہیٹ کو گھٹنوں میں دبائے بیٹھا رہا۔ جب وہ میز سے اٹھا تو گاڑی چھوٹ جانے کے باعث پریشان نظر نہ آتا تھا اور نہ اس امکان سے رنجیدہ تھا کہ اسے کالے دو روز اس قصبے میں گزارنے ہوں گے جس کا نام تک جاننے کی اُس نے کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں اپنی پیٹھ کو ایک کرسی کی سیدھی اور سخت پشت سے ٹکا کر بیٹھ گیا اور دیر تک گراموفون پر بجتے ہوئے ریکارڈوں کو سنے بغیر وہاں بیٹھا رہا حتیٰ کہ ریکارڈوں کا انتخاب کرتی ہوئی لڑکی نے اسے مخاطب کر کے کہا: ''باہر برآمدے میں گرمی کم ہے۔''

اس نے خود کو بے آرام محسوس کیا۔ اجنبیوں کے ساتھ گفتگو شروع کرنا اس کے لیے ہمیشہ سے مشکل رہا تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے وہ خوف زدہ رہتا تھا اور جب بات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا تو اسے یوں لگتا جیسے الفاظ اس طرح ادا نہیں ہو سکتے جیسے وہ چاہتا تھا۔ ''ہاں'' اس نے جواب دیا اور اسے خفیف سی کپکپی آئی۔ اس نے کرسی کو جھلانے کی کوشش کی مگر یہ بھول گیا کہ وہ جھولنے والی کرسی میں نہیں بیٹھا۔

''جو لوگ بھی یہاں آتے ہیں وہ کرسی برآمدے میں لے جاتے ہیں، اس لیے کہ وہاں ٹھنڈک ہوتی ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ اس کی بات سنتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی شدت سے گفتگو کرنے کی خواہش مند تھی۔ اُس نے لڑکی پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈال ہی لی، اس وقت جب وہ گراموفون کو چابی دے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مہینوں بلکہ شاید برسوں سے وہیں بیٹھی ہے اور وہاں سے ہلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ گراموفون کو چابی تو دے رہی تھی مگر اس کی پوری جان لڑکے ہی پر مرکوز تھی۔ پھر وہ مسکرانے لگی۔

''شکریہ'' لڑکے نے جواب دیا اور اٹھنے میں اور اپنی دوسری حرکات میں کچھ روانی اور بے ساختگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لڑکی اپنی نظریں اس پر گاڑے رہی اور بولی ''اور وہ لوگ اپنے ہیٹ کھونٹے پر لٹکا دیا کرتے ہیں۔''

اس بار اسے اپنے کان جلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ لڑکی کے تجاویز دینے کے انداز کے بارے میں سوچ کر اسے کپکپی سی آئی۔ اس نے تکلیف دہ حد تک اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کیا اور

وہ ایک بار پھر گاڑی چھوٹ جانے کے ہول کا شکار ہو گیا۔ لیکن اسی وقت مالکہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"تم کیا کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ کرسی گھسیٹ کر برآمدے میں لے جا رہا ہے، جیسے سب کرتے ہیں" لڑکی نے کہا۔ لڑکی کے لہجے سے اسے لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"کرسی گھسیٹنے کی ضرورت نہیں" مالکہ نے کہا۔ "میں تمہیں اسٹول لائے دیتی ہوں۔"

لڑکی ہنسی اور وہ مزید بدحواس ہو گیا۔ گرمی کافی تھی، خشک اور مسلسل پڑنے والی گرمی سے اس کا پسینہ بہہ رہا تھا۔ مالکہ ایک چمڑے کی نشست والا لکڑی کا اسٹول کھینچ کر برآمدے میں لے گئی۔ وہ کمرے سے باہر جانے ہی والا تھا کہ لڑکی نے دوبارہ بات کی۔

"مشکل یہ ہے کہ باہر اسے پرندے خوف زدہ کریں گے۔" وہ بولی۔

لڑکے نے مالکہ کی اس سخت نگاہ کو دیکھ لیا جو اس نے لڑکی پر ڈالی تھی۔ وہ نگاہ مختصر مگر درشت تھی۔ "تمہارے لیے منہ بند رکھنا زیادہ مناسب ہوگا" اس نے لڑکی سے کہا اور پھر لڑکے کی طرف مڑ کر مسکرائی۔ لڑکے کا اکیلے پن کا احساس کم ہو گیا اور اسے بات کرنے کی خواہش ہوئی۔

"اس نے کیا کہا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"یہ اس کا اپنا وہم ہے" مالکہ نے کہا اور جھک کر کمرے کے درمیان رکھی چھوٹی سی میز پر پڑے کاغذی پھولوں کے گلدان کو ٹھیک کرنے میں لگ گئی۔ اعصابی اضطراب سے اس کی انگلیاں اینٹھ رہی تھیں۔

"میرا وہم ہے؟ نہیں" لڑکی نے کہا۔ "پرسوں تم نے خود جھاڑو سے برآمدے میں سے دو مردہ پرندوں کو پھینکا تھا۔"

مالکہ نے زچ اور لاچار ہو کر لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی کے چہرے پر قابلِ رحم تاثر تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہر بات کو اتنی تفصیل سے بیان کرے کہ شک کی گنجائش نہ رہ جائے۔

"بھائی، ہوا یہ تھا کہ کچھ لڑکوں نے اسے ستانے کی خاطر پرسوں دو مرے ہوئے پرندے یہاں ہال میں ڈال دیے اور اس سے کہا کہ آسمان سے مردہ پرندے گر رہے ہیں۔ اسے تو جو کوئی کچھ بتائے اس پر ایمان لے آتی ہے۔"

لڑکا مسکرایا۔ واقعے کی یہ جزئیات اسے مضحکہ خیز لگیں۔ وہ ہاتھ ملتا ہوا لڑکی کو دیکھنے کے لیے مڑا جو کرب ناک حالت میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔ گراموفون چلنا بند ہو گیا تھا۔ مالکہ

دوسرے کمرے میں چلی گئی اور جب وہ وہاں سے گزر کر باہر آنے لگا تو لڑکی نے دھیمی آواز میں اصرار کیا۔

''میں نے خود انھیں گرتے دیکھا تھا۔ یقین کرو، ہر ایک نے دیکھا ہے۔''

لڑکے کو محسوس ہوا جیسے اسے لڑکی کے گراموفون کے ساتھ چمٹے ہونے اور مالکہ کی بے چارگی کی وجہ سمجھ آ گئی ہو۔ ''ہاں'' اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور ہال کی جانب بڑھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''میں نے بھی دیکھا ہے۔''

باہر بادام کے درختوں تلے گرمی کم تھی۔ اسٹول کو ٹیڑھا کر کے اس نے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائی اور سر پیچھے ڈال کر اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگا۔ کام کاج سے تھک کر وہ جھولنے والی کرسی میں بیٹھی جھاڑو کے لمبے ڈنڈے سے مرغیوں کو پرے ہٹانے میں مشغول ہو گئی اور اسے پہلی بار یہ احساس ہوا ہوگا کہ اس کا بیٹا گھر میں نہیں ہے۔

ایک ہفتہ پہلے تک اس لڑکے کو یہی گمان تھا کہ اس کی زندگی ایک سیدھے تار کی طرح ہے جو پچھلی خانہ جنگی کے زمانے کے اس بارش کے دن سے لے کر جب اس نے صبح سویرے قصباتی اسکول کی مٹی اور بھوسے سے بنی چار دیواری میں آنکھ کھولی تھی، اس کے بائیسویں جنم دن جون کی اس صبح تک سیدھا کھنچا ہوا تھا، جب اس کے میاں نے اسکے جھولنے تک آ کر اسے ہیٹ کا تحفہ اور ایک کارڈ دیا تھا جس پر لکھا تھا ''میرے پیارے بیٹے کے لیے اس کے اپنے دن پر'' کبھی کبھی وہ اپنی بے حرکت زندگی کا زنگ اُتار کر اپنے اسکول کے دنوں کو یاد کیا کرتا، کلاس کے تختۂ سیاہ کی اور اس ملک کے نقشے کی یاد جو مکھیوں کے گند سے گنجان تھا اور دیوار پر لٹکی پیالیوں کی قطار کی یاد، جس میں ہر پیالی کے نیچے ایک بچے کا نام لکھا ہوا تھا اسے ستایا کرتی۔ جس قصبے میں وہ رہتا تھا وہاں گرمی نہیں پڑتی تھی۔ وہ سرسبز، پرسکون سا قصبہ تھا جہاں خاکستری رنگ کی لمبی ٹانگوں والی مرغیاں اسکول کے اندر آ جایا کرتی تھیں اور ہاتھ منہ دھونے والے چبوترے کے نیچے بیٹھ کر انڈے دیا کرتی تھیں۔ اس کی ماں ان دنوں اداس اور کم گو عورت ہوا کرتی تھی۔ غروب آفتاب کے وقت وہ بیٹھ کر کافی کے باغوں سے نتھر کر آنے والی ہوا میں سانس لیا کرتی اور کہتی تھی کہ ''مانورے دنیا کا سب سے خوب صورت قصبہ ہے۔'' اور پھر اس کی طرف مڑ کر جو اُن دنوں اپنے جھولنے میں لیٹا روز بہ روز بڑا ہو رہا تھا، اس سے کہتی: ''بڑے ہو کر یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی'' لیکن اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں جب وہ اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا اور سست روز زندگی کی ودیعت کی ہوئی گستاخانہ اور بے دھڑک صحت سے پھٹا پڑ رہا تھا، اس وقت بھی

وہ سمجھ سے عاری تھا۔ اس کی بیسویں سالگرہ تک اس کی زندگی میں سوائے اپنے جھولنے والے بستر میں سونے کے انداز میں تبدیلی کے، کوئی اہم تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ لیکن انھی دنوں اس کی ماں کو جوڑوں کے درد کے باعث اٹھارہ سال کی نوکری کے بعد مدرسی چھوڑنی پڑی تھی، نتیجے کے طور پر اسے اور اس کی ماں کو دو کمروں اور کشادہ آنگن والے مکان میں جا کر رہنا پڑا تھا۔ وہاں وہ خاکستری رنگ کی لمبی ٹانگوں والی وہی مرغیاں پالنے لگے تھے جیسی کسی زمانے میں اسکول کے اندر گھس آیا کرتی تھیں۔

مرغیوں کی نگہداشت اس کا حقیقت کے ساتھ پہلا ربط تھا اور جولائی کے مہینے تک وہی اکلوتا ربط تھا۔ جولائی میں اسکی ماں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے متعلق سوچا تھا اور اپنے بیٹے کو اس بات کا اہل جانا تھا کہ اس بارے میں عرضی دعویٰ کرے۔ لڑکے نے نہایت موثر طریقے سے ضروری کاغذات کی تیاری میں ہاتھ بٹایا تھا، حتیٰ کہ مناسب موقع شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حلقے کے پادری کو ماں کی بپتسمے کی تاریخ چھ ماہ پیچھے کرنے پر بھی رضا مند کر لیا تھا کیوں کہ اس تبدیلی کے بغیر اس کی ماں کی عمر ابھی ریٹائرمنٹ کی نہیں بنتی تھی۔ جمعرات کو اسے آخری ہدایات ملی تھیں جن میں اس کی ماں کی مدرسی کے تجربے کی تفصیلات انتہائی احتیاط سے بتائی گئی تھیں۔ تب اس نے بارہ پیسو جیب میں ڈال کر کپڑوں کا ایک جوڑا اور کاغذات کا پلندا ساتھ لے کر شہر کی طرف سفر شروع کیا تھا۔ لفظ ریٹائرمنٹ سے اس نے بنیادی اور خاص طور پر یہ مراد لی تھی کہ حکومت اسے کچھ رقم دے گی تاکہ وہ سور پالنے کا کاروبار شروع کر سکے۔

ہوٹل کے برآمدے میں اونگھتے ہوئے شدید گرمی سے بے سدھ، اسے ابھی اپنی صورتِ حال کی سنگینی کا مکمل ادراک نہ ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگلے روز تک اس کی ساری پریشانی صرف اس حد تک تھی کہ اتوار کے روز سفر دوبارہ جاری کرنے کا انتظار کرے اور ہمیشہ کے لیے اس قصبے کو فراموش کر دے جہاں اتنی شدید گرمی پڑتی تھی۔ چار بجے سے کچھ پہلے اسے آنکس والی مگر بے آرامی کی نیند آ گئی اور وہ یہ سوچتے ہوئے سو گیا کہ اسے جھولنے والا بستر ساتھ لانا چاہیے تھا۔ اسی وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے کپڑوں کی گٹھری اور ماں کی ریٹائرمنٹ کے کاغذات گاڑی ہی میں بھول آیا ہے۔ وہ خوف کے مارے چونک کر اٹھ بیٹھا اور اپنی ماں کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک بار پھر ہول کا شکار ہو گیا۔

جس وقت وہ اسٹول کو گھسیٹ کر دوبارہ کھانے کے کمرے میں لایا، قصبے کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ اس نے کبھی بجلی کی روشنیاں نہ دیکھی تھیں اس لیے وہ ہوٹل میں غلط سلط جگہوں پر لگے

بلب دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔اسے یاد آیا کہ اس کی ماں نے بجلی کے بارے میں اسے ایک بار بتایا تھا۔ گھڑمکھیوں سے بچتے ہوئے جو گولیوں کی طرح شیشوں سے ٹکرا رہی تھیں، وہ اسٹول کو گھسیٹ کر کھانے کے کمرے کے اندر لے آیا۔اس نے کھانا کھایا، مگر اس کی بھوک مر چکی تھی۔ کچھ تو اپنی صورتِ حال سے، کچھ شدید گرمی کی وجہ سے اور کچھ اپنے اکیلے پن کی تلخی سے، جس سے وہ پہلی بار روشناس ہوا تھا، وہ تذبذب میں تھا۔ نو بجے کے بعد اسے عمارت کے عقبی حصے میں لکڑی کے بنے ایک کمرے میں لے جایا گیا جس کی دیواروں پر اخباروں اور رسالوں کے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ آدھی رات کے وقت تک وہ ایک ہیجانی اور بخار کی سی نیند میں ڈوب چکا تھا جب کہ وہاں سے پانچ بلاک پرے مقدس قربان گاہ کا پادری اینتونی از ابیل بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس شام کو ہونے والے واقعات سے اس خطبے کو جو اس نے دوسرے دن صبح سات بجے کے لیے تیار کیا تھا، خاصی تقویت ملی ہے۔ بارہ بجے سے کچھ دیر پہلے وہ پورا قصبہ پار کر کے ایک عورت کے لیے آخری دنیاوی رسوم ادا کر کے آیا تھا اور ابھی تک برانگیختہ اور مضطرب تھا، جس کے نتیجے میں رسوم ادا کرنے کی مقدس اشیا اس نے اپنے بستر کے قریب ہی چھوڑ دیں اور لیٹ کر صبح کے خطبے کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا۔ وہ کئی گھنٹے بستر میں یوں ہی اوندھا لیٹا رہا حتیٰ کہ اسے صبح کے وقت لمبی ٹانگوں والے پلوور پرندوں کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ تب اس نے بیدار ہونے کی کوشش کی اور تکلیف میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بستر سے نیچے اترتے ہوئے اس کا پاؤں مقدس گھنٹی پر پڑا اور وہ سیدھا سر کے بل اپنے کمرے کے ٹھنڈے اور سخت فرش پر جا گرا۔

ہوش میں آتے ہی اسے اپنے جسم کے بائیں حصے میں رعشے کا سا احساس ہوا جو اسے اوپر کی جانب اٹھتا ہوا لگا۔ اس لمحے میں وہ اپنے وجود کے بوجھ سے جس میں اس کے جسم، گناہوں اور عمر کا بوجھ سب شامل تھے، مکمل طور پر آگاہ تھا۔ اپنے رخساروں کے نزدیک اسے پتھریلے فرش کے جمود کا احساس ہوا۔ جب وہ اپنے خطبے تیار کیا کرتا تھا تو اسی فرش کے ٹھوس پن سے اس راستے کا واضح تعین کیا کرتا جو جہنم کی طرف جاتا تھا۔ ''خداوند'' وہ خوف سے بڑبڑایا اور سوچنے لگا، اب میں کبھی نہیں اٹھ سکوں گا۔

اسے احساس نہیں تھا کہ وہ گر کر کتنی دیر زمین پر لیٹا رہا، نہ اس دوران میں اس نے کچھ سوچا ،حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اسے نیک موت کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ بس یوں تھا جیسے وہ ایک لمحے کے لیے حقیقتاً مر گیا ہو لیکن جب اسے مکمل ہوش آیا تو اسے کسی خوف یا درد کا کوئی احساس نہ رہا تھا۔ دروازے کے نیچے سے اسے صبح کا اجالا دکھائی دیا۔ اس نے دور سے مرغوں کی

افسردہ اور بھرائی ہوئی آواز سنی اور اسے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے اور خطبے کے الفاظ اسے پوری طرح یاد ہیں۔

جب اس نے دروازے کے کواڑوں کے آگے اٹکی ہوئی لکڑی ہٹائی اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ اسے اب کہیں درد کی شکایت نہ تھی بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گرنے کی چوٹ نے اسے بڑھاپے کے بوجھ سے آزاد کر دیا ہو۔ قصبے کی تمام اچھائی، بدکرداری اور اذیت اس کے جسم میں اُس وقت داخل ہوئی جب اس نے مرغوں سے بھری نیلی نمی والی ہوا میں پہلا سانس لیا۔ تب اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا جیسے خود کو تنہائی سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہو اور صبح کے پُرسکون سائے میں برآمدے میں ایک دو تین مردہ پرندوں کو پڑے دیکھا۔

نو منٹ تک وہ ان تین پرندوں کے خیال میں مستغرق رہا اور اپنے تیار کردہ خطبے کی روشنی میں سوچتا رہا کہ ان تین پرندوں کی اکٹھی موت کفارے کی آرزومند ہے۔ پھر وہ چلتا ہوا برآمدے کے دوسرے کونے تک گیا۔ تینوں مردہ پرندوں کو یکے بعد دیگرے مٹکے کے اندر سبز اور ساکت پانی میں ڈال دیا۔ تین اور تین مل کر نصف درجن پرندے ہو گئے، وہ سوچنے لگا اور وہ بھی ایک ہفتے کے اندر اور ذہنی درخشندگی کے معجزاتی شعلے نے اسے احساس دلایا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم دن گزارنے والا ہے۔

سات بجے گرمی شروع ہو گئی۔ ہوٹل میں اکیلا کرایہ دار ناشتے کا منتظر تھا۔ گراموفون والی لڑکی ابھی بیدار ہوئی تھی۔ مالکہ اس کے قریب آئی اور اس وقت یوں لگا جیسے گھنٹے کے ساتھ بجانے کی آوازیں اس کے پھولے ہوئے پیٹ کے اندر سے آئی ہوں۔

''تو تمہاری گاڑی چھوٹ گئی۔'' اس نے تاخیر سے کیے گئے افسوس کے لہجے میں کہا۔ اس نے ناشتہ لڑکے کے سامنے رکھا۔ ناشتے میں دودھ والی کافی، تلا ہوا انڈا اور کچے کیلے کے قتلے تھے۔

لڑکے نے کھانے کی کوشش کی مگر اسے بالکل بھوک نہ تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ گرمی ابھی سے پڑنی شروع ہو گئی ہے۔ بالٹیوں کے حساب سے اس کا پسینہ بہہ رہا تھا اور دم گھٹ رہا تھا۔ وہ کپڑے پہنے پہنے رات ٹھیک سے سویا بھی نہ تھا اور اب اسے کچھ بخار سا تھا۔ اسے پھر ہول سا اٹھا اور اپنی ماں کی یاد آئی، عین اس وقت جب مالکہ نے آکر میز پر سے برتن اٹھانے شروع کیے، اس نے بڑے بڑے میز پھولوں والا نیا لباس پہن رکھا تھا اور بہت تابندہ لگ رہی تھی۔ اس کے لباس سے لڑکے کو یاد آیا کہ آج اتوار ہے۔

''کیا یہاں عبادت ہوتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ہوتی تو ہے'' مالکہ نے جواب دیا۔ ''مگر نہ ہونے کے برابر۔ کوئی عبادت کے لیے جاتا ہی نہیں۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں نیا پادری ہی نہیں بھیجا۔''

''اس والے میں کیا خرابی ہے؟''

''ایک تو وہ سو سال کا ہے اور دوسرے آدھا پاگل ہے'' عورت نے کہا۔ وہ ساکت، کچھ سوچتے ہوئے ایک ہی ہاتھ میں تمام برتن تھامے کھڑی تھی۔ پھر وہ بولی'' کچھ روز پہلے کی بات ہے اس نے منبر پر قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے ابلیس کو دیکھا ہے۔ اس دن سے لوگوں نے عبادت کے لیے جانا چھوڑ دیا ہے۔''

چناں چہ کچھ تو اپنی امید شکن صورت حال کی وجہ سے اور کچھ سوالہ آدمی کو دیکھنے کے تجسس میں وہ لڑکا گرجے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ ایک مردہ قصبہ ہے جس کی گلیاں ختم نہ ہونے والی اور گرد آلود ہیں اور جس کے لکڑی کے بنے، جست کی چھتوں والے اندھیرے گھر غیر آباد لگتے ہیں۔ اتوار کے دن قصبے کی یہ حالت تھی کہ گھاس سے خالی گلیاں، بغیر جالیوں کے گھر، نیچے تمتمائی ہوئی گرمی اور اوپر شان دار آسمان۔ اس نے سوچا کہ یہاں کوئی ایسی علامت نہیں ہے جس سے اتوار اور کسی دوسرے دن کا فرق معلوم ہو سکے۔ ویران گلیوں میں چلتے ہوئے اسے اپنی ماں کی بات یاد آئی'' سارے قصبوں میں ساری گلیاں لازماً یا تو گرجے کو جاتی ہیں یا قبرستان کو'' پتھر کی اینٹوں کے بنے چھوٹے سے چوک میں داخل ہوا جس میں ایک سفیدی کی ہوئی عمارت تھی جس کا ایک مینار تھا اور اوپر ایک مرغ بادنما بنا ہوا تھا اور ایک گھڑیال تھا جس کی سوئیاں چار بج کر دس منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔

چوک کو عبور کرنے میں جلدی کیے بغیر وہ گرجے کی ڈیوڑھی کی تین سیڑھیاں چڑھا اور اسے پرانے پسینے اور لوبان کی ملی جلی بو آئی۔ وہ تقریباً خالی گرجے کے اندر کے نیم گرم سائے میں داخل ہو گیا۔

مقدس قربان گہ کا پادری اینتونی از ابیل بھی منبر پر کھڑا ہی ہوا تھا۔ وہ اپنا وعظ شروع کرنے والا تھا جب اس نے ایک لڑکے کو ہیٹ پہنے گرجے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکے نے اپنی بڑی بڑی شفاف اور پُرسکون آنکھوں سے خالی گرجے کا بغور جائزہ لیا۔ پھر اس نے اسے آخری بنچ پر بیٹھتے دیکھا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ لڑکا قصبے میں نیا نیا آیا ہے۔ وہ پچھلے تیس برس سے اس قصبے میں رہ رہا تھا اور وہاں کے ہر باسی کو اس کی بو سے پہچان سکتا تھا۔ اس لیے

اسے یقین تھا کہ یہ لڑکا جو ابھی گرجے میں داخل ہوا ہے، قصبے میں اجنبی ہے۔ ایک ہی مختصر اور گہری نظر میں اس نے جان لیا کہ وہ خاموش طبع اور اداس سا ہے اور اس کے کپڑے گندے اور شکن آلود ہیں جیسے وہ انھیں پہنے پہنے دیر تک سوتا رہا ہو۔ یہ بات سوچتے ہوئے اس لڑکے سے گھن بھی آئی اور اس پر ترس بھی آیا۔ ساتھ ہی اسے بنچ پر بیٹھے دیکھ کر اس کا دل تشکر سے بھی بھر گیا اور وہ اپنا وہ خطبہ دینے کے لیے تیار ہوا جو اس کی زندگی کا سب سے اہم خطبہ تھا۔ خداوندا، اس نے اس دوران میں سوچا، لڑکے کو اپنا ہیٹ اتارنا یاد رہ جائے اور یہ نہ ہو کہ مجھے اسے گرجے سے بے دخل کرنا پڑے اور اس نے اپنا خطبہ شروع کر دیا۔

شروع میں یہ جانے بغیر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے وہ بولتا چلا گیا۔ وہ اپنی بات خود نہیں سن رہا تھا۔ وہ ہموار، بہتا ہوا اصاف نغمہ جو دنیا کے آغاز سے اس کی روح کی گہرائی میں رواں تھا، اس نے مشکل ہی سے سنا۔ اسے مبہم سا احساس ضرور تھا کہ وہ لفظ جو اس کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے ہیں، صحیح، مناسب اور برمحل ہیں اور متوقع ترتیب میں ہیں۔ اسے یوں لگا جیسے نیم گرم بخارات اسے اندر سے دبا رہے ہوں، لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی روح نمود و نمائش کے جذبے سے پاک ہے اور یہ کہ خوشی کا احساس جو اسے مفلوج کیے دے رہا ہے اُس کا تکبر، سرکشی یا خودنمائی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اس کی روح کی خداوند خدا سے محض شادمانی کا اظہار ہے۔

اپنے سونے کے کمرے میں ربیکا، یہ جانتے ہوئے کہ چند ہی لمحوں میں گرمی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی، بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ اگر اسے نئی جگہوں سے گہرے خوف کی بنا پر اس قصبے میں گڑے ہوئے ہونے کا احساس نہ ہوتا تو اپنے پردادا کی طرح جس کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا، کب کی ایک صندوق میں اپنا مال اسباب بند کر کے اور صندوق میں فینائل کی گولیاں ڈال کر وہاں سے سدھار گئی ہوتی۔ لیکن اسے علم تھا کہ اسے موت یہیں آنی ہے۔ لمبی غلام گردشوں اور نوخواب گاہوں والے اسی گھر میں جس کی جالیوں کی جگہ، گرمی کا موسم ختم ہونے پر، اس کا خیال تھا کہ نیم شفاف شیشے لگوا لے گی۔ لہٰذا اس کا وہیں رہنے کا ارادہ تھا (اور یہ ارادہ، وہ جب بھی الماری میں اپنے کپڑے قرینے سے رکھتی، ہمیشہ دوہرایا کرتی تھی) اور اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اپنے "عالی مرتبت عم زاد" کو بھی لکھے گی کہ اس قصبے کے لیے کوئی جوان پادری بھیجا جائے تا کہ وہ ایک بار پھر اپنا مخمل کے پھولوں والا ہیٹ پہن کر گرجے میں جا سکے اور باربط عبادت کر سکے اور معقول اور اصلاحی وعظ سن سکے۔ کل سوموار ہے، اس نے سوچا اور بشپ کو نوشتہ لکھنے کے لیے مناسب القاب کی تلاش شروع کر دی (وہ القاب جنھیں کرنل بوئندیا نے بیہودہ اور گستاخانہ کہا

تھا) عین اس وقت آرخے نیدا نے جالی کا دروازہ کھولا اور چیخ کر کہا: سینورا، لوگ کہہ رہے ہیں کہ فادر منبر پر کھڑے کھڑے پاگل ہو گیا ہے!''

بیوہ نے اپنا تلخ اور غیر معمولی طور پر پژمردہ چہرہ دروازے کی جانب پھیرا۔ ''وہ تو پچھلے پانچ سال سے پاگل ہے'' اس نے کہا۔ وہ کپڑے ترتیب سے رکھنے میں مصروف رہی اور پھر بولی ''اس نے ایک بار پھر ابلیس کو دیکھ لیا ہوگا۔''

''اس بار ابلیس نہیں ہے، سینورا'' آرخے نیدا نے کہا۔

''تو کون ہے؟'' ریکا نے سنجیدگی اور لاتعلقی سے پوچھا۔

''اس بار وہ کہتا ہے کہ اس نے گردش زدہ یہودی کو دیکھا ہے۔''

بیوہ کو اپنی جلد پر کیڑے مکوڑے رینگتے محسوس ہوئے۔ اس کے ذہن میں الجھے ہوئے خیالات کا انبوہ، جس میں پھٹی ہوئی جالیوں، گرمی، مردہ پرندوں اور طاعون کے درمیان تمیز کرنا مشکل تھا'' گردش زدہ یہودی!'' کے الفاظ سن کر اس کے ذہن سے گزرا، جو اسے اپنے دور دراز بچپن کی کسی دوپہر میں سننے کے بعد سے یاد بھی نہ رہے تھے۔ تب اس نے برہم ہو کر اور سرد مہری سے اُس جانب قدم بڑھائے جدھر آرخے نیدا اپنا منہ پھاڑے کھڑی تھی۔

''ہاں، یہ سچ ہے'' اس نے کہا اور اس کی آواز وجود کی گہرائی میں سے برآمد ہوئی۔ ''مجھے اب پتا چلا کہ پرندے کیوں مر رہے ہیں۔''

دہشت کے مارے اس نے اپنے آپ کو کڑھائی والی چادر میں لپیٹا اور وہ چشم زدن میں طویل برآمدہ اور چیزوں سے بھرا نشست کا کمرہ پار کر کے گلی کا دروازہ کھول کر اور دو بلاک کا راستہ طے کر کے گرجے میں داخل ہو گئی، جہاں مقدس قربان گاہ کا پادری اینتونی از ابیل اپنی نئی ہیئت میں بیان دے رہا تھا:

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے دیکھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج صبح جب میں حوناس بڑھئی کی بیوی کی آخری رسوم ادا کر کے واپس آ رہا تھا تو اس نے میرا راستا کاٹا، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسکا چہرہ یسوع مسیح کی بد دعا سے تیرہ ہو چکا تھا اور وہ جس جس راستے سے گزر رہا تھا وہاں اپنے پیچھے جلتے ہوئے انگارے چھوڑ جاتا رہا تھا۔''

خطبے کے الفاظ ہوا میں تیرتے تیرتے رُک گئے۔ پادری کو احساس ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں کے رعشے پر قابو پانے سے قاصر ہے، اس کا سارا جسم کپکپا رہا ہے اور پسینے کا ایک ٹھنڈا قطرہ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر لکیر سی بناتا ہوا نیچے سفر کر رہا ہے۔ رعشے اور پیاس اور انتڑیوں میں شدید مروڑ

کے باعث اور ایک آواز سن کر جو آرگن پر کھرج کے سُر جیسی تھی، اسے لگا جیسے وہ سخت علیل ہو۔ لیکن اس وقت اصل حقیقت اس پر آشکار ہوئی۔

اس نے دیکھا کہ گرجا گھروں سے بھر چکا ہے اور ربیکا، دکھاوے اور بناوٹ کی شوقین وہی حسرت ناک عورت، بازو کھولے اور اپنا درشت اور سرد چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے نافِ کلیسا میں چلی آ رہی ہے۔ پریشانی کے عالم میں اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے سامنے کیا ہو رہا ہے اور اسے اب اتنی سمجھ بھی تھی کہ اس واقعے کو معجزہ سمجھنا خود پسندی کی بات ہو گی۔ انکسار کے ساتھ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ منبر کے چوبی کنارے پر رکھ دیے اور خطبہ دوبارہ جاری کیا۔

''تب وہ میری طرف بڑھا'' اس نے کہا۔ اس بار اسے اپنی جذبے سے بھرپور اور یقین دلانے والی آواز سنائی دی۔ ''وہ میری طرف بڑھا اور اس کی آنکھیں زمرد کی طرح تھیں، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اسکے پاس سے ایسی بو آ رہی تھی جیسی بھیڑ بکریوں کے پاس سے آیا کرتی ہے۔ تب میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے یسوع مسیح کے نام پر ملامت کی اور کہا ''رک جاؤ، اتوار کا دن قربانی کے لیے مناسب نہیں ہوتا''۔

جب وہ خطبے سے فارغ ہوا گرمی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اگست کے مہینے کی شدید، جامد، سوخت کرنے والی ناقابلِ فراموش گرمی، لیکن پادری اینتونی از ابیل کو اب گرمی کا احساس نہیں تھا۔ اسے علم تھا کہ اس کی پشت پر پورا قصبہ اس کے خطبے کے اثر سے ایک بار پھر منکسر اور بے زبان بن چکا ہے، مگر یہ بات اس کے لیے باعث انبساط نہ تھی۔ نہ ہی اسے اس امکان سے خوشی ہوئی تھی کہ شراب کا ایک گلاس اس کے گلے کی غارت گری کا علاج کر دے گا۔ وہ بے آرام اور مضطرب تھا۔ اس کا دماغ اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا اور وہ قربانی کے پُرعظمت لمحے پر دھیان نہ دے پا رہا تھا۔ یہ قصہ اس کے ساتھ عرصے سے ہو رہا تھا، لیکن آج اس کے ذہن کی ابتری مختلف تھی کیوں کہ آج اس کا ہر احساس واضح بے چینی کا شکار تھا۔ تب زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تکبر کا تجربہ ہوا اور عین اسی طرح جیسے اس نے تکبر کو جانا تھا اور اپنے وعظوں میں بیان کیا تھا، اسے احساس ہوا کہ تکبر بھی پیاس کی طرح جسم کی ایک ضرورت ہے۔ اس نے تبرکات رکھنے کے صندوق کا ڈھکنا زور سے بند کیا اور پکارا: ''فیتا غوث''!

مددگار ملازم، مُنڈے ہوئے چمکدار سر والا ایک لڑکا، جو کہ پادری اینتونی از ابیل کا لے پالک تھا اور جس کا اُس نے خود یہ نام رکھا تھا۔ قربان گاہ کی جانب بڑھا۔

''لوگوں سے نذر کے پیسے اکٹھے کرو'' پادری نے کہا۔

لڑکے نے آنکھیں جھپکائیں اور ایڑیوں پر پورا گھوم گیا اور پھر بے حد دھیمی آواز میں بولا'' مجھے پتا نہیں کہ نذر والی تھالی کدھر ہے۔''

یہ ٹھیک بھی تھا۔ مہینوں ہو گئے تھے کہ کسی نے کبھی نذر اکٹھی نہ کی تھی۔

''تو مخزن میں سے ایک تھیلا لے آؤ اور جتنی رقم اکٹھی کر سکتے ہو کرو'' پادری نے کہا۔

''اور لوگوں سے کہنا کیا ہے؟'' لڑکے نے پوچھا۔

اب پادری کی آنکھیں جھپکانے کی باری تھی۔ وہ غور سے لڑکے کی منڈی ہوئی نیلی کھوپڑی اور اس کے سر کی ہڈیوں کے جوڑوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

''لوگوں سے کہو کہ یہ رقم گردش زدہ یہودی کو خارج کرنے کے لیے ہے۔'' یہ کہتے وقت اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے دل میں بہت بڑے بوجھ کو سنبھال رہا ہو۔ چند لمحے تک اس نے خاموش معبد میں موم بتیوں کے جل کر پانی بننے کی اور اپنی برانگیختہ اور دشوار سانس کی آمد و رفت کی آواز سنی۔ پھر مددگار ملازم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جو اسے اپنی گول پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جا رہا تھا، پادری نے اس سے کہا:

''اور پھر ساری رقم اکٹھی کر کے جا کر اس لڑکے کو دے دینا جو خطبے کے شروع میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اسے کہنا کہ یہ پادری کی طرف سے ہے اور یہ کہ وہ اپنے لیے نیا ہیٹ خرید لے۔''



(مشمولہ: ''ذہن جدید''، دہلی، جلد ۱۵، شمارہ ۴۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۵ء)

کاغذی گلاب

ترجمہ: فاروق حسن

صبح سویرے کی اُداسی میں اپنا راستہ تلاش کرتے ہوئے مینا نے بغیر آستینوں والا وہ لباس پہن لیا جو ایک رات پہلے اس نے مسہری کے پاس ٹانگ رکھا تھا اور بڑے صندوق کے اندر اس کی الگ ہو جانے والی آستینیں ڈھونڈنے لگی۔ پھر اس نے انھیں دیوار پر لگی کیلوں پر تلاش کیا، دروازوں کے پیچھے ڈھونڈا، اس احتیاط کے ساتھ کہ شور نہ مچے تا کہ اس کی اندھی نانی نہ جاگ اُٹھیں جو اس کمرے میں سو رہی تھیں۔ مگر جب وہ اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تو اس نے دیکھا کہ نانی تو پہلے ہی سے اُٹھی ہوئی ہیں اور باورچی خانے میں چلی آئی کہ ان سے آستینوں کے بارے میں دریافت کرے۔

"غسل خانے میں ہیں۔" نابینا عورت نے کہا۔ "میں نے کل انھیں دھو ڈالا تھا۔"

وہیں تھیں وہ، ایک تار پر لکڑی کی دو چٹکیوں سے ٹنگی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی تک گیلی تھیں۔ مینا واپس باورچی خانے میں گئی اور آستینوں کو آتش دان کے پتھروں پر پھیلا دیا۔ اس کے سامنے نابینا عورت بیٹھی کافی پھینٹ رہی تھی، اس کی مردہ پتلیاں برآمدے کی پتھریلی حد پر جمی ہوئی تھیں، جہاں گملوں کی ایک قطار میں جڑی بوٹیاں اُگ رہی تھیں۔

"آئندہ سے میری چیزیں مت لینا" مینا نے کہا۔ "آج کل دھوپ کا کوئی بھروسا نہیں۔"

نابینا عورت نے اپنا چہرہ آواز کی رخ پر کر لیا۔

"میں بھول گئی تھی کہ آج پہلا جمعہ ہے۔"

لمبا سانس بھر کے یہ دیکھنے کے بعد کہ کافی تیار ہے یا نہیں، اس نے برتن آگ پر سے اُتار

دیا۔

"کاغذ کا ٹکڑا نیچے رکھ لو، کیوں کہ یہ پتھر مَیلے ہیں" مینا نے اپنی انگشتِ شہادت آتش دان کے پتھروں پر پھیر کر دیکھی۔ وہ مَیلے تھے مگر ان پر جمی ہوئی راکھ کی تہ سخت پڑ چکی تھی جو آستینوں کو اس وقت تک مَیلا نہ کرتی جب تک انھیں پتھروں پر رگڑا نہ جاتا۔

"اگر یہ مَیلی ہو گئیں تو تم ذمے دار ہو گی۔" اس نے کہا۔

نابینا عورت نے اپنے لیے ایک پیالی کافی انڈیل لی۔ "تم غصے میں ہو" اس نے برآمدے کی طرف کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "غصے کی حالت میں عشائے ربانی حاصل کرنا بے حرمتی ہے۔" وہ صحن میں گلابوں کے سامنے کافی پینے بیٹھ گئی۔ جب گرجا کی رسمِ عبادت کے لیے تیسری گھنٹی بجی تو مینا نے آتش دان پر سے آستینیں اٹھائیں جو اب تک گیلی تھیں، مگر اس نے پہن لیں۔ فادر انجل اُسے برہنہ شانوں کے ساتھ عشائے ربانی وصول کرنے نہیں دیں گے۔ اس نے منہ نہیں دھویا۔ اس نے چہرے پر سرخی کے آثار تولیے سے مٹائے، دعاؤں کی کتاب اور شال اٹھائی اور سڑک پر نکل آئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ واپس آ گئی۔

"تم وہاں کتابِ مقدس کی تلاوت کے بعد ہی پہنچ پاؤ گی" نابینا عورت نے صحن میں گلابوں کے سامنے بیٹھے بیٹھے کہا۔

مینا سیدھی بیت الخلا میں گھس گئی۔ "میں عبادت میں نہیں جا سکتی" اس نے کہا۔ "میری آستینیں گیلی ہیں اور سارے لباس پر سلوٹیں ہیں۔" اسے احساس ہوا جیسے سب کچھ جاننے والی نگاہیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔

"پہلا جمعہ ہے اور تم عبادت کے لیے نہیں جا رہی ہو" نابینا عورت پکار اٹھی۔ بیت الخلا سے واپس آ کر مینا نے اپنے لیے پیالی میں کافی انڈیلی اور تازہ سفیدی کیے ہوئے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، نابینا عورت کے پاس۔ مگر وہ کافی نہ پی سکی۔

"سارا قصور تمہارا ہے" وہ دبے دبے کینہ سوز لہجے میں بولی۔ اس احساس کے ساتھ کہ وہ اپنے آنسوؤں میں ڈوبی جا رہی ہے۔ "تم رو رہی ہو" نابینا عورت نے پکار کر کہا۔

اس نے پانی ڈالنے کا فوارہ اور ریگانو کے گملے کے پاس رکھ دیا اور یہ دُہراتے ہوئے کہ "تم رو رہی ہو" برآمدے میں چلی آئی۔ مینا نے اپنی پیالی زمین پر ٹکا دی اور تن کر بیٹھ گئی۔

"میں غصے کے مارے رو رہی ہوں۔" اس نے کہا اور نانی کے پاس آتے ہوئے بولی "تمہیں گرجے میں جا کر اعتراف کرنا پڑے گا کہ تمہاری وجہ سے مجھے پہلے جمعے کا عشائے ربانی

چھوڑنا پڑا۔"

نابینا عورت ساکت بیٹھی رہی، اس انتظار میں کہ مینا خواب گاہ کا دروازہ بند کر دے۔ پھر وہ برآمدے کے سرے تک چلتی ہوئی گئی۔ وہ رُک رُک کر جھکی، یہاں تک کہ اسے زمین پر رکھی ہوئی پیالی مل گئی، جسے چھوا بھی نہ گیا تھا۔ پیالی کی کافی گملے میں انڈیلتے ہوئے وہ کہتی رہی: "خدا جانتا ہے میرا ضمیر صاف ہے۔"

مینا کی ماں خواب گاہ سے نکل آئی۔

"تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کسی سے بھی نہیں" نابینا عورت نے کہا۔ "میں تمھیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔"

اپنے کمرے میں محفوظ ہو کر مینا نے اپنی چولی کے بند کھولے اور تین چھوٹی چابیاں نکالیں جو وہ سیفٹی پن میں لگائے رکھتی تھی۔ ان میں سے ایک چابی سے اس نے سنگار میز کی نچلی دراز کھولی اور لکڑی کی چھوٹی سی صندوقچی نکالی۔ صندوقچی کو دوسری چابی سے کھولا۔ اس کے اندر رنگ دار کاغذ پر لکھے گئے خطوں کا ایک پُلندہ تھا جس پر ربر بینڈ چڑھا ہوا تھا۔

اس نے انھیں اپنی چولی میں چھپا لیا۔ صندوقچی جگہ پر رکھی اور دراز میں تالا لگا دیا۔ پھر وہ بیت الخلا گئی اور خط پھینک دیے۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم گرجے گئی ہو۔" جب مینا باورچی خانے میں آئی تو اس کی ماں نے کہا: "یہ جا نہیں سکی" نابینا عورت بیچ میں بول اٹھی۔ "میں بھول گئی کہ آج پہلا جمعہ ہے اور میں نے کل دوپہر اس کی آستینیں دھو ڈالیں۔"

"اب تک گیلی ہیں" مینا بڑبڑائی۔

"آج کل مجھے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے" نابینا عورت نے کہا۔

"مجھے ایسٹر کے لیے پچاس اوپر سو درجن گلاب تیار کر کے دینے ہیں" مینا نے کہا۔

دھوپ جلدی تیز ہو گئی۔ سات بجے سے پہلے مینا نے بڑے کمرے میں کاغذی گلابوں کی دکان سجالی۔ ایک ٹوکری بھر کر پنکھڑیاں اور تار ایک ڈبا کریپ کے کاغذ، دو قینچیاں دھاگے کی ایک پھی اور لئی کا برتن۔ ایک لمحے بعد ٹرینیداد بغل میں دفتی کا ڈبہ دبائے آ گئی اور اس سے پوچھنے لگی کی وہ عبادت کے وقت کیوں نہیں آئی۔

"میرے پاس آستینیں نہیں تھیں" مینا نے کہا۔

''کوئی بھی تمہیں اُدھار دے دیتا'' ترینیداد بولی۔

اس نے کرسی کھینچ لی اور پنکھڑیوں کی ٹوکری کے پاس بیٹھ گئی۔

''بہت دیر ہو چکی تھی'' مینا کہنے لگی،

اس نے ایک گلاب مکمل کیا۔ پھر ٹوکری اپنے پاس کر لی کہ پنکھڑیوں میں قینچی سے چنٹ ڈال سکے۔ ترینیداد نے دفتی کا ڈبہ زمین پر رکھ دیا اور کام میں شامل ہو گئی۔ مینا نے ڈبے کی طرف دیکھا۔

''تم نے جوتے خرید لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ مرے ہوئے چوہے ہیں'' ترینیداد نے کہا۔

چوں کہ ترینیداد پنکھڑیوں میں چنٹ ڈالنے کی ماہر تھی، مینا تار کو بل دے کر پھولوں کی ڈنڈیاں بنانے اور ان پر سبز کپڑا چڑھانے کا کام پورا کرتی۔ دونوں خاموشی سے کام کرتی رہیں، اس بات پر توجہ دیے بغیر کہ دھوپ، چھپے ہوئے مناظر اور خاندانی تصاویر سے سجے ہوئے کمرے کے اندر بڑھتی آ رہی ہے۔ ڈنڈیاں ختم کر کے مینا نے اپنا چہرہ جو کسی غیر مادی شے سے مکمل ہوتا ہو لگ رہا تھا، ترینیداد کی طرف کر لیا۔ ترینیداد ٹانگیں جوڑے بیٹھی تھی اور پنکھڑی کا کنارہ انگلیوں کے درمیان ذرا ذرا سرکاتے ہوئے بہت صفائی کے ساتھ چنٹ ڈال رہی تھی۔ مینا اس کے مردانہ جوتے کی طرف دیکھنے لگی۔ ترینیداد سر اٹھائے بغیر اپنے پیر ذرا سا پیچھے کیے ہوئے اور کام روکے بغیر اس سے نظر چرا گئی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

مینا اس کی طرف جھکی۔

''وہ چلا گیا'' اس نے کہا۔

ترینیداد کی قینچی چھوٹ کر اس کی گود میں گر پڑی۔

''نہیں!''

''وہ چلا گیا'' مینا نے دوہرایا۔

ترینیداد ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آپس میں ملی ہوئی بھنوؤں کو ایک سیدھی لکیر تقسیم کر رہی تھی۔

''اور اب؟'' اس نے پوچھا۔

مینا نے مضبوط لہجے میں جواب دیا: ''اب کچھ نہیں۔'' ترینیداد نے دس بجے سے پہلے

الوداع کہہ دیا۔

اس قربت کے بوجھ سے آزاد ہو کر مینا نے ایک لمحے کے لیے کام روکنے کے بعد مردہ چوہے بیت الخلا میں پھینک دیے۔ نابینا عورت گلاب کی جھاڑی کی چھٹائی کر رہی تھی۔

''میں شرط لگاتی ہوں کہ تم کو یہ نہیں معلوم کہ میرے پاس اس ڈبے میں کیا ہے'' مینا نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ وہ چوہوں کو ہلانے لگی۔

نابینا عورت متوجہ ہو گئی'' پھر سے ہلاؤ'' اس نے کہا۔ مینا نے وہی عمل دوہرایا مگر نابینا عورت کان کی لو انگشتِ شہادت سے دبا کر تیسری دفعہ سننے کے بعد بھی ڈبے میں موجود اشیا کو نہیں پہچان سکی۔

''چوہے ہیں، جو گزشتہ رات گرجا کے چوہے دانوں میں پکڑے گئے'' مینا نے کہا۔

جب وہ واپس آئی تو نابینا عورت کے پاس سے کچھ کہے بغیر گزر گئی، مگر وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ جب وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو مینا بند کھڑکی کے پاس اکیلی بیٹھی کاغذی گلاب مکمل کر رہی تھی۔

''مینا'' نابینا عورت نے کہا۔'' اگر تم خوش رہنا چاہتی ہو تو اجنبیوں کے سامنے اعتراف مت کیا کرو۔'' مینا نے کچھ کہے بغیر اس کی طرف دیکھا۔ نابینا عورت اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور اس کے کام میں مدد دینے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر مینا نے اسے روک دیا۔

''تم گھبرا رہی ہو'' نابینا عورت نے کہا۔

''تم عبادت کے لیے کیوں نہیں گئیں؟'' نابینا عورت نے پوچھا۔

''تم اس کی وجہ خوب اچھی طرح جانتی ہو۔''

''اگر صرف آستینوں کی وجہ ہوتی تو تم گھر سے باہر ہی نہ نکلتیں۔'' نابینا عورت نے کہا۔'' راستے میں کوئی تمہارا منتظر تھا جس نے تمہیں مایوس کیا۔''

مینا نے اپنے ہاتھ نانی کی آنکھوں کے سامنے یوں ہلائے جیسے کسی نادیدہ شیشے کو صاف کر رہی ہو۔

''تم چڑیل ہو'' اس نے کہا۔

''تم آج صبح دو مرتبہ بیت الخلا گئیں'' نابینا عورت نے کہا۔'' تم ایک دفعہ سے زیادہ کبھی نہیں جاتیں۔''

مینا کاغذی گلاب بناتی رہی۔

''تم مجھے دکھانے کی ہمت کروگی کہ تم نے سنگھار میز کی دراز میں کیا چھپا رکھا ہے؟'' نابینا عورت نے پوچھا۔

بہت آہستگی سے مینا نے گلاب کھڑکی میں دھرا، چولی میں ہاتھ ڈال کر تینوں چھوٹی چابیاں نکالیں اور نابینا عورت کے ہاتھ پر رکھ دیں اور اپنے ہاتھوں سے اس کی مٹھی بند کر دی۔

''جاؤ خود اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ لو'' اس نے کہا۔

''نابینا عورت اپنی انگلیوں سے ٹٹول کر چابیوں کا معائنہ کرتی رہی۔'' ''میری آنکھیں بیت الخلا کی نالی کے اندر نہیں دیکھ سکتیں۔''

مینا نے سر اٹھایا اور اسے ایک نیا احساس ہوا، اسے یوں لگا جیسے نابینا عورت کو معلوم ہے کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔

''اپنے آپ کو نالی میں گرا کر دیکھ لو، اگر تمہیں اتنی ہی دل چسپی ہے کہ میں کیا کرتی ہوں۔''

نابینا عورت نے اس گستاخی کو نظر انداز کر دیا۔

''تم بستر میں لیٹے لیٹے صبح تک جاگ کر لکھتی رہتی ہو'' اس نے کہا۔

''تم خود بتی بجھاتی ہو'' مینا نے کہا۔

''اور تم فوراً ٹارچ جلا لیتی ہو'' نابینا عورت نے کہا۔ ''میں تمہارے سانسوں کی آواز سے پہچان سکتی ہوں کہ اس وقت تم لکھ رہی ہو۔''

مینا نے کوشش کی کہ پُر سکون رہے۔ ''بہت اچھا'' اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ''فرض کرو ایسا ہی ہے تو پھر؟ کیا خاص بات ہے اس میں؟''

''کچھ نہیں'' نابینا عوت نے جواب دیا۔ ''صرف یہ کہ اس وجہ سے تم نے پہلے جمعے کی عشائے ربانی چھوڑ دی۔''

دونوں ہاتھوں سے مینا نے دھاگے کی گچھی، قینچیوں اور اَدھ بنے گلابوں اور ڈنڈیوں کو سمیٹ لیا۔ اس نے یہ سب چیزیں ٹوکری میں ڈال دیں اور اپنا رخ نابینا عورت کی طرف کر لیا۔ ''تم سننا چاہتی ہو کہ میں نے بیت الخلا میں کیا کیا؟'' اس نے پوچھا۔ دونوں بے چینی سے سانس روکے رہیں جب تک کہ مینا نے اپنے پوچھے ہوئے سوال کا جواب نہیں دے دیا: ''میں پاخانہ کرنے گئی تھی۔''

نابینا عورت نے تینوں چھوٹی چابیاں ٹوکری میں پھینک دیں۔ ''اچھا بہانہ ہے'' باورچی

خانے میں جاتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ ''مجھے تمہاری بات کا اعتبار آ جاتا اگر تم نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسا لفظ منہ سے نہ نکالا ہوتا۔'' مینا کی ماں برآمدے میں مخالف سمت سے آ رہی تھی، اس کے بازو کانٹے دار پھول کے گچھوں سے بھرے ہوئے تھے۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں پاگل ہوں'' نابینا عورت بولی۔ ''مگر ظاہر بات ہے تمہیں تو مجھ کو پاگل خانے بھجوانے کا خیال اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک میں پتھر نہ مارنے لگوں۔''



(مشمولہ: ''ذہن جدید''، دہلی، جلد ۱۵، شمارہ نمبر ۴۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۵ء)

بڑی ماما کا جنازہ

ترجمہ: فاروق حسن

تو لیجیے حضرات، یہ رہی کُل عالم کے منکرین کے لیے، ماکوندو کی سلطنت کی مطلق العنان فرماں روا، بڑی ماما کی سچی داستان، جو بانوے برس بقید حیات رہی اور گزشتہ ستمبر کے ایک منگل کے روز، تحریم کی خوشبو میں لپٹی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئی اور جس کے جنازے میں پاپائے اعظم نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی۔

ناظرین، اب جب کہ اس سانحے سے بدحواس قوم کا ذہنی توازن بحال ہو چکا ہے، اب جب کہ سان باسنتو کے بین بجانے والے، گواہیرا کے اسمگلر، سینو کے چاولوں کے کاشتکار، گواکامایال کی طوائفیں، سیئر پے کے جادوگر اور اراکاتا کا کے کیلے کے باغوں کے مزدور، طویل اور نڈھال کر دینے والے ماتم سے فارغ ہو کر اپنے خیمے سمیٹ چکے ہیں اور ان کی استقامت لوٹ آئی ہے، اب جب کہ جمہوریہ کے صدر، ان کے کابینہ کے ارکان اور سرکاری اور غیر مرئی طاقتوں کے تمام نمائندے جو تاریخ کے ابواب میں رقم کیے جانے والے اس عالی شان جنازے میں شریک تھے، اپنی اپنی جاگیروں پر اپنا تسلط دوبارہ قائم کر چکے ہیں، اب جب کہ تقدس مآب پاپائے اعظم اپنی روح اور جسم سمیت عرشِ بریں کی سمت سفر کر گئے ہیں اور جسم سمیت عرشِ بریں کی سمت سفر کر گئے ہیں اور اب جب کہ ماکوندو خالی بوتلوں اور ڈبوں، بجھے ہوئے سگریٹوں، چبائی ہوئی ہڈیوں، چیتھڑوں اور غلاظت کے انباروں سے جو جنازے میں شریک جمِ غفیر اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے، اَٹ گیا ہے، حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں چلنا پھرنا محال ہو چکا ہے، اب موقع آن پہنچا ہے کہ آدمی صدر دروازے کے آگے اسٹول ٹکا کر بیٹھے اور شروع سے لے کر اس قومی افراتفری کی

داستان کو پیشتر اس کے کہ یہ تاریخ نویسوں کے ہتھے چڑھ جائے، پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دے۔

چودہ ہفتے قبل بڑی ماما نے جو کہ ان گنت راتوں سے پلٹسوں، سرسوں کے پلاسٹروں اور جونکوں کا ہدف بنی رہی تھی، اور جو نزع کے عالم میں ہذیان کا شکار ہو چکی تھی، حکم دیا تھا کہ اسے اس کی بید کی جھولنے والی کرسی میں بٹھا دیا جائے تا کہ وہ اپنا وصیتی فرمان جاری کر سکے۔ یہی واحد کام ایسا تھا جو وہ مرنے سے قبل ادا کرنا ضروری سمجھتی تھی۔ اس صبح اس نے پادری انتونی ازابیل کی اعانت سے اپنے روحانی معاملات کو سلجھا لیا تھا اور اب اپنے نو بھتیجے بھتیجیوں کی موجودگی میں وہ جگہ اسکی سلطنت کے بلاشرکتِ غیرے وارث تھے اور اس کے بستر کے گرد جمع تھے، اپنے دنیاوی معاملات سے فراغت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پادری جس کی سوویں سالگرہ نزدیک تھی اور جو اپنے آپ سے گفتگو کرتے رہنے کا عادی تھا، اسی کمرے میں مقیم تھا۔ دس آدمی اسے بڑی ماما کی خوابگاہ میں لے کر آئے تھے اور یہی مناسب سمجھا گیا تھا کہ وہ وہیں قیام کرے تا کہ ان آدمیوں کو اسے نیچے لے جانے اور پھر بڑی ماما کے آخری لمحات میں دوبارہ اوپر لانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

بڑی ماما کا سب سے بڑا بھتیجا نکانور، دیوہیکل اور وحشی آدمی، خاکی کپڑوں میں ملبوس مہمیز لگے جوتے پہنے اور ۱۹۳۸ء قطر کا ریوالور قمیض کے اندر لٹکائے، وکیل کی تلاش میں نکل گیا۔ عظیم الشان دو منزلہ حویلی، جس میں اجوائن اور گڑ کے شیرے کی خوشبو رچی ہوئی تھی اور جس کے تاریک حجرے صندوقوں اور پچھلی چار نسلوں کی، جو خاک ہو چکی تھیں، یادگاروں سے اٹے پڑے تھے، اس متوقع لمحے کے انتظار میں مفلوج پڑی تھی۔ طویل مرکزی ہال میں جہاں اگلے زمانوں میں کھونٹیوں پر ہلاک کیے ہوئے سور ٹنگے رہتے تھے یا جہاں ہرن اگست کے خوابیدہ اتواروں کو ذبح کیے جاتے تھے، اب چپراسی نمک کی بوزیوں اور زراعتی سامان پر خوابیدہ تھے اور احکام کے منتظر کہ کب خچروں پر زینیں کس اور انھیں دوڑا کر وسیع وعریض جاگیر کے چاروں کونوں میں بری خبر کی منادی کریں۔ خاندان کے باقی افراد دیوان خانے میں موجود تھے۔ عورتیں کم خوابی اور وراثت کی تقسیم کی طویل کاروائی سے تھک کر ادھ موئی ہو رہی تھیں۔ وہ ایک سخت سوگ میں تھیں جو بے شمار جمع شدہ سوگوں کا نقطۂ عروج تھا۔ بڑی ماما کی مادرانہ سخت گیری اس کی خوش بختی اور شہرت کو چاروں جانب سے مقدس حفاظتی باڑھ کی طرح گھیرے رہی تھی اور اس باڑھ کے عقب میں چچوں نے اپنی بھتیجیوں کی اولادوں سے، عم زادوں اور خالہ زادوں نے اپنی خالاؤں سے اور

بھائیوں نے اپنی سالیوں سے شادیاں رچائی تھیں، حتیٰ کہ قرابت داریوں کا ایک گنجلک تانا بانا بن گیا تھا، جس نے افزائش نسل کے فریضے کو ایک شیطانی چکر بنا دیا تھا۔ صرف بڑی ماما کی سب سے چھوٹی بھتیجی ماگدالینا اس چکر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ اپنی ذہنی بد خوابی سے دہشت زدہ ہو کر اس نے پادری اینتھونی ازابیل سے جن بھوت نکلوانے کا عمل کروایا تھا اور اپنا سر منڈا کر دنیا کی شان و شوکت اور ظاہری بناوٹ کو تج کر مبلغوں کے علاقے کی مبتدی راہباؤں کے گروہ میں شامل ہو گئی تھی۔ باضابطہ خاندان کی سرحدوں پر مردوں نے جاگیردارانہ حقوق کو استعمال میں لاتے ہوئے جاگیر کی نئی آبادیوں، دیہاتوں اور مویشی خانوں میں ناجائز اولاد کی ایک کھیپ پیدا کر دی تھی اور یہ نسل، خاندانی نام کے بغیر بڑی ماما کے نوکروں کے درمیان اس کی خادم منظورِ نظر یا متوسل بنی زندگی گزار رہی تھی۔

بڑی ماما کی موت کی قربت نے ایک تھکا دینے والی توقع کو جنم دیا تھا۔ دوسروں سے اطاعت اور تعظیم حاصل کرنے کی خوگر، مرنے والی عورت کی آواز کسی بند کمرے میں کھرج کے سُر بجاتے ہوئے آرگن سے زیادہ بلند نہ تھی، مگر اس کی گونج جاگیر کے دور دراز کونوں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کی موت سے لاتعلق رہا ہو۔ اس پوری صدی کے دوران بڑی ماما کوندو کی کششِ ثقل کا مرکز بنی رہی تھی، اپنے ماں باپ، بھائیوں اور آباؤ اجداد کی طرح جو ماضی میں دو سو برس سے حکمرانی کرتے چلے آ رہے تھے۔ شہر کا نام بھی اس کے خاندانی نام پر رکھا گیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بڑی ماما نے اپنی جاگیر کہاں سے حاصل کی تھی اور نہ کسی کو اس کی دولت اور جائیداد کی حدا در قیمت کا صحیح علم تھا۔ سب نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ بڑی ماما، تمام بہتے ہوئے یا ساکن پانیوں، تمام بارشوں، خشک سالی کے دنوں، ضلعے کی تمام شاہراہوں، بجلی کے کھمبوں، لیپ کے برسوں اور گرم ہواؤں کی مالک ہے اور مزید یہ کہ زندگی اور املاک پر اس کا موروثی حق ہے۔ جب وہ پچھلے پہر کی خنک ہوا میں بالکنی میں براجمان ہوتی اور اس کے سارے اقتدار اور اس کی بوجھل توند کا وزن بید کی جھولنے والی پرانی کرسی میں سمٹا ہوا ہوتا تو اس کی قوت اور دولت لامتناہی لگتی اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دنیا کی امیر ترین اور طاقتور ترین اَن بیاہی خاتون ہے۔

قبیلے کے چند لوگوں کے اور بڑی ماما کے اپنے ذہن کے سوا، جسے پادری اینتھونی ازابیل اپنے سال خوردہ اندیشوں سے کچوکے دیتا رہتا تھا، کسی اور کے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ بڑی ماما فانی ہستی ہے۔ بڑی ماما کا اپنا خیال یہ تھا کہ وہ سو برس سے اوپر زندہ رہے گی، اپنی اس

نانی کی طرح جس نے ۱۸۸۵ء کی جنگ میں اپنے باورچی خانے میں مورچہ بندی کر کے کرنل اوریلیانو بوئندیا کے گشتی دستے کو مقابلہ کیا تھا۔ صرف اس سال اپریل کے مہینے میں آن کر بڑی ماما پر انکشاف ہوا تھا کہ اس کے مقدر میں خداوند نے یہ نہیں لکھا کہ وہ وفاق پرست میسنز سے کھلے میدان میں جنگ کر کے اپنے ہاتھوں سے انھیں تہس نہس کرنے کا شرف حاصل کرے۔

تکلیف کے پہلے ہفتے میں خاندانی معالج نے بڑی ماما کو سرسوں کے پلاسٹروں اور اون کی جرابوں میں جکڑ کر زندہ رکھا تھا۔ یہ موروثی معالج تھا۔ اس نے مونت پیلیے میں تعلیم پائی تھی اور اپنے فلسفیانہ یقین کی بنیاد پر علمِ طب میں ترقی کے سخت خلاف تھا۔ بڑی ماما کے جانب سے اسے عمر بھر کے لیے یہ اختیار حاصل ہو چکا تھا کہ اپنے جیتے جی ماکوندو میں کسی دوسرے معالج کے پاؤں نہ جمنے دے۔ کسی زمانے میں وہ گھوڑی کی پیٹھ پر شہر کا دورہ کیا کرتا تھا اور شام کے جھٹپٹے میں دُکھی اور بیمار لوگوں کے گھروں میں جاتا تھا۔ قدرت کی جانب سے اسے بہت سے لوگوں کے بے شمار بچوں کا باپ ہونے کی سعادت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اب وہ گٹھیا کے ہاتھوں بستر کا قیدی تھا، اس کے جوڑ اینٹھ گئے تھے اور اب وہ مریضوں کا علاج انھیں دیکھے بغیر معائنے کی جگہ مفروض، نامہ بروں اور ملازموں کے بھروسے پر کرلیا کرتا تھا۔ بڑی ماما کا بلاوا آیا تو دو چھڑیوں کے سہارے چلتے ہوئے اپنے شب خوابی کے لباس میں اس نے قصبے کا چوک عبور کیا اور حویلی میں پہنچ کر علیل عورت کی خواب گاہ ہی میں اپنا ڈیرا ڈال دیا۔ جب اسے یہ احساس ہو گیا کہ بڑی ماما کا وقت آن پہنچا ہے، تب ہی اس نے اپنا صندوقچہ منگوایا جس میں تام چینی کے مرتبان رکھے تھے جن پر لاطینی زبان میں لیبل چسپاں تھے۔ تین ہفتے تک ہر طرح کے مرہم لگا لگا کر اور اعلیٰ قسم کی مرحک ادویات اور انیمے دے دے کر اس نے بڑی ماما کا اندر باہر ایک کر دیا۔ پھر اس نے بڑی ماما کے متورم اعضا پر پھولے ہوئے مینڈک ملوائے اور اس کے گردوں پر جونکیں لگوائیں۔ لیکن آخر کار ایک صبح اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ یا تو وہ کسی جراح سے بڑی ماما کی فصد کھلوائے یا پادری اینتھونی ازابیل سے بڑی آسیب اتارنے کا عمل کروائے۔

اس وقت نکانور نے پادری کو بلوا بھیجا۔ نکانور کے دس بہترین آدمی پادری کو گرجے سے ملحق اس کے گھر سے اٹھا کر بڑی ماما کی خواب گاہ میں لے آئے۔ وہ بید کی چرخ چوں کرتی ہوئی جھولنے والی کرسی میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سر پر کائی لگا چھتر سایہ کیے ہوئے تھا، جو صرف غیر معمولی موقعوں کے لیے مخصوص تھا۔ ستمبر کی نیم گرم صبح کو سفری قربان گاہ کی ننھی سی گھنٹی کی آواز ماکوندو کے ساکنوں کے لیے متوقع حادثے کی اولین اطلاع تھی۔ سورج طلوع ہونے تک بڑی ماما

کی حویلی کے سامنے والا چھوٹا سا چوک کسی دیہاتی میلے کا منظر پیش کرنے لگا۔

یہ منظر کسی دوسرے عہد کی یاد دلا رہا تھا۔ ستر برس کی عمر تک بڑی ماما اپنا جنم دن ہر سال ایسی دھوم دھام سے اور اتنے دنوں تک مناتی رہی تھی کہ اس کی مثال شاید ہی حافظے میں موجود ہو۔ شہر کے باسیوں کے لیے رَم کے مٹکوں کی سبیل لگائی جاتی۔ عوامی چوک میں جانوروں کی قربانی کی جاتی۔ موسیقاروں کا ایک طائفہ، ایک بڑے سے تخت پوش پر ایستادہ تین روز تک ایک لمحے کو رکے بغیر لوگوں کا دل بہلاتا رہتا۔ بادام کے جن گرد آلود درختوں کے نیچے اس صدی کی پہلے ہفتے میں کرنل اوریلیانو بوئندیا کے دستوں نے خیمے لگائے تھے، وہاں دکانیں لگتیں، جن پر کیلے کی شراب، گوشت کے تلے ہوئے پارچے، چھوٹی گول روٹیاں، خون کی پڈنگ، بُھنا ہوا گوشت، کیلے کی روٹیاں، گوشت کے سموسے، ساسج، تیل میں تلے کیک، مکئی کی روٹیاں، پیسٹریاں، اوجھڑیاں، ناریل کے گول گپے، کالے سیاہ سیخ کباب اور تاڑی جیسی خورد ونوش کی اشیا دوسری الم غلم چیزوں، چھوٹے چھوٹے کھلونوں، نمائشی زیوروں اور مرغوں کی لڑائی اور لاٹری کے ٹکٹوں کے ہمراہ بکتیں۔ پُر جوش ہجوم کی پیدا کردہ افراتفری میں بڑی ماما کی شبیہ والے پرنٹ بکتے اور شانہ پٹیاں بھی فروخت ہوتیں۔

تقریبات دو دن پہلے شروع ہو جاتیں اور جنم دن کو گرج دار آتش بازی اور بڑی ماما کی حویلی کے اندر خاندان کے افراد کے رقص پر ختم ہوتیں۔ اس رقص میں احتیاط سے منتخب اور مدعو کیے گئے مہمانوں کے ساتھ خاندان کے افراد اور ان کی خدمت پر مامور ناجائز اولاد، سب شرکت کرتے اور ایک قدیم پیانولا کی جدید ترین دھنوں پر رقص کرتے۔ بڑی ماما ہال کے عقب میں لِنن کے گدیلوں والی آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر اس تقریب کی صدارت کرتی اور اپنے دائیں ہاتھ کے اشارے سے جس کی تمام انگلیاں انگوٹھوں سے آراستہ ہوتیں، موقع بہ موقع ہدایات جاری کرتی۔ اس رات آئندہ برس میں ہونے والی تمام شادیاں طے ہوتیں۔ گو بعض شادیوں میں فریقین کی خفیہ مرضی کا دخل ہوتا لیکن ان کے فیصلے بڑی ماما اپنے دل کے مشورے کے مطابق کرتی۔ جشن کے اختتام پر وہ جاپانی قندیلوں اور پھولوں کے گجروں سے سجی بالکنی میں نمودار ہو کر ہجوم پر سکے نچھاور کرتی۔

خاندان میں یکے بعد دیگرے متعدد اموات اور ملک میں سیاسی عدم استحکام کے باعث پچھلے چند برسوں سے اس روایت کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ نئی نسلوں نے تو ان شاندار تقریبات کے صرف قصے ہی سن رکھے تھے، انھوں نے تو عشائے ربانی کی پرتکلف رسم میں بڑی ماما کی

شرکت کا نظارہ بھی نہ دیکھا تھا جس میں شہری انتظامیہ کا کوئی نہ کوئی افسر اسے پنکھا جھلتا رہتا اور جہاں بڑی ماما کو اختیار حاصل تھا کہ وہ چاہے تو گھٹنوں پر بھی نہ جھکے، حتیٰ کہ رکوع کے دوران بھی نہیں تا کہ اس کا ولندیزی اسکرٹ اور کلف لگے کیمبرک کا پیٹی کوٹ میلا نہ ہو۔صرف بڑے بوڑھوں کو، جوانی کے کسی دھندلے خواب کی طرح وہ دن یاد تھا جب حویلی سے لے کر قربان گاہ تک دو سو گز لمبا قالین بچھایا گیا تھا جس پر چل کر ماریا دیل روزار یو کاستانیدا ای مونتیرو نے والد کی تجہیز و تکفین کی رسومات میں شرکت کی تھی اور پھر نئے اور تابناک وقار کے ساتھ اسی قالین سے آراستہ گلی میں چل کر حویلی میں واپس آئی تھی اور بائیس برس کی عمر ہی میں بڑی ماما کہلائی جانے لگی تھی۔ وہ قرونِ وسطیٰ کا سا منظر نہ صرف بڑی ماما کے خاندان کی روایات میں شامل تھا بلکہ پوری قوم کے ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ اپنی رعایا سے بتدریج دست کش ہوتی، اِن کے لیے غیر اہم بنتی اور اپنی بالکنی میں بہ مشکل دکھائی دیتی ہوئی بڑی ماما جھلستی دوپہروں میں جیرینیم کے پھولوں کی خوشبو میں مرجھاتی ہوئی اپنی داستانی عظمت میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ عملاً تمام اختیارات نکانور کے ہاتھوں میں تھے۔خاندان کے افراد کے درمیان ایک خاموش معاہدہ چلا آ رہا تھا کہ جس روز بڑی ماما کی وصیت سر بہ مہر کی جائے گی، اس کے جانشین تین دن کے عوامی جشن کا اعلان کریں گے۔ دوسری طرف سب کو بڑی ماما کے اس فیصلے کا بھی علم تھا کہ وہ اسی وقت اپنی آخری خواہشات کا اظہار کرے گی جب اس کے مرنے میں صرف چند گھنٹے باقی رہ جائیں گے، مزید براں کبھی کسی نے سنجیدگی سے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ بڑی ماما بھی فانی مخلوق ہے۔صرف اس صبح جب قربانی کی مدھم گھنٹی نے ماکوندو کے باسیوں کو بیدار کیا تو انھیں احساس ہوا کہ بڑی ماما نہ صرف فانی ہے بلکہ موت کے دروازے پر ہے۔

اس کا وقت آ پہنچا تھا۔ مشرق سے درآمد کیے ہوئے کریپ سے بنے اور گرد و غبار سے اَٹے چھتر کے نیچے اسے اپنے لِنن کے بستر پر دراز اور کانوں تک ایلوے کی پُلٹس میں لتھڑا ہوا دیکھ کر یہ کہنا ناممکن تھا کہ اس کی بوڑھی چھاتیوں میں رواں نحیف سانس میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہے۔ پچاس برس کی عمر پانے تک بڑی ماما نے شادی کے ہر امیدوار کی پیش کش کو رد کر دیا تھا، حالاں کہ قدرت نے اسے ایسا جسم ودیعت کیا تھا کہ اپنی تمام آل اولاد کو اکیلے دودھ پلا کر پال سکتی تھی۔ نتیجتاً آج وہ کنواری اور بے اولاد اس جہان سے جا رہی تھی۔ پادری اینتونی از ابیل کو اس کی ہتھیلیوں پر مقدس روغنیات کی مالش کرنے کے لیے دوسروں سے مدد لینا پڑی، کیوں کہ نزع کا عالم شروع ہوتے ہی بڑی ماما نے اپنی مٹھیاں کس کے بند کر لی تھیں ۔ بھانجیوں بھتیجیوں کی کمرے میں

حاضری بے فائدہ تھی، اس کشمکش میں ہفتے بھر میں پہلی بار مرنے والی نے قیمتی جواہر سے لدے ہوئے ہاتھ کو سینے پر بھینچ کر اپنی بے رنگ آنکھوں سے بھانجیوں بھتیجیوں کو گھورا اور انھیں چور اور ڈاکو کہہ کر پکارا، لیکن پھر اس کی نگاہ پادری ایتونی ازابیل پر پڑی جس نے مذہبی فرائض کی ادائیگی والا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس کے مددگار ملازم پر جو مذہبی رسوم کا سامان اٹھائے کھڑا تھا۔ جب اس نے پُرسکون یقین کے ساتھ آہستہ آواز میں کہا "میرا وقت آن پہنچا ہے۔" پھر اس نے بڑے ہیرے والی انگوٹھی اپنی انگلی سے اُتار کر ماگدالینا کے حوالے کر دی جو اس کے وارثوں میں سب سے کم عمر ہونے کے باعث انگوٹھی کی حق دار تھی۔ یہ ایک روایت کا خاتمہ تھا، ماگدالینا اپنے ورثے سے کلیسا کے حق میں دست بردار ہو چکی تھی۔

صبح سویرے بڑی ماما نے نکانور کے ہمراہ تنہا چھوڑ دیے جانے کی خواہش ظاہر کی تاکہ آخری ہدایات جاری کر سکے۔ نصف گھنٹے تک اس کے ہوش و حواس پوری طرح قائم رہے اور اس نے جاگیر سے متعلق معاملات پر استفسار کیا اور اپنے جسدِ خاکی کی تیاری کی بابت خصوصی ہدایات دیں۔ آخر میں اس نے شب بیداری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نکانور سے کہا: "تمھیں ہر لمحے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہوں گی۔ ہر قیمتی چیز کو تالا لگا کر رکھنا ہوگا۔ بہت سے لوگ چوری کرنے کی خاطر شب بیداریوں میں شامل ہوتے ہیں۔" چند لمحوں بعد اس نے پادری کے سامنے لمبا چوڑا آخری اعتراف کیا جو مفصل بھی تھا اور دیانت دارانہ بھی۔ بعد ازاں اس نے بھتیجیوں اور بھانجیوں کی موجودگی میں عشائے ربانی کی رسم ادا کی۔ اسی موقعے پر اس نے حکم دیا کہ اسے بید کی جھولنے والی کرسی میں بٹھا دیا جائے تاکہ وہ اپنی آخری خواہشات کا اظہار کر سکے۔

نکانور نے چوبیس پرتوں پر مشتمل اور خوشخط حروف میں مرقوم اس کی اِملاک کی بے عیب اور صاف فہرست بڑی احتیاط سے تیار کی تھی۔ سکون سے سانس لیتے ہوئے اور پادری اینتونی ازابیل اور اپنے معالج کو شاہد بنا کر بڑی ماما نے وکیل کو اپنی جائیداد کی تفصیل بتائی جو تین اضلاع پر مشتمل تھی۔ یہ اضلاع نو آبادی کے قیام کے وقت شاہی فرمان کی رو سے اس کے خاندان کو عطا ہوئے تھے۔ وقت کے ساتھ اور متعدد سہولت کی شادیوں کے پیچیدہ تانے بانے کی بدولت بڑی ماما کے زیرِ انتظام اِملاک اور جائیداد میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ اب یہ جائیداد پانچ اضلاع پر پھیل چکی تھی۔ اس غیر مزروعہ زمین پر جس کی صحیح حدیں کبھی متعین ہوئی تھیں، تین سو باون کرایہ دار مزارعوں کے کنبے قیام پذیر تھے اور اس تمام علاقے میں مالکوں کے خرچ پر کبھی ایک بھی فصل نہ بوئی گئی تھی۔ ہر سال اپنے نام کے دن بڑی ماما وہ واحد انتظامی قدم اٹھاتی تھی، جس کے باعث یہ علاقہ دوبارہ

ریاست کی تحویل میں نہیں جا سکتا تھا، وہ قدم اپنے مزارعوں سے کرایہ وصول کرنے کا تھا۔ حویلی کے عقبی برآمدے میں بیٹھ کر وہ بنفسِ نفیس اپنی زمین پر قیام کے حق کا معاوضہ وصول کرتی تھی، جیسے اس کے آباو اجداد اس کے مزارعوں کے آباو اجداد سے سو برس سے زیادہ عرصے سے کرتے چلے آئے تھے۔ تین دن بعد جو وصولی کا سلسلہ ختم ہوتا تو اس کا برآمدہ مختلف تحائف سے جن میں سور، مرغیاں، فیل مرغ، فصل کے اولین اثمار اور دوسری اجناس کے عُشر شامل ہوتے، پَٹ چکا ہوتا۔ حقیقت یہ تھی کہ پیمائش کی رو سے تقریباً ایک لاکھ ہیکٹیر اراضی سے جو ابتدا ہی سے بنجر تھی، پیداوار کے طور پر صرف یہی کچھ بڑی ماما کے خاندان کو حاصل ہوا تھا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے کہ اسی علاقے کی حدود کے اندر ماکوندو کے چھ قصبات پھل پھول رہے تھے او ضلعی دارالحکومت قائم ہو چکا تھا حالانکہ وہاں کے کسی مکین کو صحیح معنوں میں حقِ ملکیت حاصل نہیں تھا، سوائے اُس حق کے جو مکان کی چار دیواری تک محدود تھا۔ زمین کی اصل مالک بڑی ماما تھی جو اس کا کرایہ وصول کرتی تھی، اسی طرح جیسے خود حکومت کو عوام کے تصرف میں آئی ہوئی گلیوں کے استعمال کے لیے اُسے کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

ان آبادیوں کے اطراف میں متعدد مویشی، جن کی تعداد کا کسی کو علم نہیں تھا اور نہ جن کی کوئی دیکھ بھال کرتا تھا، آوارہ پھرتے رہتے تھے۔ ان کے پٹھوں پر تالے کا نشان ثبت تھا۔ یہ موروثی نشان دور دراز کے علاقوں میں معروف ہو چکا تھا، لیکن اس کی شہرت کی وجہ مویشیوں کی کثرت نہ تھی بلکہ مالکان کی بدانتظامی تھی جس کے باعث جانور ادھر اُدھر کے علاقوں میں نکل جاتے، وہاں بھٹکتے پھرتے اور گرمیوں کے دنوں میں پیاس سے دم توڑ دیتے تھے۔ مویشیوں کا گلّہ وہ ٹھوس ستون تھا جس پر خاندان کی داستانی عظمت استوار تھی۔ چند ایسے اسباب کی بنا پر جن کی وضاحت کرنے کی کسی نے زحمت گوارا نہ کی تھی، خاندان کے وسیع و عریض اصطبل پچھلی خانہ جنگی کے بعد سے بتدریج خالی ہوتے گئے تھے، اور وہاں مویشیوں کے بجائے عیشکر کچلنے اور دودھ دوہنے کی مشینیں اور چاول کے کارخانے کام کرنے لگے تھے۔

مذکورہ اشیا کے علاوہ بڑی ماما نے اپنی وصیت میں سونے کی مُہروں سے بھری ہوئی تین دیگوں کا بھی ذکر کیا۔ جنگِ آزادی کے دوران یہ دیگیں حویلی کے کسی حصے میں دفن کر دی گئی تھیں۔ ان کو ڈھونڈنے کے لیے کئی جگہ محنت سے کھدائی کی گئی تھی مگر انھیں ابھی تک برآمد نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس وصیت کی رو سے نئے وارثوں کو جہاں کرائے پر دی ہوئی زمین سے استفادہ کرنے، عُشر اور اثمارِ اول اور کئی دوسرے غیر معمولی نوعیت کے تحفے وصول کرنے کے حقوق تفویض ہوئے

تھے، وہاں ساتھ ہی ایک نقشہ بھی مرحمت ہوا تھا جو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا تھا۔ ہر نسل اسے مکمل حالت میں رکھنے کی ذمے دار تھی تاکہ مدفون خزانے کی بازیافت میں سہولت پیدا ہو سکے۔

اپنی مملوکہ اشیا کی تفصیلات بیان کرنے میں بڑی ماما کو تین گھنٹے صرف ہوئے۔ خواب گاہ کے گھٹے ہوئے ماحول میں بڑی ماما ہر چیز کو اس کا ذکر کر کے عزت بخشتی رہی۔ جوں ہی اس نے اپنے لرزاں ہاتھ سے وصیت پر دستخط کیے اور گواہوں نے اس کی تصدیق کی، حویلی کے سامنے چوک میں بادام کے گرد آلود درختوں کے سائے میں جمع ہوتے ہوئے ہجوم کے دل ایک ان جانے خوف سے لرز اٹھے۔

گنتی میں ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی۔ ابھی تک بڑی ماما کی 'غیر مادی' املاک کا بیان نہ آیا تھا۔ بڑی ماما کے ہر پیشرو نے اپنی موت سے قبل خاندان کا اقتدار یقینی طور پر بحال رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی، اسی طرح بڑی ماما بھی اٹھ کر اپنے بھاری بھرکم چوتڑوں پر بیٹھ گئی اور تحکمانہ اور مخلص آواز میں وکیل کو اپنی غیر مادی جائیداد کی تفصیل لکھوانے لگی۔ اس جائیداد میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل تھیں: زیر زمین دولت، علاقائی پانی، جھنڈے کے رنگ، قومی خودمختاری، روایتی جماعتیں، انسانی حقوق، شہری حقوق، قوم کی قیادت، اپیل کا حق، کانگریس کی سماعتیں، سفارشی خطوط، تاریخی مسودے، آزاد انتخابات، ملکہء حسن کا انتخاب، مابعد الطبیعیاتی تقاریر، عظیم عوامی مظاہرے، ممتاز نوجوان خواتین، معزز شریف مرد، تکلفات کے عادی عسکری، تقدس مآب حضور عالی مقام، عالتِ عالیہ، ممنوعہ درآمدی سامان، آزادی پسند خواتین، مسئلہ گوشت، زبان کی پاکیزگی، اچھی مثالوں کا قیام، آزاد مگر ذمے دار پریس، جنوبی امریکا کا ایتھنز، رائے عامہ، جمہوریت کے سبق، مسیحی اخلاقیات، زرِ مبادلہ کی کمی، پناہ کا حق، اشتمالیوں کی دہشت پسندی، ریاست کا سفینہ، بڑھتی ہوئی مہنگائی، ری پبلکن روایات، غیر مراعات یافتہ طبقے، سیاسی حمایت کے بیانات وغیرہ وغیرہ۔

بڑی ماما کو یہ گنتی مکمل کرنے کی مہلت نصیب نہ ہوئی۔ یہ پُر مشقت کام اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ دو صدیوں سے خاندان کے اقتدار کا اخلاقی جواز جن تحریری کلیوں پر قائم تھا، ان کے شور و غل میں غرق ہوتے ہوئے اس نے ایک زور دار ڈکار لی اور سدھار گئی۔

اس سہ پہر زرد اُفتادہ، خاموش اور افسردہ دارالحکومت میں شائع ہونے والے اخباروں کے ضمیموں کے صفحاتِ اوّل پر ایک بیس سالہ خاتون کی تصویر شائع ہوئی، جسے وہاں کے باشندوں نے نئی ملکہءِ حسن کی تصویر سمجھا۔ اس تصویر کی مطلوبہ ری ٹچنگ کر کے گھنیرے بالوں کو اوپر اٹھا کر

ان میں ہاتھی دانت کی کنگھی اُس کرا اور فیتے کے کالر میں پھولوں کا تاج آویزاں کر کے اسے چار کالموں پر پھیلایا گیا تھا اور یوں بڑی ماما کی جوانی لحاظی طور پر دوبارہ وجود میں آ گئی تھی۔ سڑک پر دکان سجانے والے کسی فوٹو گرافر کے ہاتھوں، جو اس صدی کے اولین برسوں میں ماکوندو سے گزرا تھا، اتری ہوئی سالہا سال سے اخبار کے غیر شناخت یافتہ افراد کے شعبے کے سرد خانے میں رکھی ہوئی یہ تصویر آئندہ نسلوں کی یاد میں محفوظ ہو جانے والی تھی۔ پرانی شکستہ بسوں میں وزارت خانوں کے اعلیٰ ویڑوں میں، دھندلی اور پھیلی ہوتی ہوئی سجاوٹ کی اشیا سے آراستہ تاریک چائے خانوں میں، ہر جگہ لوگ مرحومہ کے بارے میں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ملیریائی، لورزدہ علاقے سے تعلق رکھنے والی اور چند گھنٹے قبل تک ملک کے دوسرے حصوں میں بالکل غیر معروف اس شخصیت کا احترام اور عزت کے ساتھ ذکر ہو رہا تھا۔ اخباروں میں چھپے ہوئے حروف نے اس کے گرد تقدس کا ہالہ بُن دیا تھا۔ ہلکی ہلکی باندا باندی نے راہ گیروں کو وسوسوں اور کہرے میں ڈھانپ رکھا تھا۔ تمام گرجوں کی گھنٹیاں مرحومہ کے لیے نوحہ کناں تھیں۔ صدر جمہوریہ کے لیے یہ خبر غیر متوقع حیرت کا باعث تھی۔ موصولہ تار کی پشت پر صدر مملکت نے اپنے ہاتھ سے وزیر جنگ کے نام یہ پیغام درج کیا کہ خطبے کے اختتام پر بڑی ماما کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی جانی چاہیے۔

بڑی ماما کی موت سے لگتا تھا جیسے معاشرتی نظام پر خراش آ گئی ہو۔ صدر مملکت خود شہری آبادی کے جذبات سے جو کسی مقطر کے ذریعے پاک وصاف ہو کر صدر کے دل تک پہنچ گئے تھے، متاثر معلوم ہوتے تھے۔ کار میں گزرتے ہوئے صدر نے شہر کے اضطراب کا عارضی مگر قدرے سفاک رویہ دیکھ لیا تھا۔ شہر میں صرف چند گھٹیا قہوہ خانے کھلے تھے۔ میٹروپولیٹن گرجا نو دن تک مرگ کی رسوم ادا کرنے کے لیے تیار کیا جا چکا تھا۔ قومی دارالحکومت کی عمارتیں جہاں بھکاری، اخباروں میں لپٹے لپٹائے یونانی ستونوں اور جمہوریہ کے آں جہانی صدور کے خاموش مجسموں کے زیرِ سایہ شب بسری کیا کرتے تھے، کانگریس روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ صدرِ مملکت جن کا دل شہر میں سوگواری کی فضا دیکھ کر پگھل چکا تھا، جس وقت اپنے دفتر میں داخل ہوئے ان کی کابینہ کے ارکان ماتمی لبادوں میں ملبوس ان کے منتظر تھے۔ ان کے چہرے معمول سے زیادہ زرد اور سنجیدہ تھے۔

اُس رات اور اس کے بعد آنے والی راتوں میں رونما ہونے والے واقعات، بعد ازاں تاریخی سبق قرار دیے جانے والے تھے، کیوں کہ ان راتوں میں نہ صرف شہری اقتدار کے عالی

نفس کارکنان مسیحی جذبے سے سرشار نظر آتے تھے بلکہ وہاں ایثار کی فضا قائم ہوگئی تھی جس کے زیرِ اثر بڑی ماما کے عالی مرتبت تنِ خاکی کے دفنائے جانے کے مشترک مقصد نے مخالف مفادات اور متصادم آرا میں مصالحت کرا دی تھی۔ عرصۂ دراز سے بڑی ماما کا وجود اپنے زیرِ اقتدار علاقے میں سیاسی ہم آہنگی اور معاشرتی امن کا ضامن رہا تھا، جس کی بنیاد ان تین صندوقوں پر تھی جو جعلی انتخابی کاغذوں سے بھرے ہوئے تھے اور جو بڑی ماما کی خفیہ جائیداد میں شامل تھے۔ بڑی ماما کے ملازم، اس کے پروردگان، اس کے مزارعے، بوڑھے یا جوان، اپنا حق رائے دہی استعمال کرتے وقت ان لوگوں کے ووٹ بھی ڈالا کرتے تھے جو سو سال قبل آنجہانی ہو چکے تھے۔ بڑی ماما کی ذات کی بدولت روایتی اور دیرپا اقتدار کو عارضی اور ناپائیدار اقتدار پر سبقت حاصل تھی۔ طبقوں کو عوام پر فوقیت اور حکمتِ خداوندی کو عقل انسانی کی برجستگی پر فضیلت تھی۔ امن و امان کے زمانے میں بڑی ماما کی غالب منشا سے کلیسا کے عہدوں اور اوقاف اور جاگیروں کے بٹوارے کی تصدیق یا تردید ہوتی تھی اور بڑی ماما کے طرف داروں کی فلاح و بہبود کی نگرانی اور ایسے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے وہ ہتھکنڈوں کے استعمال اور انتخابات میں جعل سازی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ بے امنی کے دنوں میں بڑی ماما اپنے حامیوں کو خفیہ ذریعوں سے ہتھیار فراہم کرتی تھی، لیکن عوام کے سامنے وہ جبر کا نشانہ بننے والے لوگوں کی مدد کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ اس انداز کے پُرجوش جذبۂ حب الوطنی کے سبب وہ اعلیٰ ترین اعزاز کی مستحق قرار پائی تھی۔

اس معاملے میں صدر جمہوریہ کو اپنی ذمے داری کی اہمیت اور سنجیدگی کا احساس کرنے کے لیے اپنے مشیروں سے مشورہ کرنے کی حاجت نہ تھی۔ محل کے استقبالیہ ہال اور سیمنٹ کے فرش والے عقبی دالان کے درمیان سرو کے درختوں سے بھرا ایک باغیچہ تھا جسے وائسرائے پورچ کے طور پر استعمال کرتے رہے تھے، اور جہاں کالونی کے آخری دنوں میں ایک پرتگالی راہب نے عشق میں ناکامی کے باعث خودکشی کر لی تھی۔ غروبِ آفتاب کے وقت اس باغیچے میں سے گزرتے ہوئے صدرِ محترم، تمغوں سے بوجھل، شور کرتے ہوئے مشیروں کی رفاقت کے باوجود ایک انجانے خوف کی لرزش محسوس کیا کرتے تھے۔ اس مخصوص شام کو وہ لرزش بدشگونی کا روپ دھار چکی تھی۔ اس وقت صدرِ محترم کو اپنے تاریخی مقدر سے مکمل طور پر آگاہی ہوئی۔ نتیجتاً انھوں نے کا سوگ نو دن تک قومی سطح پر منانے کا فرمان جاری کیا اور بڑی ماما کو اس اعزاز سے نوازا۔ یہ اِن جنگ میں وطن کی خاطر شہید ہونے والا ہستیوں کے لیے مختص ہوتا ہے اور بعد از شہادت عطا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں جیسا کہ صدرِ محترم نے صبح کے وقت ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اپنے ہم وطنوں

سے ایک ڈرامائی خطبے میں فرمایا انھیں محکم یقین تھا کہ بڑی ماما کی رسوم مرگ کی ادائگی دنیا بھر کے لیے ایک نئی مثال قائم کرے گی۔

اس ارفع عزم اور چند گمبھیر عملی زحمتوں میں ٹکراؤ ہونا ناگزیر تھا۔ ملک کا عدلی نظام، جس کی تشکیل بڑی ماما کے قدیم پیش رووں ہی نے کی تھی، ان حالات سے نمٹنے سے قاصر تھا جو رونما ہونے شروع ہوئے۔ زیرک قانون داں اور مستند دستوری کیمیا گر، مقدس کتب کی تفسیرات اور علمِ منطق کی قیاس آرائیوں کے مطالعے میں غرق ہو گئے کہ کوئی فارمولا ایسا وضع کر لیں جس کی رو سے صدر جمہوریہ کا رسومِ تجہیز و تکفین میں شامل ہونا ممکن ہو جائے۔ سطح اعلا کے سیاست داں، دینی علما اور اصحابِ ثروت دن دن بھر دہشت زدہ رہنے لگے۔ ایک صدی سے تجریدی قانون سازی کرنے کی سعی میں خود مجرد بنی ہوئی اور قومی سورماؤں کی روغنی تصویروں اور یونانی مفکروں کے مجسموں کے سائے میں واقع کانگریس کے وسیع حلقوں کی نظر میں بڑی ماما کے منصب کی اہمیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی۔ اس دوران میں ماکوندو کے درشت ستمبر کی گرمی میں بڑی ماما کی نعش میں بلبلے اٹھنے شروع ہو چکے تھے۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ عوام بڑی ماما کو وقت اور عمر کی قید سے آزاد، منزہ اور داستانی ہستی کے طور پر دیکھ رہے تھے اور اس کی بید کی جھولنے والی کرسی، اس کے سہ پہر کے قیلولوں اور سرسوں کے پلاسٹروں کو ذہن میں لائے بغیر اسے یاد کر رہے تھے۔ پوری جمہوریہ میں ہر جگہ الفاظ نے حکمرانی حاصل کر لی تھی۔ ان گنت گھنٹے لفظوں کی گونج کی نذر ہو چکے تھے۔ یہ لفظ وہ تھے جنھیں نشر و اشاعت کے اداروں کے نمائندوں نے پر وقار بنا دیا تھا اور ساری گفتگوئیں اس وقت تک جاری رہیں جب تک اس حقیقت کے ذکر نے لفظوں کی چاند ماری میں مشغول قانون دانوں کے مصفا گروہ کو یہ یاد دہانی نہ کرادی کہ بڑی ماما کا مردہ جسم سائے میں ایک سو چار درجے کی گرمی میں رکھا ان کے فیصلے کا منتظر ہے۔ عقلِ سلیم کے اس دھماکے سے تحریری قانونوں کی پاکیزہ فضا میں کسی کو آنکھ جھپکنا تک یاد نہ رہا۔ جسدِ خاکی کو محفوظ کرنے کے فوری احکام جاری کیے گئے۔ اس اثنا میں قانونی موشگافیوں کا استنباط جاری رہا۔ مختلف مدرسہ ہائے فکر کو ہم آہنگ کرنے کی تدبیریں ہوئیں اور دستور میں ترمیمیں کی گئیں تاکہ صدر جمہوریہ کو کفن دفن کی رسوم میں شرکت کرنے کی اجازت حاصل ہو جائے۔

اس موضوع پر اتنا کچھ کہا گیا کہ بحث ملکی سرحدوں کو پار کر کے سمندر عبور کر گئی اور ایک شگون کی طرح قصرِ گوندولفو میں پاپائے روم کے خلوت خانے میں جا گھسی۔ اگست کے کسالت

کے دنوں کی غنودگی سے افاقہ حاصل کرنے کے بعد پاپائے اعظم کھڑکی کے قریب کھڑے خلیج کا نظارہ کر رہے تھے، جہاں اس وقت غوطہ خور ایک مقتول نوجوان لڑکی کے جسم سے علاحدہ کیے ہوئے سر کو برآمد کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ پچھلے چند ہفتوں سے شام کے اخباروں کو اس سر بریدہ لڑکی کی موت کے سوا کسی دوسرے معاملے سے سروکار نہ تھا اور پاپائے اعظم اس لاینحل مسئلے سے جوان کے گرمائی مستقر کے گردونواح میں وقوع پذیر ہوا تھا، لاتعلق نہ رہ سکے تھے۔ لیکن اس شام اخباروں نے غیر متوقع ردو بدل کر کے ممکنہ مقتولین کی تصویروں کی بجائے ایک اکیس سالہ خاتون کی تصویر کالے حاشیوں میں شائع کر دی۔ ''بڑی ماما!'' پاپائے اعظم نے حیرت زدہ ہو کر پکارا۔ انھوں نے اس دھندلی ڈگیروٹائپ تصویر کو فوراً پہچان لیا۔ یہ انھیں بہت سال پہلے اس موقعے پر پیش کی گئی تھی جب انھوں نے سینٹ پیٹر کی گدی سنبھالی تھی۔ کارڈینلز کے مدرسے کے ارکان نے بھی اپنے اپنے خلوت خانوں میں ہم نوا ہو کر ''بڑی ماما، بڑی ماما'' کا الاپ شروع کر دیا۔ بیس صدیوں کے عرصے میں یہ صرف تیسرا موقع تھا کہ عیسائیت کی لامحدود مملکت میں انتشار، جھنجھلاہٹ اور دوڑ دھوپ کی یہ ساعت آئی تھی اور یہ حالات اس وقت تک قائم رہے جب تک پاپائے اعظم اپنی طویل سیاہ لیموزین میں متمکن ہو کر بڑی ماما کے انوکھے اور بعید المسافت جنازے میں شمولیت کے لیے روانہ ہو گئے۔

چمکیلے آڑوؤں کے باغ پیچھے رہ گئے اور آپیالہ اینتیکا کی شاہراہ بھی، جہاں گھروں کے چبوتیروں پر دھوپ سے گرمائے ہوئے فلمی ستارے اس ہلچل سے بے خبر اپنے جسموں کو سنولانے میں مگن تھے، حتیٰ کہ قصرِ سان آنجلو کی راس آ پہنچی جو دریائے تے ویرے کے کنارے واقع ہے۔ آخر شام کے دھندلکے میں سینٹ پیٹر کے کلیسا کی گونج اور گھنٹیوں کی آواز ماکوندو سے بلند ہونے والی پھٹی ہوئی ٹن ٹن سے ہم آغوش ہونے لگی۔ باہم الجھے ہوئے سرکنڈوں اور بے صدا دلدلوں سے اُدھر جو کہ سلطنت روما اور بڑی ماما کے مویشی باڑوں کے درمیان حدِ فاصل تھیں، پاپائے اعظم اپنے گھٹن بھرے خیمے کے اندر تمام رات گزرتے لوگوں سے مشتعل ہوتے ہوئے بندروں کا شوروغل سنتے رہے۔ رات کے سفر کے دوران ان کا ڈونگا یکا سے بھرے تھیلوں، کچے کیلس کے ڈنٹھلوں اور مرغوں کے ٹوکروں سے لدا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس میں وہ عورتیں اور مرد بھی سوار تھے جو اپنے معمول کے کاروبار ترک کر کے بڑی ماما کی رسوم مرگ کی ادائیگی کے دنوں میں دوسرے کاروبار کرنے اور اپنی قسمت آزمانے جا رہے تھے۔ کلیسا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مقدس پاپائے اعظم کو اس رات بے خوابی کے تپ اور مچھروں کی اذیت سے پالا پڑا، لیکن بڑی ماما کی

سلطنت پر دل فریب طلوعِ صبح کے منظر، یکسانی سیبوں اور اگوانوں کے ازلی نظارے نے پاپائے اعظم کی ساری تکلیف کی تلافی کر دی اور سفر کی کوفت کو ان کی یادداشت سے یکسر محو کر دیا۔

دروازے پر تین بار دستک نے جو پاپائے مقدس کی آمد کا اعلان تھی، نکانور کو نیند سے بیدار کیا۔ حویلی موت کی گرفت میں تھی۔ صدرِ محترم کی تابڑ توڑ اور نہایت اہم تقریروں سے اور ہیجانی تنازعات کی تپش سے جواب قدرے سرد پڑ چکی تھی مگر ابھی تک روایتی علامتوں کے ذریعے اظہار پا رہی تھی، متاثر ہو کر دنیا بھر کے افراد اور عوام کے جنھوں نے اپنے سب کاموں سے منہ موڑ کر تاریک گیلریوں، پرہجوم دالانوں اور تنگ بالا خانوں میں جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ دیر سے پہنچنے والے، گرجے کی نیچی چار دیواری پر، کٹہروں پر، ممٹیوں اور منڈیروں پر، جہاں کہیں انھیں جگہ ملی تھی چڑھ گئے تھے۔ بڑی ماما کا حنوط ہوتا ہوا جسم، ٹیلی گراموں کے مرتعش ڈھیر میں پوشیدہ اہم فیصلوں کا منتظر تھا۔ اس کے نو بھتیجے بھانجے جو رو رو کر نڈھال ہو چکے تھے، نعش کے پہلو میں بیٹھے باری باری سے وجد آور نگرانی میں مشغول، شب بیداری کی رسم ادا کر رہے تھے۔

لیکن کائنات کو ابھی اور بہت دن اس انتظار کو طول دینا تھا۔ بلدیہ کا ہال چمڑے کے چار اسٹولوں، مقطر پانی کے جگ اور ریشوں سے بنے جھولنے والے بستر سے مزین کر دیا گیا تھا، جہاں پاپائے اعظم پسینے میں شرابور بے خوابی میں مبتلا، طویل دم گھونٹنے والی راتوں میں انتظامیہ اور یاددہانیوں کو پڑھ پڑھ کر اپنا دھیان بٹا رہے تھے۔ دن کے دوران میں وہ بچوں میں جو انھیں دیکھنے کے لیے کھڑکی میں سے جھانکتے رہتے تھے، اطالوی مٹھائیاں بانٹتے اور دوپہر کا کھانا عموماً پادری اینتونی ازابیل کے ہمراہ بسکن کے کنج میں تناول کرتے۔ کبھی کبھار یہ شرف نکانور کو بھی حاصل ہو جاتا۔ انھوں نے بے شمار دن اور ہفتے، جنھیں گرمی کی حدّت اور شدید انتظار نے اور بھی طویل کر دیا تھا، وہیں گزارے حتیٰ کہ ایک روز پادری پاسترانا پنے طبلچیوں کے ہمراہ چوک کے درمیان نمودار ہوا اور یہ فرمان پڑھ کر سنایا کہ ملکی نظم و نسق میں خلل واقع ہونے کے باعث دھن دھنا دھن، صدرِ جمہوریہ کو دھن دھنا دھن ایسے ہنگامی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں کہ دھن دھنا دھن، کہ جن کی رو سے وہ بڑی ماما کے جنازے میں شامل ہو سکتے ہیں، دھن دھنا دھن، دھن دھنا دھن، دھن دھن۔

بالآخر وہ عظیم دن آن پہنچا۔ کوچہ و بازار میں لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہر طرف ریڑھیاں اور چھابڑیاں سجی تھیں۔ ہانکیں لگا لگا کر خوراک بیچنے والے لوگ تھے۔ جگہ جگہ لاٹری کے کھوکھے لگے تھے۔ چند لوگ گردنوں میں سانپ لپیٹے روغنِ اکسیر بیچ رہے تھے اور دعوے کر رہے تھے کہ ان کا

روغن داد اور چنبل کا تیر بہدف علاج ہے اور مریضوں کو حیاتِ ابدی دینے کا اہل ہے۔ مختصر سے پنچ رنگے چوک میں جہاں لوگوں نے جگہ جگہ خیمے گاڑے ہوئے تھے یا بستر پھیلا لیے تھے، مستعد کمان برادر سپاہی افسرانِ بالا کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔

وہ سب کے سب وہاں اس عظیم لمحے کے منتظر تھے۔ سان خورخے کی دھوبنیں، کابودلا ویلا کے موتیوں کے غوطہ طور، سیبے ناگا کے ماہی گیر، تاساہیرا کے کیکڑے پکڑنے والے، موخا خانا کے جادوگر، مانورے کے نمک کی کانوں میں کام کرنے والے، والیدو پار کے اکارڈین بجانے والے، ایاپیل کے نفیس شہسوار، سان پیلایو کے بینڈ کے سازندے، لاکویوا کے نسلی مرغ پالنے والے، ساباناس دے بولیوار کے کرشمہ ساز، رے بولو کے بانکے، ماگدالینا کے کشتی ران، مون پاکس کے جعلی وکیل۔ یہ سب ان کے علاوہ تھے جن کا ذکر اس سرگزشت آغاز میں کیا جاچکا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے جن میں کرنل اور یلیانو بوئندیا کی فوج کے آزمودہ کار سپاہی تھے، جو بڑی ماما اور اس کی آل اولاد کے خلاف اپنی صد سالہ نفرت کو وقتی طور پر سر طاق رکھ کر جنازے میں شامل ہونے کے لیے چلے آئے تھے۔ ان کی سربراہی ڈیوک آف مارلبرو کر رہا تھا جس نے اپنی شان و شوکت کی نمود کی خاطر چیتے کی کھال اور شیر کے دانت اور پنجے جسم پر سجا رکھے تھے۔ یہ بوڑھے سپاہی صدرِ محترم سے اپنی پنشن کے بارے میں درخواست کرنے آئے تھے جسکے جاری ہونے کے انتظار میں وہ ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ گزار چکے تھے۔

گیارہ بجے سے ذرا پہلے چلچلاتی دھوپ میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے اور بجی سجائی وردیوں والے مشاق سپاہیوں کے دستے کے ہاتھوں تھمے ہوئے ہجوم نے نشاط و مسرت سے سرشار ایک گرج دار نعرہ بلند کیا۔ سنجیدہ، باوقار، اپنے بلند ہیٹ اور لمبے کوٹ زیبِ تن کیے صدرِ جمہوریہ، ان کی کابینہ کے ارکان قومی اسمبلی کے مندوبین، عدالتِ عالیہ کے جج، مشیرانِ مملکت، روایتی جماعتوں اور کلیسا کے کارکن اور صنعت و تجارت اور بینکوں کے نمائندے تار گھر کے کونے پر جلوہ افروز ہوئے۔ معمر، فربہی کی جانب مائل، گنجے اور علیل صدرِ مملکت عوام کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ عوام نے انھیں صدارت کا عہدہ سنبھالتے تو دیکھا تھا لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون اور کیسی ہستی ہیں۔ صرف آج وہاں انھیں دیکھ کر وہ ان کے بارے میں شہادت دینے کے اہل تھے۔ اپنے فرائضِ دینی کی متانت کے ہاتھوں نڈھال مذہبی عہدے داروں اور چوڑے چکلے، تمغوں سے بوجھل سینوں والے فوجیوں کے درمیان چلتے پھرتے قائدِ عوام کے پور پور سے قوت کے سرچشمے پھوٹتے معلوم ہوتے تھے۔ دوسری قطار میں ماتمی کریپ

میں ملبوس خاموش قومی ملکائیں محوِ نمائش تھیں۔ وہ ماضی، حال، مستقبل کی ہر چیز کی ملکائیں تھیں اور آج پہلی بار اپنی ارضی شان وشوکت کے بغیر عالمی ملکہ کی رہنمائی میں پریڈ کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں لوبیے کی ملکہ، کیلوں کی ملکہ، یکا کے پھولوں کی ملکہ، امردوں کی ملکہ، ناریل کی ملکہ، سویا کی پھلیوں کی ملکہ، چھپکلیوں کے انڈوں کے دوسر پچپن میل لمبے ہار کی ملکہ اور بہت سی دوسری ملکائیں تھیں جن کا ذکر اس سرگزشت کی طوالت کے خوف سے حذف کر دیا گیا ہے۔

اس لمحے اپنے تابوت میں قرمزی کفن مین لپٹی بڑی ماما کو تابوت کے تانبے کے آٹھ گنڈوں نے دنیائے حقیقت سے علاحدہ کر رکھا تھا۔ وہ جراثیم کش دواؤں سے وضع کی ہوئی ابدیت میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے اپنے جاہ وجلال کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ جاہ وحشم کے جو خواب وہ گرمی کی شدت سے پیدا کردہ بے خوابی کی حالت میں اپنی حویلی کی بالکنی میں بیٹھ کر دیکھا کرتی تھی، وہ تمام خواب ان شہرۂ آفاق اڑتالیس گھنٹوں میں پورے ہو چکے تھے جن میں اس کے عہد کی ہر علامتی ہستی نے اسے خراجِ عقیدت پیش کیا تھا، حتیٰ کہ خود پاپائے اعظم نے بھی، جنھیں بڑی ماما اپنی ہذیانی کیفیت میں ویٹی کن کے باغات کے اوپر ایک نورانی بگھی میں پرواز کرتے دیکھا کرتی تھی، کھجور کے پتوں سے بنے چٹائی والے ایک دستی پنکھے کی مدد سے گرمی پر فتح حاصل کر لی تھی اور دنیا کے اس عظیم ترین جنازے کو اپنے برتر درجات سے سرفراز فرمایا تھا۔

طاقت کی اس نمائش سے مبہوت عوام کو اس حریصانہ سرگرمی کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا جو اس چوب پر رونما ہوئی جس پر حویلی کی چھت قائم تھی۔ اس سرگرمی کے نتیجے کے طور پر قصبے کے جھگڑالو بزرگوں کو مفاہمت پر مجبور کر دیا گیا اور اسی کی بدولت قصبے کا سب سے معمر بزرگ تابوت کو کندھا دے کر حویلی سے باہر لایا تھا۔ عوام میں سے کسی نے گدھوں کے ان چوکس سایوں کو بھی نہ دیکھا تھا جو ماکوندو کی گرمی سے تپی ہوئی تنگ گلیوں میں تابوت کی گاڑی کے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے اور نہ کسی کو یہ معلوم ہوا کہ قصبے کے بزرگ اپنے جلو میں قصبے کے بازاروں میں مہلک گندگی کا کتنا طویل سلسلہ چھوڑ گئے تھے۔ کسی کو یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ بڑی ماما کا جنازہ حویلی سے نکلتے ہی اس کے بھانجوں اور بھتیجیوں، پوتوں، دوہتوں، خادموں، ملازموں اور پروردوں حویلی کو بانٹنے کی غرض سے باہر کے دروازے بند کر کے اندرونی دروازے اکھاڑ ڈالے، ان کے تختوں میں سے کیلیں نکال لیں اور دیواروں کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ البتہ ایک بات ایسی تھی جو جنازے کے غل غپاڑے کے باوجود کسی کی نظر سے اوجھل نہ رہی جو یہ تھی کہ وہاں پر موجود جم غفیر نے چودہ روز کی منت سماجت، وصف وثنا اور بدمستانہ گائیکی کے انجام پر اور پگھلے ہوئے سیسے

سے بڑی ماما کی قبر کے سر بہ مہر ہونے پر اطمینان کا زوردار سانس لیا تھا۔
اس موقعے پر موجود لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی آگہی کی بدولت یہ محسوس کر چکے تھے کہ ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب پاپائے مقدس اپنی ارضی زندگی کا واحد مقصد پورا کرنے کے بعد اپنے جسم اور روح سمیت عرشِ بریں کی جانب پرواز کر سکتے تھے، اب صدر مملکت اپنی صواب دید کے مطابق کاروبار حکومت چلا سکتے تھے، اب تمام موجودہ اور آئندہ اشیا کی ملکائیں شادیاں رچا سکتی تھیں۔ خوش و خرم زندگی بسر کر سکتی تھی، حاملہ ہو سکتی تھیں اور ڈھیروں بیٹے پیدا کر سکتی تھیں، اب عوام کھلے بندوں بڑی ماما کی بے کراں سلطنت میں جہاں جی چاہے خیمہ زن ہو سکتے تھے کیوں کہ وہ فردِ واحد جو انھیں پابند کرنے کی اہل تھی اور مرضی کا کام کرنے سے روکنے کی طاقت رکھتی تھی۔ زیرِ زمین، پگھلے ہوئے سیسے کی چار دیواری کے اندر بند گلنا سڑنا شروع ہو گئی تھی۔ صرف ایک کام باقی رہ گیا تھا، جو یہ تھا کہ کوئی شخص اب اپنے دروازے کے آگے اسٹول ٹکا کر بیٹھ جائے اور آئندہ نسلوں کے لیے یہ کہانی، سبق اور مثال کے طور پر بیان کر دے تاکہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہ رہ جائے جو بڑی ماما کی کہانی کی شنید سے منکر ہو سکے، کیوں کہ کل بروزِ بد، گندگی اٹھانے والا عملہ قصبے میں وارد ہوگا اور اس تمام کوڑے کرکٹ کو رہتی دنیا تک کے لیے سمیٹ کر لے جائے گا جو بڑی ماما کے جنازے کی بدولت ہر جانب پھیل چکا ہے۔



(مشمولہ: ''ذہن جدید''، دہلی، جلد ۱۵، شمارہ نمبر ۴۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۵ء)

گم گشتہ وقت کا سمندر

ترجمہ: آصف فرخی

جنوری کے آخر میں سمندر تیز و تند ہو جاتا تھا، کوڑے کے ڈھیر لا لا کر قصبے پر پٹخنے لگتا اور چند ہفتوں کے بعد ہر چیز اس کی ناقابلِ برداشت کیفیت سے آلودہ ہو جاتی۔ اس دن کے بعد سے دنیا رہنے کے قابل نہ رہتی، کم از کم اگلے دسمبر تک۔ چنانچہ کوئی بھی آٹھ بجے رات کے بعد جاگتا ہوا نہیں ملتا تھا۔ مگر جس سال مسٹر ہربرٹ آئے، اُس سال سمندر نہیں بدلا، فروری میں بھی نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ پہلے سے بھی زیادہ پُرسکون، ہموار اور منور ہو گیا اور مارچ کی اوّلین راتوں میں سمندر سے گلابوں کی خوشبو آنے لگی۔

توبیاس نے یہ خوشبو سونگھی۔ اس کا خون کیکڑوں کو اپنی جانب کھینچتا تھا اور وہ آدھی آدھی رات انھیں اپنے بستر سے بھگانے میں گزارتا، یہاں تک کہ ہوا تیز ہو جاتی، تب وہ سونے پاتا۔ جاگتے پڑے رہنے کے طویل وقفوں میں اس نے ہوا میں ہونے والی تمام تبدیلیوں کو پہچاننا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ جب اسے گلابوں کی خوشبو آئی تو اسے یہ معلوم کرنے کے لیے دروازہ کھول کر باہر نہیں جھانکنا پڑا کہ خوشبو سمندر سے آئی ہے۔

وہ دیر سے اٹھا۔ کلوتیلدے آنگن میں آگ جلا رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور تارے اپنی اپنی جگہوں پر تھے، مگر انھیں گننا مشکل تھا کیونکہ افق پر سمندر کی روشنی سے چھوٹ پڑ رہی تھی۔ کافی پینے کے بعد بھی توبیاس کو اپنے حلق میں رات کا ہلکا سا ذائقہ چپکا ہوا محسوس ہوا۔

''کل رات ایک عجیب بات ہوئی،'' اس نے یاد کیا۔

کلوتیلدے کو، بلاشبہ، خوشبو نہیں آئی تھی۔ اس کی نیند اتنی گہری تھی کہ اسے اپنے خواب بھی

یاد نہ رہتے تھے۔

''گلابوں کی خوشبو تھی،'' تو بیاس نے کہا،''اور مجھے یقین ہے کہ سمندر سے آ رہی تھی۔''

''مجھے نہیں پتا گلابوں کی خوشبو کیسی ہوتی ہے،'' کلوتیلدے نے کہا۔

یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہو۔ قصبہ بالکل بنجر تھا، اس کی پتھریلی زمین شورے سے گدی ہوئی تھی، اور کبھی کبھار ہی کوئی باہر سے گلدستہ لے کر آتا کہ سمندر میں ڈال دے جہاں وہ اپنے مُردے پھینکا کرتے تھے۔

''یہ وہی خوشبو ہے جو گواکامایال کے اُس ڈوبے ہوئے آدمی سے آتی تھی،'' تو بیاس نے کہا۔

''اچھا!'' کلوتیلدے مسکراتے ہوئے بولی،''اگر یہ اچھی خوشبو ہے تو پھر سمجھ لو کہ اس سمندر سے نہیں آسکتی۔''

یہ سمندر واقعی بے حد سفاک تھا۔ بعض دنوں میں، جب مچھیروں کے جال میں بہتے ہوئے خس وخاشاک کے سوا کچھ نہ آتا تب بھی پانی اترنے کے بعد قصبے کی سڑکیں مردہ مچھلیوں سے بھر جاتیں۔ بارود لگانے سے یہ حاصل ہوتا کہ پرانے غرقاب جہازوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے سطح تک اٹھ آتے۔

قصبے میں کلوتیلدے کی طرح جو چند عورتیں باقی رہ گئی تھیں، وہ تلخی کے مارے کھول رہی تھیں اور، اسی کی طرح، بوڑھے یاکوب کی بیوی تھی، جو اس صبح اپنے معمول سے پہلے اٹھ گئی، گھر کی چیزیں ترتیب سے رکھیں اور ناشتے کی میز پر مخاصمانہ چہرہ لیے بیٹھ گئی۔

''میری آخری خواہش،'' اس نے اپنے شوہر سے کہا،''یہ ہے کہ مجھے زندہ دفن کر دیا جائے۔''

اس نے یہ بات اس طرح کہی جیسے وہ بسترِ مرگ پر پڑی ہو، حالانکہ وہ کھانے کے کمرے میں میز پر بیٹھی تھی، جہاں مارچ کی چمکیلی دھوپ کھڑکیوں میں سے اندر آتی ہوئی پورے گھر میں بھر رہی تھی۔ جو شخص اس کے سامنے بیٹھا اپنی پُرسکون بھوک مٹا رہا تھا، بوڑھا یاکوب تھا جس نے اس سے اتنی محبت کی تھی، اور اتنے طویل عرصے سے کیے جا رہا تھا، کہ اسے کوئی ایسا دکھ درد یاد نہ تھا جس کا آغاز اس کی بیوی سے نہ ہوا ہو۔

''میں اس یقین کے ساتھ مرنا چاہتی ہوں کہ مجھے معقول لوگوں کی طرح سے زمین میں دفن کیا جائے گا،'' وہ کہتی رہی،''اور اس یقین کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں گھر گھر جا کر لوگوں سے

کہوں کہ مجھ پر رحم کھاؤ اور مجھے زندہ دفن کر دو۔''

''تمہیں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں،'' بوڑھے ہاکوب نے تمام تر سکونِ قلب کے ساتھ کہا۔ ''میں خود تمہیں گاڑ آؤں گا۔''

''تو پھر چلو، چلیں،'' وہ بولی، ''کیونکہ میں جلد ہی مر جاؤں گی۔''

بوڑھے ہاکوب نے اسکی طرف دیکھا؛ اس کی آنکھیں وہ واحد شے تھیں جن میں ابھی تک جوانی کی رمق باقی تھی۔ اس کے جوڑوں کی ہڈیوں میں گانٹھیں پڑ گئی تھیں اور اس کے چہرے پر ہل چلے ہوئے کھیت کا وہ تاثر تھا جو سچ پوچھیں تو اس پر ہمیشہ سے طاری تھا۔

''تم پہلے سے زیادہ ٹھیک لگ رہی ہو۔''

''کل رات مجھے گلابوں کی خوشبو آئی۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

''اس پر قطعی دھیان نہ دو،'' بوڑھے ہاکوب نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ ''ایسی چیزیں تو ہم غریبوں کے ساتھ روز ہوتی رہتی ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں،'' وہ بولی۔ ''میں نے ہمیشہ یہ دعا مانگی ہے کہ مجھے پہلے سے معلوم ہو جائے کہ میری موت کب آنے والی ہے تاکہ میں سمندر سے دور جا کر مروں۔ اس قصبے میں گلابوں کی خوشبو خدا کا پیغام ہی ہو سکتی ہے۔''

بوڑھا ہاکوب بس یہی سوچ سکا کہ اس سے چیزیں ٹھیک سے رکھنے کے لیے کچھ مہلت مانگ لے۔ اس نے سنا تھا کہ لوگ اس وقت نہیں مرتے جب انھیں مرنا چاہیے بلکہ اس وقت مرتے ہیں جب وہ مرنا چاہتے ہیں، اور وہ اپنی بیوی کی پیش گوئی سے بہت پریشان ہو گیا۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ وہ لمحہ آیا تو کیا وہ اسے زندہ دفن کر سکے گا''؟

نو بجے کے قریب اس نے وہ جگہ کھولی جہاں اس کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اس نے دو کرسیاں ڈالیں اور چھوٹی سی میز پر بساط بچھا کر دروازے کے پاس رکھ لی اور تمام صبح یہ کرتا رہا کہ جو بھی وہاں سے گزرتا اس سے ایک بازی کھیل لیتا۔ اپنے گھر میں بیٹھ کر اس نے کھنڈر ہوتے ہوئے تباہ حال قصبے کو دیکھا جس میں ان گزشتہ رنگوں کے آثار باقی تھے جنھیں اب دھوپ نے اور سڑک کے آگے بہتے سمندر نے چبا ڈالا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے وہ ہمیشہ کی طرح دون ماکسیمو گومیز کے ساتھ کھیلنے بیٹھا۔ بوڑھے ہاکوب کو اس شخص سے زیادہ نرم خو حریف نہیں مل سکتا تھا جو دو خانہ جنگیوں سے زندہ سلامت، اور تیسری میں ایک آنکھ گنوا کر بچ نکلا تھا۔ ایک بازی جان بوجھ کر ہارنے کے بعد

بوڑھے ہاکوب نے اسے دوسری کے لیے روک لیا۔

"ایک بات بتاؤ، دون ماکسیمو،" تب اس نے پوچھا۔ "کیا تم اپنی بیوی کو زندہ دفن کرنے کا یُوتا رکھتے ہو؟"

"یقیناً،" دون ماکسیمو گومیز نے جواب دیا۔ "اور میں جو کہہ رہا ہوں اس کا اعتبار کرلو کہ اس وقت میرا ہاتھ ذرا سا بھی نہ کانپے گا۔"

بوڑھا ہاکوب حیرت زدہ خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اپنی بہترین گوٹیں گنوا بیٹھنے کے بعد، اس نے ٹھنڈی سانس بھری:

"اچھا، مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ پیترا مرنے والی ہے۔"

دون ماکسیمو گومیز کے چہرے کا تاثر ذرا نہیں بدلا۔ "تو پھر،" اس نے کہا، "اسے زندہ دفن کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے دو گوٹیں اور پیٹ لیں اور ایک کو بادشاہ بنا دیا۔ پھر اداسی کی نمی سے بھیگی آنکھیں اپنے مدِ مقابل پر جما دیا۔

"کیا ہوا ہے اُسے؟"

"کل رات،" بوڑھا ہاکوب سمجھانے لگا، "اسے گلابوں کی خوشبو آئی۔"

"تب تو آدھا قصبہ مرنے والا ہے،" دون ماکسیمو گومیز نے کہا۔ "صبح سے سب یہی بات کررہے ہیں۔"

بوڑھے ہاکوب کے لیے دشوار تھا کہ اسے ناراض کیے بغیر ایک بازی اور ہار جائے۔ وہ میز اور کرسیاں اندر اٹھا لایا، دکان بند کی، اور سارے قصبے میں گھوم کر ان لوگوں کو ڈھونڈتا پھرا جنہوں نے یہ خوشبو سونگھی تھی۔ آخر میں جا کر صرف تو بیاس ہی ملا جسے خوشبو کا یقین تھا۔ سو بوڑھے ہاکوب نے اس سے درخواست کی کہ مہربانی کر کے اس کے گھر کی طرف سے ہوتا جائے، جیسے اتفاقاً وہاں سے گزر رہا ہو، اور اس کی بیوی کو یہ حال سنائے۔

تو بیاس نے یہی کیا۔ چار بجے کے قریب، اپنا اتوار والا بہترین لباس پہنے ہوئے، وہ وہاں نمودار ہوا جہاں برساتی کے تلے بوڑھی عورت دوپہر سے بیٹھی بوڑھے ہاکوب کے لیے رنڈ سالے کا جوڑا تیار کررہی تھی۔

وہ اتنی خاموشی سے چلتا ہوا آیا کہ بڑھیا سٹپٹا گئی۔

"خدا کی پناہ،" اس نے کہا۔ "میں سمجھی موت کا فرشتہ آگیا۔"

"اب تو دیکھ لیا کہ موت کا فرشتہ نہیں،" تو بیاس نے کہا، "بلکہ یہ میں ہوں، اور میں

تمہیں کچھ بتانے آیا ہوں۔''

اس نے عینک سنبھالی اور دوبارہ سلائی میں جٹ گئی۔

''مجھے پتا ہے کیا بات ہے،'' وہ بولی۔

''شرط لگا لو تمہیں نہیں پتا،'' توبیاس نے کہا۔

''تمہیں کل رات گلابوں کی خوشبو آئی تھی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' توبیاس نے ڈھئی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''میری جتنی عمر میں،'' وہ بولی،'' سوچنے کے لیے اتنا وقت بچ رہتا ہے کہ آدمی اچھا خاصا پیغمبر بن سکتا ہے۔''

بوڑھا یاکوب، جو دکان کے پچھواڑے دیوار سے کان لگائے کھڑا تھا، شرمندہ ہو گیا۔

''ارے عورت، دیکھ لیا!'' وہ دیوار کے پیچھے سے چلایا۔ پھر مڑا اور برساتی میں آ گیا۔''دیکھ لیا، تم جو سوچ رہی تھیں وہ نہیں نکلا۔''

''یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے،'' وہ سر اٹھائے بغیر بولی۔''اسے کوئی خوشبو نہیں آئی۔''

''کوئی گیارہ بجے ہوں گے،'' توبیاس نے کہا۔''میں کیکڑے بھگا رہا تھا۔''

بڑھیا نے گریبان ترپ کر سی دیا۔

''جھوٹ!'' وہ مصر رہی۔''سب کو پتا ہے تم بہت چالاک ہو۔'' اس نے اپنے دانتوں سے دھاگا توڑا اور عینک کے شیشوں میں سے توبیاس کو گھورنے لگی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے بالوں میں تیل چپڑ کر اور جوتے چمکا کر یہاں آنے کی زحمت صرف میری بے عزتی کرنے کے لیے کیوں اٹھائی۔''

اس وقت سے توبیاس سمندر پر نظر رکھنے لگا۔ اس نے اپنا جھولنا آنگن کے پاس برساتی میں ٹانگ لیا اور ساری رات انتظار کرتا اور حیران ہوتا رہا کہ جب لوگ سو جاتے ہیں تو دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ کئی راتوں تک وہ کیکڑوں کی مایوسانہ کھرکھراہٹ سنتا رہا کہ پنجوں کے بل مکان کی بنیادوں پر چڑھنا چاہ رہے تھے، یہاں تک کہ اتنی راتیں بیت گئیں کہ وہ کوشش کرتے کرتے ہار گئے۔ وہ کلوتیلدے کا سونے کا طریقہ جان گیا۔ اسے پتا چلا کہ اس کے سریلے خراٹے کس طرح گرمی کی بڑھتی ہوئی شدت کے ساتھ اونچے ہوتے جاتے، یہاں تک کہ جولائی کی گرم راتوں میں آلکسی کا ایک طویل، نڈھال سُر بن جاتے۔

توبیاس نے پہلے پہل سمندر پر اس طرح نظر رکھی جیسے وہ لوگ رکھتے ہیں جو سمندر کو خوب

اچھی طرح جانتے ہیں اور افق کے ایک مخصوص نقطے پر نظریں جمائے رہا۔ وہ سمندر کو رنگ بدلتے دیکھتا رہا۔ وہ دیکھتا رہا کہ سمندر اپنی روشنیاں گل کر رہا ہے، جھاگوں بھرا اور غلیظ ہوا جا رہا ہے، اور جب تند خو طوفانِ باد و باراں اس کا ہاضمہ بگاڑ دیتے تو وہ گندگی بھری الٹیاں کرنے لگتا۔ دھیرے دھیرے اس نے ان لوگوں کی طرح نظر رکھنا سیکھ لیا جو سمندر کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں، کہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن اسے سوتے میں بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

بوڑھے ہاکوب کی بیوی اگست میں مرگئی۔ اس کا سوتے میں دم نکل گیا اور لوگوں کو اسے، باقی تمام مردوں کی طرح، پھولوں سے عادی سمندر میں پھینکنا پڑا۔ تو بیاس انتظار کرتا رہا۔ وہ اتنے عرصے سے انتظار کر رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ ہوا بدل گئی ہے۔ وقفے وقفے سے ایک موج سی اٹھتی، اس وقت کی طرح جب ایک جاپانی جہاز اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سڑی ہوئی پیاز کا لداؤ گودی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ پھر بو گاڑھی ہوتی گئی اور صبح تک ہوا میں ٹھہر گئی۔ جب اسے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اس بو کو ہاتھوں سے اٹھا سکتا ہے اور دوسروں کو دکھا سکتا ہے، تبھی وہ اپنے جھولنے میں سے باہر لپکا اور کلوتیلدے کے کمرے میں آیا۔ اس نے کلوتیلدے کو جھنجوڑا۔

''یہ رہی،'' اس نے اسے بتایا۔

کلوتیلدے کو یہ بو مکڑی کے جالے کی طرح ہاتھ سے ہٹانی پڑی، تب وہ اٹھ سکی۔ پھر وہ نیم گرم چادروں پر ڈھیر ہو گئی۔

''خدا کی مار اس پر!'' وہ بولی۔

تو بیاس دروازے کی طرف لپکا، گلی میں آیا اور چیخنے لگا۔ وہ پورا زور لگا کر چیخا، لمبا سانس لیا اور پھر چیخا، اور پھر خاموشی چھا گئی، پھر اس نے اور گہرا سانس لیا اور سمندر پر خوشبو چھائی رہی۔ لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر وہ گھر گھر دروازے کھٹکھٹاتا پھرا، ان مکانوں کے بھی جن مکینوں کا پتا نہ تھا، یہاں تک کہ اس کا واویلا کتوں کے رونے میں خلط ملط ہو گیا اور اس نے سب کو جگا دیا۔

بہت سے لوگ کچھ نہ سونگھ پائے۔ مگر باقی لوگ، خاص طور پر بڑے بوڑھے، اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ساحل پر چلے گئے۔ یہ ایسی دبیز اور تہہ دار بو تھی کہ ماضی کی کسی اور خوشبو کے لیے ذرا سی بھی گنجائش نہ چھوڑتی تھی۔ بعض لوگ سونگھ سونگھ کر اکتا گئے اور گھر چلے گئے۔ زیادہ تر لوگ اپنی باقی ماندہ نیند پوری کرنے کے لیے ساحل پر ٹھہر گئے۔ صبح ہونے تک خوشبو میں اس قدر نکھار آ گیا تھا کہ سانس لیتے ہوئے بھی دل دکھتا تھا۔

تو بیاس دن بھر سوتا رہا۔ کلوتیلدے قیلولے کے وقت اس کے ساتھ جا گھسی اور انھوں نے ساری دوپہر بستر میں خرمستیاں کرتے ہوئے گزاری اور صحن کا دروازہ بھیڑنے کی بھی پروا نہیں کی۔ پہلے انھوں نے کیچوؤں کی طرح کیا، پھر خرگوشوں کی طرح، اور آخر میں کچھوں کی طرح کیا، یہاں تک کہ دنیا پر اداسی چھا گئی اور پھر سے اندھیرا ہو گیا۔ ہوا میں گلابوں کا خفیف سا شائبہ ابھی تک تھا۔ کبھی کبھار موسیقی کی لہر خواب گاہ تک آئی۔

''کا تارینو کے ہاں سے آ رہی ہے،'' کلوتیلدے نے کہا۔ ''کوئی آیا ہوگا قصبے میں۔''

ایک عورت اور تین مرد آئے تھے۔ کا تارینو نے یہ سوچ کر کہ شاید بعد میں اور لوگ آئیں، اپنا گراموفون ٹھیک کرنا چاہا۔ جب وہ یہ کام نہیں کر سکا تو اس نے پانچو اپا ریسیدوسے کہا، جو ہر طرح کا کام کر لیا کرتا تھا، کیونکہ کوئی چیز کبھی اس کی ملکیت نہیں رہی تھی، اور پھر اس کے پاس اوزاروں کا صندوق اور ہاتھوں میں پھرتی تھی۔

کا تارینو کا ٹھکانا لکڑی کی ایک الگ تھلگ عمارت میں تھا جو سمندر کے رخ پر تھی۔ اس میں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں بنچیں اور چھوٹی میزیں بچھی تھیں اور پیچھے کی طرف کئی کمرے شب بسری کے لیے تھے۔ پانچو کو کام کرتا دیکھتے، وہ عورت اور تینوں مرد شراب خانے میں بیٹھے خاموشی سے پیتے رہے اور باری باری جمائیاں لیتے رہے۔

کئی دفعہ کی کوششوں کے بعد گراموفون بج اٹھا۔ جب لوگوں نے موسیقی کی دور سے آتی ہوئی مگر واضح آواز سنی تو باتیں بند کر دیں۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گئے، کہ اس وقت کہیں جا کر انھیں احساس ہوا کہ آخری بار جب انھوں نے موسیقی سنی تھی تب سے لے کر اب تک وہ کتنے بوڑھے ہو چکے ہیں۔

تو بیاس کو تمام لوگ نو بجے کے بعد بھی جاگتے ہوئے ملے۔ وہ اپنے دروازوں کی دہلیز پر بیٹھے کا تارینو کے پرانے ریکارڈ سن رہے تھے اور چہروں پر بچوں کے سے توکل کا تاثر تھا گویا گرہن کو دیکھ رہے ہوں۔ ہر گیت پر انھیں کچھ نہ کچھ یاد آنے لگتا۔ وہ لوگ جو مر گئے! بہت لمبی بیماری سے اٹھ کر کھانا کھانے کا مزہ یا کوئی کام جو برسوں پہلے انھیں اگلے دن کرنا تھا اور کبھی نہ کر پائے کیونکہ اس کے بارے میں بھول چکے تھے۔

موسیقی گیارہ بجے کے قریب بند ہوئی۔ بہت سے لوگ، یہ سوچ کر کہ بارش ہوگی، جا کر سو گئے کیونکہ سمندر پر گھنا بادل چھایا ہوا تھا۔ مگر بادل نیچے اُتر آیا، کچھ دیر سطحِ سمندر پر تیرتا رہا، اور پھر پانی میں ڈوب گیا۔ اوپر بس ستارے رہ گئے۔ ذرا دیر میں ہوا قصبے سے باہر کی سمت چلی، اور

واپس آئی تو گلابوں کی خوشبو لیے ہوئے تھی۔

''دیکھا، میں نے تم سے کیا کہا تھا ہاکوب!'' دون ماکسیمو گومیز چلایا۔''خوشبو ہمارے پاس لوٹ آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ ہر رات ہمارے ساتھ ہوگی۔''

''خدا نہ کرے،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔'' یہ خوشبو واحد چیز ہے جو میری زندگی میں اس وقت آئی ہے جب بہت دیر ہو چکی۔''

وہ دونوں موسیقی کے ریکارڈوں پر کوئی توجہ دیے بغیر، خالی دکان میں بیٹھے گوٹین کھیلتے رہے۔ان کی یادیں اتنی قدیمی تھیں کہ ان کو جگانے کے لیے اتنے پرانے ریکارڈ بھی نہیں تھے۔

''جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ان چیزوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتا،'' دون ماکسیمو گومیز نے کہا۔''اتنے برس خاک پھانکنے کے بعد، اور پھول اُگانے کی ذرا سی کھلی جگہ کے لیے اتنی عورتوں کے خواہش کرنے کے بعد، یہ عجیب بات نہیں کہ آدمی ایسی خوشبو سونگھنے لگے اور اسے سچ بھی سمجھنے لگے۔''

''مگر ہم سب نے خود اسے اپنی ناک سے سونگھا ہے،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،'' دون ماکسیمو گومیز نے کہا۔''جنگ کے زمانے میں، جب انقلاب ہو چکا تھا، تو ہم ایک جنرل کی اتنی شدید ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ ہم نے ڈیوک آف مارلبرو کو گوشت پوست کی حالت میں ظاہر ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، ہاکوب۔''

آدھی رات بیت چکی تھی۔ اکیلے رہ جانے کے بعد ہاکوب نے دکان بند کی اور لیمپ لے کر کمرے میں آ گیا۔ اسے کھڑکی میں سے، سمندر کی سرخی میں گھری وہ گھاٹی دکھائی دی جہاں سے لوگ اپنے مردے سمندر میں پھینکا کرتے تھے۔

''پیترا!'' اس نے دھیرے سے پکارا۔

وہ اس کی آواز نہیں سن سکتی تھی۔ اس لمحے وہ دوپہر کی چمکدار دھوپ میں تقریباً سطح پر بہتی بہتی خلیج بنگال جا پہنچی تھی۔ اس نے ایک بڑے سے بحری جہاز کو دیکھنے کے لیے اپنا سر پانی سے یوں اُٹھایا جیسے روشنی سے جگمگ کرتے شوکیس میں جھانک رہی ہو۔ مگر وہ اپنے شوہر کو نہیں دیکھ سکی جسے اس لمحے دنیا کے دوسرے سرے پر دوبارہ کا تاریسو کے گراموفون کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

''ذرا سوچو،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔'' صرف چھ مہینے پہلے یہ لوگ تمہیں پاگل سمجھتے تھے اور اب خود اسی خوشبو کا میلہ لگا رہے ہیں جو تمہارے لیے موت کا پیغام تھی۔''

اس نے بتی بجھا دی اور بستر میں لیٹ گیا۔ وہ اس بھونڈے انداز میں دریا کر دھیرے دھیرے رونے لگا جو بوڑھوں سے مخصوص ہے، لیکن جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

''میں اس قصبے سے اگر نکل سکتا تو نکل جاتا'' وہ کروٹیں لیتے میں سسکیاں بھرتا رہا۔''میں سیدھا جہنم چلا جاتا، یا کہیں بھی اور، بس اگر میرے پاس بیس پیسو جمع ہو جاتے۔''

اُس رات کے بعد متواتر کئی ہفتوں تک خوشبو سمندر پر طاری رہی۔ خوشبو مکانوں کی لکڑی میں بس گئی؛ غذا میں، پینے کے پانی میں، کہیں اس سے مفر نہیں تھا۔ کئی لوگ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے کہ یہ خوشبو ان کے فضلے کے اخراجات میں موجود تھی۔ وہ تین مرد اور ایک عورت جو کارتارینو کے ہاں آئے ہوئے تھے، ایک جمعے کو چلے گئے، لیکن ہفتے کو پورا ایک مجمع ساتھ لے کر پھر واپس آ گئے۔ اتوار کے دن اور لوگ آ گئے۔ وہ ہر جگہ اندر باہر آ جا رہے تھے، چیونٹیوں کی طرح، اور کھانا اور سونے کی جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے، یہاں تک کہ گلیوں میں چلنا ناممکن ہو گیا۔

اور لوگ آنے لگے۔ وہ عورتیں جو قصبے کے مردہ پڑ جانے کے بعد چلی گئی تھیں، کارتارینو کے ہاں لوٹ آئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ فربہ ہو گئی تھیں، زیادہ سنگھار کیے ہوئے تھیں، اور تازہ ترین گیتوں کے ریکارڈ لے کر آئی تھیں، جنھیں سن کر کسی کو کوئی پرانی بات یاد نہ آتی تھی۔ قصبے کے بعض پرانے باشندے واپس آ گئے، جو غلاظت کی حد تک دولت مند ہونے کہیں اور چلے گئے تھے، اور واپس آ کر اپنی جمع پونجی کی باتیں کرنے لگے، مگر کپڑے وہی پہنے ہوئے تھے جو پہن کر یہاں سے گئے تھے۔ سازندے اور کھیل تماشے آنے لگے، قسمت کے چکر، تقدیر کا حال بتانے والے اور بندوق باز اور گردن پر موٹے موٹے سانپ لپیٹے ہوئے سپیرے جو بوتلوں میں آبِ حیات بیچ رہے تھے۔ ہفتوں ان کی آمد کا سلسلہ رہا، موسم کی پہلی بارشوں کے بعد بھی جب سمندر طوفانی ہو گیا اور خوشبو غائب ہو گئی۔

ایک پادری آخری آنے والوں میں تھا۔ وہ سارے میں پھرتا پھرا، ہلکی کافی میں روٹی ڈبو ڈبو کر کھاتا رہا، اور ایک ایک کر کے اس نے ہر چیز کو جو اس کے سامنے آئی، خلافِ شرع قرار دے دیا۔ داؤ لگانے والے کھیل، نئے گیتوں کی موسیقی اور اس پر ناچنے کی گت، اور ساحل پر سونے کی نئی رسم۔ ایک شام، میلچور کے گھر، اس نے سمندر کی خوشبو کے موضوع پر ایک وعظ کیا۔

''شکر ادا کرو، میرے بچو،'' اس نے کہا، ''کہ یہ خدا کی خوشبو ہے۔''

کسی نے اسے بیچ میں ٹوک دیا۔

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں، مقدس باپ؟ آپ نے تو ابھی اسے سونگھا تک نہیں۔''

"خدا کا کلام،" اس نے جواب دیا، "خوشبو کے باب میں بہت واضح ہے۔ ہم خدا کے منتخب گاؤں میں رہ رہے ہیں۔"

توبیاس اس میلے میں یوں آتا جاتا رہا جیسے نیند میں چل رہا ہو۔ وہ کلوتیلدے کو یہ دکھانے کے لیے لے گیا کہ پیسہ کیا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے سوانگ رچایا کہ وہ رُولیٹ پر بے تحاشا رقم لگا رہے ہیں۔ اور وہ یوں ہی فرض کرنے لگے اور یہ سوچ کر کہ وہ اتنا بہت سا روپیہ جیت سکتے ہیں، اپنے آپ کو بہت دولت مند سمجھنے لگے۔ مگر ایک رات، انھوں نے ہی نہیں تمام مجمعے نے اتنا پیسہ ایک جگہ دیکھا کہ وہ اس کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہ وہ رات تھی جب مسٹر ہربرٹ کی آمد ہوئی۔ وہ اچانک آگئے، گلی کے بیچوں بیچ میز بچھائی، اور میز پر دو بڑے بڑے صندوق رکھ دیے جو چوٹی تک نوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اتنا زیادہ روپیہ تھا کہ پہلے پہل کسی نے اس پر توجہ نہیں دی، کیونکہ انھیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ حقیقت ہو سکتی ہے۔ لیکن جب مسٹر ہربرٹ نے چھوٹی سی گھنٹی بجانی شروع کر دی تو لوگوں کو اعتبار کرنا پڑا اور وہ سننے چلے آئے۔

"میں دنیا کا امیر ترین آدمی ہوں،" انھوں نے کہا۔ "میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میرے پاس رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ اور پھر میرا دل اتنا بڑا ہے کہ میرے سینے میں اس کے لیے جگہ نہیں بچی ہے، اس لیے میں دنیا کے سفر پر نکلا ہوں تاکہ انسانیت کی مشکلیں آسان کروں۔"

ان کا قد اونچا اور رنگت سرخ و سفید تھی، وہ رُکے بغیر اونچی آواز میں بولتے اور بولنے کے دوران اپنے نیم پُرجوش، ست ہاتھوں کو گردش دیتے رہتے، اور ان کے ہاتھ یوں لگتے جیسے ابھی ابھی ان کے بال مونڈے گئے ہوں۔ وہ پندرہ منٹ تک بولتے رہے، پھر آرام کرنے لگے۔ پھر انھوں نے گھنٹی بجائی اور دوبارہ بولنے لگے۔ تقریر کے عین درمیان میں مجمعے میں سے کسی نے ٹوپی لہرائی اور بول پڑا۔

"چلو میاں، اتنی باتیں نہ بناؤ۔ مال بانٹنا شروع کرو۔"

"اتنی جلدی نہیں،" مسٹر ہربرٹ نے جواب دیا۔ "یوں بلا بات کے پیسے بانٹنا نہ صرف کام کرنے کا نامناسب طریقہ ہے بلکہ اس میں کوئی تک بھی نہیں ہے۔"

آنکھوں آنکھوں میں انھوں نے مجمعے میں سے اس آدمی کو ڈھونڈ نکالا جو ان کی تقریر کے بیچ میں بول پڑا تھا، اور اس کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ مجمعے نے اسے آگے آنے کا راستہ دے دیا۔

"بلکہ،" مسٹر ہربرٹ نے کہا، "ہمارے یہ بے صبرے دوست خود ہمیں یہ موقع فراہم کریں

گے کہ ہم لوگوں کو دولت کی تقسیم کا سب سے زیادہ منصفانہ طریقہ سمجھائیں۔'' انھوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس آدمی کو اوپر بلا لیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''پیتر ینچو۔''

''اچھا تو پیتر ینچو'' مسٹر ہربرٹ نے کہا،'' سب لوگوں کی طرح تمہاری بھی کوئی مشکل ہے جو تم بہت دیر سے حل نہیں کر پا رہے ہو۔''

اس نے ٹوپی اتار دی اور اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا مشکل ہے؟''

''میری مشکل یہ ہے،'' پیتر ینچو نے کہا،'' کہ میرے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں۔''

''تمہیں کتنے کی ضرورت ہے؟''

''اڑتالیس پیسو۔''

مسٹر ہربرٹ نے فاتحانہ نعرہ مارا''اڑتالیس پیسو،'' انھوں نے دہرایا۔ مجمع تالیاں بجانے میں ان کا ساتھ دینے لگا۔

''بہت خوب، پیتر ینچو،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا۔'' اب ہمیں ایک بات بتاؤ۔ تم کر کیا سکتے ہو؟''

''بہت سی چیزیں۔''

''ایک کا فیصلہ کرلو،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا،'' جو تم سب سے اچھی طرح کر سکتے ہو۔''

''اچھا،'' پیتر ینچو بولا،'' چڑیاں بننا!''

مسٹر ہربرٹ نے ایک بار پھر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے اور مجمعے کی طرف رخ پھیرا

-

''اچھا تو خواتین و حضرات، ہمارے دوست پیتر ینچو، جو پرندوں کی نقل اتارنے کا کام غیر معمولی مہارت سے کرتے ہیں، اس وقت اڑتالیس مختلف پرندوں کی نقل اتاریں گے اور اس طرح اپنی زندگی کی مشکل آسان کرلیں گے۔''

تب، مجمعے کی حیرت زدہ خاموشی کے سامنے، پیتر ینچو چڑیاں بننے لگا۔ کبھی سیٹی بجاتا، کبھی حلق سے گنگناتا، اس نے تمام جانے پہچانے پرندوں کی نقل اتاری، اور پھر ایسی آوازیں نکال کر یہ تعداد مکمل کی جنھیں کوئی نہ پہچان سکا۔ جب وہ یہ کام کر چکا تو مسٹر ہربرٹ نے مجمعے سے تالیاں

بجانے کو کہا اور اڑتالیس پیسو اس کے حوالے کر دیے۔

''اور اب،'' وہ بولے،''ایک ایک کر کے آتے جاؤ۔ میں کل اسی وقت تک یہاں لوگوں کی مشکلیں آسان کرتا رہوں گا۔''

بوڑھے ہاکوب کو اس افراتفری کا اندازہ اپنے گھر کے سامنے سے گزرنے والوں کی بات چیت سے ہوا۔ ہر فقرے کے ساتھ اس کا دل بڑھتا گیا، بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اسے لگا پھٹ جائے گا۔

''تمہارا کیا خیال ہے اس گرینگو کے بارے میں؟'' اس نے پوچھا۔

دون ماکسیمو گومیز نے کندھے اُچکا دیے۔ ''کوئی سخی سیٹھ ہوگا۔''

''کاش میں بھی کچھ کر سکتا،'' بوڑھا ہاکوب بولا ''میں بھی اپنی چھوٹی سی مشکل آسان کر لیتا۔ زیادہ نہیں ہے، صرف بیس پیسو۔''

''تم گوٹیں اچھی کھیل سکتے ہو،'' دون ماکسیمو گومیز نے کہا۔

بظاہر یوں لگا کہ بوڑھے ہاکوب نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی، لیکن اکیلا ہوتے ہی اس نے گوٹوں کا ڈبا اور بساط اخبار میں لپیٹی، اور مسٹر ہربرٹ نے اپنے صندوق بند کروا دیے اور اگلی صبح تک کے لیے خدا حافظ کہہ دیا۔

وہ سونے کے لیے نہیں گئے۔ وہ ساتھ میں صندوق اٹھانے والوں کو لیے کارتارینو کے ہاں پہنچ گئے، اور مجمع سارے راستے ان کے پیچھے پیچھے اپنی مشکلیں لیے چلاتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ ان کی مشکلیں حل کرتے گئے اور انھوں نے اتنی مشکلیں آسان کیں کہ آخر میں دکان کے اندر عورتیں اور چند مرد رہ گئے تھے، اور ان کی بھی مشکلیں آسان ہو چکی تھیں۔ اور کمرے کے پچھلے حصے میں ایک تنہا عورت گتّے کے اشتہار سے اپنے آپ کو دھیرے دھیرے پنکھا جھل رہی تھی۔

''اور تم،'' مسٹر ہربرٹ نے چلا کر اس سے پوچھا،''تمہاری کیا مشکل ہے؟''

عورت نے پنکھا جھلنا بند کر دیا۔

''مجھے اپنے تماشے میں پھانسنے کی کوشش نہ کرو مسٹر گرینگو،'' وہ کمرے کے دوسرے سرے سے چلائی۔ ''میری کسی قسم کی کوئی مشکل نہیں ہے، اور میں رنڈی ہوں کیونکہ میرے پیڑو کی آنچ بہت تیز ہے۔''

مسٹر ہربرٹ نے کندھے اُچکا دیے۔ وہ اپنے کھلے صندوق کے ساتھ بیٹھے ٹھنڈی بیئر پیتے رہے اور اَور مشکلوں کا انتظار کرتے رہے۔ اُنھیں پسینہ آ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد ایک عورت ان لوگوں

سے کٹ کر آ گئی جو اس کے ساتھ میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور نیچی آواز میں اس سے کچھ کہنے لگی۔ اسے پانچ سو پیسو کی مشکل تھی۔

''تم اس کا حساب کیسے کرو گی؟''

''پانچ پانچ کر کے۔''

''ذرا سوچو،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا،''یہ سو آدمی ہو گئے۔''

''کوئی بات نہیں،'' وہ بولی۔''اگر مجھے یہ پوری رقم مل جائے تو یہ میری زندگی کے آخری سو مرد ہوں گے۔''

مسٹر ہربرٹ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ کافی نو عمر تھی۔ اس کی ہڈیاں نرم تھیں مگر آنکھوں میں سیدھا سادا عزم جھلک رہا تھا۔

''ٹھیک ہے،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا،''اپنے کمرے میں چلی جاؤ اور میں تمہارے پاس آدمی بھیجنا شروع کرتا ہوں۔ ہر ایک تمہیں پانچ پیسو دے گا۔''

وہ گلی میں آئے اور گھنٹی بجانے لگے۔

صبح سات بجے تو بیاس کو کاتارینو کی دکان کھلی ہوئی ملی۔ ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ مسٹر ہربرٹ، نیند میں ڈوبے اور بیئر سے پھولے ہوئے، لڑکی کے کمرے میں مردوں کے داخلے کی نگرانی کر رہے تھے۔

تو بیاس اندر چلا گیا۔ لڑکی نے اسے پہچان لیا اور اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی،''تم بھی؟''

''انھوں نے مجھ سے کہا کہ اندر چلے جاؤ،'' تو بیاس بولا۔''مجھے پانچ پیسو دیے اور کہا کہ زیادہ دیر نہ لگانا۔''

لڑکی نے بستر پر سے گیلی چادر اتاری اور تو بیاس سے کہا کہ دوسرا سرا پکڑ لے۔ چادر ترپال کی طرح بھاری ہو رہی تھی۔ وہ اس کے دونوں سرے مروڑ کر اسے نچوڑنے لگے یہاں تک کہ وہ پہلے کی طرح ہلکی ہو گئی۔ پھر انھوں نے گدا پلٹا اور گدے کی دوسری طرف سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ تو بیاس جو کچھ کر سکتا تھا اس نے کیا۔ جاتے وقت اس نے پانچ پیسو نوٹوں کے اس ڈھیر پر رکھ دیے جو بستر کے پاس دھیرے دھیرے بلند ہوتا جا رہا تھا۔

''جس جس کو بھیج سکتے ہو بھیج دو،'' مسٹر ہربرٹ نے اس سے کہا۔''دیکھیں اگر یہ معاملہ دوپہر سے پہلے نبٹ جائے۔''

لڑکی نے دروازہ ذرا سا کھولا اور ٹھنڈی بیئر مانگی۔ اس وقت تک کئی لوگ منتظر کھڑے تھے۔

"کتنے اور رہ گئے؟" اس نے پوچھا۔

"تریسٹھ" مسٹر ہربرٹ نے جواب دیا۔

بوڑھا ہاکوب تمام دن بغل میں ڈبا تھامے ان کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ اس کی باری کہیں رات گئے آئی اور اس نے اپنی مشکل بیان کر دی، اور مسٹر ہربرٹ اس کی بات مان گئے۔ انھوں نے دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز گلی میں بچھی ہوئی بڑی میز پر رکھ دیں اور بوڑھے ہاکوب نے پہلی چال چلی۔ یہ آخری بازی تھی جس کی وہ پیش بندی کر سکا۔ وہ ہار گیا۔

"چالیس پیسو" مسٹر ہربرٹ نے کہا، "اور اس دفعہ میں تمھیں دو چالوں سے مات دوں گا۔"

وہ پھر جیت گئے۔ ان کے ہاتھ گوٹوں پر ٹکتے ہوئے بھی نظر نہ آتے۔ پھر وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر، محض اپنے مدمقابل کی چالوں کا اندازہ لگا کر کھیلنے لگے، اور پھر بھی جیت گئے۔ مجمع کھیل دیکھتے دیکھتے اکتا گیا۔ جب بوڑھے ہاکوب نے ہار مانی تو اس وقت تک وہ کوئی پانچ ہزار سات سو بیالیس پیسو اور تیئس سینٹ کے برابر رقم کا مقروض ہو چکا تھا۔

ان کے چہرے کا تاثر ذرا نہیں بدلا۔ انھوں نے یہ رقم کاغذ کے پرزے پر لکھ لی، جو اُن کی جیب میں پڑا ہوا تھا۔ پھر انھوں نے بساط تہہ کی، گوٹیں ڈبے میں ڈالیں، اور ساری چیزیں اخبار میں لپیٹ لیں۔

"میرے ساتھ جو جی چاہے کرو،" اس نے کہا، "مگر یہ چیزیں میرے پاس رہنے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمام زندگی محنت کر کے تمہارا ایک ایک سینٹ چکا دوں گا۔"

مسٹر ہربرٹ نے گھڑی دیکھی۔

"مجھے بہت افسوس ہے،" وہ کہنے لگے، "تمہارے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔" وہ انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ انھیں یقین ہو گیا کہ ان کے حریف کو کوئی حل نہیں ملا۔ "تمہارے پاس داؤ پر لگانے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہے؟"

"میری عزت۔"

"میرا مطلب ہے،" مسٹر ہربرٹ نے سمجھایا، "کوئی ایسی چیز جس پر رنگ میں ڈوبا ہوا برش پھیرا جائے تو اس کا رنگ بدل جائے۔"

''میرا مکان،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا، جیسے کوئی پہیلی بوجھ رہا ہو۔ ''زیادہ مالیت کا نہیں ہے، لیکن مکان تو ہے۔''

تو اس طرح مسٹر ہربرٹ نے بوڑھے ہاکوب کے مکان کا قبضہ سنبھال لیا۔ انھوں نے ان لوگوں کے مکان اور جائیدادیں بھی حاصل کرلیں جو اپنے قرضے ادا نہیں کر سکے، لیکن انھوں نے ہفتے بھر کے لیے گانے بجانے، آتش بازی اور نٹوں کے کھیل تماشوں کا اعلان کیا اور سارے انتظامات خود سنبھال لیے۔

یہ بہت یادگار دن تھے۔ مسٹر ہربرٹ نے قصبے میں معجزانہ تبدیلی کی بات کی بلکہ مستقبل کے شہر کا نقشہ کھینچ ڈالا، شیشے کی عظیم الشان عمارتیں جن کی اوپری منزلوں پر رقص گاہیں تھیں۔ وہ مجمعے کو نقشہ دکھاتے رہے۔ لوگ حیران ہو کر دیکھتے رہے، اپنے آپ کو ان پیدل راہ گیروں میں تلاش کرتے رہے جن کا خاکہ مسٹر ہربرٹ نے اپنے رنگوں میں کھینچا تھا، مگر اس تصویر کے لوگ اتنے عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ یہ لوگ خود کو پہچان نہ پائے۔ انھیں مسٹر ہربرٹ سے یوں فائدہ اٹھاتے ہوئے دکھ ہوا۔ وہ یہ بات یاد کر کے ہنستے رہے کہ وہ اکتوبر میں روئے دے رہے تھے، اور امید کے دھندلکے میں رہتے رہے، یہاں تک کہ مسٹر ہربرٹ نے گھنٹی بجا کر تماشے کے ختم ہونے کا اعلان کیا۔ تب کہیں جا کر مسٹر ہربرٹ کو آرام کرنے کا موقع ملا۔

''تم اس طرح زندگی گزارتے رہے تو مر جاؤ گے،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔

''میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میرے مرنے کی کوئی وجہ نہیں،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ وہ بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ بہت دنوں تک سوتے، شیر کی طرح خراٹے لیتے رہے، اور اتنے دن گزر گئے کہ لوگ ان کے جاگنے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ لوگوں کو غذا کی تلاش میں کیکڑے کھود کر نکالنے پڑے۔ کاتارینو کے نئے ریکارڈ اتنے پرانے ہو گئے کہ جو بھی انھیں سنتا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے، اور اسے اپنی دکان بند کرنی پڑتی۔

مسٹر ہربرٹ کو سوئے ہوئے بہت وقت بیت چکا تھا کہ پادری نے بوڑھے ہاکوب کے دروازے پر دستک دی۔ گھر کا دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ چونکہ سوتے ہوئے آدمی کے تنفس نے تمام ہوا کھینچ کر استعمال کرلی تھی، اس لیے چیزیں بے وزن ہو کر فضا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔

''مجھے ان سے ایک بات کہنی ہے،'' پادری نے کہا۔

''آپ کو انتظار کرنا پڑے گا،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''تشریف رکھیے پادری صاحب ، اور انتظار کیجیے'' بوڑھے ہاکوب نے دہرایا،''اور براہِ مہربانی اس وقت تک مجھ سے باتیں کیجیے۔ بہت دن ہو گئے مجھے پتا نہیں چلا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔''

''سب لوگ بکھر گئے،'' پادری نے کہا۔'' زیادہ دن نہیں جاتے کہ قصبہ بالکل ویسا ہی ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔ بس یہی ایک خبر ہے۔''

''لوگ پھر واپس آجائیں گے جب سمندر سے گلابوں کی خوشبو آنے لگے گی،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔

''لیکن اس دوران ہمیں یہاں رہ جانے والوں کے فریبِ نظر کو کسی نہ کسی چیز سے برقرار رکھنا ہوگا۔'' پادری نے کہا۔'' یہ بہت ضروری ہے کہ ہم فوراً گرجا کی تعمیر شروع کر دیں۔''

''تو آپ اس لیے مسٹر ہربرٹ سے ملنے آئے ہیں۔'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔

''بالکل درست،'' پادری نے کہا۔'' گرینگو دل کے بہت سخی ہوتے ہیں۔''

''تو پھر ذرا انتظار کیجیے، مقدس باپ،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔'' شاید وہ جاگ ہی جائیں ۔''

وہ گوٹیں کھیلنے لگے۔ یہ بہت طویل اور پیچیدہ بازی تھی جو کئی دنوں تک چلتی رہی، مگر مسٹر ہربرٹ سو کر نہ اٹھے۔

پادری مایوسی کے ہاتھوں الجھن میں پڑ گیا۔ وہ تانبے کی طشتری لیے گرجے کی تعمیر کے لیے چندہ مانگتا سارے میں پھرتا رہا لیکن اسے کوئی خاص رقم نہیں ملی۔ وہ اتنی بھیک مانگنے سے روز بروز پُرنور ہوا جا رہا تھا، اس کی ہڈیوں میں آوازیں سمائی جا رہی تھیں، اور ایک اتوار کو وہ زمین سے دو ہاتھ اوپر اٹھ گیا، مگر کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ پھر اس نے ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے ڈالے، دوسرے میں جمع کی ہوئی رقم ڈالی اور ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔

''وہ خوشبو واپس نہیں آئے گی،'' اس نے ان دوستوں سے کہا جنھوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔'' تم لوگوں کو اس حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے کہ قصبہ گناہ میں مبتلا ہو گیا ہے۔''

جب مسٹر ہربرٹ جاگے تو قصبہ ویسا ہی تھا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا۔ بارش نے کوڑے کے ان ڈھیروں کو سڑا دیا تھا جو ہجوم گلیوں میں چھوڑ گیا تھا، اور زمین ایک بار پھر بنجر اور اینٹ کی طرح سخت ہو گئی تھی۔

''میں دیر تک سوتا رہا،'' مسٹر ہربرٹ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''صدیوں تک،'' بوڑھے ہاکوب نے کہا۔

''بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔''

''سب کی یہی حالت ہے۔'' بوڑھے ہاکوب نے کہا، ''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ساحل پر جائیں اور کیکڑے ڈھونڈنے کے لیے زمین کھودیں۔''

جب توبیاس کی ان سے ملاقات ہوئی تو وہ زمین کھود رہے تھے اور ان کے منھ سے جھاگ نکل رہا تھا، اور توبیاس کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ جب دولت مند لوگ فاقے میں مبتلا ہوتے ہیں تو وہ بڑی حد تک غریبوں کی طرح لگتے ہیں۔ مسٹر ہربرٹ کو زیادہ کیکڑے نہیں ملے۔ رات پڑنے پر انھوں نے توبیاس کو کھانے کی چیزیں ڈھونڈنے کے لیے سمندر کی تہوں میں چلنے کی دعوت دی۔

''سنو،'' توبیاس نے انھیں خبردار کیا۔ ''صرف مُردوں کو معلوم ہے کہ وہاں گہرائی کے اندر کیا ہے۔''

''سائنس دانوں کو بھی پتا ہے،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا، ''ڈوبے ہوئے لوگوں کے سمندر کی تہہ میں کچھوے ہیں جن کا گوشت بہت عمدہ ہوتا ہے۔ چلو، کپڑے اتارو اور چلتے ہیں۔''

وہ چلے گئے۔ پہلے پہل وہ سیدھے سیدھے تیرتے رہے، پھر نیچے بہت گہرائیوں میں، جہاں پہلے سورج کی روشنی ختم ہوئی اور پھر سمندر کی، اور چیزیں اپنی ہی روشنی میں نظر آنے لگیں۔ وہ ایک غرقاب گاؤں کے پاس سے گزرے جہاں مرد اور عورتیں گھوڑوں پر بیٹھے موسیقی کی تال پر گھوم رہے تھے۔ وہ ایک شاندار دن تھا اور برآمدوں میں شوخ رنگ پھول کھلے تھے۔

توبیاس گاؤں کی طرف مڑنے لگا مگر مسٹر ہربرٹ نے اسے اشارہ کیا کہ نیچے ہی نیچے جانا ہے۔

''وہاں گلاب ہیں،'' توبیاس بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ کلوتیلدے کو بھی پتا لگ جائے کہ گلاب کیسے ہوتے ہیں۔''

''تم یہاں کسی اور دن فرصت سے آجانا،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ ''اس وقت تو میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔''

مسٹر ہربرٹ ہاتھوں اور بازوؤں کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے، آکٹوپس کی طرح نیچے جاتے رہے۔ توبیاس جو پوری کوشش کر رہا تھا کہ انھیں آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے، یہ سوچنے لگا کہ امیر آدمیوں کے تیرنے کا یہی طریقہ ہوتا ہوگا۔ رفتہ رفتہ وہ معمولی آفات کے سمندر کو

پیچھے چھوڑتے جارہے تھے اور مُردوں کے سمندر میں داخل ہو رہے تھے۔

وہاں اتنی بڑی تعداد میں مردے تھے کہ توبیاس نے سوچا کہ میں نے دنیا میں اتنے آدمی کبھی نہیں دیکھے۔ سارے مُردے بے حس و حرکت بہتے چلے جا رہے تھے، چہرے اوپر کیے، مختلف سطحوں پر بہتے ہوئے، اور ان سب پر بھولی بسری ارواح کا تاثر تھا۔

''یہ سب بہت پرانے مردے ہیں۔'' مسٹر ہربرٹ نے کہا، ''انھیں صدیاں لگ گئیں تب جا کر استراحت کی اس حالت کو پہنچے۔''

اس سے اور نیچے، تازہ تر مُردوں کے پانیوں میں پہنچ کر مسٹر ہربرٹ رک گئے۔ توبیاس اس لمحے ان کے پاس آ کر رکا جب ایک بہت نوعمر عورت ان کے سامنے سے گزری۔ وہ پہلو کے بل تیر رہی تھی، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پیچھے پیچھے پھولوں کی موج تھی۔

مسٹر ہربرٹ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور اس وقت تک رکھے رہے جب تک کہ آخری پھول سامنے سے بہہ نہ گئے۔

''میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ حسین عورت نہیں دیکھی۔'' انھوں نے کہا۔

''یہ بوڑھے ہاکوب کی بیوی ہے،'' توبیاس بولا۔ ''اس کی عمر پچاس سال کم ہو گئی ہے، مگر یہ ہے وہی۔ مجھے یقین ہے۔''

''اس نے بہت سفر کیا ہے،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا، ''اس کے پیچھے دنیا کے تمام سمندروں کے پھول ہیں۔''

وہ تہہ تک پہنچ گئے۔ مسٹر ہربرٹ نے زمین پر دو تین چکر لگائے جو چمکدار چٹان کی طرح لگ رہی تھی۔ توبیاس نے ان کی پیروی کی۔ جب وہ تہہ کی نیم روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو گیا تو اس نے دیکھا کہ اردگرد کچھوے ہی کچھوے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں، تہہ میں چپکے ہوئے اور اس قدر بے حس و حرکت کہ پتھرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

''یہ زندہ ہیں،'' مسٹر ہربرٹ نے کہا، ''مگر ہزاروں لاکھوں برس سے سو رہے ہیں۔''

انھوں نے ایک کچھوے کو پلٹا۔ ہولے سے اسے چھو کر اوپر کی طرف دھکیلا، اور سوتا ہوا حیوان ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اوپر کی طرف بہتا گیا۔ توبیاس نے اسے جانے دیا۔ پھر اس نے سطحِ سمندر کی طرف دیکھا اور اسے پورا سمندر الٹا نظر آیا۔

''یہ تو بالکل خواب کی طرح ہے،'' اس نے کہا۔

''تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ کسی کو اس کے بارے میں نہ بتاؤ'' مسٹر ہربرٹ نے کہا۔

''ذرا سوچو کہ دنیا میں کتنا انتشار برپا ہو جائے گا اگر لوگوں کو ان چیزوں کے بارے میں پتا چل گیا۔''

جب وہ واپس قصبے میں پہنچے تو رات آدھی بیت چکی تھی۔ انھوں نے کلوتیلدے کو جگایا کہ پانی ابال دے۔ مسٹر ہربرٹ نے کچھوے کا گوشت بنا دیا، مگر وہ تینوں ساتھ لگے تب جا کر کچھوے کے دل کا پیچھا کر کے اسے ایک بار پھر ہلاک کر سکے، جو اس وقت اچھل کر آنگن میں آ گیا تھا جب وہ گوشت کے پارچے کاٹ رہے تھے۔ انھوں نے اتنا کھایا کہ ان سے سانس نہ لیا جاتا تھا۔

''اچھا تو بیاس،'' تب مسٹر ہربرٹ نے کہا، ''ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا ہے۔''

''بے شک۔''

''اور حقیقت یہ کہتی ہے،'' مسٹر ہربرٹ بولے، ''کہ خوشبو واپس نہیں آئے گی۔''

''ضرور آئے گی۔''

''نہیں آئے گی۔'' کلوتیلدے نے دخل دیا۔ ''علاوہ اور وجوہات کے اس لیے بھی کہ خوشبو اصل میں آئی ہی نہیں تھی، یہ تم ہی تھے جس نے سب لوگوں میں ہنگامہ مچا دیا۔''

''تم نے خود بھی تو سونگھی تھی،'' تو بیاس نے کہا۔ ''میں اُس رات مدہوش ہو رہی تھی،'' کلوتیلدے بولی۔ ''مگر اب، اس وقت، میں کسی بھی ایسی چیز کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی جس کا تعلق اس سمندر سے ہو۔''

''اچھا، تو میں اپنی راہ لوں،'' مسٹر ہربرٹ بولے۔ پھر ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا،'' اور تمہیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ دنیا میں کرنے کے لیے اتنا کچھ ہے کہ تم یہاں پڑے فاقے نہیں کر سکتے۔''

وہ چلے گئے۔ تو بیاس آنگن میں بیٹھا افق کی آخری حدوں تک تارے گنا کیا، اور اسے معلوم ہوا کہ پچھلے دسمبر کے مقابلے میں اس مرتبہ تین تارے زیادہ ہیں۔ کلوتیلدے نے اسے خواب گاہ میں بلایا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

''یہاں آؤ، مٹی کے مادھو،'' کلوتیلدے نے اصرار کیا۔ ''کتنے سال گزر گئے ہم نے خرگوشوں کی طرح نہیں کیا۔''

تو بیاس بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ آخر کار جب وہ اندر گیا تو وہ سو چکی تھی۔ اس نے اسے کچھ کچھ جگا لیا مگر وہ اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ وہ دونوں گڑبڑا گئے اور بس کچھووں ہی کی طرح

کر پائے۔

''تم پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہے ہو،'' کلوتیلدے نے بدمزاجی سے کہا۔ ''کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرو۔''

''میں کسی اور چیز ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

کلوتیلدے نے معلوم کرنا چاہا کہ وہ کوئی اور چیز کیا ہے اور تو بیاس نے اس شرط پر اسے بتانے کی ہامی بھری کہ وہ کسی کے سامنے اس کا ذکر نہیں کرے گی۔ کلوتیلدے نے وعدہ کر لیا۔

''سمندر کی تہہ میں ایک گاؤں ہے،'' تو بیاس نے بتایا، ''جس میں چھوٹے چھوٹے سفید گھر ہیں اور ان کے برآمدوں میں لاکھوں پھول کھلے ہیں۔''

کلوتیلدے نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔

''ارے تو بیاس،'' وہ بولی، ''ارے تو بیاس، خدا کے واسطے، اب یہ باتیں پھر سے شروع نہ کرو۔''

تو بیاس کچھ نہ بولا۔ وہ کروٹ بدل کر بستر کے کنارے پر آ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ صبح سویرے تک نہیں سو سکا جب ہوا کا رُخ بدلا اور کیکڑوں نے اسے چین سے نہ سونے دیا۔



(مشمولہ: ''گابرئیل گارسیا مارکیز: منتخب تحریریں''، کراچی، آج، ۲۰۱۱ء)

محبت کے اُس پار منتظر موت

ترجمہ: راشد مفتی

سینیٹراونے سیمو سانچیز کے پاس مرنے سے پہلے چھ مہینے اور گیارہ دن تھے کہ اسے وہ عورت ملی جو اُس کی زندگی کا حاصل تھی۔ ان کی ملاقات روزل ویل ویرے نامی ایک گمنام سے گاؤں میں ہوئی جو رات کے وقت اسمگروں کے جہاز کے لیے خفیہ بندرگاہ کا کام دیتا تھا۔ اور، دوسری طرف، روزِ روشن میں کسی انتہائی ناکارہ صحرائی راستے کی طرح ایسے سمندر پر کھلتا نظر آتا تھا جو نہ صرف بے سمت اور بے کیف تھا، بلکہ ہر جگہ سے اتنی دور تھا کہ وہاں کسی ایسے شخص کے رہنے کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا جو کسی کی تقدیر بدلنے پر قادر ہو۔ اس گاؤں کا نام بھی ایک طرح کا مذاق تھا، کہ وہاں دستیاب واحد گلاب کا پھول سینیٹراونے سیمو سانچیز نے۔ اُس سہ پہر جب وہ لورا فارینا سے ملا۔ خود اپنی قمیض میں لگا رکھا تھا۔

یہ اُس انتخابی مہم کا ایک ناگزیر پڑاؤ تھا جو سینیٹر ہر چوتھے سال چلایا کرتا تھا۔ تماشے والی گاڑیاں صبح ہی آچکی تھیں۔ ان کے بعد مقامیوں سے بھرے ہوئے ٹرک آئے، جنھیں مختلف قصبوں میں جلسوں کی حاضری بڑھانے کے لیے کرائے پر لایا جاتا تھا۔ گیارہ بجے سے ذرا قبل موسیقی، آتش بازی اور حواریوں کی جیپوں کے جلو میں اسٹرابری سوڈے کی سی رنگت والی بڑی سی وزارتی گاڑی نمودار ہوئی۔ ایئر کنڈیشنڈ کار میں سینیٹراونے سیمو سانچیز موسم سے بے نیاز، پُرسکون بیٹھا تھا، لیکن جوں ہی اس نے دروازہ کھولا، گرم ہوا کے تھپیڑے نے اسے ہلا دیا اس کی خالص ریشم کی قمیض ایک طرح کے نور رنگ سوپ میں بھیگ گئی اور وہ خود کو اپنی عمر سے کئی سال بڑا اور پہلے سے کہیں زیادہ تنہا محسوس کرنے لگا۔ حقیقی زندگی میں وہ ابھی بیالیس سال کا ہوا تھا۔ اس

نے گوٹنگن سے اعزاز کے ساتھ میٹلر جیکل انجینئر کی حیثیت سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ ناقص طور پر ترجمہ کی ہوئی لاطینی کلاسیکی کتابوں کا مشتاق قاری تھا، گو اس مطالعے سے اسے کچھ زیادہ حاصل نہ تھا۔ اس نے ایک خوش حال جرمن عورت سے شادی کی تھی، جس سے اس کے پانچ بچے تھے جو سب کے سب اپنے گھر میں مسرور تھے۔ ان سب سے زیادہ مسرور وہ خود تھا، تا آنکہ، تین ماہ قبل، اسے بتایا گیا کہ اگلے کرسمس تک وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مر چکا ہوگا۔

جب تک جلسۂ عام کی تیاریاں مکمل ہوتیں، سینیٹر نے اس مکان میں جو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، آرام کے لیے ایک گھنٹہ نکال لیا۔ لیٹنے سے قبل اس نے پانی سے بھرے گلاس میں وہ گلاب ڈال دیا جسے اس نے سارے صحرا کے سفر میں زندہ رکھا تھا، پرہیز کی غذا کھائی جو وہ ساتھ رکھتا تھا تاکہ بکری کے گوشت کے تلے ہوئے ٹکڑوں سے بچ سکے جو باقی دن میں اس کے سامنے بار بار آنے والے تھے، اور وقت سے پہلے کئی درد کُش گولیاں کھائیں تاکہ درد اٹھے تو اس کا مداوا پہلے سے موجود ہو۔ پھر اس نے بجلی کا پنکھا جھولنے کے نزدیک کیا اور برہنہ ہو کر پندرہ منٹ کے لیے گلاب کے سائے میں دراز ہو گیا۔ اونگھنے کے دوران موت کے خیال سے دھیان ہٹانے کے لیے اسے انتہائی کاوش کرنا پڑی۔ ڈاکٹروں کے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ اسے ایک مقررہ میعاد کی سزا ملی ہے، کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی لائے بغیر اس راز کو اکیلے ہی برداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن اس کا باعث فخر نہیں بلکہ شرم تھی۔

آرام کرنے اور نہانے دھونے کے بعد جب تین بجے سہ پہر وہ جلسے میں آیا تو خود پر مکمل قابو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کھردری لینن کی پتلون اور پھولوں والی قمیض پہن رکھی تھی، اور اس کی روح درد کُش گولیوں سے سنبھالا لے چکی تھی۔ تاہم موت کی کاٹ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ مضرت رساں تھی کیونکہ پلیٹ فارم پر چڑھتے ہی اس نے ان لوگوں کے لیے ایک عجیب سی تحقیر محسوس کی جو اس سے ہاتھ ملانے کی خوش بختی کے لیے لڑ رہے تھے، اور گزشتہ کے برعکس اسے ان برہنہ پا مقامیوں پر افسوس نہیں ہوا جو چھوٹے سے بنجر چوک میں شورے کے گرم ڈلوں کی تپش بمشکل برداشت کر پا رہے تھے۔ اس نے تالیوں کے شور کو تقریباً طیش میں آتے ہوئے، اپنے ہاتھ کے اشارے سے رکا اور گرمی سے ہانپتے سمندر پر نظریں جمائے ہوئے، اپنے ہاتھوں کو حرکت دیے بغیر بولنا شروع کر دیا۔ اس کی نپی تلی گہری آواز میں پُرسکون پانی کی سی کیفیت تھی۔ لیکن اپنی رٹی ہوئی اور بارہا دہرائی ہوئی تقریر اس کی زبان پر سچی بات کی طرح نہیں، بلکہ مارکس اوریلیئس کے مراقبات کی کتاب چہارم میں درج کسی جبریہ فیصلے کے طور پر اُبھری تھی۔

''ہم یہاں فطرت کو شکست دینے آئے ہیں،'' اس نے اپنے تمام معتقدات کے برعکس آغاز کرتے ہوئے کہا۔''اب ہم اپنے ملک میں ناپرساں نہیں رہیں گے، پیاس اور دشوار آب و ہوا کی اس مملکت میں خدائی یتیم نہیں رہیں گے، اپنی زمین پر جلاوطن نہیں رہیں گے۔ ہم ایک مختلف قوم ہوں گے، خواتین وحضرات، ہم ایک عظیم اور مسرور قوم ہوں گے۔''

اس تماشے کا ایک خاص ڈھب تھا۔ اس کی تقریر جاری تھی کہ اس کے نائبین نے کاغذی پرندوں کے جھنڈ ہوا میں اچھال دیے۔ ان مصنوعی مخلوقات میں جان سی پڑ گئی اور وہ تختوں کے بنے ہوئے پلیٹ فارم پر سے اُڑتی ہوئی سمندر کی طرف چلی گئیں۔ اسی دوران دوسرے آدمیوں نے گاڑیوں میں سے نمدے کے پتوں والے مصنوعی درخت نکال کر ہجوم کے عقب میں شور زدہ زمین میں لگا دیے۔ انھوں نے یہ سوانگ گتے کا پیش منظر لگا کر مکمل کیا جس میں سرخ اینٹوں اور شیشے کی کھڑکیوں والے جھوٹ موٹ کے مکان بنے تھے، اور اس طرح انھوں نے حقیقی زندگی کے خستہ حال جھونپڑوں کو ڈھانپ دیا۔

اس سوانگ کو مزید وقت دینے کے لیے سینیٹر نے اپنی تقریر کو لاطینی کے دو اقتباسات کے ذریعے طویل کر دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ بارش برسانے والی مشین، غذائی جانوروں کی افزائش کے دستی آلات، شورے میں سبزیاں اور کھڑکیوں میں پھول اُگانے والا روغنِ مسرت فراہم کرے گا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی افسانوی دنیا تیار ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا:'' ہماری دنیا ایسی ہوگی، خواتین وحضرات!'' اس نے بلند آواز سے کہا،'' دیکھیے! ہماری ایسی ہوگی۔''

حاضرین نے مڑ کر دیکھا۔ رنگ دار کاغذ کا بنا ہوا بحری جہاز، جو اس مصنوعی شہر کی بلند ترین عمارتوں سے بھی اونچا تھا، مکانوں کے عقب سے گزر رہا تھا۔ یہ بات صرف سینیٹر ہی نے محسوس کی کہ بار بار لگانے، اتارنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے باعث گتے کا شہر شدید موسمی اثرات سے بری طرح متاثر ہو چکا ہے اور اب اتنا ہی خستہ وخراب ہے جتنا خود یہ روزل دیل ویرے کا گاؤں۔

بارہ سال میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ نیلسن فارینا سینیٹر کا سواگت کرنے نہیں گیا۔ اس نے اپنے باقی ماندہ قیلولے کے دوران گھر کے ایک ٹھنڈے کنج میں جھولنے پر لیٹے لیٹے تقریر سنی۔ ناتراشیدہ تختوں کا یہ گھر اس نے انھی دوا ساز ہاتھوں سے بنایا تھا جن سے اپنی پہلی بیوی کو گھسیٹ کر اس کے ٹکڑے کیے تھے۔ وہ ڈیولز آئی لینڈ سے فرار کو کر معصوم طوطوں سے لدے ہوئے ایک جہاز کے ذریعے روزل ویل ویرے میں وارد ہوا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک خوبصورت اور بے دین سیاہ فام

عورت تھی جو اسے پارامار یبو میں ملی تھی اور جس سے اس کی ایک بیٹی تھی۔ کچھ عرصے بعد یہ عورت فطری اسباب سے مرگئی اور اس طرح اُس عورت کے انجام سے بچ گئی جس کے ٹکڑوں نے اس کے گوبھی کے قطعے کو زرخیز کیا تھا، اور سالم حالت میں، ولندیزی نام کے ساتھ، مقامی قبرستان میں دفن ہوئی۔ لڑکی کو اپنے باپ کی زرد اور متحیر آنکھوں کے ساتھ اپنی ماں کا رنگ روپ ورثے میں ملا تھا؛ یوں نیلسن کے پاس یہ تصور کرنے کی معقول وجہ تھی کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت کی پرورش کر رہا ہے۔

سینیٹر اونے سیمو سانچیز سے اُس کی پہلی انتخابی مہم کے دوران ملاقات ہونے کے دن سے نیلسن فارینا، قانون کی پہنچ سے دور ہونے کے لیے، اس سے درخواست کر رہا تھا کہ اسے جعلی شناختی کارڈ بنوا دے۔ سینیٹر نے دوستانہ مگر سخت انداز میں انکار کر دیا تھا، لیکن نیلسن فارینا نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ کئی سال تک، جب بھی اسے موقع ملتا، اپنی درخواست مختلف انداز میں دُہراتا رہا۔ لیکن اس بار وہ قزاقوں کے اس جلتے ہوئے بھٹ میں اپنے جھولنے میں پڑا سڑتا رہا۔ اس نے اختتامی تالیاں سن کر اپنا سر اٹھایا اور باڑھ کے تختوں کے اوپر سے نظریں دوڑاتے ہوئے، سوانگ کا عقبی حصہ دیکھا جو عمارتوں کے پیل پایوں، درختوں کے سہاروں اور بحری جہاز کو دھکیلتے ہوئے پوشیدہ فریب کاروں پر مشتمل تھا۔ اس نے کوئی نفرت محسوس کیے بغیر تھوک دیا۔

''ہونہہ! سیاست کا شعبدہ باز!'' اس نے فرانسیسی میں تبصرہ کیا۔

تقریر کے بعد، جیسا کہ رواج تھا، سینیٹر موسیقی اور آتش بازی کے شور میں شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ اپنی اپنی بپتا سناتے ہوئے شہر کے باسیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ ان کی شکایتیں خندہ پیشانی سے سن رہا تھا۔ اسے ہر ایک کو، کوئی خاص مہربانی کیے بغیر، مطمئن کرنے کا گُر آتا تھا۔ چھ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہمراہ ایک مکان کی چھت پر استادہ عورت نے شور وغل اور آتش بازی کے ہنگامے میں جیسے تیسے اپنی آواز اس کے کانوں تک پہنچائی۔

''میں کوئی بڑی چیز نہیں مانگ رہی ہوں، سینیٹر،'' وہ بولی ''پھانسی پانے والے کے کنویں سے پانی لانے کے لیے صرف ایک گدھا۔''

سینیٹر نے چھ سوکھے بچوں پر نظر کی۔ ''تمہارے شوہر کا کیا بنا؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ قسمت آزمانے آروبا کے جزیرے میں گیا تھا،'' عورت نے خوش مزاجی سے جواب دیا، ''لیکن وہاں ایک غیر ملکی عورت کا ہو رہا، اس طرح کی جو اپنے دانتوں پر ہیرے جڑتی ہیں۔''

اس جواب نے قہقہوں کا طوفان برپا کر دیا۔

''خوب!'' سینیٹر نے فیصلہ کیا۔ ''تمہیں گدھا مل جائے گا۔''

تھوڑی دیر بعد اس کا ایک نائب عورت کے گھر ایک اچھالدو گدھا چھوڑ گیا جس کے پٹھے پر انمٹ رنگ سے ایک انتخابی نعرہ لکھا تھا تاکہ لوگ سینیٹر کے تحفے کو بھول نہ جائیں۔

گلی کی مختصر طوالت طے کرتے ہوئے اس نے دیگر چھوٹی چھوٹی نوازشات کیں۔ اس نے ایک بیمار آدمی کو، جس نے اسے گزرتا دیکھنے کے لیے اپنا بستر گھر کے دروازے پر لگوایا تھا، چمچے سے دوا بھی پلائی۔ آخری نکڑ پر باڑھ کے تختوں کی جھریوں میں سے اس نے نیلسن فارینا کو جھولنے میں لیٹے دیکھا جو زرد اور ملول نظر آ رہا تھا۔ تاہم سینیٹر نے کوئی لگاوٹ ظاہر کیے بغیر اس کی مزاج پرسی کی۔

''ہیلو، کیسے ہو؟''

نیلسن فارینا نے جھولنے میں کروٹ لی اور اپنی نظر کی اداسی سے اسے بھگو دیا۔

''کون؟ میں؟ آپ جانتے ہی ہیں،'' اس نے فرانسیسی میں جواب دیا۔

اس کی بیٹی نے علیک سلیک کی آواز سنی تو وہ آنگن میں آ گئی۔ اس نے مقامیوں کی گھٹیا سی پرانی گواہیرو پوشاک پہن رکھی تھی، سر پر رنگین کپڑے کی تتلیاں سجا رکھی تھیں اور چہرے پر دھوپ سے بچاؤ کے لیے رنگ ملا ہوا تھا؛ لیکن اس خستہ حالی میں بھی یہ تصور کرنا ممکن تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ حسین عورت نہیں رہی ہوگی۔ سینیٹر دم بخود رہ گیا۔ ''مارا گیا!'' اس نے حیرت سے سانس لیا۔ ''خدا بھی عجب بدحواسیاں کرتا ہے!''

اس رات نیلسن فارینا نے اپنی بیٹی کو بہترین پوشاک پہنا کر سینیٹر کے پاس بھیجا۔ دو رائفل بردار محافظوں نے، جو عارضی مکان میں گرمی کی شدت سے اونگھ رہے تھے، اسے راہداری میں پڑی اکلوتی کرسی پر انتظار کرنے کو کہا۔

سینیٹر دوسرے کمرے میں تھا، جہاں وہ روزل ویل ویرے کے سرکردہ لوگوں سے ملاقات کر رہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اس غرض سے اکٹھا کیا تھا کہ اپنی تقریروں کے بچے کھچے نکتے ان کے کانوں میں انڈیل سکے۔ وہ ان سب لوگوں سے جن سے سینیٹر کا صحرا کے سبھی شہروں میں ہمیشہ سابقہ پڑتا تھا، اس قدر مشابہ تھا کہ ان مستقل شبینہ اجلاسوں سے وہ خود تنگ آ چکا تھا۔ اس کی قمیض پسینے سے تر تھی اور وہ اسے اپنے بدن پر اس گرم ہوا سے سکھانے کی کوشش کر رہا تھا جو کمرے کی شدید گرمی میں لدھڑ مکھی کی طرح بھنبھناتے ہوئے بجلی کے پنکھے سے آ رہی تھی۔

''ہم کاغذی پرندے نہیں کھا سکتے،'' وہ کہہ رہا

تھا،'' میں اور تم جانتے ہیں کہ جس دن بھی اس
گوبر کے ڈھیر میں درخت اور پھول اُگے، جس
دن بھی جوہڑوں میں کیڑوں کی جگہ مچھلیاں
دکھائی دیں، اُس دن یہاں تم نظر آؤ گے نہ میں
۔میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس اثنا میں سینیٹر نے کیلنڈر سے ایک ورق پھاڑ کر اسے کاغذی تتلی کی شکل دے دی تھی۔ اس نے اس تتلی کو، بغیر کسی خاص نشانے کے پنکھے سے آنے والی ہوا کی رو میں اچھال دیا۔ تتلی کمرے میں اِدھر اُدھر اُڑا کی اور پھر ادھ کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ سینیٹر نے موت کی ساز باز سے تقویت پائے ہوئے ضبط کے ساتھ گفتگو جاری رکھی۔

''لہذا،'' اس نے کہا،''مجھے وہ بات دُہرانے کی ضرورت نہیں جو تم پہلے ہی جانتے ہو۔ یعنی میرا دوبارہ انتخاب مجھ سے زیادہ تمہارے لیے سود مند ہے، کیونکہ میں بند پانی اور پسینے کی بو سے تنگ آ چکا ہوں جبکہ دوسری طرف تم لوگ روٹی اسی کی کھاتے ہو۔''

لورا فارینا نے کاغذی تتلی کو باہر آتے دیکھا۔ صرف اسی نے تتلی کو دیکھا کیونکہ راہداری میں موجود محافظ اپنی رائفلوں کو لپٹائے، سیڑھیوں پر سو چکے تھے۔ چند گردشوں کے بعد کاغذی تتلی کی تہیں مکمل طور پر کھل گئیں اور وہ دیوار کے ساتھ چپک کر وہیں جم گئی۔ لورا فارینا نے اسے اپنے ناخنوں سے کھرچ کر اتارنے کی کوشش کی۔ ایک محافظ نے، جو دوسرے کمرے میں تالیوں کی گونج سے جاگ گیا تھا، اس کی رائیگاں کوشش دیکھی۔

''یہ نہیں اترے گی۔'' وہ غنودگی میں بولا۔''یہ دیوار پر نقش ہے۔''

لوگ کمرے سے باہر آنے لگے تو لورا فارینا دوبارہ بیٹھ گئی۔ سینیٹر دروازے کی بتی پر ہاتھ رکھے دہلیز پر کھڑا تھا۔ اس نے لورا فارینا کو تبھی دیکھا جب راہداری خالی ہو گئی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''مجھے میرے ابا نے بھیجا ہے،'' وہ فرانسیسی میں بولی۔

سینیٹر سمجھ گیا۔ اس نے خوابیدہ محافظوں کا جائزہ لیا، پھر لورا فارینا کو بغور دیکھا جس کا غیر معمولی حسن اس کے درد سے کہیں زیادہ توجہ طلب تھا، اور تب اسے یقین ہو گیا کہ جو فیصلہ اس کو کرنا تھا وہ موت کو چکی ہے۔

''اندر آ جاؤ،'' اس نے لڑکی سے کہا۔

لورا فارینا دہلیز پر قدم رکھتے ہی ششدر رہ گئی۔ ہزاروں نوٹ اس تتلی کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے ہوا میں تیر رہے تھے۔ سینیٹر نے پنکھا بند کر دیا اور نوٹ بے ہوا ہو کر کمرے کی مختلف اشیا پر اتر گئے۔

''دیکھا تم نے؟'' وہ بولا۔ ''غلاظت بھی اُڑ سکتی ہے۔''

لورا فارینا ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کی جلد، جس کا رنگ اور سنولایا ہوا گاڑھا پن خام تیل جیسا تھا، ہموار اور تنی ہوئی تھی، اس کے بال کسی نوعمر گھوڑی کی ایال تھے اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں روشنی سے زیادہ چمکدار تھیں۔ سینیٹر نے اس کے تارِ نظر کا تعاقب کیا اور بالآخر گلاب تک پہنچ گیا جو شورے میں اپنی چمک کھو چکا تھا۔

''گلاب ہے،'' اس نے کہا۔

''ہاں،'' لڑکی نے قدرے الجھاؤ سے کہا، ''میں نے ریوہاچا میں پہلی بار دیکھے تھے۔''

سینیٹر ایک فوجی چارپائی پر بیٹھ گیا اور اپنی قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے، گلابوں کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے سینے پر، اس طرف جہاں اس کے خیال میں اس کا دل تھا، کسی قزاق کی طرح تیر سے گدا ہوا دل نقش تھا۔ اس نے گیلی قمیض فرش پر پھینکی اور لورا فارینا سے اپنے جوتے اتارنے میں مدد کرنے کو کہا۔

وہ چارپائی کے مقابل گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ سینیٹر کچھ سوچتے ہوئے اس کا جائزہ لیتا رہا اور جب تک وہ اس کے تسمے کھولتی رہی، حیران ہوتا رہا کہ اس حادثے کی بدنصیبی دونوں میں سے کس کے حصے میں آئے گی۔

''تم تو ابھی بالکل بچی لگتی ہو!'' اس نے کہا۔

''اس پر نہ جاؤ۔'' وہ بولی! ''میں اپریل میں انیس سال کی ہو جاؤں گی۔''

سینیٹر کی دلچسپی جاگ اٹھی۔

''کس تاریخ کو؟''

''گیارہ،'' وہ بولی۔

سینیٹر بہتر محسوس کرنے لگا، ''ہم دونوں کا برج حمل ہے،'' اس نے کہا، اور پھر مسکراتے ہوئے اضافہ کیا؛

''یہ تنہائی کی علامت ہے۔''

لورا فارینا توجہ نہیں دے رہی تھی، کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے جوتوں کا کیا

کرے۔ اِدھر سینیٹر بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ لورا فارینا کا کیا کرے۔ وہ اچانک معاشقوں کا عادی نہیں تھا اور وہ جانتا تھا کہ موجودہ معاملے کی جڑیں تو ذلت میں پیوست ہیں۔ سوچنے کے لیے چند لمحے چرانے کو اس نے لورا فارینا کو اپنے گھٹنوں کے درمیان مضبوطی سے جکڑ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیے اور پشت کے بل چارپائی پر لیٹ گیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ لڑکی پوشاک کے نیچے برہنہ ہے، کیونکہ اس کے بدن سے کسی جنگلی جانور کی سی پُراسرار خوشبو آ رہی تھی، لیکن اس کا دل خوفزدہ تھا اور اس کی جلد ٹھنڈے پسینے سے نم۔

''ہم لوگوں سے کوئی محبت نہیں کرتا،'' سینیٹر نے آہ بھری۔

لورا فارینا نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہاں صرف اتنی ہوا تھی کہ وہ سانس لی لے پائی۔ سینیٹر نے اسے سنبھالا دینے کے لیے اپنے برابر لٹا لیا۔ اس نے روشنی گل کر دی اور کمرہ گلاب کے سائے میں آ گیا۔ لڑکی نے اپنے آپ کو قسمت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ سینیٹر ٹٹولتے ہوئے ہاتھوں سے نرمی کے ساتھ اس کا بدن سہلانے لگا، لیکن جہاں اسے اس کی نسوانیت پانے کی توقع تھی، وہاں کوئی سخت سی چیز اس کی راہ میں حائل تھی۔

''ارے، یہ کیا ہے؟''

''تالا،'' لڑکی نے بتایا۔

''لعنت ہو،'' سینیٹر نے مشتعل ہو کر کہا، اور وہ سوال کیا جس کا جواب وہ اچھی طرح جانتا تھا،

''چابی کہاں ہے؟''

لورا فارینا نے سکون کا سانس لیا۔

''میرے ابا کے پاس،'' اس نے جواب دیا۔ ''انھوں نے کہا ہے کہ آپ چابی کے لیے اپنا آدمی بھیج دیں، اور اس کے ہاتھ یہ تحریری پیغام بھی کہ آپ ان کا مسئلہ حل کر دیں گے۔''

سینیٹر کا پارہ چڑھ گیا۔ ''حرامی مینڈک،'' وہ برہمی سے بڑبڑایا۔ اس نے سکون کی خاطر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اندھیرے میں اپنے آپ سے ملا۔ یاد رکھو، اسے یاد آیا، چاہے تم ہو یا کوئی اور، اس میں زیادہ دیر نہیں ہے کہ تم فنا ہو جاؤ گے، اور اس میں بھی زیادہ دیر نہیں ہے کہ تمہارا نام بھی باقی نہیں رہے گا۔

اس نے تھرتھری کے گزرنے کا انتظار کیا۔

''ایک بات بتاؤ،'' اس نے پوچھا، ''تم نے میرے بارے میں کیا سنا ہے؟''

''سچ سچ سننا چاہتے ہو؟''

''سچ سچ''

''اچھا'' لورا فارینا نے جرأت کی۔''لوگ کہتے ہیں کہ تم دوسروں سے بدتر ہو، کیونکہ تم مختلف ہو۔''

سینیٹر برہم نہیں ہوا۔ وہ آنکھیں بند کیے کافی دیر خاموش رہا، اور جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اپنی انتہائی پوشیدہ جبلتوں سے لوٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

''اوہ، کیا مصیبت ہے'' اس نے فیصلہ کیا۔'' اپنے حرامی باپ کو بتا دینا میں اس کا کام کردوں گا۔''

''آپ چاہیں تو میں خود جا کر چابی لا سکتی ہوں،'' لورا فارینا نے کہا۔

سینیٹر نے اسے روک دیا۔

''چابی کو بھول جاؤ'' اس نے کہا،''بس کچھ دیر میرے ساتھ لیٹی رہو۔ آدمی تنہا ہو تو کسی کا پاس ہونا اچھا ہوتا ہے۔''

پھر لڑکی نے اپنی نظریں گلاب پر جماتے ہوئے اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ سینیٹر نے اسے کمر سے تھام کر اپنا چہرہ اس کی بغل میں چھپا لیا اور دہشت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ چھ مہینے اور گیارہ دن بعد، لورا فارینا کے اسکینڈل کے باعث بے قدر اور مسترد ہو کر، اور اس کے بغیر مرنے پر غصے سے روتے ہوئے، وہ اسی حالت میں مر جائے گا۔

☆☆☆

(مشمولہ:''گابرئیل گارسیا مارکیز: منتخب تحریریں''، کراچی، آج، ۲۰۱۱ء)

اگست کی روحیں

ترجمہ: طاہرہ نقوی

ہم بارہ بجے کے قریب آریزو پہنچے اور ہمیں اس کاسل رینیسانس کو ڈھونڈنے میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے، جو وینیز دیلا کے ایک مصنف میگوئیل اوٹیرا سلوا نے ٹسکنی کے دیہی علاقے کے ایک دلکش کونے میں خریدا تھا۔

وہ شروع اگست میں اتوار کا ایک تپتا ہوا، پُر ہجوم دن تھا۔ سیاحوں کی بھیڑ میں سڑکوں پر کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا، جسے کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ پتہ ہو۔ متعدد بے سود کوششوں کے بعد ہم واپس اپنی کار کی طرف لوٹ گئے، اور ایک ایسی سڑک لے کر جس کے دونوں کناروں پر صنوبر کے درخت تھے، مگر جو علاماتِ شارع سے عاری تھی۔ ہم شہر سے باہر نکل آئے اور بطخوں کی دیکھ بھال کرتی ہوئی ایک بوڑھی عورت نے، ہمیں کاسل کا راستہ تفصیل سے سمجھایا۔ خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہم وہاں رات گزارنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ہم نے جواب دیا کہ ہم صرف دوپہر کا کھانا کھانے کی غرض سے جارہے ہیں۔ اس وقت ہمارا یہی ارادہ تھا۔

''اچھا ہی ہے، کیوں کہ وہ گھر آسیب زدہ ہے۔'' اس نے کہا۔

میں اور میری بیوی دوپہر کے بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اور اس عورت کے پراعتماد انداز سے بہت محظوظ ہوئے، لیکن ہمارے دونوں بیٹے، جن کی عمریں نو اور سات سال تھیں، ایک جیتی جاگی روح سے ملاقات کے خیال سے بے حد خوش ہوئے۔

میگوئیل اوٹیرا سلوا نے، جو ایک بہترین میزبان تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک اعلیٰ درجے کا

ذائقہ شناس اور ایک اچھا ادیب بھی۔ اس نے ہمارے لیے ایک ناقابلِ فراموش لنچ تیار کر رکھا تھا ۔کیوں کہ ہم دیر سے پہنچے، ہمیں کھانے پر بیٹھنے سے پہلے کاسل کا اندرونی حصہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس کی بیرونی شکل کسی طرح بھی دہشت انگیز معلوم نہیں ہوئی۔ جو تھوڑی بہت پریشانی ہم محسوس کر بھی رہے تھے، وہ پھولوں کی کیاری سے سجے اس چبوترے سے شہر کو دیکھنے سے ختم ہو گئی، جہاں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ اس بات پر یقین کرنا مشکل تھا کہ اس پہاڑی پر جہاں بمشکل نوے ہزار لوگوں کے رہنے کی جگہ تھی، وہاں ہمیشہ قائم رہنے والی اور غیر معمولی ذہانت کے لوگوں نے جنم لیا تھا۔ لیکن اپنے مخصوص کیریبین سے منسوب مزاحیہ انداز میں میگوئیل سلوا نے کہا کہ ان سب میں کوئی بھی آریز و کا مشہور ترین شہری نہیں تھا۔

''سب سے ممتاز بوڈو و یچو تھا۔'' اس نے کہا۔

بوڈو و یچو جس کے ساتھ کوئی موروثی نام منسلک نہیں تھا۔ لوڈو و یچو، جو فنونِ لطیفہ اور جنگی فنون کا سرپرست تھا، جس نے اپنے غم و اندوہ سے یہ کاسل بنایا تھا، اور جس کے بارے میں میگوئیل سلوا کھانے کے دوران مستقل بات چیت کرتا رہا۔

اس نے ہمیں لوڈو و یچو کی بے پایاں قوت کے بارے میں بتایا، اس کی اذیت بھری محبت اور خوفناک موت کے حالات بیان کیے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح ہذیانی کیفیت کے زیرِ اثر اس نے اپنی محبوبہ کو چاقو گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ وہیں جہاں کچھ دیر پہلے وہ ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کر رہے تھے، اور کیسے پھر اس نے اپنے آپ کو خونخوار کتوں کے حوالے کر دیا، جنہوں نے اسے چیڑ پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس نے ہمیں پورے اعتماد کے ساتھ یقین دلایا کہ لوڈو و یچو کی روح آدھی رات گزرنے کے بعد گھر کے تاریک حصوں میں محبت کی پرکیٹوری کی تلاش میں بھٹکتی ہے۔

کاسل واقعی بہت پھیلا ہوا تھا، ایک غمگین اندھیرے میں ڈوبا ہوا۔ لیکن دن کی روشنی میں شکم پر اور آسودہ دل کے ساتھ تو میگوئیل سلوا کی کہانی اسی طرح کی تفریح کا حصہ محسوس ہوئی جن سے وہ اپنے مہمانوں کا دل بہلاتا تھا۔ دوپہر میں ستا لینے کے بعد ہم نے بغیر کسی دھڑکے کے ان تمام بیاسی کمروں میں پھر کر دیکھا جن میں مختلف اوقات پر ان کے مختلف مالکان تبدیلیاں کر چکے تھے۔ میگوئیل نے نیچے کا پورا حصہ دوبارہ سے سجایا تھا اور ایک جدید طرز کی خوابگاہ بنائی تھی، جس میں سنگِ مرمر کا فرش تھا، ورزش کی مشینیں اور گرم حمام تھا۔ اس کے علاوہ پھولوں کی کیاریوں سے سجا وہ چبوترہ جہاں ہم نے لنچ کیا تھا۔ دوسری منزل میں، جو گزری ہوئی صدیوں

میں سب سے زیادہ استعمال ہوئی تھی، بہت سے عام وضع کے کمرے تھے، جن میں مختلف زمانوں کا ساز وسامان موجود تھا، اور جن کو اب اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن سب سے اوپر کی منزل پر ہم نے ایک کمرہ دیکھا، اپنی اصلی حالت میں، جسے وقت بھول چکا تھا۔ لوڈو ویچو کی خوابگاہ، یہ ایک طلسماتی گھڑی تھی۔ وہاں پلنگ تھا، اس کے پردے جن پر سنہرے تاروں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی، اور وہ پلنگ پوش جس کی موتیوں والی جھالر ابھی تک اس کی قربان کی گئی محبوبہ کے منجمد خون سے اکڑا ہوا تھا۔ وہ آتش دان جس میں برف کی سی ٹھنڈی راکھ ابھی تک موجود تھی، اور اس میں جلنے والی لکڑی کا ٹکڑا پتھر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ الماری جس میں ہتھیار اپنی پرانی حالت میں موجود تھے، اور سوچ میں ڈوبے سپاہی کی سنہری فریم والی تصویر۔ جو کسی فلورنٹین مصور نے تخلیق کی تھی، اور جسے اپنے مقرر شدہ دور سے نکلنے کی خوش نصیبی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ مرغوب کیا وہ اسٹابری کی خوشبو تھی جو پوری خواب گاہ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئی تھی۔

موسم گرما کی راتیں ٹسکنی میں بہت لمبی اور سست رو ہوتی ہیں، اور رات نو بجے تک افق اپنی جگہ پر رہتا ہے۔ جب ہم نے کاسل کا دورہ مکمل کیا، اس وقت پانچ بج چکے تھے۔ لیکن میگوئیل سلوا نے بہت اصرار کیا کہ ہم سان فرانسکو کے گرجا کی پلستر پر کی ہوئی نقاشی دیکھنے چلیں۔ اس کے بعد ہم چوراہے میں درختوں کے جھنڈ کے نیچے کافی پیتے رہے۔ اور جب ہم اپنے سوٹ کیس لینے وہاں پہنچے تو ہمارے لیے کھانا تیار تھا، ہم رات کے کھانے کے لیے رک گئے۔

ہم اودے آسمان کے نیچے بیٹھے تھے، جس پر ایک اکیلا ستارہ ٹمٹما رہا تھا۔ بچوں نے باورچی خانے سے تارچیں لیں اور اوپر کی منزلوں کے اندھیروں کی چھان بین کرنے نکل پڑے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سن سکتے تھے۔ دروازوں کی سسکیاں اور لوڈو ویچو کے اندھیرے کمروں میں بلاتی ہوئی پُر مسرت چیخیں۔ یہ بچوں ہی کا منصوبہ تھا کہ یہاں سویا جائے۔ میگوئیل سلوا خوشی خوشی ان کا ساتھ دے رہا تھا اور ہم اخلاقاً خاموش رہے۔

خدشات کی موجودگی میں بھی ہم بہت گہری نیند سوئے۔ میں اور میری بیوی پہلی منزل پر ایک خواب گاہ میں تھے، جب کہ بچے برابر کے کمرے میں۔ دونوں کمروں کو جدید طرز کی وضع دی گئی تھی، اس لیے ان کمروں کا ماحول تاریک یا سنسان نہیں تھا۔ نیند کے انتظار میں، میں نے بڑی گھڑی کے جاگتے ہوئے گھنٹوں کو بجتے ہوئے سنا، اور مجھے اس عورت کی خوفناک تنبیہ یاد آئی جو بطخوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ لیکن تھکن سے نڈھال ہم جلد ہی گہری نیند میں ڈوب گئے۔ صبح

سات بجے ہماری آنکھ کھلی تو ایک چمکتے ہوئے سورج نے ہمارا خیر مقدم کیا، جس کی روشنی کھڑکی سے باہر امر بیل کی ٹہنیوں میں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ میرے ساتھ لیٹی میری بیوی معصومیت کے پر سکون سمندر میں تیر رہی تھی۔

''اس زمانے میں بھوت پریت پر یقین کرنا بھی کیا بے وقوفی ہے'' میں نے سوچا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب تازہ اسٹرابری کی خوشبو نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے آتش دان دیکھا جس میں راکھ سرد تھی، اور لکڑی کا آخری ٹکڑا پتھر بن چکا تھا۔ اس افسردہ سپاہی کی تصویر جو سنہرے فریم میں بجی تھی، تین صدیوں کو پار کر کے ہمیں دیکھ رہی تھی، کیوں کہ ہم پہلی منزل کی خواب گاہ میں نہیں تھے کہ جہاں ہم سوئے تھے، بلکہ لوڈووِیچو کی خواب گاہ میں تھے۔ مسہری پر تنی چادر اور مٹی سے اٹے ہوئے پردوں اور اس بدبخت کی پلنگ کی چادروں کے نیچے لیٹے تھے جو ابھی تک گرم خون سے تربتر تھیں۔



(مشمولہ: ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ نمبر ۴۱، اکتوبر ۲۰۱۴ء)

خواب دیکھنے والی

ترجمہ: اجمل کمال

صبح کے نو بجے، جب ہم ہوانا کے ہوٹل ریویئرا کے ٹیریس میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے، یک لخت سمندر میں ایک دہشت ناک لہر اٹھی ۔۔۔ حالانکہ دن دھوپ بھرا اور پرسکون تھا۔ اور ایک بڑے شور کے ساتھ ہم پر آ پڑی۔ اتنی زبردست لہر تھی کہ اس نے ساحل پر سے گزرتی ہوئی کاروں کو، اور نزدیک پارک کی ہوئی کچھ کاروں کو بھی اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا اور ہمارے ہوٹل کے پہلو میں دے مارا۔ ڈائنا مائٹ کا سا دھماکا تھا جس نے ہمارے ہوٹل کی عمارت کی بیس منزلوں میں سراسیمگی پھیلا دی اور لابی کو ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ڈھیر میں بدل ڈالا۔ ہوٹل میں مقیم بہت سے مسافر جو وہاں بیٹھے تھے، فرنیچر کی طرح زیر و زبر ہو گئے اور کئی ایک کو ٹوٹے ہوئے شیشوں کی بوچھاڑ نے زخمی کر دیا۔ وہ یقیناً نہایت غیر معمولی قامت کی طوفانی لہر رہی ہوگی، گو ہوٹل کی عمارت کو سمندر کی جانب ایک دیوار اور اس سے آگے ایک چوڑی دو طرفہ سڑک نے حفاظت میں لے رکھا تھا، مگر لہر اتنی قوت سے حملہ آور ہوئی کہ شیشے کی دیواروں والی لابی کو نیست و نابود کر دیا۔

کیوبن رضا کار، مقامی فائر بریگیڈ کی مدد سے فوراً ملبے کو سمیٹنے میں لگ گئے اور چھ گھنٹے سے کم وقت میں، ہوٹل کے سمندر کی جانب کھلنے والے پھاٹک کو بند کر کے اور ایک متبادل راستا کھول کر، انہوں نے ہر چیز کو معمول کے مطابق کر دیا۔ اس پورے وقت میں کسی کی توجہ اس کار کی طرف نہ گئی جو ہوٹل کی دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی تھی، اور سب اسے ان گاڑیوں میں شمار کرتے رہے جو سڑک کے کنارے پارک کی ہوئی تھیں۔ جس وقت اسے کرین کی مدد سے ہٹایا جانے لگا تو اندر ایک عورت کی لاش کی موجودگی کا انکشاف ہوا جسے سیٹ بیلٹ نے ڈرائیونگ سیٹ

کے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ اس کے جسم کی کوئی ایک ہڈی بھی ٹوٹنے سے نہ بچی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ اور ناقابلِ شناخت تھا، پنڈلیوں تک لمبے بوٹ سلائی پر سے ادھڑ گئے تھے اور لباس دھجی دھجی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی جو سلامت رہ گئی تھی۔ انگوٹھی سانپ کی شکل میں بنی ہوئی تھی اور سانپ کی آنکھوں کی جگہ زمرد جڑے ہوئے تھے۔ پولیس نے پتا لگایا کہ وہ عورت نئے پرتگالی سفیر اور اس کی بیوی کی گھریلو ملازمہ تھی۔ درحقیقت وہ ان کے ساتھ پندرہ روز پہلے ہی وہاں پہنچی تھی اور اس صبح ان کی نئی کار میں بازار جانے کے لیے نکلی تھی۔ جب میں نے اخباروں میں اس واقعے کے بارے میں پڑھا تو اس عورت کے نام نے مجھ میں ردِعمل پیدا نہ کیا لیکن اس انگوٹھی کے ذکر نے مجھے متجسس کر دیا جو سانپ کی شکل کی تھی اور جس میں آنکھوں کی جگہ زمرد جڑے ہوئے تھے۔ مگر بدقسمتی سے میں یہ نہ جان سکتا تھا کہ انگوٹھی کون سی انگلی میں تھی۔

یہ ایک بے حد اہم تفصیل تھی، مجھے اندیشہ تھا کہ یہ عورت وہ ہے جس سے میں واقف رہا ہوں اور جسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا، اگرچہ مجھے اس کا نام کبھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ وہ بھی سانپ کی شکل کی انگوٹھی پہنتی تھی جس میں آنکھوں کی جگہ زمرد جڑے ہوئے تھے، لیکن وہ اسے ہمیشہ اپنی پہلی انگلی میں پہنا کرتی تھی جو اس زمانے میں بھی ایک غیر ازمعمول بات تھی۔ میں اس سے چھیالیس سال پہلے ویانا میں ملا تھا جب وہ ایک سے خانے میں، جہاں لاطینی امریکی طلبا بہت آیا کرتے تھے، ساسج اور ابلے ہوئے آلو کھانے اور پیپے سے براہ راست بیئر پینے میں مشغول تھی۔ میں اسی صبح روم سے وہاں پہنچا تھا اور مجھے آج تک وہ تاثر یاد ہے جو اس کے اوپیرا کی مغلیہ کے سے بھرے بھرے سینے، اس کے کوٹ کے کالر کے گرد جمع جھولتی ہوئی پشموں اور سانپ کی شکل کی اس مصری انگوٹھی نے مجھ پر طاری کیا تھا۔ وہ کسی ہانپتے ہوئے دکان دار کے سے انداز میں بہت ابتدائی قسم کی ہسپانوی بول رہی تھی اور میں نے اسے آسٹریائی ۔۔۔ اس طویل میز کے گرد بیٹھے ہوئے تمام لوگوں میں واحد آسٹریائی ۔۔۔ فرض کر لیا۔ میرا خیال غلط نکلا وہ کولوبیا میں پیدا ہوئی تھی اور اس نے دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں موسیقی اور گائیگی سیکھنے کی نیت سے آسٹریا کا سفر اختیار کیا تھا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی، اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ رہی ہو گی اور وہ اپنے وقت سے پہلے ہی ڈھلنے لگی تھی۔ اس کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک سحر تھا اور علاوہ ازیں، وہ میری جان پہچان کے سب سے زیادہ خوف زدہ کر دینے والے افراد میں سے تھی۔

اس زمانے میں ۔۔یعنی سن چالیس کی دہائی کے اواخر میں ۔۔۔ دیانا کی حیثیت ایک قدیم دارالسلطنت سے زیادہ کی نہ رہ گئی تھی جسے تاریخ نے دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں رونما ہونے والی دو باہم منحرف دنیاؤں کے درمیان واقع ایک دور افتادہ علاقائی صدر مقام میں بدل ڈالا تھا اور جو بلیک مارکیٹ اور بین الاقوامی جاسوسی کی جنگ کی طرح تھا۔ میں اس سے زیادہ موزوں گردوپیش کا اپنی اس سرگرداں ہم وطن کے لیے تصور نہیں کر سکتا تھا جو نکٹر کے اس مے خانے میں محض اپنی اصل سے دور ہونے کی بے قراری میں آیا کرتی تھی، حالانکہ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اسے اس میں آنے جانے والوں سمیت، خرید سکتی تھی۔ اس نے ہمیں اپنا اصل نام کبھی نہیں بتایا، ہم سب اسے ہمیشہ زبان کو بل دینے والے اس جرمن نام سے یاد کیا کرتے تھے جو لاطینی امریکی طلباء نے اس کے لیے وضع کیا تھا، فراؤ فریڈا، جوں ہی میرا اس سے تعارف ہوا، میں اس سے یہ سوال کرنے کی اتفاقیہ جسارت کر بیٹھا کہ وہ کولومبیا کے خطے کی نیدو کے، تیز ہوا کے جھکڑوں کی زد میں واقع پہاڑی مقام سے دنیا کے اس حصے میں کیوں کر آ پہنچی۔ اس نے حقیقت گویانہ انداز میں جواب دیا ''میں معاوضے پر لوگوں کے لیے خواب دیکھتی ہوں۔''

یہ اس کی معاش تھی۔ وہ کالداس کے قدیمی علاقے کے ایک خوشحال دکاندار کے گیارہ بچوں میں تیسری تھی، اور بولنے کی عمر کو پہنچنے تک یہ عادت اختیار کر چکی تھی کہ ناشتے سے پہلے۔۔۔۔۔ جب اس کے بیان کے مطابق، اس کی پیش گوئی کی قوت اپنی خالص ترین صورت میں ہوتی تھی۔۔۔ اپنے تمام خواب گھر والوں کو سنایا کرتی تھی۔ سات برس کی عمر میں اس نے خواب دیکھا کہ وہ ایک طوفانی ریلا اس کے ایک بھائی کو بہا کر لے گیا ہے۔ اس کی ماں نے محض اعصابی وہم زدگی کے زیرِ اثر، اپنے بیٹے کو اس کے سب سے پرلطف شغل، یعنی پہاڑی تالاب میں تیرنے کی ممانعت کر دی۔ لیکن فراؤ فریڈا اپنی پیش گوئیوں کی تعبیر کرنے کا اپنا نجی نظام اس وقت وضع کر چکی تھی۔

''خواب کا مطلب یہ نہیں ہے۔'' اس نے وضاحت کی'' کہ وہ ڈوب کر مرے گا، بلکہ یہ ہے کہ اسے مٹھائیاں نہیں کھانی چاہئیں۔''

یہ تعبیر ایک سخت سزا سے کم نہ تھی، خصوصاً پانچ سالہ لڑکے کے لیے جو اتوار کے دن کی ان شیرینیوں کے بغیر زندگی کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ لیکن ماں نے جسے اپنی بیٹی کی غیبی صلاحیت پر مکمل اعتقاد تھا، اس کے فرمان کو پوری طرح نافذ کیا۔ بدقسمتی سے بس ایک لمحے کی چوک ہوگئی۔ لڑکے کے حلق میں ایک لڈو پھنس گیا اور اس کی جان نہ بچ سکی۔

فراؤ فریڈا نے اس وقت تک کبھی گمان نہ کیا تھا کہ وہ اپنی اس صلاحیت کو روزی کمانے کے لیے استعمال کر سکتی ہے جب زندگی نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور اس نے ویانا کے شدید جاڑوں میں، اس پہلے مکان کی گھنٹی پر انگلی رکھی جس میں رہنے کو اس کا جی چاہا۔ جب پوچھا گیا کہ وہ کیا کام کر سکتی ہے، تو اس نے یہ سادہ جواب دیا ''میں خواب دیکھتی ہوں۔'' ایک مختصر سی وضاحتی گفتگو کے بعد خاتونِ خانہ نے اسے ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ اگرچہ معمولی جیب خرچ سے زیادہ نہ تھی، لیکن رہنے کو ایک عمدہ کمرہ اور تین وقت کا کھانا اس کے علاوہ تھا۔ ان کھانوں میں سب سے بڑھ کر ناشتہ تھا، جب گھر کے سب لوگ اپنی اپنی فوری تقدیر سننے بیٹھتے۔ باپ، جو ایک نفیس شخصیت والا سرمایہ کار تھا، ماں، جو رومانی چیمبر موسیقی کی دل دادہ ایک خوش طبع عورت تھی اور دو بچے جو بالترتیب گیارہ اور نو برس کی عمر کے تھے۔ وہ سب مذہبی خیال کے تھے، اور اس باعث قدیم توہمات کے زیرِ اثر آنے کی حس رکھتے تھے۔ فراؤ فریڈا کی گھر میں آمد سب کے لیے خوشی کی بات تھی۔ بشرطیکہ وہ ہر روز اپنے خوابوں کے ذریعے ان کی تقدیر کا انکشاف کیا کرے۔

اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، خصوصاً فوری بعد آنے والے جنگ کے برسوں میں، جب حقیقت کسی بھی بھیانک خواب سے زیادہ سنگین تھی۔ ہر صبح ناشتے کی میز پر یہ فیصلہ بلا شرکتِ غیرے اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا کہ گھر کا ہر فرد اس روز کیا کرے گا اور کس طرح کرے گا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کی پیش گو آواز نے گھر کی واحد حاکمانہ آواز کی حیثیت اختیار کر لی۔ گھرانے پر اس کی حاکمیت مطلق تھی، خفیف سے خفیف جنبش بھی اس کے حکم کی محتاج تھی۔ باپ کا انتقال میرے ویانا آنے سے ذرا ہی پہلے ہوا تھا اور اس نے موزوں شائستگی سے کام لیتے ہوئے اپنی دولت کا ایک حصہ فراؤ فریڈا کے نام چھوڑا تھا۔ شرط وہی تھی کہ جب تک اس کی یہ صلاحیت اسکا ساتھ نہ چھوڑ دے وہ گھر والوں کی تقدیر کے انکشاف کے لیے خواب دیکھنا جاری رکھے گی۔

ویانا میں میں نے ایک مہینہ ایک ایسے طالبِ علم کے طور پر گزارا جسے کبھی نہ آنے والی رقم کا انتظار تھا۔ مے خانے میں فراؤ فریڈا کی غیر متوقع اور کشادہ دست آمد ہماری تنگ مایہ اقلیم میں ایک جشن کی طرح ہوتی تھی۔ ایک رات، جب ہمارے اردگرد بیئر کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی، اس نے آ کر مجھ سے اتنے تیقن کے ساتھ سرگوشی کی کہ میرے لیے اس کی بات پر توجہ نہ دینا ناممکن ہو گیا۔

''میں خاص طور پر تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میں نے کل رات تمہیں خواب میں دیکھا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم اسی وقت ویانا سے چلے جاؤ اور پانچ سال تک یہاں واپس نہ آنا۔''

اس کا لہجہ اتنا محکم تھا کہ اس نے مجھے اسی رات روم جانے والی آخری ٹرین میں سوار کرا دیا۔ میں اتنا دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ مجھے اس کے بعد سے رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ میں ایک ایسے سانحے سے بچ نکلا ہوں جو مجھے پیش نہیں آیا۔ میں نے آج تک ویانا میں دوبارہ قدم نہیں رکھا۔

ہوانا والے حادثے سے پہلے فراؤ فریڈا سے میری ایک بار اور ملاقات ہوئی تھی۔ بارسلونا میں اس سے مڈبھیڑ اتنی غیر متوقع تھی کہ مجھے خاص طور پر پراسرار معلوم ہوئی۔ یہ وہ دن تھا جب پابلو نیرودا نے، چیلے کی شہر والپریزو کی جانب اپنے طویل بحری سفر میں ایک وقفے کے دوران، خانہ جنگی کے بعد سے پہلی بار ہسپانوی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اس نے صبح کا وقت ہمارے ساتھ قدیم کتابوں کی دکانوں میں، گویا کسی کم یاب شکار کی تلاش میں گزارا۔ اس نے بالآخر اڑتی ہوئی روشنائی اور پھٹی ہوئی جلد والی ایک کتاب خریدی اور اس کے لیے یہ جو رقم ادا کی وہ رنگون میں چیلے کے قونصل خانے کی دو مہینے کی تنخواہ کے برابر تو ضرور رہی ہوگی۔ وہ کسی گٹھیا کے مریض ہاتھی کی طرح رک رک کر پرشور انداز میں چلتا رہا اور اپنی نگاہ کے سامنے آنے والی ہر شے کے اندرونی کل پرزوں اور کام کرنے کے طریقوں سے بچوں کی سی دلچسپی ظاہر کرتا رہا۔ دنیا اسے ہمیشہ چابی سے چلنے والا ایک بڑا سا مشینی کھلونا دکھائی دی۔

میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں جانا جو نشاۃ الثانیہ کے زمانے کے پوپ کی اکتسابی شکل و صورت سے ـــ یعنی پرخوری اور تہذیبِ نفس کے آمیزے سے ـــ اس قدر قریبی مشابہت رکھتا ہو جتنا یہ شخص جو کسی بھی میز پر بیٹھتا، نہ چاہتے ہوئے بھی صدر نشین اور حاکم کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ اس کی بیوی ماتیلد نے اس کے گلے کے گرد ایک بب سی باندھ دی جو کسی ریستوران کے نیپکن سے زیادہ حجام کی دکان کا ایپرن دکھائی دیتی تھی، لیکن یہ اسے شوربے اور چٹنی میں نہا جانے سے روکنے کا واحد طریقہ تھا۔ اس روز نیرودا نے تین سالم لوبسٹر، کسی سرجن کی سی باریک بین توجہ کے ساتھ قطع کر کے، کھائے اور اس دوران ہر شخص کی ڈش کو حرص آمیز نگاہوں ہی نگاہوں میں نگلتا رہا، یہاں تک کہ ہر پلیٹ میں سے کچھ نہ کچھ لینے کی ترغیب نے اسے مغلوب کر لیا۔ کالیسیا کے گھونگے، کنٹابریا کی بطخیں، الی کانتے کے جھینگے، کوستابراوا کی سورڈش ـــ اور یہ سب اس نے ایسی اشتہا کے ساتھ کیا جسے ہر شخص نے متعدی پایا۔ تمام وقت وہ فرانسیسیوں کی طرح، دوسرے خوش مزہ کھانوں کی، خصوصاً چیلے کی ماقبل تاریخ شیل فش کی باتیں کرتا رہا جو اسے سب کھانوں سے زیادہ مرغوب تھی۔ کھاتے کھاتے اچانک وہ رک گیا، اس کے کان لوبسٹر کے

انٹینوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور اس نے مجھ سے سرگوشی کی۔ ''میرے پیچھے کوئی شاعر بیٹھا ہے جو مجھے متواتر گھور رہا ہے۔''

میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے نظر ڈالی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کے پیچھے، تین میزیں چھوڑ کر، ایک عورت پرانے فیشن کا کینوس کا ہیٹ اور جامنی سکارف پہنے سکون سے بیٹھی آہستہ آہستہ کھانا کھا رہی تھی اور اس کی نگاہ نیرودا پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ بوڑھی اور فربہ ہو گئی تھی لیکن وہ وہی تھی، اپنی پہلی انگلی میں سانپ کی شکل کی انگوٹھی سمیت۔

دو نیپلز سے اسی کشتی پر چلی آ رہی تھی جس پر نیرودا اپنے کنبے کے ساتھ سفر کر رہا تھا، لیکن سفر کے دوران ان کی آپس میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے اسے ساتھ کافی پینے کے لیے اپنی میز پر بلا لیا اور میں نے اسے دعوت دی کہ وہ شاعری کو محظوظ کرنے کی خاطر ہی سہی، اپنے خوابوں کے بارے میں گفتگو کرے۔ لیکن شاعر اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھا، اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ اسے خوابوں کے الوہی ہونے پر قطعاً اعتقاد نہیں۔

''صرف شاعری پیش آگہی کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' اس نے کہا۔

دوپہر کے کھانے اور رمبلاس کے کنارے کی ناگزیر سیر کے بعد میں جان بوجھ کر فراؤ فریڈا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ذرا پیچھے رہ گیا تاکہ ہم دوسروں کی سماعت سے باہر اپنی شناسائی کی تجدید کر سکیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ آسٹریا میں اپنی جائیداد بیچ کر پرتگال کے شہر پورتو منتقل ہو گئی ہے اور وہاں ایک ایسے مکان میں رہ رہی ہے جو اس کے الفاظ میں ایک نقلی قلعہ ہے جو ایک اونچی چٹان پر بنا ہوا ہے جہاں سے وہ پورے بحر اوقیانوس کو، امریکا تک، دیکھ سکتی ہے۔ یہ واضح تھا، اگرچہ اس نے کھل کر کہا تھا، کہ خوابوں کے ذریعے سے رفتہ رفتہ اس نے اپنے سابقہ ویانیز مالکوں کی تمام جائیداد کی ملکیت حاصل کر لی ہے۔ اس کے باوجود میں متاثر نہ ہوا، صرف اس وجہ سے کہ میں نے ہمیشہ اس کے خوابوں کو پیسہ کمانے کی شعوری کوشش خیال کیا تھا۔ میں نے یہ بات اسے بتا بھی دی۔

وہ اپنے مخصوص، مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسی۔ تم ہمیشہ کی طرح ڈھیٹ ہو۔'' اس نے کہا۔ ہمارے بقیہ ساتھی اب نیرودا کے انتظار میں ٹھہر گئے تھے جو پرندوں کی دکان میں طوطوں سے چیلے کی بول چال کی زبان میں باتیں کرنے لگا تھا۔ جب ہم نے اپنی بات چیت دوبارہ شروع کی تو فراؤ فریڈا نے موضوع بدل دیا۔

''ویسے'' وہ بولی، ''تم چاہو تو اب ویانا واپس جا سکتے ہو۔''

اس پر مجھے احساس ہوا کہ ہماری پہلی ملاقات کو تیرہ برس ہو چکے ہیں۔

''حالانکہ تمہارے خواب غلط ہیں، مگر میں کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔'' میں نے اسے بتایا۔''

کیا پتا!''

تین بجے میں اس سے جدا ہو کر نیرودا کے ساتھ چلا تا کہ وہ ہمارے گھر میں اپنا متبرک قیلولہ کر سکے، جسے اس نے کئی بے حد سنجیدہ ابتدائی رسومات کے بعد شروع کیا جن سے مجھے کسی وجہ سے جاپانیوں کی چائے کی تقریب کا خیال آیا۔ بعض کھڑکیاں کھلی جاتی تھیں، بعض بند کی جاتی تھیں۔ ایک مخصوص درجہ حرارت بہت ضروری تھا۔۔۔ اور صرف ایک مخصوص زاویے سے آنے والی مخصوص قسم کی روشنی قابلِ برداشت تھی۔ اور اس کے بعد انتہائی مکمل خاموشی۔ نیرودا فوراً ہی سو گیا اور جیسے بچے کرتے ہیں، دس منٹ بعد، جب ہمیں اس کی ذرا بھی توقع نہ تھی، اٹھ بیٹھا۔ جب وہ لونگ روم میں داخل ہوا تو تازہ دم تھا اور تکیے کے غلاف کا مونوگرام اس کے رخسار پر چھپا ہوا تھا۔

''میں نے خواب دیکھنے والی عورت کو خواب میں دیکھا۔'' وہ بولا۔

ماتیلد نے اس سے ہمیں اپنا خواب سنانے کو کہا۔

''میں نے دیکھا کہ وہ خواب میں مجھے دیکھ رہی ہے۔'' وہ بولا۔

''یہ تو بورخیس کی طرح لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے اترے ہوئے منہ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ''کیا اس نے لکھ دیا ہے؟''

''اگر نہیں لکھا ہے تو ایک نہ ایک دن ضرور لکھے گا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اسی کی بھول بھلیوں میں سے ایک ہو گی۔''

اس سہ پہر چھ بجے نیرودا جوں ہی جہاز پر سوار ہوا، اس نے ہم سے الوداعی کلمات کہے، دور کی ایک میز پر جا بیٹھا اور سبز روشنائی والے اسی قلم سے شعر لکھنے لگا جسے وہ اپنی کتابوں پر دستخط کرتے وقت پھول، مچھلیاں اور پرندے بنانے کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ روانگی کا پہلا اعلان ہوتے ہی ہم نے جہاز میں فراؤ فریڈا کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور بالآخر اسے سیاحوں کے عرشے پر اس وقت پایا جب ہم مایوس ہو کر تلاش کو خیر باد کہنے کو تھے۔ وہ بھی ابھی ابھی قیلولے سے بیدار ہوئی تھی۔

''میں نے خواب میں تمہارے شاعر کو دیکھا۔'' اس نے ہمیں بتایا۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر اس سے خواب سنانے کو کہا۔

''میں نے دیکھا کہ وہ خواب میں مجھے دیکھ رہا ہے۔'' اس نے کہا اور میرے چہرے پر بے یقینی کا تاثر دیکھ کر گڑبڑا سی گئی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو؟ کبھی کبھی تمام خوابوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

میں نے اس کے بعد نہ کبھی اسے دیکھا نہ اس کے بارے میں سوچا۔ پھر میں نے سانپ کی شکل کی اس انگوٹھی کا ذکر پڑھا جو سمندری حادثے میں ہوٹل ریویئرا کے قریب ہلاک ہونے والی عورت کی انگلی میں پائی گئی۔ جب چند ماہ بعد ایک سفارتی استقبالیے میں میری ملاقات پرتگالی سفیر سے ہوئی تو میں اس سے اس کے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

سفیر نے اس عورت کا ذکر جذبے اور بے پناہ ستائش کے ساتھ کیا۔ ''تم تصور نہیں کر سکتے کہ وہ عورت کتنی غیر معمولی تھی۔'' وہ بولا۔ ''تم اس پر کہانی لکھنے کی ترغیب کی مزاحمت نہ کر پاتے۔'' وہ اسی رو میں بولتا رہا۔ کبھی کبھار درمیان میں کوئی حیران کن تفصیل آتی لیکن اس گفتگو کے ختم ہونے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔

''اچھا، مجھے یہ بتاؤ۔'' میں نے بالآخر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''کہ وہ کام کیا کرتی تھی۔''

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے تسلیم و رضا کے انداز میں کندھے جھٹک کر جواب دیا۔ ''وہ بس خواب دیکھتی تھی۔''



(مشمولہ: ''ادبیات''، (بین الاقوامی ادب نمبر ۵)، جلد ۱۱، شمارہ ۴۵-۴۳، اسلام آباد، بہار تا گرما ۱۹۹۸)

میں اپنے خواب بیچتی ہوں

ترجمہ: تنویر انجم

ایک صبح نو بجے جس وقت ہم چمکتے سورج کے نیچے ہوانا ریویرا ہوٹل کے ٹیرس پر ناشتہ کر رہے تھے ایک بہت بڑی لہر نے بہت سی کاروں کو جو سمندر کی دیوار کے ساتھ خیابان پر چل رہی تھیں یا کنارے پر پارک کی گئی تھیں فضا میں بلند کیا اور ان میں سے ایک کو ہوٹل کی ایک دیوار میں پیوست کر دیا۔ یہ ڈائنامائٹ کے ایک دھماکے کی طرح تھا جس نے عمارت کی تمام بیس منزلوں پر افراتفری پھیلا دی اور عظیم الشان داخلی دروازے کو چکنا چور کر دیا، لابی میں موجود متعدد سیاح فرنیچر کے ساتھ ساتھ ہوا میں اچھلے اور کچھ شیشے کی ژالہ باری سے زخمی ہو گئے۔ لہر ضرور بے حد بلند رہی ہو گی کیونکہ اس نے سمندری دیوار اور ہوٹل کے درمیان دو رویہ چوڑی سڑک کو پار کیا اور پھر بھی اس میں اتنی طاقت باقی رہی کہ اس نے دروازے کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

کیوبا کے خوش طبع رضا کاروں نے آگ بجھانے والے محکمے کی مدد سے چھ گھنٹوں سے کم مدت میں ملبہ اٹھالیا اور سمندر کے رخ والے گیٹ پر تالے ڈال کر ایک نیا گیٹ نصب کر دیا اور سب کچھ معمول پر لوٹ آیا۔ صبح کے دوران کسی نے اس کار کی پروا نہیں کی جو دیوار میں پپڑی کی طرح جمی ہوئی تھی کیونکہ لوگوں نے فرض کر لیا کہ یہ ان میں سے ایک تھی جو کنارے پر پارک تھیں۔ لیکن جب کرین نے اسے اپنی جگہ سے اٹھایا تو اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے سیٹ بیلٹ سے بندھی ایک عورت کی لاش ملی۔ ضرب اتنی ہولناک تھی کہ اس کی ایک ہڈی بھی سلامت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ تباہ ہو گیا تھا، اس کے جوتے پھٹ کر ٹکڑے ہو گئے تھے اور اس کے کپڑے تار تار تھے وہ زمردی آنکھوں والے ایک سانپ جیسی شکل کی سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئی تھی۔ پولیس نے بیان

جاری کیا کہ وہ نئے پرگیزی سفیر اور اس کی بیوی کی گھریلو منتظمہ تھی۔ وہ دو ہفتے قبل ان کے ساتھ ہوانا آئی تھی اور اس صبح مارکیٹ جانے کے لیے ایک نئی کار چلاتی ہوئی نکلی تھی۔ میں نے جب اخبار میں اس کا نام پڑھا تو میرے لیے وہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی سانپ والی انگوٹھی اور سانپ کی زمردی آنکھوں نے میری دلچسپی کو بیدار کر دیا۔ میں بہر حال یہ نہیں معلوم کر سکا کہ انگوٹھی اس نے کس انگلی میں پہنی ہوئی تھی۔

یہ معلومات کا ایک نہایت اہم جزو تھا، کیوں کہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ ایک ناقابلِ فراموش عورت تھی جس کا اصل نام مجھے کبھی پتہ نہیں چلا اور جو اسی طرح کی انگوٹھی اپنی دائیں انگشتِ شہادت میں پہنتی تھی جو اس زمانے میں اس سے بھی زیادہ انوکھی بات تھی جتنی آج کل ہے۔ میں اس سے چونتیس سال پہلے ویانا میں لاطینی امریکی طلبا کے پسندیدہ ایک شراب خانے میں ابلے ہوئے انڈوں کے ساتھ سور کا گوشت کھاتے اور ڈرافٹ بیئر پیتے ہوئے ملا تھا۔ میں اسی صبح روم سے آیا تھا اور اس کی شاندار غنائی آواز کی اٹھان، اس کے کوٹ کے کالر پر تھکی ماندی پڑی لومڑی کی دُم اور اس کی سانپ کی شکل کی مصری انگوٹھی پر اپنا فوری ردعمل مجھے آج بھی یاد ہے۔ وہ سانس کے وقفوں کے لیے رکے بغیر بھاری لہجے میں ابتدائی ہسپانوی بولتی تھی اور میرا خیال تھا کہ لکڑی کی اس لمبی میز پر وہ واحد آسٹریائی تھی۔ لیکن نہیں وہ لولمبیا میں پیدا ہوئی تھی اور دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں جب وہ ایک بچی سے کچھ ہی زیادہ بڑی تھی، موسیقی اور آواز کی تعلیم کے لیے آسٹریا آئی تھی۔ وہ تقریباً تیس سال کی تھی اور اپنی عمر کے ساتھ صحیح طور پر نہیں چلی تھی کیوں کہ وہ کبھی خوبصورت نہیں رہی تھی اور وہ وقت سے پہلے بوڑھا لگنا بھی شروع کر چکی تھی۔ لیکن وہ ایک پرکشش انسان تھی اور بے انتہا بارعب شخصیت۔

ویانا اس وقت تک ایک قدیم پرشکوہ شہر تھا مگر دوسری جنگِ عظیم کے اثرات کی تخلیق کردہ دو ناقابلِ مصالحت دنیاؤں کے درمیان اس کے جغرافیائی مقام نے اسے چور بازاری اور بین الاقوامی جاسوسی کے لیے ایک جنت میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں اپنی مفرور ہم وطن کے لیے اس سے زیادہ موزوں مقام کا تصور نہیں کر سکتا تھا، وہ جو ابھی تک صرف اپنی وطنیت سے وفاداری کی خاطر کونے پر واقع طلبا کے شراب خانے میں کھانا کھاتی تھی کیونکہ پیسہ تو اس کے پاس اتنا تھا کہ اپنی میز پر موجود تمام دوستوں کے لیے کھانا خرید دے۔ اس نے کبھی اپنا اصل نام نہیں بتایا اور ہم ہمیشہ اسے اس جرمن زبان مروڑ نام سے جانتے رہے جو ویانا میں لاطینی امریکی طلبا نے اس کے لیے ایجاد کیا تھا: فراؤ فرائیڈا۔ میرا ابھی اس سے تعارف کرایا ہی گیا تھا کہ میں اس سے یہ پوچھنے

کی خوشگوار گستاخی کر بیٹھا کہ وہ کوینڈیو کی بل کھاتی چٹانوں سے اس قدر دور اور مختلف دنیا میں کیوں کر آن بسی تھی، اور اس نے ایک تباہ کن جواب دیا۔

''میں اپنے خواب بیچتی ہوں۔''

حقیقتاً یہ اس کا واحد کاروبار تھا۔ وہ پرانے کالڈاس میں ایک خوشحال دوکان دار کے گیارہ بچوں میں سے تیسری تھی اور جیسے ہی اس نے بولنا سیکھا اس نے اپنے خاندان میں ناشتے سے قبل خواب سنانے کی خوب صورت رسم کو قائم کر دیا۔ ناشتے کا وقت جب کہ لوگوں کی الہامی صلاحیتیں اپنی خالص ترین شکل میں محفوظ ہوتی ہیں۔ جب وہ سات سال کی تھی اس نے خواب دیکھا کہ اس کے بھائیوں میں سے ایک کو سیلابی ریلہ بہا لے گیا۔ اس کی ماں نے محض مذہبی توہم کی بنیاد پر لڑکے کو پہاڑی نالے میں تیرنے سے منع کر دیا جو اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ لیکن فرافرائیڈا اپنا خاص نظام پیشین گوئی بنا چکی تھی۔

''جو اس خواب کا مطلب ہے وہ یہ نہیں کہ وہ ڈوب جائے گا'' اس نے کہا'' بلکہ یہ کہ اسے میٹھی چیزیں نہیں کھانا چاہئیں۔''

ایک پانچ سالہ لڑکے کے لیے جو اپنی اتوار کی تواضع کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا اس کی یہ تعبیر ایک ذلت و رسوائی جیسی تھی۔ ان کی ماں نے جسے اپنی بیٹی کی الہامی صلاحیتوں کا یقین تھا، ایک فولادی ہاتھ سے اس انتباہ کو نافذ کر دیا۔ لیکن اس کے اولین لاپرواہ لمحے میں ایک مٹھائی کا ٹکڑا جو وہ سب سے چھپ کر کھا رہا تھا اس کے گلے میں پھنس گیا اور پھر اسے بچانے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔

فرافرائیڈا کو اس وقت تک یہ خیال نہیں تھا کہ وہ اس صلاحیت سے اپنی روزی کما سکتی ہے جب تک کہ ویانا کی بے رحم سردیوں کے دوران زندگی نے اس کو گلے تک جکڑ نہیں لیا۔ پھر وہ اس پہلے گھر میں جہاں وہ رہنا پسند کر سکتی تھی کام کی تلاش میں پہنچی اور جب اس سے پوچھا گیا وہ کیا کر سکتی ہے تو اس نے صرف سچ بتایا ''میں خواب دیکھتی ہوں'' گھر کی مالکن کے لیے بس اس کی ایک مختصر وضاحت کافی تھی اور ایک ایسی تنخواہ پر جو اس کے چھوٹے موٹے خرچوں کے لیے کافی تھی اسے کام پر رکھ لیا گیا مگر اسے ایک عمدہ کمرہ اور دن کا تین وقت کا کھانا میسر ہو گیا تھا خاص طور پر ناشتہ جب پورا خاندان ہر فرد کے مستقبل قریب سے آگاہی کے لیے اکٹھا بیٹھتا تھا۔ باپ، ایک مہذب سرمایہ کار، ماں، رومانی خلوتی موسیقی کی دلدادہ ایک خوش باش عورت، اور دو بچے؛ گیارہ سالہ اور نو سالہ۔ وہ سب مذہبی تھے اور اسی لیے قدیم توہمات کی طرف مائل اور وہ

فرافرائیڈا کو گھر میں رکھنے پر شاداں تھے جس کا واحد فرض یہ تھا کہ اپنے خوابوں کے ذریعے ان کی ہر روز کی قسمتوں کے راز دریافت کرے۔

اس نے اپنا کام بخوبی کیا اور ایک طویل عرصے تک اور سب سے بڑھ کر ان جنگ کے برسوں میں جب حقیقت ڈراؤنے خوابوں سے زیادہ خوفناک تھی صرف وہ ہی ناشتے پر فیصلہ کر سکتی تھی کہ ہر ایک کو اس دن کیا کرنا چاہیے اور وہ کیسے کیا جانا چاہیے یہاں تک کہ اس کے پیشین گوئیاں گھر میں واحد سند بن گئیں۔ خاندان پر اس کا تسلط مطلق تھا۔ ذرا سی آہ بھی اس کے حکم سے بھری جاتی تھی۔ گھر کا مالک اس زمانے میں انتقال کر گیا جب میں ویانا میں تھا اور اس وقار کا مظاہرہ کیا کہ اپنی جاگیر کا ایک حصہ اس شرط پر اس کے لیے چھوڑا کہ وہ اس کے خاندان کے لیے خواب دیکھنا جاری رکھے جب تک کہ اس کے خواب ختم نہ ہو جائیں۔

میں ویانا میں ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک دیگر طلبا کے نامساعد حالات میں شریک مقیم رہا اس رقم کا منتظر جو کبھی نہیں پہنچی۔ فرافرائیڈا کے شراب خانے کے غیر متوقع اور فیاضانہ دورے ہمارے افلاس زدہ معمول میں ضیافتوں کی مانند ہوتے تھے۔ ایک رات بیئر کے نشے کی سرمستی میں اس نے ایک ایسے تیقن کے ساتھ جو تاخیر کی اجازت نہیں دیتا تھا میرے کان میں سرگوشی کی۔

''میں تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے آئی تھی کہ میں نے کل رات تمہیں خواب میں دیکھا۔'' اس نے کہا، ''تمہیں فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے اور ویانا میں پانچ سال تک واپس نہیں آنا چاہیے۔''

اس کا ایمان اتنا حقیقی تھا کہ میں اسی رات روم کو جانے والی آخری ٹرین پر سوار ہو گیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس کی بات کے اثر میں اس حد تک تھا کہ اس کے بعد سے میں اپنے آپ کو ایک ایسی آفت سے بچ جانے والا سمجھتا رہا جس کا میں نے کبھی تجربہ نہیں کیا۔ میں آج تک ویانا واپس نہیں گیا ہوں۔

ہوانا کی آفت سے پہلے میں بارسلونا میں فرافرائیڈا سے اتنے غیر متوقع اور اتفاقی انداز میں ملا کہ یہ مجھے ایک معمہ سا لگا۔ یہ واقعہ اس دن پیش آیا جب پابلو نیرودا نے والپرائیزو کی جانب طویل سفر کے دوران عارضی قیام کے لیے ہسپانوی سرزمین پر خانہ جنگی کے بعد پہلی بار قدم رکھا۔ اس نے پرانی کتابوں کی دکانوں پر بڑے شکار کی تلاش میں ہمارے ساتھ ایک صبح گزاری اور پورٹر پر اس نے پھٹی جلد والی ایک پرانی شکن آلود کتاب خریدی جس کے لیے اس نے جو ادائیگی کی وہ رنگون کے سفارتخانے میں اس کی دو ماہ کی تنخواہ کے برابر ہو گی۔ وہ ہجوم کے درمیان ایک

معذور ہاتھی کی طرح چل رہا تھا ہر شے کے اندرونی نظام کار کے بارے میں ایک طفلانہ تجسس لیے ہوئے کیونکہ دنیا اسے ایک ایسا عظیم چابی سے چلنے والا کھلونا لگتی تھی جس کے لیے زندگی نے خود کو ایجاد کیا تھا۔

میں کسی اور کو نہیں جانتا جو دورِ نشاۃ الثانیہ کے پوپ کے ہمارے تصور سے اتنا قریب ہو۔ وہ بسیار خور اور شائستہ تھا۔ اپنی خواہش کے برخلاف تک وہ ہمیشہ میز پر صدارت کا فرض نبھاتا۔ ماٹلڈے، اس کی بیوی، اس کی گردن کے گرد ایک بب باندھ دیتی جو طعام گاہ سے زیادہ حجام کی دکان کے لیے مناسب ہوتا۔ لیکن یہ اسے چٹنی میں غسل لینے سے بچانے کا واحد طریقہ تھا۔ کاروالیرا س پر وہ دن عام سا تھا اس نے تین سالم لوبسٹر ایک سرجن کی مہارت سے چیر پھاڑ کر کے کھائے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی نظروں سے ہر ایک کی پلیٹ کو ہڑپ کیا اور ہر ایک کی پلیٹ سے ایک ایسے انبساط کے ساتھ تھوڑا تھوڑا چکھا کہ جس نے کھانے کی خواہش کا چھوت سب کو لگا دیا۔ گالیشیا کے گھونگے، کنٹیبریا کے صدفیے، ایلیکانتے کے جھینگے، کوسٹا براوا کے سمندری کھیرے۔ اس دوران فرانسیسیوں کی طرح اس نے کسی بارے میں بات نہیں کی سوائے دوسری نفیس غذاؤں کے اور خصوصاً چلی کی قبل از تاریخ خول مچھلی کے جسے اس نے اپنے دل میں بسایا ہوا تھا۔ اچانک اس نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اور اپنے گھونگے کے جیسے محاسوں کو بلند کیا اور ایک بہت ہلکی آواز میں مجھ سے کہا۔

''میرے پیچھے کوئی ہے جو مجھے گھورنا بند نہیں کر رہا۔''

میں نے اس کے شانے کے پیچھے نظر ڈالی اور یہ سچ تھا۔ تین میٹروں کے فاصلے پر ایک پرانے فیشن کی فلیٹ ہیٹ اور ایک اودا اسکارف پہنے بغیر عجلت کے کھانا کھاتی ہوئی اور اسے گھورتی ہوئی ایک نڈر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ایک نظر میں اسے پہچان لیا۔ وہ بوڑھی اور فربہ ہو چکی تھی لیکن وہ فرافرائیڈا تھی اور اس کی انگشتِ شہادت میں سانپ انگوٹھی تھی۔

وہ نیپلز سے ایک جہاز میں سفر کر رہی تھی جس میں نیرودا اور اس کی بیوی تھی لیکن انھوں نے جہاز میں ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے اسے اپنی میز پر کافی پینے کی دعوت دی اور میں نے اسے شاعر کو ششدر کرنے کے لیے اپنے خوابوں کے بارے میں بات کرنے پر اکسایا۔ شاعر نے کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ شروع ہی سے اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ خوابوں کی پیش گوئیوں پر یقین نہیں رکھتا۔

''صرف شاعری غیب داں ہے۔'' اس نے کہا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد رمبلاس کے کنارے کنارے ناگزیر چہل قدمی کے دوران میں فرافرائیڈا کے ساتھ دوسروں سے پیچھے ہو گیا تاکہ ہم دوسرے کانوں کو کچھ سنائے بغیر اپنی یادوں کو تازہ کر سکیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے آسٹریا میں اپنی جائیداد کو بیچ دیا تھا اور پرتگال میں اوپورٹو منتقل ہو گئی تھی جہاں وہ ایک ایسے مکان میں رہتی تھی جو پہاڑی پر واقع ایک مصنوعی قلعے جیسا تھا جس سے کوئی سمندر پار امریکاؤں کو دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے ایسا کچھ بتایا نہیں مگر اس کی گفتگو سے واضح ہو گیا کہ ایک ایک خواب کر کے اس نے ویانا میں اپنی تعریف کے لیے ناقابل بیان سرپرستوں کی تمام دولت ہتھیالی تھی۔ مجھے بہر حال اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میرا ہمیشہ یہی خیال تھا کہ اس کے خواب ذاتی بقا کی ایک چال سے زیادہ کچھ نہیں اور میں نے اسے یہ بتا بھی دیا۔

وہ اپنی ناقابلِ مزاحمت ہنسی ہنسی ''تم اتنے ہی بدتمیز ہو جتنے ہمیشہ تھے۔'' اس نے کہا، اور پھر کچھ نہیں کہا کیونکہ باقی تمام لوگ نیرودا کے انتظار میں ٹھہر گئے تھے تاکہ وہ رمبلا ڈی لو پا جاروز کے ساتھ ساتھ بیٹھے طوطوں سے سڑک کی چلینین بولی میں اپنی گفتگو ختم کر لے۔ جب ہم نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا تو فرافرائیڈا نے موضوع بدل دیا۔

''ایک بات اور'' اس نے کہا ''تم اب ویانا واپس جا سکتے ہو اس پر ہی مجھے احساس ہوا کہ ہماری پہلی ملاقات کو تیرہ سال گزر چکے تھے۔

'' اگر تمہارے خواب جھوٹے بھی ہیں تب بھی میں کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔'' میں نے اسے بتایا'' کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔۔''

تین بجے ہم نے اسے نیرودا کے مقدس قیلولے میں اس کا ساتھ دینے کے لیے چھوڑ دیا۔ جو نیرودا نے ہمارے گھر میں کیا، نہایت سنجیدہ تیاریوں کے ساتھ جو کچھ کچھ جاپانی چائے کی رسم کی یاد دلا رہی تھیں۔ کچھ کھڑکیوں کو کھولنا پڑا اور کچھ کو بند کرنا پڑا تاکہ حرارت کی بہترین سطح کو حاصل کیا جا سکے اور ایک خاص سمت سے ایک خاص قسم کی روشنی اور مکمل خاموشی ضروری تھی۔ نیرودا فوراً ہی نیند میں ڈوب گیا اور دس منٹ کے بعد جاگ گیا، جیسے بچے کرتے ہیں جبکہ ہمیں اس کی بالکل توقع نہیں تھی۔ وہ لونگ روم میں آ پہنچا بالکل ہشاش بشاش اور اپنے گال پر تکیے کے خطوط سجائے۔

''میں نے اس عورت کو خواب میں دیکھا جو خواب دیکھتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ماٹلڈ سے چاہتی تھی کہ وہ اسے اپنا خواب سنائے۔

''میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ میرے بارے میں خواب دیکھ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ تو بالکل بورخیس کا مقولہ لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے قدرے تاسف کے ساتھ مجھ پر نظر ڈالی۔

''کیا وہ پہلے ہی لکھ چکا ہے۔؟''

''اگر نہیں لکھا ہے، تو کسی وقت لکھ دے گا۔'' میں نے کہا۔

''یہ اس کی بھول بھلیوں میں سے ایک ہوگا۔''

جیسے ہی نیرودا چھ بجے شام جہاز پر سوار ہوا اس نے ہمیں خدا حافظ کہا اور ایک الگ تھلگ میز پر بیٹھ گیا اور اس سبز روشنائی سے رواں اشعار لکھنا شروع کر دیے جسے وہ اپنی کتابوں کا انتساب کرتے ہوئے پھولوں اور مچھلیوں اور پرندوں کی تصویریں بنانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

جب ''سب کنارے پر'' تھے تو سب سے پہلے ہم نے فراؤ فرائیڈا کی تلاش کی اور آخر کار اسے سیاحوں کے عرشے پر ڈھونڈ لیا بالکل اس وقت جب ہم اسے خدا حافظ کہے بغیر رخصت ہونے والے تھے۔ اس نے بھی قیلولہ کر لیا تھا۔

''میں نے شاعر کو خواب میں دیکھا۔'' اس نے کہا۔

حیرت زدہ، میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے اپنا خواب سنائے۔

''میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ مجھے خواب میں دیکھ رہا ہے۔'' اس نے کہا اور میری حیرت بھری نظر نے اسے مضطرب کر دیا۔'' تم کیا توقع کر رہے تھے؟ کبھی کبھار میرے سارے خوابوں میں کوئی ایسا بھی آ جاتا ہے جس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

میں اس سے دوبارہ پھر کبھی نہیں ملا اور اس کے بارے میں سوچا تک نہیں اس دن تک کہ جب میں نے سانپ انگوٹھی والی عورت کے بارے میں سنا جو ہوانا ریویرا آفت میں ماری گئی۔ اور میں پرگیزی سفیر سے جب ہم ایک سفارتی دعوت میں اتفاقیہ ملیں گن لینے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ سفیر نے اس کا تذکرہ نہایت جوش و خروش اور بہت زیادہ پسندیدگی کے ساتھ کیا۔'' آپ تصور نہیں کر سکتے وہ کتنی غیر معمولی تھی۔'' اس نے کہا۔'' آپ اس کے بارے میں ایک کہانی لکھنے پر مجبور ہو جاتے۔'' اور وہ اسی انداز میں حیرت انگیز تفصیلات کے ساتھ بات کرتا گیا مگر اس سراغ کے بغیر جو مجھے ایک حتمی نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیتا۔

''ٹھوس لفظوں میں'' میں نے آخر کار اس سے پوچھا'' وہ کرتی کیا تھی؟''

''کچھ نہیں'' اس پر طاری فسوں گویا ٹوٹ گیا۔ وہ خواب دیکھتی تھی۔



(مشمولہ: ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ نمبر ۴۱، اکتوبر ۲۰۱۴ء)

پن ککڑیوں کی رات

ترجمہ: محمد عاصم بٹ

ہم تینوں میز کے گرد بیٹھے تھے جب کسی نے مشین میں سکہ ڈالا اور ورلنیزر نے پھر سے وہی ریکارڈ چلا دیا جو رات بھر بجتا رہا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہمیں سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ اس سے پیشتر کہ ہم یاد کرتے کہ ہم کہاں تھے اور جغرافیائی حدود اربع سے متعلق ہماری حسیات بیدار ہوتیں۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ ہم میں سے ایک نے اپنا ہاتھ کاؤنٹر پر رکھا اور ادھر اُدھر ٹوہنے لگا (ہمیں ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی) ہاتھ ایک گلاس میں جا پھنسا اور پھر خاموشی چھا گئی، وہ دونوں ہاتھوں کو سخت سطح پر رکھے ہوئے تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی کھوج میں اندھیرے میں دیکھا اور ہم تینوں نے ایک دوسرے کو پا لیا۔ تیس انگلیوں کے مشترکہ جوڑ تھے جو کاؤنٹر پر ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ ہم میں سے ایک نے کہا ''ہمیں چلنا چاہیے۔''

ہم اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم تا حال اپنے حواس میں تھے۔

ہال میں سے گزرتے ہوئے ہم نے قریب ہی بجتی موسیقی سنی جس کی لہریں ہم سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہم نے وہاں بیٹھی اور انتظار کرتی ہوئیں مغموم عورتوں کی بو سونگھی۔ دروازے کی طرف چلتے ہوئے ہمیں اپنے سامنے ہال کے وسیع کھوکھلے پن کا احساس ہوا اور دوسری بار بو ہمیں خوش آمدید کہتی محسوس ہوئی۔ دروازے کے نزدیک بیٹھی ہوئی عورت کی تیکھی بو۔

ہم نے کہا ''ہم جا رہے ہیں۔''

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمیں ایک جھولتی ہوئی کرسی کی بلند ہوتی چڑچڑاہٹ سنائی

دی جو اس کے کھڑے ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ ہم نے ڈھیلے تختوں پر قدموں کی چاپ سنی اور پھر عورت واپس لوٹ گئی۔ پھر سے قمیضوں کی چڑ چڑاہٹ سنائی دی اور ہمارے عقب میں دروازہ بند ہو گیا۔ ہم پیچھے مڑے بالکل ہمارے عقب میں ایک غیر مرئی صبح کی تیز اور کٹیلی ٹھنڈی ہوا تھی اور ایک آواز تھی جس نے کہا" راستے سے ہٹ جاؤ۔ اس راستے پر میں چل رہی ہوں۔" ہم پیچھے مڑ گئے۔ آواز نے پھر سے کہا" تم ابھی تک دروازے کے مقابل کھڑے ہو۔"

تب ہم اپنے ہر طرف مڑتے گئے۔ ہر جگہ وہی آواز سنائی دیتی۔ ہم نے کہا" ہم یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔ پن کڑیوں نے ٹھونگیں مار کر ہماری آنکھیں نوچ لی ہیں۔"

عین اسی لمحہ ہمیں بہت سے دروازے کھلتے ہوئے سنائی دیئے۔ ہم میں سے ایک ساتھی ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ہمیں تاریکی میں گھسٹ گھسٹ کر چلتے، چکر کھاتے اور ہمارے اردگرد چیزوں سے ٹکراتے ہوئے سنائی دیا، تاریکی میں کہیں سے وہ بولا" ہم قریب ہی ہیں۔ یہاں اردگرد لدے ہوئے صندوقوں کی سڑاند پھیلی ہوئی ہے۔"

ہم نے دوبارہ اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک آواز ہمارے قریب سے گزری لیکن مخالف سمت کو ہو لی۔

" یہ تابوت ہوں گے۔" ہم میں سے ایک نے کہا۔ وہ جو کونے میں دبکا ہوا اور تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ بولا" یہ صندوق ہیں۔ بچپن ہی سے میں جان لیتا تھا کہ یہ ذخیرہ کئے گئے کپڑوں کی باس ہے۔"

ہم باس کی سمت میں آگے بڑھے۔ زمین نرم اور ہموار تھی۔ ہم ایک عمدہ خطہ پر چل رہے تھے۔ کسی نے ہمارا ہاتھ پکڑا ہمیں تازہ اور زندہ جلد کا لمس محسوس ہوا تاہم ہمیں سامنے کوئی دیوار نہ ملی۔

" یہ ایک عورت ہے۔" ہم نے کہا۔

جس نے صندوقوں کی سڑاند محسوس کی تھی۔ بولا" میرا خیال ہے یہ سوئی ہوئی ہے۔"

ہمارے ہاتھوں کے تلے جسم میں جھٹکا لگا، وہ کپکپایا اور پھسلتا محسوس ہوا۔ وہ ہماری دسترس سے باہر نہیں تھا لیکن وہ صریحاً غائب ہو رہا تھا۔ ایک تاریخ کے بعد جس بیچ ہم یکسر ساکت اکڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے کندھوں پر جھکے کھڑے رہے۔ ہمیں اس کی آواز سنائی دی۔

" وہاں کون ہے۔" اس نے پوچھا۔

" یہ ہم ہیں۔" ہم نے بغیر ہلے جواب دیا۔ ہمارے بستر کی سرسراہٹ سنی جا سکتی تھی، تاریکی میں چپل کی تلاش میں چرچرانے اور رگڑ کھاتے ہوئے پیروں کی آواز ابھری۔ ہم نے

ایک بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن ابھی پوری طرح جاگی نہیں تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔'' وہ بولی۔

ہم نے جواب دیا،'' ہم خود نہیں جانتے، ہماری آنکھیں پن ککڑیوں نے ٹھونگیں مار کر نوچ لی ہیں۔''

آواز نے کہا کہ اس نے اس بارے میں کچھ سن رکھا ہے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ تین آدمی صحن میں بیٹھے مے نوشی کر رہے تھے وہیں پانچ یا چھ پن ککڑیاں بھی تھیں بلکہ سات پن ککڑیاں۔ ان میں سے ایک آدمی ان کی نقل اتارتے ہوئے گانے لگا۔

''بدترین بات یہ تھی کہ وہ ایک گھنٹہ پیچھے تھا۔'' اس نے کہا'' چھپے پرندے اچک کر میزوں پر چڑھ گئے اور ان کی آنکھیں نوچ لیں۔'' اس نے کہا کہ یہ تو وہ بات تھی جو اخبار نے لکھی۔ لیکن کوئی اس پر یقین نہیں کرتا۔ ہم نے کہا'' اگر لوگ وہاں گئے ہوں تو انہیں پن ککڑیاں ضرور دکھائی دی ہوں گی۔''

عورت نے کہا'' وہ گئے تھے'' اگلے روز سارا صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک عورت نے ان پن ککڑیوں کو وہاں سے غائب کر دیا تھا۔

ہم واپس مڑے تو عورت خاموش ہوگئی۔ ہمارے سامنے پھر سے ایک دیوار تھی۔ یوں مڑتے ہی ہم نے اس دیوار کو پا لیا تھا۔ ہمارے اردگرد ہمیں گھیرے ہوئے وہاں ہمیشہ سے ایک دیوار تھی۔ ہم میں سے ایک پھر سے ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ ہم نے اسے رینگتے اور زمین کو سونگھتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا'' میں نہیں جانتا کہ صندوق کہاں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم کسی دوسری جگہ پر ہیں۔''

ہم نے کہا'' یہاں آؤ، ہمارے نزدیک کوئی ہے۔'' پھر اسے نزدیک آتے سنا۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کی گرم سانس ہمارے چہروں سے ٹکرا رہی تھی۔

''فوراً ادھر جاؤ'' ہم نے اسے بتایا'' ہم جانتے ہیں کہ وہاں کوئی موجود ہے۔'' وہ پہنچا ہوگا اور ہماری بتائی ہوئی سمت میں گیا ہوگا ایک ہی لمحہ بعد وہ لوٹا اور بولا'' میرا خیال ہے کہ یہ کوئی لڑکا ہے۔''

ہم نے اسے بتایا'' خوب، اس سے پوچھو کیا وہ ہمیں جانتا ہے۔''

اس نے سوال کیا۔ ہمیں ایک لڑکے کی سادہ اور بے حس آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا''

ہاں، میں تمہیں جانتا ہوں۔ تمہیں وہ تین آدمی ہو، جن کی آنکھیں پن ککڑیوں نے نوچ لی ہیں۔''

پھر ایک بالغ آواز ابھری۔ یہ ایک نسوانی آواز تھی۔ عورت جو بند دروازے کے پیچھے کھڑی معلوم ہوتی تھی، وہ کہہ رہی تھی ''تم پھر سے خود ہی سے باتیں کر رہے ہو۔''

بچے کی آواز نے اس سے کوئی تاثر لیے بغیر کہا ''نہیں، دراصل جن مردوں کی آنکھیں پن ککڑیوں نے نوچ لی تھیں وہ پھر سے یہاں موجود ہیں۔''

قبضوں کی چرچراہٹ کی آواز آئی۔ بالغ عورت بولی جو پہلے سے زیادہ نزدیک تھی۔

''انہیں گھر لے جاؤ۔'' وہ بولی۔

لڑکے نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا، یہ کہاں رہتے ہیں۔''

بالغ آواز نے کہا ''اتنے گھٹیا مت بنو، اس رات کے بعد سے جب پن ککڑیوں نے ان کی آنکھیں نوچ لی تھیں۔ ہر کسی کو ان کے گھر کا پتہ معلوم ہو گیا ہے۔''

عورت نے اپنا لہجہ بدلا۔ جیسے وہ اب ہم سے مخاطب تھی۔ ''اب یہ ہوا ہے کہ کوئی اس بات کو ماننے پر آمادہ نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اخبارات نے اپنی اشاعت بڑھانے کی نیت سے یہ فرضی قصہ گھڑا ہے۔ کسی نے پن ککڑیوں کو نہیں دیکھا۔''

وہ بولا ''اگر میں انہیں باہر لے جاؤں تب بھی کوئی یقین نہیں کرے گا۔''

ہم مطلق اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ہم ساکت دیوار سے لگے کھڑے سن رہے تھے۔ عورت نے کہا ''کوئی دوسرا تمہیں لے جانا چاہے تو یہ مختلف بات ہو گی۔ لیکن لڑکے کی کہی ہوئی پر کون توجہ دے گا۔''

بات کو کاٹتی ہوئی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ''اگر میں ان کے ساتھ باہر گلیوں میں جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یہی وہ آدمی ہیں جن کی آنکھیں پن ککڑیوں نے نوچ لی ہیں تو بچے ہمیں پتھر ماریں گے۔ گلی میں ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔''

ایک لمحے کے لیے مکمل خاموشی رہی۔ دروازہ پھر سے بند ہو گیا۔ لڑکا بولا 'دراصل بات یہ ہے کہ میں ''ٹیری اینڈ دی پائریٹس'' پڑھ رہا ہوں۔''

کسی نے ہمارے کان میں کہا ''میں اسے قائل کر لوں گا۔'' پھر وہ رینگتا ہوا آواز کی سمت میں بڑھا ''یہ لڑکا مجھے اچھا لگتا ہے۔'' ''وہ بولا'' کم از کم یہ ہمیں اتنا تو بتائے گا کہ اس ہفتے ٹیری کے ساتھ کیا بیتی۔''

ہم نے سوچا کہ وہ اس کا اعتماد جیتنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن بچے نے کہا ''اس بات میں

میری کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری دلچسپی صرف رنگوں میں ہے۔''

ہم نے کہا ''تیری ایک چیستاں میں ہے۔''

لڑکے نے جواب دیا ''یہ سب کچھ جمعہ کے دن ہوا۔ آج اتوار ہے۔ آج میں صرف رنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ ایک سرد، بے حس اور بے مروت لہجہ بول رہا تھا۔

جب ہم میں سے تیسرا لوٹ آیا تو ہم نے کہا ''ہم تین دنوں سے کھوئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک لمحے کے لیے بھی آرام نہیں کیا۔''

ہم میں سے ایک بولا ''ٹھیک ہے ہمیں آرام کرنا چاہیے۔ لیکن کوئی دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوڑے گا۔''

ہم نیچے بیٹھ گئے۔ ایک دکھائی نہ دینے والا سورج ہمارے کندھوں پر اپنی تپش ڈال رہا تھا۔ لیکن ہمیں سورج کی موجودگی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہمیں یہاں وہاں ہر جگہ محسوس ہوتا ہم فاصلے، وقت اور سمت کے احساسات سے عاری ہو چکے تھے۔

جبھی کتنی ہی آوازیں ہمارے قریب سے گزریں۔

''پن ککڑیوں نے ہماری آنکھیں نوچ لی ہیں۔'' ہم نے کہا۔

ان آوازوں میں سے ایک بولی ''دیکھو! یہ اخبارات کو سنجیدگی سے پڑھتے ہیں۔''

آوازیں غائب ہوگئیں۔ ہم وہاں بیٹھے رہے اسی طرح کندھے سے کندھا ملائے، انتظار کرتے ہوئے۔ آوازوں کے بہاؤ میں اور ہیولوں کے بہاؤ میں۔ صرف اس لیے کہ شاید کوئی ایک شناسا آواز یا باس ہمارے قریب سے گزرے۔ سورج ہمارے سروں کے عین اوپر تھا۔ ہمیں حدت پہنچا رہا تھا۔ کسی نے کہا ''چلو پھر سے دیوار کی طرف چلتے ہیں۔''

تب دوسروں نے حرکت کیے بغیر اپنے سروں کو غیر مرئی روشنی کی طرف بلند کیا ''نہیں، ابھی نہیں۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ حتیٰ کہ سورج ہمارے چہروں کو جھلسانے لگے۔''

☆☆☆

(مشمولہ: ''ادبیات''، (بین الاقوامی ادب نمبر ۵)، جلد ۱۱، شمارہ نمبر ۴۵-۴۳، اسلام آباد، بہار تا گرما ۱۹۹۸)

سفر بخیر، جناب صدر!

ترجمہ: اجمل کمال

وہ سنسان باغ میں زرد پتوں کے نیچے ایک چوبی بنچ پر بیٹھا، دونوں ہاتھ اپنی چھڑی کے نقرئی دستے پر رکھے، گرد آلود بطخوں کو تکتے ہوئے، موت کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ جب وہ پہلی بار جینوا آیا تھا تو یہ جھیل پرسکون اور شفاف تھی، مرغابیاں اتنی مانوس تھیں کہ آ کر ہاتھ پر سے دانہ چگ لیتی تھیں، اور مہاجر عورتیں اپنے آرگنڈی ملبوسوں اور ریشمی چھتریوں کے ساتھ شام چھ بجے کی تصوراتی مخلوقات دکھائی دیتی تھیں۔ اب جہاں تک وہ دیکھ سکتا تھا، واحد ممکن عورت ویران گودی پر پھول بیچ رہی تھی۔ اس کے لئے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ وقت نہ صرف اس کی زندگی میں بلکہ پوری دنیا میں اس قدر تباہی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

بھیس بدلے ہوئے ناموروں لوگوں کے اس شہر میں وہ بھی ایک ایسا ہی شخص تھا جس نے بھیس بدل رکھا تھا۔ وہ گہرے نیلے رنگ کا سوئی جیسی باریک دھاریوں والا سوٹ، بروکیڈ کی واسکٹ اور کسی ریٹائرڈ مجسٹریٹ کا سا اکڑا ہوا ہیٹ پہنے تھا۔ اس کی متکبر مونچھیں کسی بندوقچی کی سی تھیں، آبی مائل سیاہ بالوں میں رومانوی لہریں تھیں، انگلیاں کسی بربط نواز کی سی تھیں، بائیں ہاتھ کی انگوٹھی والی انگلی میں کسی ایسے شخص کی سی پتلی پٹی بندھی ہوئی تھی جس کی بیوی مر چکی ہو، اور آنکھیں مسرت سے لبریز تھیں۔ صرف اس کی جلد کی کسل مندی اس کی صحت کی اصل حالت کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس کی عمر تہتر برس تھی مگر اس کے باوجود اس کی خوش وضعی نمایاں تھی۔ لیکن اس صبح، وہ اپنے آپ کو ہر طرح کی خودنمائی کی دسترس سے باہر محسوس کر رہا تھا۔ جاہ و جلال اور اقتدار کا زمانہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا، اور اب فقط اس کی موت کا وقت باقی تھا۔

وہ دو عالمی جنگوں کے بعد جنیوا واپس آیا تھا تا کہ اس درد کی حتمی تشخیص ہو سکے جس کو شناخت کرنے سے مارتینیک کے معالج قاصر رہے تھے۔ اس کا قصد یہاں دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے کا نہ تھا، لیکن تھکا دینے والے ٹیسٹوں اور ان کے غیر حتمی نتائج میں چھ ہفتے گزر چکے تھے، اور ابھی ان کا اختتام دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انہوں نے اس درد کو اس کے جگر میں، گردوں میں، لبلبے میں، پروسٹیٹ میں، غرض ہر اس مقام پر تلاش کیا تھا جہاں وہ نہیں تھا۔ مگر یہ اس اذیت ناک جمعرات سے پہلے کی بات ہے جب اس نے نیورولوجی کے شعبے میں صبح نو بجے ایک ایسے معالج سے ملاقات کا وقت لیا تھا جو اس کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں میں سب سے کم معروف تھا۔ اس کا کمرہ کسی راہب کی کوٹھری سے مشابہ تھا، اور ڈاکٹر خود پستہ قد اور سنجیدہ، اور اپنے داہنے ہاتھ کے ٹوٹے ہوئے انگوٹھے پر پلاسٹر چڑھائے ہوئے تھا۔ اس کے روشنی بند کرتے ہی اسکرین پر ریڑھ کی ہڈی کا ایک روشن ایکسرے ابھر آیا، لیکن صدر نے اسے اپنی ہڈی کے طور پر اس وقت پہچانا جب ڈاکٹر نے ایک سلائی کے ذریعے کمر کے نیچے کے دو لہروں کے جوڑ کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ کا درد یہاں ہے'' اس نے کہا۔

اس کے لئے یہ بات اتنی سادہ نہ تھی۔ اس کا درد غیر یقینی اور پر فریب تھا، کبھی اسے اپنی داہنی پسلیوں میں محسوس ہوتا اور کبھی پیٹ کے نچلے حصے میں، اور اکثر اوقات اسے، بالکل غیر متوقع طور پر، رانوں کے جوڑ پر، اچانک آ لگنے والی برچھی کی طرح لگتا۔ ڈاکٹر اس کی بات متاثر ہوئے بغیر سنتا رہا، اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سلائی اسکرین پر بالکل ساکن رہی۔ ''یہی وجہ ہے کہ اس کی تشخیص اتنے عرصے تک نہ ہو سکی'' وہ بولا۔ ''مگر اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس درد کا مرکز اسی جگہ ہے۔'' پھر اس نے اپنی انگلیاں اپنی کنپٹی پر رکھ لیں اور نہایت قطعیت سے کہا: ''ویسے، جناب صدر، اصل میں تو ہر درد کا مرکز یہاں ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر کا معالجاتی انداز اس قدر ڈرامائی تھا کہ اس کا آخری فیصلہ خاصا دردمندانہ معلوم ہوا'' صدر کو ایک خطرناک اور ناگزیر آپریشن سے گزرنا ہوگا'' اس نے خطرے کے امکان کے بارے میں استفسار کیا، اور ڈاکٹر نے اسے غیر یقینی پن کی دھند میں لپیٹ دیا۔ ''ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے'' اس نے جواب دیا۔

''کچھ عرصہ پہلے تک،'' ڈاکٹر نے وضاحت کی'' مہلک حادثات کا امکان بہت زیادہ ہوتا تھا، اور اس سے بھی زیادہ خطرہ کسی قسم اور مختلف شدت کے فالج کا تھا۔ لیکن دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں ہونے والی طبی ترقی کے باعث یہ خطرات اب ماضی کی بات ہو گئے ہیں۔''

فکر مت کیجئے'' وہ آخر میں بولا۔ ''اپنے معاملات کو درست کر کے ہم سے رابطہ قائم کیجئے۔ لیکن یہ مت بھولیے کہ آپریشن جلد ہو اتنا ہی بہتر ہے۔''

اس بری خبر کا سامنا کرنے کے لئے یہ کوئی اتنی اچھی صبح نہیں تھی، اور باہر کھلی فضا میں تو ہرگز نہیں۔ وہ ہوٹل سے سویرے ہی، اوورکوٹ لئے بغیر، نکل آیا تھا، کیوں کہ اسے کھڑکی میں سے چمکتی دھوپ دکھائی دی تھی، اور بوسولیل کی سڑک سے، جہاں ہسپتال واقع تھا، نپے تلے قدم رکھتا ہوا، چوری چھپے محبت کرنے والوں کی اس پناہ گاہ باغ انگلستان، میں آ پہنچا تھا۔ وہ گھنٹے بھر سے زیادہ دیر سے یہاں بیٹھا فقط موت کے بارے میں سوچ رہا تھا، کہ خزاں کا آغاز ہو گیا۔ جھیل کا پانی غصیلے سمندر کی لہروں کی طرح تہہ و بالا ہونے لگا، اور ہوا کے مغرور جھکڑوں نے مرغابیوں کو خوف زدہ کر دیا اور بچے کھچے پتوں کو اڑا لے گئے۔ صدر اٹھ کھڑا ہوا، اور پھول بیچنے والی سے خریدنے کے بجائے ڈیزی کا ایک پھول عوامی باغ کی کیاری سے توڑ کر اپنے کاج میں لگا لیا۔ پھول بیچنے والی نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا۔

''یہ پھول خدا کی ملکیت نہیں ہیں موسیو'' وہ تنک کر بولی۔ ''یہ شہرداری کی ملکیت ہیں۔''

صدر نے اسے نظر انداز کر دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا، اپنی چھتری کو بیچ سے پکڑے اور کچھ کچھ دیر بعد ایک آزادہ روی کے ساتھ اسے ہوا میں گھماتا، آگے چل دیا۔ موں بلاں کے پل پر ہوا کے اچانک چلنے والے جھکڑوں سے پاگل ہوتے ہوئے وفاقی پرچم ممکنہ تیز رفتاری سے نیچے اتارے جا رہے تھے، اور کف آلود دلکش فوارے کو معمول سے پہلے بند کر دیا گیا تھا۔ صدر کو ساحل پر بنا ہوا کیفے پہچان میں نہ آیا جہاں وہ اکثر جا بیٹھتا تھا، کیوں کہ داخلے کے دروازے کے باہر لگا ہوا سائبان اتار لیا گیا تھا اور موسم گرما میں بیٹھنے کے پھولوں بھرے دالان ذرا دیر پہلے بند کر دیئے گئے تھے۔ اندر دن کے وقت روشنیاں جل رہی تھیں اور سازندے موتسارت کی ایک گت بجا رہے تھے جو کسی ہونی کی پیش گوئی سے پر تھی۔ صدر نے کاؤنٹر پر گاہکوں کے لئے رکھے اخباروں کے ڈھیر میں سے ایک اخبار اٹھا لیا، ہیٹ اور چھتری کو ریک پر لٹکا دیا، سب سے تنہا میز پر جا کر سنہری رم والا پڑھنے کا چشمہ لگا لیا، اور تب اسے احساس ہوا کہ خزاں کا موسم آ پہنچا ہے۔ اس نے عالمی خبروں کے صفحے سے شروع کیا جس پر اسے کبھی کبھار امریکی براعظموں کی کوئی خبر دکھائی دے جایا کرتی تھی، اور بیچ کے صفحوں سے گزرتا ہوا پہلے صفحے پر پہنچا: ویٹرس نے ایوین واٹر کی بوتل اس کے پاس لا رکھی جو وہ روز پیتا تھا۔ اپنے معالجوں کے احکام پر عمل کرتے ہوئے اس نے کافی پینے کی عادت تیس سال پہلے ہی ترک کر دی تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا: ''اگر مجھے یقینی طور پر

معلوم ہوگیا کہ میں مرنے والا ہوں تو دوبارہ کافی پینے لگوں گا۔'' شاید وہ وقت آ گیا تھا۔
''ایک کافی بھی لے آؤ'' اس نے بے عیب فرانسیسی زبان میں حکم دیا۔ اور، اپنی بات کے دوہرے معنی کو محسوس کیے بغیر، اضافہ کیا: ''اطالوی قسم کی، اتنی تیز کہ مردے کو جگا دے۔''

اس نے کافی، شکر کے بغیر آہستہ آہستہ گھونٹ لے لے کر پی اور پھر پیالی کو طشتری پر الٹا کر رکھ دیا تاکہ کافی کے ذرات کو لکیروں کے ذریعے، اتنے برس بعد، اس کی تقدیر لکھنے کا موقع مل سکے۔ ذائقے کی اس بازیافت نے ذرا دیر کے لیے اسے اس کے غم ناک خیالوں سے نکال لیا۔ لمحے بھر بعد، گویا اسی سحر کی توسیع کے طور پر، اسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے بے خیالی کے سے انداز میں ورق پلٹا اور اپنے چشمے کے اوپر سے ایک زرد رو، شیو بڑھائے ہوئے آدمی کا اسپورٹس شرٹ اور بھیڑ کی کھال کے استر والی جیکٹ پہنے پایا جو فوراً دوسری طرف دیکھنے لگا تاکہ ان کی نظریں نہ مل سکیں۔

اس کا چہرہ پہچانا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہسپتال کے برآمدے میں کئی بار ایک دوسرے کے پاس سے گزرے تھے، ایک آدھ بار، باغ میں مرغابیوں کا نظارہ کرتے ہوئے، اس نے اس شخص کو خیابان دلاک پر موٹر اسکوٹر چلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ لیکن اسے کبھی اپنے پہچانے جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس نے اس خیال کو بھی مسترد نہیں کیا کہ یہ احساس جلا وطنی میں ستائے جانے کے بہت سے واہموں میں سے ایک ہوسکتا ہے۔

اس نے اطمینان کے ساتھ اخبار پڑھنا ختم کیا اور اس دوران سازندوں کی چیلو پر بجائی ہوئی برام کی پر تکلف لہروں پر بہتا رہا، یہاں تک کہ اسے اپنا درد موسیقی کی درد ربائی سے زیادہ شدید محسوس ہونے لگا۔ تب اس نے اپنی چھوٹی سی طلائی گھڑی اور اس کی زنجیر پر نظر ڈالی جسے وہ اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھتا تھا، اور ایوین واٹر کے آخری گھونٹ کے ساتھ دوپہر کے وقت کی دو گولیاں کھائیں۔ چشمہ اتارنے سے پہلے اس نے کافی کے ذروں کی ترتیب دی ہوئی اپنی تقدیر پڑھی اور برف جیسی سرد دہشت محسوس کی: اسے ان غیر یقینی لکیروں میں تذبذب کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ آخر کار اس نے بل ادا کیا، کسی کنجوس کی سی ٹپ چھوڑی، ریک پر سے ہیٹ اور چھتری اٹھائی، اور اس آدمی کی طرف دیکھے بغیر جو اسے دیکھ رہا تھا، باہر سڑک پر نکل آیا۔ وہ مسرور چال سے آندھی کی اجاڑی ہوئی پھولوں کی کیاریوں کے پاس قدم رکھتا گزر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنی کیفیت سے نکل آیا ہے۔ مگر تبھی اس کو اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی اور کونے پر مڑتے ہوئے وہ آدھا گھوم گیا۔ تعاقب کرنے والے آدمی کو ٹکر سے بچنے کے لیے فوراً رکنا پڑا اور

اس کی چونکی ہوئی آنکھیں چند انچ کے فاصلے سے اسے دیکھنے لگیں۔ ''جناب صدر'' اس نے منہ ہی منہ میں کہا۔

''جن لوگوں نے تمہیں اس کام کی اجرت دی ہے، ان سے کہہ دو کہ زیادہ امید نہ رکھیں'' صدر نے اپنی مسکراہٹ یا آواز کی دلکشی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔''

''یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہے'' وہ آدمی اپنے سر پر آ پڑنے والے جاہ و جلال کے وزن سے دبتے ہوئے بولا۔ ''میں ہسپتال میں کام کرتا ہوں۔'' اس کی زبان اور چال ڈھال، یہاں تک کہ اس کا بودا پن، اس کے دیہی کریبیئن ہونے کے غماز تھے۔

''مجھے یہ مت بتانا کہ تم ڈاکٹر ہو'' صدر نے کہا۔

''کاش میں یہ کہہ سکتا، جناب۔ میں ایمبولینس چلاتا ہوں۔''

''معافی چاہتا ہوں'' صدر نے اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کام خاصا سخت ہے۔''

''اتنا نہیں جتنا آپ کا کام ہے، جناب۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے چھتری کا سہارا لیتے ہوئے اس پر سیدھی نگاہ ڈالی، اور حقیقی دلچسپی کے ساتھ پوچھا'' کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''کریبیئن کا ہوں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے'' صدر نے کہا۔ ''مگر کس ملک کے؟''

''جس ملک کے آپ ہیں، جناب'' اس آدمی نے کہا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''میرا نام ہومیرو رے۔۔۔''

''حیرت زدہ صدر نے اپنا ہاتھ بڑھائے بغیر اس کی بات کاٹ دی۔

''خدایا'' وہ بولا۔ ''کیسا شان دار نام ہے۔''

ہومیرو پرسکون ہو گیا۔ ''پورا نام زیادہ اچھا ہے'' اس نے کہا۔ ''ہومیرو رے دلا کاسا ۔۔۔ہومر، کنگ آف ہز ہاؤس۔''

سڑک کے بیچ میں کھڑا صدر سرمائی ہوا کے ایک تیز جھونکے کی زد میں آ گیا۔ لرزہ اس کی ہڈیوں تک اتر گیا اور وہ جان گیا کہ اوور کوٹ کے بغیر دو بلاک طے کر کے اسے سستے ریستوران تک پہنچنا ممکن نہیں ہو گا جہاں وہ عموماً کھانا کھایا کرتا تھا۔

''تم کھانا کھا چکے ہو؟'' اس نے ہومیرو سے پوچھا۔

''میں دوپہر کو کھانا نہیں کھاتا، ہومیرو نے کہا۔'' صرف ایک بار کھاتا ہوں، رات کو اپنے گھر پہنچ کر۔''

''آج کھاؤ'' اس نے اپنی تمام شان کو کام میں لاتے ہوئے کہا۔'' میں تمہیں اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دیتا ہوں۔''

وہ اس آدمی کو بازو سے پکڑ کر سڑک کی دوسری جانب والے ریستوران میں لے گیا جس کا نام سائبان پر زریں حروف میں لکھا ہوا تھا: لیوف کوروتے۔ اندر کا حصہ تنگ اور گرم تھا اور کوئی میز خالی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہومیرو رے، اس بات پر حیران کہ کسی نے صدر کو نہیں پہچانا، مدد طلب کرنے کی غرض سے کمرے کے کونے میں گیا۔

''کیا یہ کوئی قائم مقام صدر ہے؟'' ریستوران کے مالک نے دریافت کیا۔

''نہیں'' ہومیرو بولا۔''معزول''

مالک تائید کے انداز میں مسکرایا۔'' ان کے لئے'' وہ بولا'' میرے پاس ہمیشہ ایک خاص میز ہوتی ہے۔''

وہ ان دونوں کو ریستوراں کے عقبی حصے میں رکھی ایک تنہا میز پر لے گیا جہاں بیٹھ کر وہ جی بھر کر باتیں کر سکتے تھے۔ صدر نے اس کا شکریہ ادا کیا۔'' ہر ایک کو تمہاری طرح جلاوطنی کے وقار کی پہچان نہیں ہوتی'' وہ بولا۔

اس ریستوراں کی مخصوص چیز گائے کی سکی ہوئی پسلیاں تھیں۔ صدر اور اس کی میزبان نے دوسری میزوں پر سکے ہوئے گوشت کے پارچوں کو دیکھا جس پر چربی کی پتلی سی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔'' کیا شاندار گوشت ہے۔'' صدر نے مدہم آواز میں کہا۔'' مگر مجھے منع ہے'' اس نے ہومیرو کو عیار آنکھوں سے دیکھا۔'' درحقیقت مجھے ہر چیز منع ہے۔''

''آپ کو تو کافی بھی منع ہے۔'' ہومیرو بولا۔'' مگر آپ پیتے ہیں۔''

''تمہیں پتا چل گیا؟'' صدر نے کہا۔'' مگر آج کا دن خاص ہے، اس لئے میں نے اپنا معمول ترک کر دیا تھا۔''

اس روز اس نے فقط کافی ہی کے سلسلے میں اپنا معمول ترک نہیں کیا۔ اس نے گائے کی سکی ہوئی پسلیاں بھی منگوائیں اور زیتون کے عرق میں ہلکا سا بھیگا ہوا تازہ سبزیوں کا سلاد بھی۔ اس کے مہمان نے بھی یہی کچھ منگوایا، اور اس کے ساتھ پینے کے لئے سرخ وائن کا نصف قرابہ۔

جس وقت دونوں کھانے کا انتظار کر رہے تھے ہومیرو نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا جس میں کوئی رقم نہیں تھی اور بہت سے کاغذ تھے، اور صدر کو ایک مٹتا ہوا فوٹو گراف دکھایا۔ صدر نے خود کو قمیض میں ملبوس، اب سے چند پاؤنڈ کم وزن اور سیاہ بالوں اور مونچھوں کے ساتھ پہچان لیا۔ اس کے گرد نوجوانوں کا ہجوم تھا جو تصویر میں دکھائی دینے کے شوق میں پنجوں کے بل اٹھے ہوئے تھے ۔ ایک ہی نگاہ میں اس نے اس تصویر کے مقام، اور اس نفرت انگیز انتخابی مہم کے نشان کو بھی پہچان لیا، اور اسے وہ منحوس تاریخ بھی یاد آ گئی۔ ''اسے دیکھ کر بہت صدمہ ہوتا ہے'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ آدمی حقیقی زندگی سے زیادہ تیزی سے تصویروں میں بوڑھا ہوتا ہے ۔'' اور ایک قطعیت کے اشارے کے ساتھ تصویر اسے واپس دے دی۔ ''مجھے یہ موقع اچھی طرح یاد ہے'' اس نے کہا۔ ''ہزاروں سال پہلے، سان کرستوبال دلا کاسا میں، کاک پٹ میں بیٹھے ہوئے۔''

''میں وہیں کا ہوں۔'' ہومیرو نے کہا اور تصویر میں دکھائی دیتے ہوئے ایک شخص پر انگلی رکھ کر بولا: ''یہ میں ہوں۔''

صدر نے بھی تصویر میں اسے پہچان لیا۔ ''تم تو بالکل بچے تھے''

''تقریباً'' ہومیرو نے کہا۔ ''میں یونیورسٹی بریگیڈ کے لیڈر کی حیثیت سے جنوبی علاقوں کی پوری انتخابی مہم میں آپ کے ساتھ رہا تھا۔''

صدر نے اس طعنے کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا۔ ''میں نے بہر حال تمہیں نہیں دیکھا تھا۔''

''ایسی بات نہیں۔ آپ تو بلکہ مجھ پر بہت مہربان ہوئے تھے'' ہومیرو بولا۔ ''لیکن وہاں اتنے سارے لوگ تھے، آپ کیسے یاد رکھ سکتے ہیں۔''

''بعد میں کیا ہوا؟''

''یہ آپ سب سے اچھی طرح جانتے ہیں'' ہومیرو نے کہا۔ ''فوجی انقلاب کے بعد تو معجزہ یہ ہے کہ ہم دونوں یہاں موجود ہیں، آدھی گائے کھانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ ایسی قسمت سب کو نہیں ملی۔''

اسی موقع پر کھانا لگایا گیا۔ صدر نے اپنا نیپکن، کسی بچے کی بب کی طرح، گلے میں باندھ لیا، اور اپنے مہمان کے خاموش تعجب سے لاعلم نہیں رہا۔ ''اگر ایسا نہ کروں تو ہر کھانے پر ایک ٹائی برباد ہو جائے'' وہ بولا۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے اس نے یہ دیکھنے کے لئے کہ اچھی طرح گلا ہوا ہے یا نہیں، گوشت کو تھوڑا سا چکھا، اور اشارے سے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اپنے

موضوع پر لوٹ آیا۔ ''میری سمجھ میں یہ نہیں آیا'' اس نے کہا'' کہ تم نے اس سے پہلے مجھ سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی، شکاری کتے کی طرح میرا پیچھا کرتے رہے۔''

اس پر ہومیرو نے اسے بتایا کہ وہ اس کو اسی وقت پہچان گیا تھا جب وہ نہایت خاص مریضوں کے لئے مخصوص دروازے سے ہسپتال کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ موسم گرما کے وسط کی بات تھی اور اس نے آ تنیلز کا تھری پیس لنن سوٹ اور کالے سفید جوتے پہن رکھے تھے۔ کالر میں ڈیزی کا پھول لگا رکھا تھا اور اس کے حسین بال ہوا میں بکھر رہے تھے۔ ہومیرو نے پتا چلا لیا تھا کہ وہ جنیوا میں تنہا اور کسی مددگار کے بغیر ہے، کیوں کہ صدر اس شہر سے اچھی طرح واقف ہے جہاں اس نے اپنی قانون کی تعلیم مکمل کی تھی۔ ہسپتال کی انتظامیہ نے صدر کی درخواست پر داخلی احتیاط کے تمام اقدامات کئے تھے تاکہ اس کی شناخت کا راز افشاء نہ ہو۔ اسی رات، ہومیرو اور اس کی بیوی نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے باوجود ہومیرو پانچ ہفتے، کسی مبارک موقعے کے انتظار میں، اس کا تعاقب کرتا رہا تھا، اور آج بھی، اگر صدر خود اس کے روبرو نہ آ گیا ہوتا تو اس سے مخاطب نہ ہو پاتا۔

''مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے سامنے آ گیا'' صدر نے کہا'' حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ تنہا رہنا مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔''

''یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' صدر نے خلوص سے پوچھا۔ ''میری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ سب لوگ مجھے بھول چکے ہیں۔''

''ہم آپ کو اتنا یاد کرتے ہیں کہ آپ تصور نہیں کر سکتے'' ہومیرو نے اپنے جذبات کو چھپائے بغیر کیا۔ ''آپ کو یوں، جوان اور صحت مند دیکھنا بڑی مسرت کی بات ہے۔''

''جبکہ'' صدر کسی میلوڈراما کے بغیر بولا'' تمام علامات موجود ہیں کہ میری موت قریب ہے۔''

''آپ کی صحت یابی کے امکانات بہت اچھے ہیں'' ہومیرو نے کہا۔

صدر حیرت سے چونک پڑا، لیکن اپنی حس مزاح سے دست بردار نہیں ہوا۔ ''خدایا!'' وہ چلایا۔ ''کیا حسین سوئٹزر لینڈ میں طبی راز داری کو بالکل خیر باد کہہ دیا گیا ہے؟''

''دنیا کے کسی ملک کے کسی بھی ہسپتال میں ایمبولینس ڈرائیور سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی'' ہومیرو نے کہا۔

''خود مجھے جتنا کچھ معلوم ہے وہ ابھی دو گھنٹے پہلے ایک ایسے شخص کی زبانی معلوم ہوا ہے جس کے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔''

''کچھ بھی ہو، آپ گمنامی کی موت نہیں مریں گے'' ہومیرو نے کہا۔ ''کوئی شخص وقار کی عظیم مثال کے طور پر آپ کا جائز مقام بحال کر دے گا۔''

صدر نے پر مزاح تعجب کی اداکاری کی۔ ''خبردار کرنے کا شکریہ'' اس نے کہا۔

اس نے کھانا بھی اسی انداز میں کھایا جس انداز میں ہر کام کرتا تھا۔ بغیر عجلت کے، اور بڑی احتیاط کے ساتھ۔ کھانے کے دوران اس نے ہومیرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اس شخص کو احساس ہوا کہ وہ اس کے خیالات کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ یادوں سے بھری ہوئی ایک طویل گفتگو کے بعد وہ شرارت کے سے انداز میں مسکرایا۔ ''میں نے اپنی لاش کے بارے میں فکر مند نہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا'' وہ بولا ''مگر اب لگتا ہے کہ مجھے جاسوسی ناولوں والی تمام احتیاطیں کرنی ہوں گی تاکہ یہ کسی کے ہاتھ نہ آ سکے۔''

''اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا'' ہومیرو نے جوابی مذاق کیا۔ ''ہسپتال میں کسی راز کی عمر ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتی۔''

جب دونوں کافی پی چکے تو صدر نے اپنی تقدیر دوبارہ پڑھی اور دوبارہ لرز اٹھا۔ اس بار بھی وہی پیغام تھا۔ مگر اس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے بل کی نقد ادائیگی کی لیکن اس سے پہلے حساب کو کئی بار جوڑ کر دیکھا، بے حد احتیاط کے ساتھ کئی بار رقم گنی اور ایسی ٹپ چھوڑی جو ویٹر کی جانب سے ایک ہونکارے سے زیادہ کی مستحق نہ تھی۔ ''نہایت پر مسرت وقت گزرا'' اس نے ہومیرو سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابھی آپریشن کی تاریخ طے نہیں کی ہے، بلکہ یہ فیصلہ بھی نہیں کیا ہے کہ آپریشن کرواؤں گا یا نہیں۔ لیکن اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو ہم دوبارہ ملیں گے۔''

''اس سے پہلے کیوں نہیں؟'' ہومیرو بولا۔ ''لزارا، میری بیوی، مال دار لوگوں کے لئے کھانے پکاتی ہے۔ جھینگے اور چاول اس سے اچھے کوئی نہیں پکا سکتا، اور ہم آپ کو جلد ہی کسی رات اپنے گھر دعوت پر بلانا چاہتے ہیں۔''

''مجھے مچھلی بھی منع ہے، مگر میں بڑی خوشی سے کھاؤں گا'' اس نے کہا۔ ''تو پھر کب؟''

''جمعرات کو میری چھٹی ہوتی ہے۔'' ہومیرو نے کہا۔

''بہت خوب'' صدر نے کہا۔ ''جمعرات کو شام سات بجے میں تمہارے گھر پر ہوں گا۔

میرے لئے یہ بڑی مسرت کی بات ہو گی۔"

"میں آپ کو لینے آ جاؤں گا" ہومیر و بولا "او تلیئر دام، نمبر ۴۲ ریو دلند ستری۔ اسٹیشن کے پیچھے۔ درست ہے؟"

"درست ہے" صدر نے کہا، اور ہمیشہ سے زیادہ شان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ "معلوم ہوتا ہے تم میرے جوتے کا ناپ بھی جانتے ہو۔"

"یقیناً، جناب" ہومیرو لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "اکتالیس نمبر۔"

جو بات ہومیر درے نے صدر کو نہیں بتائی، مگر بعد میں برسوں، سننے پر آمادہ ہر شخص کو بتاتا رہا، وہ یہ تھی کہ ابتدا میں اس کے ارادے اتنے نیک نہیں تھے۔ دوسرے ایمبولینس ڈرائیوروں کی طرح اس کے بھی تدفین کا بندوبست کرنے والے اداروں اور انشورنس کمپنیوں کے ساتھ روابط تھے اور وہ ہسپتال کے اندر، خصوصاً کم وسائل رکھنے والے غیر ملکی مریضوں سے، اس قسم کا کام حاصل کیا کرتا تھا۔ منافع کم تھا، اور اس میں سے ہسپتال کے ان ملازموں کو بھی حصہ دینا پڑتا تھا جو سنگین بیماریوں میں مبتلا مریضوں کی خفیہ فائلیں فراہم کرتے تھے، مگر ایک جلا وطن اور مستقبل سے محروم شخص کے لئے، جسے ایک مضحکہ خیز تنخواہ میں بیوی اور دو بچوں کا پیٹ پالنا ہو، اتنا بھی غنیمت تھا۔

لزارا داویس ماس کی بیوی زیادہ حقیقت پسند تھی۔ وہ سانولی جوان، پورٹو ریکو کی رہنے والی ایک چھریرے بدن کی ملاتا عورت تھی جس کا قد چھوٹا اور بدن مضبوط تھا، جلد کی رنگت سوختہ شکر جیسی، اور آنکھیں لومڑی کی سی جو اس کے مزاج سے بہت مطابقت رکھتی تھیں۔ دونوں کی ملاقات ہسپتال کے خیراتی وارڈ میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنے وطن کے ایک ماہر مالیات کے ساتھ نرس کے طور پر جنیوا آنے اور اس شخص کے پاس ملازمت چھوٹنے پر شہر میں در بدر پھرنے کے بعد سے، ایک مددگار کے طور پر کام کرنے لگی تھی۔ ان کی شادی کی تقریب کیتھولک طریقے سے ہوئی تھی۔ حالاں کہ وہ یوروبان شاہی گھرانے کی فرد تھی، اور وہ بغیر لفٹ کی اور افریقی تارکین وطن سے آباد، ایک عمارت کی آٹھویں منزل پر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ ان کی بیٹی باربرا نو سال کی تھی، اور سات سالہ بیٹے لزارو میں ذہنی پس ماندگی کی علامتیں موجود تھیں۔

لزارا داویس ذہین اور بد مزاج تھی لیکن اس کا دل نرم تھا۔ وہ خود کو خالص برج ثور کی خصوصیات کا حامل سمجھتی تھی اور ستاروں کے شگونوں کو پہچاننے کی اپنی صلاحیت پر اندھا اعتقاد رکھتی تھی۔ اس کے باوجود اس کا کروڑ پتیوں کو تقدیر کا حال بتانے کا پیشہ اختیار کرنے کا خواب کبھی پورا

نہ ہو سکا۔ دوسری طرف وہ مال دار خواتین کے لئے، جنہیں مہمانوں پر اپنی زبردست انتیلی کھانے پکانے کی صلاحیت کا رعب ڈالنے کا شوق تھا، کھانے تیار کر کے گھر کی آمدنی میں اکثر تھوڑا بہت اور کبھی کبھار اچھا خاصا اضافہ کر لیا کرتی تھی۔ البتہ ہومیرو دردناک حد تک دبو واقع ہوا تھا اور اپنی قلیل آمدنی میں اضافہ کرنے کے خواب نہیں دیکھتا تھا مگر لزارا اس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتی تھی جس کی وجہ ہومیرو کی دلی معصومیت اور اس کے مردانہ عضو کی قابل قدر کارکردگی تھی۔ ان کے دن ٹھیک ہی گزر رہے تھے، مگر ہر نیا سال زیادہ دشوار ہو رہا تھا اور بچے بڑے ہو رہے تھے۔ صدر کی آمد کے وقت تک دونوں اپنی پانچ برس کی بچت کو خرچ کرنا شروع کر چکے تھے۔ اور اس طرح جب ہومیرو نے ہسپتال کے گمنام مریضوں میں صدر کو شناخت کیا تو ان کی امیدیں بیدار ہو گئیں۔

انہیں یقین سے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا مانگیں گے، یا کس حق کے تحت مانگیں گے۔ پہلے پہل انہوں نے تدفین کے مکمل بندوبست کا ٹھیکا حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا جس میں لاش کو حنوط کرنے اور وطن واپس لے جانے کے انتظامات بھی شامل تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی موت اتنی بھی قریب نہیں ہے جتنی شروع میں معلوم ہوتی تھی۔ صدر کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے دن تو ہومیرو سخت شکوک میں مبتلا ہو گیا۔

سچ یہ ہے کہ ہومیرو یونیورسٹی بریگیڈ یا کسی اور شے کا لیڈر وغیرہ نہیں رہا تھا، اور اس انتخابی مہم میں اس کا کردار صرف اس گروپ فوٹو میں شامل ہو جانے تک محدود تھا جو کسی معجزے سے الماری میں پڑے کاغذوں کے ڈھیر میں سے اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ لیکن اس کا جوش و خروش حقیقی تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ اسے فوجی انقلاب کے خلاف عام مظاہرے میں حصہ لینے کے نتیجے میں ملک سے فرار ہونا پڑا تھا، اگرچہ اب اتنے برس بعد تک جینوا میں رہنے کا واحد سبب اس کی روح کی ناداری کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے ایک آدھ جھوٹ اس کے صدر کا التفات حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔

ان دونوں کے لئے پہلا حیرت انگیز انکشاف یہ تھا کہ وہ نامور جلاوطن شخص لے گروت کے غمناک علاقے کے ایک چوتھے درجے کے ہوٹل میں، ایشیائی تارکین وطن اور شب بیدار عورتوں کے درمیان، مقیم تھا اور سستے ریستورانوں میں تنہا کھانا کھایا کرتا تھا، جب کہ جینوا ایسے مناسب بنگلوں سے بھرا پڑا تھا جنہیں معزول شدہ سیاست دان اپنی سکونت کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ ہر روز ہومیرو اسے اپنے پچھلے دن کے معمولات کو دہراتے دیکھا کرتا۔ پرانے شہر کی ماتمی

دیواروں اور عشق پیچاں کی بوسیدہ بیلوں کے درمیان سیر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں متواتر اس کے تعاقب میں رہتیں اور کبھی کبھی تو دونوں کے درمیان فاصلہ احتیاط کے لحاظ سے خاصا کم ہو جاتا تھا۔ اس نے اسے کالون کے مجسمے کے سامنے گھنٹوں خیالوں میں غرق دیکھا تھا۔ چنبیلی کی آتشیں مہک سے بے حال ہوتے ہوئے وہ اس کے تعاقب میں پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر بورگ دفور کے اوپر تک گیا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ موسم گرما کے سست رو غروبِ آفتاب کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ ایک رات ہومیرو نے اسے موسم کی پہلی بارش میں، اوور کوٹ یا چھتری کے بغیر، طالبِ علموں کے ساتھ روبنسٹائن کے کنسرٹ کی قطار میں کھڑا دیکھا تھا۔ ''میں حیران ہوں کہ اسے نمونیا کیوں نہیں ہوا'' بعد میں اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ جس سنیچر کو موسم بدلنا شروع ہوا اس نے صدر کو نقلی فر کے کالر والا ایک خزانی کوٹ خریدتے دیکھا، اور خیابان دیورون کی جگمگاتی دکانوں میں نہیں جہاں مغرور شیوخ خریداری کرتے تھے، بلکہ استعمال شدہ اشیا کے ہفتہ وار بازار میں۔

''پھر تو ہم کچھ نہیں کر سکتے'' جب ہومیرو نے اس کا تذکرہ کیا تو لزارا چلا کر بولی۔ وہ انتہائی کنجوس شخص ہے جو اپنی خیراتی تدفین کرانے کو ترجیح دے گا اور قلاشوں کے قبرستان میں دفن ہوگا۔ اس شخص سے ہمیں ایک کوڑی بھی حاصل نہیں ہوگی۔''

''ہو سکتا ہے وہ واقعی غریب ہو'' ہومیرو نے کہا۔'' آخر اتنے برسوں سے بے روزگار ہے۔''

''آہ میری جان چڑھتے ہوئے سیارے کا برج حوت میں ہونا ایک بات ہے اور احمق ہونا بالکل دوسری'' لزارا بولی'' سب جانتے ہیں کہ وہ ملک بھر کا سونا لے کر فرار ہوا تھا اور ماتینیک کا امیر ترین جلاوطن ہے۔''

ہومیرو، جو بیوی سے دس سال بڑا تھا، اخباروں میں یہ قصے پڑھ پڑھ کر جوان ہوا تھا کہ صدر نے راج مزدور کی حیثیت سے کام کر کے جنیوا میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اس کے برعکس لزارا کی پرورش حزبِ اختلاف کے اخباروں کے ان سکینڈلوں پر ہوئی تھی جنہیں اس مکان میں بڑا کر کے دیواروں پر لگایا جاتا تھا جہاں وہ کمسنی میں کام کرنے جاتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جس دن ہومیرو اس بات پر مسرت سے بے حال گھر پہنچا کہ اس نے صدر کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا ہے، تو وہ اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوئی کہ وہ اسے ایک مہنگے ریستوراں میں لے گیا تھا۔ اسے اس پر بہت غصہ آیا کہ ہومیرو نے ان بہت ساری فرمائشوں میں سے ایک بھی فرمائش نہیں کی جن کا وہ دونوں خواب دیکھتے رہے تھے، یعنی بچوں کے لئے وظیفے سے لے کر ہسپتال میں بہتر ملازمت تک۔

صدر کے اس فیصلے سے کہ وہ، مناسب تدفین اور شان دار وطن واپسی پر اپنے فرانک خرچ کرنے کے بجائے اپنی لاش کو گدھوں کے سپرد کرے گا، لزارا کے شبہات کی تصدیق ہوتی تھی۔ مگر خبر کے آخری تنکے کو ہومیرو نے گفتگو کے آخر کے لئے بچا رکھا تھا: اس نے جمعرات کی رات صدر کو اپنے گھر آ کر جھینگے اور چاول کھانے کی دعوت دی ہے۔

''بس اسی کی کسر رہ گئی ہے'' لزارا چیخ کر بولی'' کہ ڈبوں میں بند جھینگے کھا کر ہمارے ہی گھر میں اس کا دم نکلے، اور ہمیں بچوں کے لئے رکھی ہوئی رقم خرچ کر کے اس کے کفن دفن کا بندوبست کرنا پڑے۔''

آخر کار جس چیز نے اس کے طرز عمل کا تعین کیا وہ اس کی خانگی وفاداری کا احساس تھا۔ اسے پڑوس کے ایک گھر سے سلور کی تین پلیٹیں اور سلاد کا پیالہ، دوسرے سے بجلی کا کافی پاٹ، اور تیسرے سے ایک کڑھا ہوا میز پوش اور کافی پینے کے برتن ادھار لینے پڑے۔ اس نے پرانے پردے اتار کر نئے پردے لگائے۔ جنہیں صرف تہواروں کے موقعوں پر نکالا جاتا تھا اور میز کرسیوں پر سے غلاف اتار دیئے۔ ایک پورا دن اس نے فرش دھونے، گرد جھاڑنے، اور چیزوں کی ترتیب بدلنے میں لگایا یہاں تک کہ ان کا گھر ایسی حالت میں آ گیا جس کی بالکل الٹ حالت ان کے لئے موزوں ہو سکتی تھی، یعنی جس کی مدد سے وہ اپنے مہمان کو اپنی پر وقار مفلسی سے متاثر کر سکتے تھے۔

جمعرات کی رات کو، آٹھ منزلیں چڑھ کر اپنا سانس درست کرتے ہوئے صدر اپنا خریدا ہوا پرانا کوٹ اور کسی گزرے زمانے کا تربوز کی شکل کا ہیٹ پہنے، اور لزارا کو پیش کرنے کے لئے گلاب کا فقط ایک پھول لئے، دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ اس کی مردانہ وجاہت سے اور اس کے شہزادوں کے سے شائستہ ادب آداب سے بہت متاثر ہوئی، مگر سب سے بڑھ کر اس کو وہی دکھائی دیا جسے دیکھنے کی وہ توقع کر رہی تھی: ایک فریبی اور غارت گر شخص۔ اس کو وہ بدلحاظ معلوم ہوا، کیوں کہ اس نے تو اس خیال سے کھڑکیاں بند رکھی تھیں کہ کہیں گھر میں جھینگوں کی بو نہ بس جائے، اور اس نے گھر میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ غیر متوقع انبساط سے مغلوب ہو کر ایک گہرا سانس لیا، بازو پھیلا کر آنکھیں بند کیں اور زور سے چلایا: ''آہ، ہمارے سمندر کی مہک!'' اس کو وہ ہمیشہ سے زیادہ کنجوس بھی معلوم ہوا کیوں کہ اس کے لئے گلاب کا فقط ایک پھول لایا تھا، جو بلا شبہ اس نے شہر داری باغ سے چرایا ہوگا۔ وہ اسے بد دماغ بھی معلوم ہوا کیوں کہ اس نے اپنے صدارتی دور کے ان اخباری تراشوں اور اپنی انتخابی مہم کے پھریروں اور جھنڈوں پر بڑی ناگواری سے نظر

ڈالی جنہیں ہومیرو نے اتنے خلوص سے لونگ روم کی دیواروں پر لگایا تھا۔ وہ اسے سنگ دل بھی معلوم ہوا کیوں کہ اس نے بار بار اور لزارا سے سلام دعا تک نہیں کی جنہوں نے اس کے لئے ایک تحفہ لے کر رکھا تھا اور پھر کھانے کے دوران دو چیزوں کا نام لیا جن کو وہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کتے اور بچے۔ اسے اس شخص سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس کی کریبیئن مہمان نوازی اس کی بدگمانیوں پر غالب آ گئی۔ اس نے ایک افریقی گاؤن پہنا تھا جو وہ خاص موقعوں پر پہنتی تھی، اور سانتیریا کی مالا اور کنگن، اور کھانے کے دوران تمام وقت اس نے کسی قسم کی غیر ضروری حرکت کرنے اور کوئی زائد لفظ بولنے سے پوری طرح گریز کیا۔ وہ میزبان کے طور پر صرف موزوں ہی نہیں بلکہ بہترین ثابت ہوئی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ جھینگے اور چاول اس کے باورچی خانے کی اعلیٰ ترین چیزوں میں سے نہیں تھے، لیکن اس نے انہیں پوری دلجمعی سے تیار کیا تھا اور وہ بہت اچھے پکے تھے۔ صدر نے تین مرتبہ اپنی پلیٹ بھری اور کھانے کی تعریف میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اس کے علاوہ تلے ہوئے کیلوں اور ایوو کاڈو کا سلاد بھی اسے بہت پسند آیا اگرچہ وہ ان دونوں کے نوسٹلجیا میں شریک ہونے سے قاصر رہا۔ لزارا نے بیٹھا پیش کرنے تک صرف سننے پر اکتفا کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بظاہر بغیر کسی وجہ کے ہومیرو نے خود کو خدا کے وجود کی بحث کی اندھی گلی میں جا پھنسایا۔

''میں خدا کے وجود کو مانتا ہوں'' صدر نے کہا ''مگر اسے انسانوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ اس سے زیادہ بڑے کاموں میں مشغول ہے۔''

''میں صرف ستاروں پر یقین رکھتی ہوں۔'' لزارا نے کہا اور صدر کے ردعمل کو غور سے دیکھنے لگی۔ ''آپ کس تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔''

''گیارہ مارچ کو''

''میں جانتی تھی'' لزارا فاتحانہ اشارے کے ساتھ بولی، اور پھر خوشگوار لہجے میں پوچھنے لگی: ''کیا آپ کے خیال میں ایک میز پر برج حوت کے دو افراد ضرورت سے زیادہ نہیں ہیں؟''

دونوں مرد خدا کے بارے میں گفتگو میں مصروف تھے۔ جب وہ کافی تیار کرنے باورچی خانے میں گئی۔ اس نے میز اچھی طرح صاف کر دی تھی اور دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی تھی کہ دعوت خیر و خوبی سے ختم ہو۔ کافی لے کر لونگ روم میں واپس آتے ہوئے اسے صدر کا ایک اڑتا ہوا فقرہ سنائی دیا جس سے وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

''یقین کرو میرے پیارے دوست، اگر میں صدر رہتا تو یہ ہمارے غریب ملک کے لئے

انتہائی بدقسمتی ہوتی۔"

ہومیرو نے لزارا کو ادھار لی ہوئی پیالیاں اور کافی پاٹ اٹھاتے دیکھا اور اسے خیال گزرا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے گی۔ صدر کی توجہ بھی اس طرف ہو گئی۔ "مجھے اس طرح مت دیکھو سینورا" وہ دوستانہ آواز میں بولا "میں اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں" اور پھر، ہومیرو کی طرف مڑ کر اس نے اپنی بات پوری کی: "بالکل مناسب ہے کہ اپنی حماقت کی میں اتنی بڑی قیمت ادا کر رہا ہوں۔"

لزارا نے کافی پیش کی اور میز کے اوپر لگی ہوئی بتی بجھا دی کیوں کہ اس کی چمک گفتگو میں حارج ہو رہی تھی۔ کمرے میں قربت کا ایک سایہ سا چھا گیا۔ اسے پہلی بار مہمان سے دل چسپی پیدا ہوئی جس کی حس مزاح اس کے اندر کی اداسی کو چھپانے میں ناکام تھی۔ لزارا کے تجسس میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب کافی ختم کرنے کے بعد اس نے اپنی پیالی کو الٹا کر طشتری میں رکھ دیا تا کہ کافی کے ذرات بہہ کر نیچے جمع ہو جائیں۔

صدر نے انہیں بتایا کہ اس نے اپنی جلا وطنی کے لئے جزیرہ مارتینیک کو شاعر ایمے سیزیر سے اپنی دوستی کے باعث منتخب کیا تھا جس کی کتاب Cahier d'un Retour au Pays Natal (آبائی وطن کے سفر کی نظمیں) انہیں دنوں شائع ہوئی تھی، اور جس نے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اس کے خاندانی ورثے میں سے جو کچھ باقی رہ گیا تھا اس سے اس نے اور اس کی بیوی نے فورد فرانس کی پہاڑیوں میں نوبل وڈ سے بنا ہوا ایک مکان خرید لیا جس کی کھڑکیوں پر جھلملیاں لگی ہوئی تھیں اور قدیم پھولوں سے بھرے دالان کا رخ سمندر کی جانب تھا، جہاں جھینگروں کی آوازوں اور شکر کے کارخانوں کی سمت سے آتی ہوئی راب اور رم کی مہک سے لبریز ہوا میں سونا ایک نعمت تھا۔ وہ اس مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا ــــ جو اس سے چودہ سال بڑی اور اس کے واحد بچے کو جنم دینے کے بعد مفلوج تھی ــــ اور تقدیر سے اپنی مدافعت کے لئے لاطینی کلاسیکی کتابوں کو اصل لاطینی میں پڑھنے کی عادت اور اپنے اس یقین کا سہارا لیا کرتا تھا کہ یہ اس کی زندگی کے ڈرامے کا آخری ایکٹ ہے۔ برسوں سے وہ اپنے شکست خوردہ حامیوں کے تجویز کیے ہوئے ہر قسم کے ایڈونچروں کی ترغیب کی مزاحمت کرتا چلا آ رہا تھا۔

"لیکن میں نے ایک بھی خط کو کھول کر نہیں دیکھا" اس نے کہا۔ "کبھی نہیں۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے انتہائی اہم خط ایک ہفتہ گزرنے پر کم اہم معلوم ہونے لگتے ہیں

اور دو مہینے بعد آدمی ان کو اور انہیں لکھنے والوں کو بالکل بھول جاتا ہے۔''

اس نے نیم تاریکی میں لزارا پر نظر ڈالی جو ایک سگریٹ سلگا رہی تھی، اور اپنے ہاتھ کی ایک پراشتیاق حرکت سے سگریٹ اس سے چھین لیا۔ ایک طویل کش لے کر اس نے دھوئیں کو دیر تک اپنے حلق میں رکھا۔ حیرت زدہ لزارا نے دوسرا سگریٹ سلگانے کے لئے ڈبیا اور ماچس اٹھائی تو اس نے جلتا ہوا سگریٹ اسے واپس دے دیا۔ ''تم اتنے مزے سے سگریٹ پیتی ہو کہ مجھ سے نہ رہا گیا'' وہ بولا۔ لیکن اس کو دھواں منہ سے نکالنا ہی پڑا کیوں کہ اسے کھانسی آنے لگی تھی۔

''میں نے یہ عادت برسوں پہلے ترک کر دی تھی، لیکن اس عادت نے مجھے پوری طرح ترک نہیں کیا'' اس نے کہا۔ ''بعض موقعوں پر میں اس سے ہار جاتا ہوں۔ جیسے اس وقت۔''

کھانسی کا دورہ اسے دو مرتبہ اور پڑا۔ اس کا درد لوٹ آیا۔ صدر نے اپنی چھوٹی سی جیبی گھڑی میں وقت دیکھا اور رات کی دو گولیاں کھائیں۔ پھر اس نے اپنی کافی کی پیالی پر نظر ڈالی، مگر اس بار اس پر لرزہ طاری نہیں ہوا۔

''میرے بعض حامی میرے بعد صدر رہ چکے ہیں۔'' وہ بولا

''سایا گو'' ہومیرو نے کہا۔

''سایا گو بھی اور دوسرے بھی'' اس نے کہا ''وہ سب میری طرح تھے: ایک ایسے اعزاز کے غاصب جس کے ہم مستحق نہیں تھے، ایک ایسے منصب پر قابض جس کی ذمے داریاں نبھانا ہم نہیں جانتے تھے۔ کچھ لوگوں کی طاقت کی طلب ہوتی ہے، مگر زیادہ تر اس سے بہت کمتر چیز کی تلاش میں ہوتے ہیں...... ملازمت کی۔''

لزارا کو غصہ آ گیا۔ ''آپ کو معلوم ہے لوگ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

ہومیرو نے چونک کر دخل اندازی کی۔ ''وہ سب جھوٹ ہے۔''

''جھوٹ ہے بھی اور نہیں بھی'' صدر نے ماورائی سکون کے ساتھ کہا۔ ''جب معاملہ کسی صدر کا ہو تو بدترین قیاس بھی بیک وقت درست اور غلط ہو سکتا ہے۔''

اس نے اپنی جلاوطنی کا پورا عرصہ مارتینیک میں گزارا تھا، جہاں بیرونی دنیا سے اس کا واحد رابطہ سرکاری اخبار میں چھپنے والی چند خبروں تک محدود تھا، اور وہ ایک سرکاری درس گاہ میں اسپانوی اور لاطینی زبانیں پڑھا کر، اور ایسے سیزیر کی کوششوں سے کبھی کبھار ملنے والے ترجمے کے کام سے اپنا خرچ چلایا کرتا تھا۔ اگست میں گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی تھی، اور وہ دوپہر تک چھوٹے

میں پڑا، اپنے کمرے میں لگے ہوئے پنکھے کی گنگناہٹ سنتا اور کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ دن کے گرم ترین حصوں میں بھی اس کی بیوی، تنکوں کے بنے اور مصنوعی پھلوں اور آرگنڈی کے پھولوں سے سجے ہوئے ہیٹ کی مدد سے خود کو دھوپ سے بچائے، ان پرندوں کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی جن کو وہ صحن میں آزار رکھ کر پال رہی تھی۔ مگر جب گرمی کم ہوتی تو دالان کی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا وہ اندھیرا ہونے تک سمندر پر نظریں جمائے رہتا اور اس کی بیوی اپنی جھولنے والی کرسی میں بیٹھی، سر پر پھٹا پرانا ہیٹ اور ساری انگلیوں میں چمکدار پتھروں والی انگوٹھیاں پہنے، دنیا بھر کے جہازوں کو گزرتے دیکھا کرتی تھی۔ ''یہ پوئرتو ریکو جا رہا ہے'' وہ کہتی۔ ''اس والے کے لئے تو چلنا مشکل ہو رہا ہے، پوئرتو سانتو کے کیلوں سے اس بری طرح لدا ہوا ہے۔'' وہ کہتی۔ کیوں کہ اس کے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ گزرنے والا ہر جہاز ان کے اپنے ملک کا نہ ہو۔ وہ اس کی بات سنی ان سنی کر دیتا تھا، اگرچہ آخر کار وہ فراموش کرنے میں اس سے زیادہ اچھی طرح کامیاب ہوئی کیوں کہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی۔ وہ اسی طرح بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ جھٹ پٹا ختم ہو جاتا اور انہیں مچھروں سے بچنے کے لئے اندر پناہ لینی پڑتی۔ اگست کے ایسے بہت سے مہینوں میں سے ایک کے دوران، دالان میں اخبار پڑھتے ہوئے، صدر حیرت سے چونک پڑا۔

''اوہ خدایا'' وہ بولا۔ ''میرا ایستورل میں انتقال ہو گیا ہے۔''

اس کی بیوی، جو غنودگی کے سمندر میں تیر رہی تھی، اس خبر سے دہشت زدہ ہو گئی۔ یہ خبر ایک ایسے اخبار کے پانچویں صفحے پر چھ سطروں میں شائع ہوئی تھی جو ان کی گلی کے نکڑ پر چھپا کرتا تھا اور جس میں اس کے کئے ہوئے ترجمے بھی شائع ہوتے رہے تھے، اور جس کا منیجر اس سے ملنے بھی کبھی کبھار آ نکلتا تھا۔ اور اب اس اخبار کا کہنا تھا کہ وہ یورپی انحطاط پسندوں کی پناہ گاہ اور سیر گاہ ایستورل در بو آمیں وفات پا گیا ہے جہاں اس نے کبھی قدم تک نہیں رکھا تھا اور جو شاید دنیا میں واحد جگہ تھی جہاں مرنا اسے ناپسند ہوتا۔ اس کی بیوی البتہ ایک سال بعد چل بسی، اپنے پاس باقی واحد یاد کے ہاتھوں اذیت اٹھاتے ہوئے: اپنے اکلوتے بیٹے کی یاد جس نے اپنے باپ کی معزولی میں حصہ لیا تھا اور بعد میں اپنے ہی ساتھیوں کی گولی کا نشانہ بنا گیا تھا۔

صدر نے آہ بھری۔ ''ہم اسی طرح ہیں، اور کوئی شے ہمیں نجات نہیں دلا سکتی'' وہ بولا۔ ''دنیا کے قبیح ترین لوگوں کا تصور کیا ہوا ایک براعظم، محبت کے ایک لمحے تک سے محروم: اغوا، زنا بالجبر، قانون شکنی، بدنام کاروائیوں، فریب کاریوں اور دشمنوں کے دشمنوں سے اتحاد پر پرورش پائے ہوئے بچوں کا تصور کیا ہوا براعظم۔'' اس نے لزارا کی افریقی آنکھوں کی طرف رخ پھیرا جو

اسے بے رحمی سے گھور رہی تھیں اور اس نے کسی کہنہ مشق کی سی خوش گفتاری سے اس عورت کا دل موہ لینا چاہا۔ ''نسلوں کی آمیزش کا مطلب ہے آنسوؤں اور بہتے ہوئے خون کی آمیزش۔ اس قسم کے آمیزے سے کوئی کیا توقع کرسکتا ہے؟''

لزارا نے اپنی موت کی سی خاموشی سے اسے اس کے مقام پر جما دیا۔ مگر نصف شب سے پہلے لزارا اپنے آپ پر تھوڑا بہت قابو پا چکی تھی اور اس نے ایک رسمی بوسے کے ساتھ اسے الوداع کہا۔ صدر نے ہومیرو کو اپنے ساتھ ہوٹل تک جانے کی اجازت نہیں دی مگر اس کو ٹیکسی تلاش کرنے میں مدد دینے سے باز نہ رکھ سکا۔ جب ہومیرو واپس آیا تو اس کی بیوی ایک طیش کے عالم میں تھی۔ ''یہ دنیا کا واحد صدر ہے جو واقعی معزول کیے جانے کا مستحق تھا'' وہ بولی۔ ''کتے کا بچہ''

ہومیرو کی اسے تسلی دینے کی کوششوں کے باوجود دونوں نے ایک اندوہناک اور بے خواب رات گزاری۔ لزارا نے اعتراف کیا کہ صدر وہ خوش شکل ترین مرد تھا جسے اس نے تمام زندگی میں دیکھا تھا اور اس میں ترغیب کی تباہ کن صلاحیت اور کسی گھوڑے کی سی جنسی کشش تھی۔ ''اس وقت بھی جب وہ بوڑھا اور تھکا ہوا ہے، بستر میں وہ یقیناً کسی چیتے کی طرح جان دار ہوگا۔'' اس نے کہا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ اس شخص نے خدا کی بخشی ہوئی ان صلاحیتوں کو محض خود نمائی میں صرف کر دیا۔ اس کا یہ دعویٰ لزارا کے لئے ناقابل برداشت تھا کہ وہ اپنے ملک کا بدترین صدر رہا ہے۔ اور اس کی راہبانہ ادائیں، جب کہ اسے یقین تھا کہ وہ مارٹینیک میں گنے کی آدھی فصل کا مالک ہے۔ اور اقتدار کے لئے اس کی ریاکارانہ تحقیر، جب کہ یہ بات واضح تھی کہ وہ محض اتنی دیر کے لئے دوبارہ صدر بننے کے لئے کچھ بھی دینے کو تیار ہو جائے گا کہ اپنے دشمنوں کو خاک چٹا سکے۔

''اور یہ سب کچھ'' اس نے اپنی بات پوری کی ''محض اس لئے کہ ہم اس کے قدموں میں گر کر اس کی پرستش کرنے لگیں۔''

''اس سے اسے کیا فائدہ ہوگا؟'' ہومیرو نے پوچھا

''کچھ بھی نہیں'' وہ بولی۔ ''مگر حقیقت یہ ہے کہ رجھانے کی لت ایسی ہے جس کی تسکین کبھی نہیں ہو سکتی۔''

اس کا غیظ و غضب اس درجے کا تھا کہ ہومیرو اس کے ساتھ ایک بستر میں رہنا برداشت نہ کر سکا، اور اس نے باقی کی رات لونگ روم کے دیوان پر ایک کمبل میں لپٹ کر گزاری۔ لزارا خود بھی رات کے درمیان، سر سے پیر تک برہنہ ـــ جس حالت میں وہ سوتے وقت یا گھر میں ہمیشہ رہا کرتی تھی ـــ اٹھ بیٹھی اور خود سے محض اس ایک موضوع پر متواتر مخاطب رہی۔ ہاتھ کی ایک

تیز حرکت سے اس نے اس نفرت انگیز دعوت کی یاد کو انسانی حافظے سے ہمیشہ کے لئے محو کر دیا۔ صبح سویرے اس نے ادھار لی ہوئی ساری چیزیں لوٹائیں، نئے پردے اتار کر پرانے پردے لگائے اور فرنیچر کو اپنی پرانی ترتیب میں واپس لے آئی۔ یہاں تک کہ ان کا گھر اسی غریبانہ اور پر وقار وضع پر لوٹ آیا جس میں ایک رات پہلے تک تھا۔ پھر اس نے اخباروں کے تراشے، تصویریں اور اس منحوس انتخابی مہم کے جھنڈے اور پھریرے دیوار پر سے نوچ کر ایک آخری چیخ کے ساتھ کوڑے کے ڈبے میں پھینک دیئے:

"جہنم میں جاؤ!"

دعوت کے ایک ہفتے بعد ہومیرو نے ہسپتال سے نکلتے ہوئے صدر کو اپنا منتظر پایا، اس درخواست کے ساتھ کہ ہومیرو اس کے ہوٹل تک اس کے ساتھ چلے۔ وہ اونچی سیڑھیوں والے زیتون کی تین منزلیں چڑھ کر اس بالا خانے میں پہنچے جس کی چھت میں صرف ایک کھڑکی تھی جس پر دھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ کمرے میں ایک ڈبل بیڈ بھی تھا، جس نے آدھا کمرہ گھیر رکھا تھا، اور ایک سخت کرسی، تپائی والی سلفچی، اور کسی غریب آدمی کی سی شیو کی صندوقچی جس کا آئینہ گدلایا ہوا تھا۔ صدر نے ہومیرو کے ردعمل کا جائزہ لیا۔ "اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں میں اسی بل میں رہتا تھا۔" اس نے گویا عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس کمرے کی ریزرویشن خود فرانس ہی سے کرائی تھی۔"

ایک مخملیں تھیلے میں سے اس نے اپنی دولت کی آخری چند نشانیاں الگ کیں اور پھر انہیں نمائش کے لئے بستر پر پھیلا دیا: کئی طلائی کنگن جن پر مختلف قسم کے قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ تین لڑیوں والا موتیوں کا ہار، اور سونے اور جواہرات کے دو اور ہار۔ تین طلائی زنجیریں جن میں ولیوں کے تمغے جھول رہے تھے۔ ایک جوڑی سونے اور زمرد کے آویزوں کی، ایک سونے اور ہیروں کا ایک تاج جو کسی ملکہ کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔ ایک اور صندوقچی میں سے اس نے کف لنکس کی تین جوڑیاں چاندی کی اور دو سونے کی، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے جوڑ کی ٹائی پن بھی تھی، سفید سونے کا پانی چڑھی ہوئی ایک جیبی گھڑی اور اس کے ساتھ کی زنجیر نکالی۔ اس کے بعد اس نے جوتے کے ڈبے میں سے اپنے چھ کے چھ اعزازات برآمد کئے۔ دو سونے کے، ایک چاندی کا اور باقی سب بے قیمت تھے۔ "بس یہی کچھ ہے جو زندگی میں میرے پاس باقی رہ گیا ہے۔" اس نے کہا۔

اس کے پاس اپنے علاج کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ان تمام چیزوں کو بیچنے کے

سوا کوئی چارہ نہ تھا اور اس نے ہومیرو سے اس کی خاطر پوری راز داری کے ساتھ یہ کام کرنے کی التجا کی۔ لیکن ہومیرو کا خیال تھا کہ اگر ان چیزوں کی رسیدیں موجود نہیں ہیں تو وہ یہ کام نہیں کر سکے گا۔

صدر نے وضاحت کی کہ یہ سب زیور اس کی بیوی کے ہیں اور اسے رشتے کی ایک دادی کے مرنے پر ورثے میں ملے تھے جو نوآبادیاتی دور میں زندہ رہی تھی اور کولمبیا کی سونے کی کانوں کا ایک حصہ ورثے میں پایا تھا۔ گھڑی، کف لنکس اور ٹائی پنیں اس کی اپنی تھیں۔ اعزازات، ظاہر ہے اس سے پہلے کسی کے نہیں تھے۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ کسی کے پاس ایسی چیزوں کی رسیدیں ہوتی ہوں گی'' اس نے کہا۔

ہومیرو ٹس سے مس نہ ہوا۔

''ایسی صورت میں'' صدر نے غور کرتے ہوئے کہا ''مجھے یہ کام خود ہی کرنا ہوگا۔''

وہ نپے تلے پرسکون انداز سے جواہرات سمیٹنے لگا۔ ''میں تم سے معافی چاہتا ہوں، پیارے ہومیرو۔ مگر کسی قلاش ہو جانے والے صدر کی مفلسی سے بدتر کوئی مفلسی نہیں۔'' وہ بولا۔ ''زندہ رہنا تک تحقیر کے قابل لگتا ہے۔'' اس لمحے میں ہومیرو نے اسے اپنے دل کی آنکھ سے دیکھا اور ہتھیار ڈال دیئے۔

لزارا اس رات دیر سے گھر لوٹی۔ اس نے میز پر پارے کے بلب کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے جواہرات کی جھلک دروازے ہی میں سے دیکھ لی، اور اس پر بالکل ایسا اثر ہوا جیسے اس نے اپنے بستر میں کسی بچھو کو دیکھ لیا ہو۔

''احمق مت بنو، ہومیرو'' وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ''یہ چیزیں یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

ہومیرو کی وضاحت نے اسے اور پریشان کر دیا۔ وہ بیٹھ کر جواہرات کو، کسی جواہر فروش کے تمام تر انہماک سے، ایک ایک کر کے دیکھنے لگی۔ پھر کسی لمحے اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ان کی قیمت کسی خزانے سے کم کیا ہوگی۔'' آخر کار وہ بیٹھ کر ہومیرو کا منہ تکنے لگی اور اپنی الجھن سے باہر آنے کا راستا کھو بیٹھی۔

''خدا کی لعنت ہو'' وہ بولی۔ ''ہمیں کیا پتا کہ وہ شخص سچ کہہ رہا ہے؟''

''کیوں نہیں؟'' ہومیرو نے کہا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ اپنے کپڑے خود دھوتا ہے اور بالکل ہماری طرح انہیں کھڑکی میں لٹکا کر سکھاتا ہے۔''

''کیوں کہ وہ کنجوس ہے۔'' لزارا بولی۔

"یا غریب ہے" ہومیرو نے کہا۔

لزارا نے ایک بار پھر جواہرات کا معائنہ کیا، اس بار ذرا کم توجہ کے ساتھ، کیوں کہ اب وہ خود بھی ہتھیار ڈال چکی تھی۔ چنانچہ اگلی صبح اس نے اپنا بہترین لباس پہنا اور جو زیور اسے سب سے زیادہ قیمتی معلوم ہوئے ان سے خود کو آراستہ کیا، تمام انگلیوں میں جتنی انگوٹھیاں پہن سکتی تھی پہنیں، اور ان میں سے ایک اپنے انگوٹھے میں بھی چڑھا لی، کلائیوں میں جتنے کنگن آ سکتے تھے پہنے، اور انہیں فروخت کرنے نکل کھڑی ہوئی۔ "دیکھتے ہیں کون لزارا داویس سے رسیدیں مانگتا ہے" وہ باہر نکلتے ہوئے ہنسی سے دوہری ہو کر بولی۔ اس نے بالکل درست جواہر فروش کا انتخاب کیا، جس کے پاس نیک نامی کم اور دکھاوا زیادہ تھا، جہاں اس کو معلوم تھا چیزیں بیچی اور خریدی جاتی ہیں اور زیادہ سوال جواب نہیں کیے جاتے۔ وہ دہشت کے عالم میں، مگر مضبوط قدم رکھتی اندر داخل ہوئی۔

شام کے لباس میں ایک دبلے، زرد رو سیلز مین نے تھیٹرانہ انداز سے جھک کر اسے خوش آمدید کہا، اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور پوچھا کہ وہ اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ چاروں طرف لگے ہوئے آئینوں اور تیز روشنیوں کی وجہ سے اندر دن سے زیادہ روشنی ہو رہی تھی، اور پوری دکان ہیروں کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ لزارا ملازم کی طرف دیکھے بغیر، کہ کہیں وہ اس کے ناٹک کو بھانپ نہ لے، اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی دکان کے پچھلے حصے میں پہنچ گئی۔

اس نے لزارا کو لوئی پانزدہم کے زمانے کے پیش تختوں میں سے ایک کے پاس بیٹھنے کی دعوت دی جو تنہا آنے والوں کی خدمت کے لیے کاؤنٹر کا کام دیتے تھے اور اس کی اوپری سطح پر ایک صاف کپڑا بچھا دیا۔ پھر وہ لزارا کے مقابل بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

اس نے انگوٹھیاں، کنگن، ہار، آویزے، تمام زیور بے دھڑک اتار دیے اور انہیں شطرنج کے مہروں کی طرح پیش تختے پر ترتیب کے ساتھ رکھنے لگی۔ "وہ صرف یہ جاننا چاہتی ہے" اس نے کہا "کہ ان چیزوں کی اصل قیمت کیا ہے۔"

جوہری نے اپنی بائیں آنکھ پر شیشہ لگا لیا اور کسی معالج کی سی خاموشی کے ساتھ زیوروں کا معائنہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد، معائنہ جاری رکھتے ہوئے، اس نے دریافت کیا: "آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

لزارا اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ "اے سینور" وہ بولی، "میں بہت دور کی ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہے" اس نے کہا۔

وہ پھر خاموش ہو گیا اور لزارا کی دہشت زدہ سرد آنکھیں بے رحمی سے اس کا جائزہ لیتی رہیں۔ جوہری نے ہیروں کے تاج پر اپنی خاص توجہ صرف کی اور اسے باقی زیوروں سے الگ کر کے رکھ دیا۔لزارا نے آہ بھری۔

''تم برج سنبلہ کا مکمل نمونہ ہو'' وہ بولی۔

''جوہری کے معائنے میں کوئی خلل نہ آیا''۔'' آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''تمہارے برتاؤ سے''لزارا بولی۔

اپنا معائنہ ختم کرنے سے پہلے اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، اور پھر اسی احتیاط کے ساتھ اسے مخاطب کیا جس سے ابتدا میں کام لیا تھا۔''یہ سب چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟''

''یہ میری دادی کا چھوڑا ہوا ورثہ ہے''لزارا کھنچی ہوئی آواز میں بولی۔''ان کا پچھلے سال ستانوے برس کی عمر میں پارامار یبو میں انتقال ہو گیا تھا۔''

تب جوہری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔''مجھے بے حد افسوس ہے'' وہ بولا'' مگر ان کی قیمت محض سونے کے وزن کے برابر ہے۔'' اس نے اپنی انگلیوں کے سروں سے تاج کو اٹھا لیا اور اسے تیز روشنی میں گھما گھما کر جگمگانے لگا۔

''اس کے سوا'' وہ بولا۔''یہ بہت پرانا ہے، شاید مصری ہے، اور اگر ہیرے اتنی بری حالت میں نہ ہوتے تو انتہائی بیش قیمت ہوتا۔مگر بہر حال، اس کی تاریخی اہمیت تو ضرور ہے۔''

اس کے سوا تمام زیوروں میں جڑے ہوئے جواہرات، یاقوت، زمرد، لعل، سلیسی، سب کے سب، کسی استثنیٰ کے بغیر جعلی تھے۔''بلاشبہ، ان کے اصل نمونے بہت شان دار رہے ہوں گے'' جوہری تمام زیوروں کو سمیٹ کر اسے لوٹاتے ہوئے بولا۔''لیکن ایک کے بعد دوسری نسل کو بار بار منتقل ہوتے ہوئے راستے میں کہیں اصل جواہرات نکال کر ان کی جگہ کانچ کے ٹکڑے جڑ دیئے گئے۔''لزارا کو شدید متلی محسوس ہوئی، اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اضطراب پر قابو پایا۔سیلز مین نے اسے تسلی دی''ایسا اکثر ہوتا ہے، مادام!''

''مجھے معلوم ہے''لزارا نے پرسکون ہو کر کہا۔''یہی وجہ ہے کہ میں ان سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

تب ہی اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا سوانگ ترک کر کے پھر سے اپنا آپ ہو چکی ہے۔مزید تاخیر کے بغیر اس نے جھدر کے کف لنکس، جیبی گھڑی، ٹائی پنیں، طلائی اور نقرئی اعزازات اور باقی ذاتی اشیا اپنے ہینڈ بیگ میں سے نکالیں اور ان سب کو میز پر رکھ دیا۔

"یہ بھی؟" جوہری نے پوچھا۔

"سب" لزارا بولی۔

اسے سوئس فرانک کے نوٹوں میں ادائیگی کی گئی جو اتنے نئے تھے کہ اسے اپنی انگلیوں کے سروں پر تازہ روشنائی لگ جانے کا خوف ہونے لگا۔ اس نے گنے بغیر یہ نوٹ لے لئے۔ دروازے پر جوہری کے رخصتی آداب خیر مقدم کی طرح پر تکلف تھے۔ اس کے واسطے دروازہ کھول کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک لمحہ توقف کرنے کو کہا۔ "ایک آخری بات، مادام" وہ بولا۔ "میرا برج دلو ہے۔"

ایک روز شام ہوتے ہی ہومیرو اور لزارا رقم لے کر ہوٹل چلے گئے۔ بہت حساب کتاب کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ تھوڑی سی رقم اور درکار ہوگی۔ اور صدر نے اپنی عروسی انگوٹھی، جیبی گھڑی اور زنجیر اور کف لنکس اور ٹائی پن اتار کر انہیں بستر پر جمانا شروع کر دیا۔

لزارا اور ہومیرو نے عروسی انگوٹھی اسے واپس دے دی۔ "یہ نہیں" وہ بولی۔ "اس طرح کی یادگاریں بیچی نہیں جاتیں۔"

صدر نے اس کی بات مان لی اور انگوٹھی دوبارہ پہن لی۔ لزارا نے اس کی جیبی گھڑی بھی لوٹا دی۔ "یہ بھی نہیں" اس نے کہا۔ صدر نے اس سے اتفاق نہیں کیا لیکن اس نے صدر کو اس کے مقام پر پہنچا دیا۔ "سوئٹزرلینڈ میں گھڑی بیچنے کی کوشش کون کر سکتا ہے؟"

"ہم نے بیچی ہے" صدر نے کہا۔

"ہاں، مگر گھڑی نہیں۔ اس میں لگا ہوا سونا۔"

"یہ بھی سونے کی ہے" صدر نے کہا۔

"ہاں" لزارا بولی۔ "آپریشن کے بغیر تو شاید کام چل جائے، لیکن وقت جاننا آپ کے لئے ضروری ہوگا۔"

وہ صدر کا طلائی رم والا چشمہ لے جانے پر بھی راضی نہیں ہوئی حالاں کہ اس کے پاس کچھوے کے خول والا ایک اور چشمہ بھی تھا۔ اس نے سب چیزیں اپنے ہاتھ میں سمیٹ لیں اور صدر کے تمام شکوک کا خاتمہ کر دیا۔ "اور باتوں کے علاوہ" وہ بولی "یہ چیزیں کافی ہوں گی۔"

روانہ ہونے سے پہلے اس نے، صدر سے صلاح کئے بغیر، اس کے گیلے کپڑے رسی پر اتار کر اپنے گھر پر سکھانے اور استری کرنے کی غرض سے ساتھ لے لئے۔ وہ دونوں اسکوٹر پر سوار ہوئے، ہومیرو اسکوٹر چلانے لگا اور لزارا اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر پیچھے بیٹھ گئی۔ شفق کی

سرخی میں سڑک پر لگی بتیاں ابھی ابھی روشن ہوئی تھیں۔ ہوا آخری پتوں کو اڑا لے گئی تھی اور پیڑ گھن
کھائے ہوئے ڈھانچوں جیسے لگ رہے تھے۔ دیوروں پر ایک ٹو ٹرک ریڈیو کو اونچی آواز میں بجاتا اور اپنے پیچھے موسیقی کی ایک لکیر چھوڑتا تیز رفتاری سے چلا رہا تھا۔ جارج براسینز گا رہا تھا:

Man amour tien bien la barre, le temps va passe par la , et le temps est un barbare dans le genre d'Attila , par la ou son cheval passe l'amour ne repousse pas.

''میرے محبوب گرفت مضبوط رکھو۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اور وقت اٹیلا کی طرح ایک وحشی ہے۔ جس جگہ اس کے گھوڑے کے قدم پڑتے ہیں وہاں محبت لوٹ کر نہیں آتی۔'' (فرانسیسی سے ترجمہ: افضال احمد سید)

ہومیرو اور لزارا گانے اور سنبل کی یادگیر مہک کے سحر میں آ کر خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد وہ گویا ایک طویل نیند سے بیدار ہوئی۔ ''لعنت ہو!'' وہ بولی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''بے چارہ بڈھا'' لزارا نے کہا۔ ''کیسی ذلیل زندگی ہے۔''

بعد کے ایک جمعے کو، جب اکتوبر کی سات تاریخ تھی، صدر پانچ گھنٹے کے ایک آپریشن سے گزرا جس سے فوری طور پر حالات کے غیر یقینی پن میں کوئی فرق نہ پڑا۔ قطعیت سے صرف اتنا کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور یہی غنیمت ہے۔ دس دن بعد اسے ایک کمرے میں دوسرے مریضوں کے ساتھ منتقل کر دیا گیا۔ وہ ایک بالکل بدلا ہوا آدمی تھا، ذہنی طور پر منتشر اور جسمانی طور پر نحیف، اور اس کے چھدرے بال تکیے کی رگڑ تک سے جھڑنے لگے تھے۔ اس کے سابقہ وجود کا اگر کچھ باقی رہ گیا تھا تو وہ اس کے ہاتھوں کی پروقار جنبش تھی۔ ہڈیوں کے امراض میں مبتلا لوگوں کے لئے مخصوص دو چھڑیاں ہاتھ میں لے کر چلنے کی اس کی پہلی پہل کی کوشش دلخراش تھی۔ لزارا ہسپتال میں ٹھہر گئی اور اس کے سرھانے سوئی تا کہ اسے نرس رکھنے کے خرچ سے بچا سکے۔ کمرے میں موجود ایک اور مریض نے پہلی رات موت کے خوف سے چیخیں مارتے ہوئے گزاری۔ ان غیر مختتم راتوں نے لزارا کا رہا سہا تکلف بھی اٹھا دیا۔

جینوا میں اپنی آمد کے چار ماہ بعد صدر کو ہسپتال سے چھٹی دی گئی۔ ہومیرو نے، جو اس کے

قلیل مالی اثاثوں کے محتاط خزانچی کی ذمے داری سنبھالے ہوئے تھا، ہسپتال کا بل ادا کیا اور اسے اپنی ایمبولینس میں ہسپتال کے چند اور ملازموں کے ساتھ اپنے گھر لے گیا، جنہوں نے اسے آٹھویں منزل تک پہنچانے میں ہومیرو کی مدد کی۔ انہوں نے اسے بچوں کے سونے کے کمرے میں رکھا جس کے وجود کو اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا، اور رفتہ رفتہ وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آتا گیا۔ اس نے سپاہیانہ مستعدی کے ساتھ خود کو صحت یابی کی جسمانی مشقیں کرنے میں لگا دیا، اور اپنی چھڑی کے سہارے چلنے کے قابل ہو گیا۔ لیکن اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بہترین لباس میں بھی وہ پہلا سا آدمی نہ بن سکا، نہ ظاہری ہیئت کے اعتبار سے اور نہ طرزِ عمل کے لحاظ سے۔ جاڑوں کے خوف سے، جن کے نہایت شدید ہونے کی توقع تھی اور جو درحقیقت اس صدی کے شدید ترین جاڑے ثابت ہوئے، اس نے ڈاکٹروں کے مشوروں کے برخلاف، جو اسے مزید کچھ عرصے تک زیرِ نگرانی رکھنا چاہتے تھے اس نے ۱۳ دسمبر کو روانہ ہونے والے مرسائی نامی جہاز پر گھر لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ آخری وقت میں معلوم ہوا کہ اس کے پاس کرائے کی پوری رقم نہیں ہے۔ اور لزارا نے اپنے شوہر کو بتائے بغیر، اپنے بچوں کے لئے رکھی ہوئی رقم میں ہاتھ مار کر فرق پورا کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے وہاں بھی اتنی رقم نہیں ملی جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ تب ہومیرو نے اعتراف کیا کہ اس نے لزارا کو بتائے بغیر ہسپتال کا بل پورا کرنے کے لئے وہاں سے کچھ رقم لی تھی۔

''خیر'' لزارا نے تن بہ تقدیر ہوتے ہوئے کہا'' ہم یہی سمجھ لیں گے کہ وہ ہمارا سب سے بڑا بیٹا ہے۔''

۱۱ دسمبر کو شدید برف باری میں وہ اسے مرسائی جانے والی ٹرین پر سوار کرانے لے گئے اور بچوں کی میز پر پڑا ہوا الوداعی خط انہیں اسٹیشن سے واپس آنے سے پہلے نظر نہیں آیا۔ وہیں اس نے اپنی عروسی انگوٹھی باربرا کے لئے چھوڑ دی تھی اور اپنی مرحوم بیوی کی عروسی پٹی بھی جس کو فروخت کرنے کی اس نے کوشش تک نہیں کی تھی اور اپنی جیبی گھڑی اور زنجیر ننھے لزارو کے لئے۔ چوں کہ وہ اتوار کا دن تھا کچھ کریبین پڑوسی، جن پر راز افشا ہو گیا تھا و یرا کروز کا ایک ہارپ بینڈ لے کر کورنا دیں اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ صدر اپنا اوباشوں کا سا اوور کوٹ اور ایک لمبا سا رنگین اسکارف پہنے جو دراصل لزارا کا تھا، ہانپتا ہوا چل رہا تھا، مگر اس کے باوجود وہ آخری ڈبے میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور تیز سرد ہوا میں ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ ٹرین رفتار پکڑنے لگی تھی جب ہومیرو

کو احساس ہوا کہ صدر کی چھڑی اس کے پاس رہ گئی ہے۔ وہ بلبٹ فارم کے آخری سرے تک دوڑتا ہوا گیا اور پوری قوت سے چھڑی اس کی طرف اچھال دی تا کہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کر پکڑ سکے، مگر وہ پہیوں کے درمیان گر کر ریزہ ریزہ ہوگئی۔ یہ ایک دہشت ناک لمحہ تھا۔ لزارا کی آنکھوں کے سامنے آخری منظر چھڑی کی طرف بڑھنے اور اسے تھامنے سے قاصر رہنے والا صدر کا کپکپاتا ہاتھ تھا، اور ٹرین کا گارڈ جس نے برف سے ڈھکا ہوا کوٹ کا کالر پکڑ کر بوڑھے آدمی کو نیچے گرنے سے آخری لمحے میں بچالیا۔ لزارا انتہائی دہشت کے عالم میں دوڑتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس پہنچی اور اپنے آنسوؤں کے پیچھے سے ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''میرے خدا!'' وہ چیخ کر بولی۔ ''یہ شخص کسی طرح نہیں مر سکتا۔''

وہ بہ خیریت پہنچ گیا، یہ بات اس کے طویل شکریے کے ٹیلی گرام سے معلوم ہوئی۔ ایک سال تک اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ آخر کار انہیں چھ صفحوں کا ہاتھ سے لکھا ہوا خط ملا جس کی تحریر سے اسے پہچاننا ناممکن تھا۔ اس کا درد لوٹ آیا تھا، پہلے کی طرح شدید اور باقاعدہ انداز میں، مگر اب اس نے اسے نظر انداز کر کے زندگی کو جوں کا توں قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاعر ایمے سیزیر نے اسے ایک اور چھڑی لے دی تھی، جس میں سیپیاں جڑی ہوئی تھیں، لیکن اس نے اس چھڑی کو استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پچھلے چھ مہینے سے وہ پابندی سے گوشت اور مچھلی کھا رہا تھا اور دن بھر میں تلخ ترین کافی کی بیس پیالیاں تک پینے پر قادر تھا۔ لیکن اس نے پیالی کی تہہ میں اپنی تقدیر پڑھنا ترک کر دیا تھا کیوں کہ اس میں دکھائی دینے والی پیش گوئی کبھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ اپنی پچھترویں سالگرہ کے دن اس نے مارتینیک کی نفیس رم کے چند گلاس پیے، جو اسے اپنے مزاج کے مناسب محسوس ہوئے، اور اب سگریٹ نوشی بھی دوبارہ شروع کر دی ہے۔ اس کی حالت، بلاشبہ، بہتر نہیں ہوئی، لیکن پہلے سے زیادہ خراب بھی نہیں ہوئی۔ مگر اس خط کا اصل مقصد انہیں یہ اطلاع دینا تھا کہ وہ ایک اصلاحی تحریک کے رہنما کی حیثیت سے، جو قوم کے وقار کے شایانِ شان تحریک ہے، وطن واپس جانے کی ترغیب محسوس کرنے لگا ہے خواہ اس کا حاصل بستر میں بڑھاپے کا شکار ہو کر نہ مرنے کی حقیر عظمت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لحاظ سے، خط کے آخر میں لکھا تھا، جنیوا کا سفر بے حد خوش آئند ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

(مشمولہ: ''ادبیات''، (بین الاقوامی ادب نمبر ۵)، جلد ۱۱، شمارہ ۴۵-۴۳، اسلام آباد، بہار تا گرما ۱۹۹۸ء)

حسنِ خوابیدہ کے سنگ پرواز

ترجمہ: ضیاء الحق

وہ خوب صورت اور نازک تھی۔ ملائم گندمی رنگت، سبز بادامی آنکھیں اور کاندھوں کو چھوتے کالے بال۔ اس کے گرد قدامت کا ایسا ہالہ تھا جو انڈونیشی بھی ہو سکتا تھا اور اینڈیز کا بھی۔ اس کے لباس میں بھی نفاست اور نازکی تھی۔ جنگلی بلی کی سمور والی جیکٹ، راسلک کا بلاؤز جس پر بہت کومل پھول کڑھے تھے، لینن کا پاجامہ اور بوگن ویلا کے رنگ کی باریک پٹی والے جوتے۔ چارلس ڈیگال ائرپورٹ پر پیرس سے نیویارک کی پرواز کے لیے چیک اِن کی قطار میں کھڑے کھڑے جب میں نے اس شیرنی جیسی دبی چال چلتے اپنے پاس سے گزرتے دیکھا تو سوچا، ”میں نے آج تک جتنی خواتین دیکھی ہیں یہ ان سب سے خوب صورت ہے۔“ وہ مافوق الفطرت شبیہہ کی طرح سے تھی جو محض ایک لمحے کے لئے قائم رہی اور پھر ٹرمینل کے ہجوم میں غائب ہو گئی۔

اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ تمام رات برف باری ہوتی رہی تھی۔ شہر کی سڑکوں پر ٹریفک عام دنوں سے کہیں زیادہ تھی اور ہائی وے پر، کہ جس کے کناروں پر ٹرک قطار اندر قطار کھڑے تھے، ٹریفک سست رفتار سی تھی۔ گاڑیاں برف باری کی وجہ سے بھاپ خارج کر رہی تھیں تاہم ائر پورٹ کی عمارت کے اندر بہار سی حدت تھی۔

میں ایک بوڑھی ولندیزی خاتون کے پیچھے کھڑا تھا جس نے اپنے گیارہ عدد سوٹ کیسوں کے وزن پر بحث کرتے کرتے گھنٹہ بھر گزار دیا۔ میں اس سب بحث پر بے زار سا ہو رہا تھا کہ جب میں نے اس حیرت زدہ کر دینے والی شبیہہ کو دیکھا۔ اسی وجہ سے میں یہ بھی نہ جان سکا کہ

جھگڑا کس طرح ختم ہوا۔ تبھی ٹکٹ کلرک نے میری توجہ کے اس بھٹکنے پر میری سرزنش کرتے ہوئے مجھے بادلوں سے نیچے لا پھینکا۔ معذرت خواہانہ انداز میں مَیں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ پہلی نظر کی محبت کی قائل ہے۔ وہ کہنے لگی، ''یقیناً! کیوں کہ کوئی دوسری صورت ناممکن ہے۔'' اس نے اپنی نظریں کمپیوٹر سکرین پر جمائے رکھیں اور پوچھا کہ آیا میں سگریٹ نوشی والے حصے میں نشست چاہتا ہوں کہ اس سے ممنوعہ حصے میں۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے واضح بغض کے ساتھ کہا۔ ''جب تک کہ میں ان گیارہ سوٹ کیسوں کے ساتھ نہ ہوں۔'' اس نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ روشن سکرین سے نظریں ہٹائے بغیر میری بات کو سراہا اور پھر مجھے کہا، ''تین، چار اور سات میں سے کون سا نمبر چاہیں گے؟'' میں نے چار نمبر کے لئے کہا۔ خوشی کے احساس سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور کہنے لگی، ''میری یہاں پندرہ سالہ ملازمت کے دوران آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے نمبر سات کا چناؤ نہیں کیا۔''

اس نے میرے داخلے کے کارڈ پر سیٹ نمبر لکھا اور اسے میرے باقی کاغذات کے ساتھ واپس کرتے ہوئے پہلی مرتبہ اپنی انگوری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے یہ نظر اس وقت تک کے لئے ایک سہارا محسوس ہوئی کہ جب میں اس حسین مجسم کو دوبارہ دیکھ سکوں۔ تبھی اس خاتون نے مجھے بتایا کہ ائر پورٹ بند کر دیا گیا ہے اور تمام پروازیں ملتوی کر دی گئی ہیں۔

''کب تک کے لئے؟''

''یہ خدا ہی جانے'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آج صبح ہی ریڈیو پر بتایا جا رہا تھا کہ یہ سال کا بدتر برفانی طوفان ہوگا۔''

اس نے غلط کہا تھا۔ یہ اس صدی کا بدتر طوفان ثابت ہوا۔

تاہم درجۂ اول کی اس انتظار گاہ میں گملوں کے تازہ گلاب بہار کی نوید سنا رہے تھے، حتیٰ کہ بانسری کے سُروں والی موسیقی بھی اپنے تخلیق کاروں کی توقع کے عین مطابق ایک عجیب پُر ہیبت سکون بخش احساس دے رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ ایسا ماحول ہی اس حُسنِ مجسم کے لئے مناسب پناہ گاہ ہو سکتا ہے اگرچہ میں اپنی اس حرکت پر حیران بھی تھا پھر بھی میں نے اس کو دوسری انتظار گاہوں تک میں نے تلاش کیا مگر زیادہ تر لوگ حقیقی دنیا سے تعلق رکھنے والے ایسے مرد تھے جو انگریزی اخبار پڑھ رہے تھے جب کہ ان کی بیویاں شیشوں سے پار برف میں کھڑے ساکن جہازوں پر نظریں جمائے کسی اور کی سوچوں میں گم تھیں۔ دوپہر تک بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہ بچی اور گرمی اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ میں تازہ ہوا کے لئے وہاں سے نکل آیا۔

باہر میں نے ایک حیران کن نظارہ دیکھا۔ ہر قسم کے لوگ انتظار گاہوں میں جمع ہو چکے تھے اور تنگ برآمدوں حتیٰ کہ سیڑھیوں میں بھی اپنے جانوروں، بچوں اور سامان سمیت آرام کر رہے تھے۔ شہر سے رابطہ بھی منقطع ہو چکا تھا اور شفاف شیشوں کا وہ محل طوفان میں پھنسے ہوئے ایک بڑے سے خلائی جہاز سے مشابہ محسوس ہوتا تھا۔ میں یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ وہ حسنِ مجسم بھی یہیں کہیں اس ہجوم میں موجود ہوگا۔ اس خیال نے مجھے انتظار کا نیا حوصلہ بخشا۔

دوپہر کے کھانے تک سب جان گئے تھے کہ وہ پھنس گئے ہیں۔ سات کے سات ریستوران، کیفے ٹیریا اور پرہجوم شراب خانوں کے باہر نہ ختم ہونے والی قطاریں تھیں اور تین گھنٹے سے بھی کم وقت میں ان سب کو بھی بند کرنا پڑا کیوں کہ کھانے پینے کی کوئی چیز نہ بچی تھی۔ بچوں نے، کہ جو ایک لمحے کے لئے تو دنیا جہان کے تمام بچے محسوس ہوتے تھے، اکٹھے رونا شروع کر دیا اور ہجوم میں جانوروں کے ریوڑ کی طرح کی بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ جبلت سے کام لینے کا وقت تھا۔ اس سب دھکم پیل میں وہ واحد چیز جو میں کھانے کے لئے حاصل کر سکا وہ بچوں کے لئے مخصوص دکان سے ونیلا آئس کریم کے آخری دو کپ تھے۔ گاہکوں کے جانے کے بعد ویٹر کرسیوں کو میزوں پر الٹا کر رکھ رہے تھے جب کہ میں گتے کے اس کپ اور چمچ کو ہاتھ میں پکڑے، آئینے میں اپنے اوپر نظریں جمائے اور اس حُسنِ مجسم کے بارے میں سوچتے ہوئے کاؤنٹر پر کھڑا آہستہ آہستہ کھاتا رہا۔

صبح گیارہ بجے کے لئے نیویارک کی پرواز اس رات آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ جب تک کہ میں جہاز پر سوار ہونے میں کامیاب ہوا، درجہء اول کے دوسرے مسافر پہلے ہی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ایک فضائی مہمان دار نے میری نشست تک میری رہ نمائی کی۔ میرا دل رُک سا گیا۔ میری نشست کے ساتھ کھڑکی کی طرف وہی حسنِ مجسم ایک تجربہ کار مسافر کی طرح اپنی نشست سنبھال رہی تھی۔ میں نے سوچا، ”اگر میں نے کبھی اس بارے میں لکھا تو کوئی میرا یقین نہیں کرے گا۔“ میں محض ایک ہکلاہٹ آمیز، غیر یقینی سلام ہی کر سکا کہ جسے اس نے سنا ہی نہیں۔

ہر چیز اس کی مناسب جگہ پر ترتیب سے رکھتے ہوئے اور اپنی نشست کو ایک مکمل گھر کی طرح ترتیب دے کر کہ جہاں ہر چیز پہنچ میں تھی وہ اس طرح سے نشست سنبھالے بیٹھی تھی جیسے کہ اس نے وہاں سالوں رہنا ہو۔ اسی دوران میں ایک فضائی مہمان دار ہمارے لیے شیمپین لے آیا۔ میں نے اسے پیش کرنے کے لئے ایک گلاس اٹھایا مگر عین وقت پر رک گیا کیوں کہ وہ صرف سادہ پانی چاہتی تھی۔ پھر اس نے اس فضائی مہمان دار سے، پہلے تو غیر واضح فرانسیسی اور پھر کسی حد تک

رواں انگریزی میں کہا کہ خواہ کوئی بھی وجہ ہو پرواز کے دوران اسے زحمت نہ دی جائے۔ اس کی بھرپور قسم کی سنجیدہ آواز میں مشرق کی اداسیت کی آمیزش تھی۔

جب وہ پانی لے کر آیا تو اس نے میک اپ بکس کو کہ جس کے کونے دادی ماں کے صندوقچے کی طرح تانبے جڑے تھے، اپنی گود میں رکھا اور ایک ڈبیا سے کہ جس میں مختلف رنگ کی کئی گولیاں تھیں، دو سنہری گولیاں کھا لیں۔ وہ ہر کام کچھ اس طور لگے بندھے اور منظم انداز میں کرتی تھی کہ جیسے اپنی پیدائش سے آج تک اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا ہو۔ بالآخر اس نے کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا، اپنی نشست کی پشت آخری حد تک پیچھے لے گئی، جوتے اتارے بغیر کمر تک کمبل کھینچ لیا، چہرے پر نیند کے لئے مخصوص خول چڑھایا، میری طرف پشت کی اور نیویارک کی اس پرواز کے آٹھ طویل گھنٹوں اور بارہ منٹوں تک بغیر کسی وقفے، آواز یا حالت کی تبدیلی کے مسلسل سوتی رہی۔

یہ ایک بھرپور سفر تھا۔ میں نے ہمیشہ سے اس بات میں یقین رکھا ہے کہ فطرت میں ایک خوب صورت خاتون سے زیادہ کچھ بھی خوب صورت نہیں۔ اس روز میرے لئے اپنے نزدیک سوئی اس دیو مالائی مخلوق کے سحر سے ایک لمحے کے لئے بھی نکلنا ناممکن ہو گیا۔ جیسے ہی جہاز اڑا وہ فضائی میزبان چلا گیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا میزبان آ گیا جس نے ایک چھوٹا سا میک اپ باکس اور موسیقی سننے کے لئے ہیڈ فون دینے کے لئے اُس حسنِ مجسم کو جگانا چاہا۔ میں نے اس کے ساتھی میزبان کو دی گئی اس کی ہدایات کو دہرا دیا مگر وہ اُس حسنِ مجسم کے اپنے ہونٹوں سے سننے پر مُصر تھا کہ وہ رات کا کھانا بھی نہیں کھانا چاہتی۔ بالآخر اس کے ساتھی میزبان نے ہی اس کی ہدایات کی تصدیق کی مگر پھر بھی اس نے جتا ہی دیا کہ اس حسنِ مجسم نے ''پریشان مت کریں'' کا چھوٹا سا گتے کا ٹکڑا اپنی گردن میں نہیں ڈالا ہوا تھا۔

میں نے اپنے آپ سے وہی باتیں کرتے ہوئے جو اس کے جاگتے ہونے کی صورت میں اس سے کرتا، تن تنہا ہی کھانا کھایا۔ اس کی نیند اس قدر بھرپور تھی کہ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خوف ناک خیال بھی آیا کہ جو گولیاں اس نے کھائی تھیں وہ سونے کے لئے نہیں بلکہ مرنے کے لئے تھیں۔ مشروب کے ہر جام کو بلند کرتے ہوئے میں نے اس حسنِ مجسم کے لئے جامِ صحت تجویز کیا۔

جب کھانے کا دور ختم ہو گیا تو روشنی مدھم کر دی گئی اور ایک فلم دکھائی جانے لگی جسے شاید کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں اس تاریک دنیا میں اکیلے تھے۔ اس صدی کا بدتر طوفان تھم چکا

تھا اور بحرِ اوقیانوس کی رات طویل اور روشن تھی۔ طیارہ ستاروں کے درمیان ساکن محسوس ہوتا تھا۔ پھر میں نے گھنٹوں اس کے تمام جسم کا مشاہدہ کیا۔ زندگی کا واحد نشان جو میں اس میں پا سکا خوابوں کے وہ سائے تھے جو پانی پر بادلوں کے عکس کی طرح سے اس کے ماتھے پر سے گزر رہے تھے۔ اس کی گردن میں ایک زنجیر سی تھی جو اس قدر باریک تھی کہ اس کی سنہری جلد پر بہ مشکل دکھائی دیتی تھی۔ اس کے خوب صورت کان چھدے ہوئے نہ تھے۔ اس کے ناخنوں میں صحت مند انہ گلابی پن تھا اور اس کے الٹے ہاتھ میں ایک سادہ سی انگوٹھی تھی۔ چوں کہ وہ بیس برس سے زائد کی دکھائی نہیں دیتی تھی میں نے اپنے آپ کو اس خیال کے تحت تسلی دی کہ یہ شادی کی انگوٹھی نہیں بلکہ عارضی بندھن کی نشانی ہے۔

میں نے شیمپین کی جھاگ والی سطح کو دیکھتے اور جیرارڈو ڈیگو کے خوب صورت گیت کو دوہراتے ہوئے سوچا۔ ''میں تمہاری قطع تعلقی کے تعلق کے ساتھ یہ سوچ کر پُر یقین، مطمئن اور پُر امید ہوں کہ تم میرے بھینچے ہوئے بازوؤں کے اس قدر نزدیک سو رہی ہو۔'' پھر جب میں نے اپنی نشست کی پشت اس کی نشست کے برابر تک پیچھے کی تو ہم ایک شادی شدہ جوڑے سے کہیں نزدیک ایک دوسرے کے برابر لیٹے ہوئے تھے۔ اس کے سانسوں کی خوش بو بھی اس کی آواز جیسی ہی تھی اور اس کی جلد سے ایسی دل آویز مہک آتی تھی جو صرف اس کے حُسن کی خوش بو ہی ہو سکتی تھی۔ یہ سب نا قابلِ یقین سا لگتا تھا۔ پچھلی گرمیوں میں میں نے کیوٹو کے ان قدیمی بورژوا طبقوں کے بارے میں یاسوناری کوابتہ کا ایک خوب صورت ناول پڑھا تھا جو شہر کی خوب صورت ترین لڑکیوں کا برہنہ بے ہوشی کے عالم میں رات بھر نظارہ کرنے کے لئے بڑی بڑی رقوم ادا کرتے اور خود بھی اسی بستر پر پیار کی شدت سے تڑپتے رہتے۔ وہ انہیں نہ تو جگا سکتے تھے اور نہ ہی چھو سکتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کے لیے کوشش بھی نہ کرتے تھے۔ کیوں کہ ان کے لئے انہیں سوتے میں دیکھنا ہی اصل لذت تھا۔ اس رات جب کہ میں اس حسنِ مجسم کو سوتے ہوئے دیکھتا رہا میں نہ صرف اس ضعیف العمری کی سوچ والی نفاست کو سمجھ گیا بلکہ اس سے بھر پور لطف بھی اٹھایا۔

شیمپین نے میرے اندر کے جھوٹ کو دو آتشہ کر دیا تھا اور میں نے سوچا۔ ''کس نے یہ سوچا ہوگا کہ میں آج کے زمانے میں ایک قدیم جاپانی بن جاؤں گا۔''

میرا خیال ہے کہ شیمپین اور فلم کی آوازوں کے زیرِ اثر میں گھنٹوں سوتا رہا۔ جب میں جاگا تو میرا سر پھٹ رہا تھا۔ میں غسل خانے تک گیا۔ میری نشست سے دو نشستیں پیچھے گیارہ سوٹ

گیسوں والی خاتون میدان جنگ میں پڑی بے آسرا لاش کی طرح سے ایک عجیب بے ہنگم انداز میں سوئی پڑی تھی۔ رنگین موتیوں کی لڑی والا اس کا مطالعے کا چشمہ نشستوں کے درمیانی راستے کے عین وسط میں گرا پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر واپس اس کی گود میں نہ رکھ کر میں نے ایک عجب بغض آمیز خوشی محسوس کی۔

جب میں شیمپین کی باقیات کے بوجھ سے نجات پا چکا تو میری نظر آئینے میں اپنے بد صورت و قابل نفرت عکس پر پڑی۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ محبت کی لائی ہوئی تباہی اس قدر خوف ناک بھی ہوسکتی ہے۔ جہاز نے اچانک بلندی کم کی، دوبارہ بحال کی اور پوری رفتار سے چلتا رہا۔ ''اپنی نشست پر واپس پہنچیں۔'' کا اشارہ جل اٹھا اور میں اس امید کو لئے تیزی سے باہر لپکا کہ ہوسکتا ہے خدائی آفت ہی اُس حسنِ مجسم کو جگا دے اور پھر اسے اپنے خوف پر قابو پانے کے لئے میری ہی بانہوں میں پناہ لینا ہوگی۔ اپنی جلدی میں مَیں نے ولندیزی خاتون کے چشمہ پر پاؤں تقریباً رکھ ہی دیا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو مجھے خوشی ہوتی مگر میں واپس پلٹا، چشمہ اٹھایا اور اپنے سے پہلے سیٹ نمبر ۴ نہ چننے پر اس کے لئے امڈنے والے احساس تشکر کے ساتھ چشمہ اس کی گود میں رکھ دیا۔

حسنِ مجسم کی نیند ناقابلِ شکست رہی تھی۔ جب پرواز ہم وار ہوگئی تو مجھے کسی نہ کسی طور جھنجھوڑ کر اسے اٹھانے کی اپنی خواہش کو دبانا پڑا کیوں کہ اس پرواز کے آخری گھنٹے میں اس کی ناراضگی کی قیمت پر بھی میں اسے جاگتے دیکھنا چاہتا تھا تاکہ میں اپنی آزادی بحال کرسکوں اور شاید اپنی جوانی بھی لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ میں نے شدید غصے کے عالم میں اپنے آپ سے کہا۔'' دفع کرو! میں Taurus پیدا کیوں نہیں ہوا تھا۔''

جب اتران کے وقت روشنیاں جلیں تو وہ خود بہ خود ہی جاگ گئی۔ وہ اتنی ہی خوب صورت اور تر و تازہ تھی جیسے کہ وہ کسی گلاب باغ میں سوئی رہی ہو۔ اس وقت مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ بوڑھے شادی شدہ جوڑوں کی طرح ہوائی جہازوں کی قریبی نشستوں پر بیٹھے لوگ بھی جاگنے پر ایک دوسرے کو صبح بخیر نہیں کہتے۔ اس نے بھی ایسا کچھ نہیں کیا۔ بس اپنے چہرے والا خول اتارا، اپنی چمک دار آنکھیں کھولیں، نشست کی پشت سیدھی کی، کمبل ایک طرف کیا، اپنے بالوں کو ہلایا جو خود بہ خود اپنی جگہ پر سیدھے ہوگئے۔ میک اپ بکس اپنے گھٹنوں پر رکھا اور تیزی سے ایک غیر ضروری قسم کا سنگھار کیا۔ اس سب عمل میں تقریباً اتنا ہی وقت لگا کہ دروازہ کھلنے تک اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ پھر اس نے جنگلی بلی کی کھال سے بنی اپنی جیکٹ پہنی اور جب اس کا

قدم تقریباً مجھ پر پڑ ہی گیا تو خالص لاطینی امریکی ہسپانوی لہجہ میں محض رسمی سی معذرت کی اور پھر مجھے خدا حافظ کہے بغیر یا کم از کم اس سب کے لئے میرا شکریہ ادا کئے بغیر کہ جو کچھ میں نے اس رات کو خوش گوار بنانے کے لئے کیا تھا، چل دی اور نیویارک کے ایمیزون جنگل میں غائب ہو گئی۔



(مشمولہ: ''سطور''، ملتان، بیکن بکس، شمارہ نمبر ۳، ۲۰۰۱ء)

سگِ نیلگوں کی آنکھیں

ترجمہ: ناصر بغدادی

پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سوچا وہ پہلی مرتبہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب وہ چراغ کے دوسری طرف مڑی تو میں نے اپنی پشت، اپنے کندھوں کے اوپر اس کی چکنی، پھسلتی نظروں کی تھپتھپاہٹ کو بے اختیار محسوس کیا۔ تب مجھے لگا کہ اس کی بجائے در حقیقت یہ میری نظریں تھیں جو اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میں نے آہستہ سے سگریٹ سلگائی اور زور زور سے کش کھینچنے لگا۔ اس وقت میں کرسی کے اندر دھنسا ہوا کرسی کو ادھر اُدھر گھما رہا تھا اور پچھلے پیروں کی وجہ ہی سے کرسی کا سارا توازن برقرار تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کو اسی جگہ کھڑے دیکھا اور عین اسی لمحے جیسے ایک غیر مانوس احساس نے میرے اندر جنم لیا ہو۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ تو ہر رات اسی جگہ، اسی زاویے سے میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہمارے درمیان چند ثانیوں تک اس صورتِ حال، اِس واردات کی ناقابلِ بیان لذت برقرار رہی۔ میں اب بھی کرسی کے پچھلے پیروں پر توازن قائم رکھ کر اُس کی جانب دیکھتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف وہ چراغ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھے خاموشی کے ساتھ کھڑی مجھ کو تکتی جا رہی تھی اور تب یکا یک مجھے معمول کی وہ بات یاد آگئی تو میں نے اس سے کہا: ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' اُس نے چراغ پر سے اپنا ہاتھ اٹھائے بغیر جواباً کہا۔ ''ہاں وہ۔ ہم اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔'' وہ جیسے اپنے حصار کے چنگل سے باہر نکل آئی تھی۔ آہستہ سے سانس بھرتی ہوئی بولی۔ ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں۔'' میں نے ہر جگہ یہی کچھ لکھ رکھا ہے۔

میں نے اُس کو سنگھار میز کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر چند لمحوں بعد آئینے کے

مدّور شیشے میں اس کا سراپا ابھر آیا تھا۔ اس وقت بھی وہ میری طرف سے بالکل غافل نہیں تھی۔ اسی حالت میں اس نے ایک چھوٹا سا صندوقچہ کھولا۔ پھر میں نے اس کو ناک پر پاؤڈر لگاتے ہوئے دیکھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے صندوقچے کو پھر سے بند کیا اور سنگھار میز پر رکھ کر دوبارہ چراغ کے قریب آ گئی۔

''میں محسوس کر رہی ہوں کہ کوئی پھر اپنے خواب میں اس کمرے کو دیکھ کر میرے سارے راز فاش کر رہا ہے۔'' یہ بات اس نے خاموشی سے کہی اور چلتی ہوئی پھر چراغ کے پاس آ گئی۔ اب چراغ کے تھرتھراتے شعلے کے اوپر اس کا پھیلا ہوا ہاتھ تھرتھرا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''کیا تم ٹھنڈک محسوس نہیں کرتے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بعض اوقات۔'' یہ سُن کر اس نے فوری کہا۔ ''تمہارا اس وقت ٹھنڈ محسوس کرنا بے حد ضروری ہے۔'' اور تب مجھے خیال آیا کہ میں کرسی پر بیٹھا کیوں خود کو تنہا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ یہ سردی ہی تھی جس نے میری تنہائی کو تیقن کے احساس سے ہمکنار کر دیا تھا۔

''ہاں'' اب میں محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے اس نے کہا۔ ''مگر یہ عجیب سی بات ہے کہ آج کی رات خاموش خاموش سی ہے۔'' میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھر سنگھار میز کی طرف چلی گئی ہے۔ میں نے اپنی کرسی کو یوں زور سے گھما دیا کہ اب میری پشت اس کی جانب ہو گئی تھی۔ اس کو بنا دیکھے بھی میں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ پھر مدّور شیشے کے آگے بیٹھ گئی ہے۔ مجھے علم تھا کہ اس کی نظروں کا مرکز میری پشت ہے جس کا بھرپور انعکاش شیشے میں اتر آیا تھا۔ اس کی تیز نگاہوں کی گرفت سے یوں بھی میرے وجود کا کوئی حصہ آزاد نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ میری پشت کو دیکھتے ہوئے بھی میرے چہرے کے راستے میرے باطن میں اتر سکتی تھی۔ اب پھر اس کے دونوں ہاتھوں میں تحرک سا پیدا ہو گیا۔ وہ آئینے میں مختلف زاویوں سے خود کو دیکھتی رہی اور اسی دوران اس کے ہونٹوں کا رنگ گہرا ارغوانی ہو کر رہ گیا۔ میرے سامنے جو ہموار دیوار کھڑی تھی، اس کی حیثیت ایک اور کور شیشے جیسی تھی جس میں جھانک کر بھی میں اس کا دیدار نہیں کر سکتا تھا مگر اپنے باطن کی کسی بے کراں مگر بے نام قوت کو بروئے کار لا کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ میرے پیچھے کہاں کھڑی ہے اور کیا کر رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس وقت میرے سامنے کی دیوار میرے تمثال دار آئینے کا کام انجام دے رہی تھی۔ میری سوچ، میرے گیان دھیان نے بنا دیکھے ہی میرے نگار خانے میں اس کے جلوؤں کی رونقوں کو دوبالا کر دیا تھا۔

''میں اس حالت میں بھی، بنا دیکھے، تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔'' میں نے اس سے کہا اور عین اسی لمحے میں نے سفید ہموار دیوار پر دیکھا کہ اس نے پلکوں کی چلمن کو اٹھا دیا ہے۔ اب وہ بڑے غور سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میری پشت اس کی طرف ہونے کے باوجود وہ اپنے تمام تر وجود کی تجلیوں کو میرے سامنے بکھیرنے کے عمل میں مصروف نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں کے چہرے دو مخالف سمتوں میں تھے مگر یوں لگ رہا تھا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ایک دوسرے کے چہرے کے جذباتی ردعمل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک بار پھر اس کی آنکھیں جھک گئی ہیں اور وہ مسلسل اپنی انگیا کو تکے جا رہی ہے۔ اس نے بتایا چونکہ میری پشت اس کی طرف ہے اس لئے اس نے بھی اپنی نگاہیں جھکا لی ہیں۔ اس کی بات سنتے ہی میں کرسی کو گھما کر معکوس پوزیشن میں لے آیا۔ میں نے سگریٹ کو مضبوطی کے ساتھ ہونٹوں میں دبا رکھا تھا، جب میں اس کے مقابل آ گیا تو وہ شیشے سے ہٹ کر چراغ کے قریب آ گئی۔ اب اس کے دونوں پھیلے ہوئے ہاتھ چراغ کے بلند شعلے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ شاید یہ گرم آگ پر سینکنے کا نتیجہ تھا کہ اس کے لانبے، گہرے سرخ رنگ کے ناخنوں کی طرح اس کا سرخ چہرہ بھی اور زیادہ روشن اور تابندہ ہو گیا۔

''لگتا ہے میں بھی سردی کا شکار ہو گئی ہوں۔'' وہ آہستہ سے منمناہٹ کے انداز میں بولی۔

''میرے خدا یہ شہر تو اچھا خاصا ایک برف خانہ ہے۔'' اس کی آواز کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور اس کے جلد کی رنگت بھی بدل گئی۔ اس کے تانبے جیسی جلد اب دہکتے ہوئے شعلے کی طرح سرخ ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا وہ یکا یک اداس اداس سی نظر آنے لگی ہے۔

''کچھ کرو خدا کے لیے کچھ کرو'' اس نے کہا اور اپنے جسم پر سے لباس اتارنا شروع کر دیا۔ ابتدا انگیا سے ہوئی اور پھر یکے بعد دیگرے جسم سے لپٹی ہوئی ہر چیز اترتی چلی گئی۔

''میں اپنا پورا چہرہ دیوار کی طرف کر لوں گا۔'' میری بات پر اس نے فوری جواب دیا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں کہ ہر جہت سے تم مجھے دیکھ لو گے جیسا کہ کچھ دیر پہلے اپنی پشت میری طرف کر کے تم میری نقل و حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔'' میں نے دیکھا کہ چند ثانیوں میں وہ مادر زاد برہنہ ہو چکی ہے اور چراغ کا کپکپاتا شعلہ اس کی تانبے جیسی جلد کو چاٹنے میں مصروف ہو گیا ہے۔

''میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ تم کو اس حالت میں دیکھوں۔ تمہارے ناف کے اطراف کی جلد پر گڑھوں کا ایک جال سا پھیل جائے اور دیکھنے والے کو لگے کہ تمہاری خوب پٹائی

ہوئی ہے۔'' اس سے پیشتر کہ اس کی برہنگی کا نظارہ دیکھتے ہوئے مجھے اپنے الفاظ کی پامالی اور بے ڈھنگے پن کا احساس ہوتا، وہ چراغ کے شعلے کے عین سامنے مجسمے کی طرح جامد اور غیر متحرک حالت میں کھڑی ہوگئی۔

''کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے دھات کے سانچے میں ڈھل کر میرا جسمانی وجود مکمل ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر چند لمحوں کے لیے اس نے خاموشی سادھ لی۔ میں نے دیکھا کہ شعلے پر رکھے اس کے دونوں ہاتھوں کے انداز میں بھی تھوڑی سی تبدیلی آ گئی ہے۔

''بعض اوقات میں نے دوسرے خوابوں میں تمہیں ایک ایسے کانسی کے مجسمے کے روپ میں دیکھا ہے جس کو میوزیم کے ایک کونے میں رکھ دیا گیا ہے۔'' میری آواز پُرسکون تھی۔ ''شاید یہی وجہ ہے کہ تم اس قدر سرد ہو چکی ہو۔'' میری بات سن کر وہ بولی۔ ''کبھی کبھی جب میں بائیں کروٹ پر سوتی ہوں تو لگتا ہے میرا بدن اندر سے کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے اور میری جلد پھیل کر پلیٹ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ایسے موقعوں پر خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرے شکم کے دروازے پر دستکیں دے رہا ہے۔ بستر میں تانبے کے کوٹنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ سب کچھ ایسا ہی ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ ورق دار دھات۔'' وہ چراغ کے کچھ اور قریب آ گئی

''میں تمہارے اندر کی اس آواز کو سننا پسند کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''اگر ہم دونوں کبھی یکجا ہوئے اور میں بائیں کروٹ پر سو گئی تو تم میری پسلیوں پر اپنے کان رکھ کر سن سکتے ہو۔'' وہ بولی ''تم محسوس کرو گے کہ میں اپنے اندر گونج پیدا کر رہی ہوں۔ میں نے بار بار خواہش کی ہے کہ تم ایسا کر کے دیکھو۔ میں نے دیکھا کہ وہ بات کرتے ہوئے یوں گہری گہری سانسیں بھرتی جا رہی ہے جیسے اس کا نظام تنفس بے قابو ہوتا جا رہا ہو۔۔۔۔ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ اسی گفتگو کا حصہ تھا جو وہ برسوں سے مجھ سے کرتی آ رہی تھی۔ مگر تا حال اس نے اس کے برعکس کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا یا بالفاظ دیگر اٹھانے سے قاصر رہی تھی۔ اس کی زندگی کا ایک خاص مشن تھا جس کے لیے وہ خود کو وقف کر چکی تھی۔ اس خاص مشن کا تعلق میری اپنی ذات سے تھا کہ وہ چلتی پھرتی حقیقی زندگی میں مجھ کو ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' والے قابلِ شناخت فقرے کے حوالے سے دریافت کرنے اور حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ اپنے اس خاص مقصد کے حصول کے سلسلے میں اب یہ فقرہ اس کی زبان کا وظیفہ بن چکا تھا۔ جن راستوں سے بھی اس کا گزر ہوتا وہ بہ آوازِ بلند اس مخصوص فقرے کی قرآت میں مصروف ہو جاتی تاکہ لوگوں کے

اژدہام میں اس یکتا و تنہا شخص کی بازیافت ممکن ہو سکے جو اس کے باطن کی تہہ نشیں صورت حال سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کو ہجوم سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس جملے یا فقرے کو لگا تار دہرانے کے عمل سے گزارنے کا مطلب صرف اور صرف اس واحد شخص کی تلاش تھی جس کو اس فقرے سے وابستہ تمام جزئیات کا ادراک تھا مگر وہ شناسا اجنبی اس کی زندگی کے کس راستے پر مل سکتا تھا، یہ بات خود اس کو معلوم نہیں تھی۔

اس نے مزید بتایا کہ اس کی یہ تلاش اس کو نہ معلوم کہاں کہاں بھٹکنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب وہ ریستورانوں میں جاتی ہے تو آرڈر لکھوانے سے پہلے ویٹروں سے کہتی ہے، ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' اور تب ویٹرز تعظیم و تکریم سے اس کے آگے اپنے سر کو جھکا دیتے ہیں مگر انہیں یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ان کے خوابوں میں یہ بات ان سے کہی گئی تھی۔ پھر وہ وہیں کاغذ کے رومالوں پر یہ فقرہ لکھ دیتی ہے اور میزوں کی وارنش کو کھرچ کر چاقو کے تیز پھل سے کندہ کر دیتی ہے۔ ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' جب بھی موقع ہاتھ آتا تو وہ بلا ہچکچاہٹ ہوٹلوں، اسٹیشنوں اور عوامی عمارتوں کی کھڑکیوں کے شیشوں پر اس مخصوص فقرے کو نمایاں کر دیتی۔ اس نے بتایا کہ ایک مرتبہ جب وہ ایک میڈیکل اسٹور میں داخل ہوئی تو ایک خاص قسم کی مانوس مہک نے اس کے سونگھنے کی قوت کو بری طرح چونکا دیا تھا۔ یقیناً یہ وہی مہک تھی جس کو اس نے مجھے اپنے خواب میں دیکھنے کے بعد اپنے کمرے میں پھیلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اور اس لمحے اسٹور میں کھڑے کھڑے اسے لگا کہ میں اس کے آس پاس، کہیں قریب ہی کھڑا ہوں۔ اس کا یہ یقین اس وقت ناقابلِ تسخیر ہو گیا جب اس نے میڈیکل اسٹور کے صاف و شفاف، چمچماتے ہوئے فرش پر نظر دوڑائی۔ اس نے اسٹور کے کلرک سے کہا۔ ''میں ہمیشہ ایک ایسے شخص کو خواب میں دیکھتی ہوں جو مجھ سے کہتا ہے ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں''۔ اس کا کہنا ہے کلرک اس بات سن کر بولا ''حقیقت تو یہ ہے محترمہ کہ آپ کی آنکھیں کچھ ایسی ہی ہیں۔'' اس نے کلرک سے مزید کہا۔ ''مجھے ہر حال میں اس شخص سے ملنا ہے جو میرے خوابوں میں یہ الفاظ کہتا ہے۔'' کلرک کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگاتا ہوا کاؤنٹر کے دوسرے کونے کی طرف چل دیا۔ وہ اس جگہ یوں کھڑی کی کھڑی رہ گئی جیسے زمین کی مقناطیسی طاقت نے اس کے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔ اس کی نگاہیں اب بھی شفاف، چمکدار فرش کو گھور رہی تھیں اور اس کے جسم کے ہر حصے کو اس مخصوص مہک نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اچانک نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے پرس سے ارغوانی لپ اسٹک نکالی اور فرش پر جا بہ جا نمایاں طور پر، ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' کا فقرہ لکھ دیا۔ کلرک نے واپس آ

کر یہ سب کچھ دیکھا تو غصے کی حالت میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اس سے کہا'' مادام! آپ نے فرش کے سارے ٹائلز کو کس قدر گندہ کر دیا ہے۔'' اس نے اس کے ہاتھ میں فرش صاف کرنے کا گیلا کپڑا تھما دیا اور تحکمانہ انداز میں '' اپنے کیے پر پانی پھیرنے'' کی ہدایت جاری کر دی۔۔۔۔ چراغ کے قریب اپنی سابقہ جگہ پر کھڑے کھڑے اس نے بتایا کہ ساری دوپہر وہ کیے کو اَن کیا کرنے کے عمل میں ذلیل و خوار ہوئی۔ وہ فرش کے ٹائلز کو صاف کرتے ہوئے بھی زور زور سے ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' کی مالا جپتی جاتی تھی۔ اسی دوران اس کے اردگرد بہت سارے لوگ جمع ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کوئی مخبوط الحواس عورت ہے۔

جب وہ گفتگو ختم کر چکی تو میں اب بھی میں ایک کونے میں کرسی کے اندر دھنسا خود کو ادھر اُدھر گھما رہا تھا۔

''ہر روز میں اس فقرے کو یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس کی مدد سے تم میری ہو سکتی ہو۔'' میں نے کہا'' ہر بار میں یہی سوچتا ہوں کہ کل ہر حالت میں وہ فقرہ مجھے یاد رہے گا۔ لیکن جب میں نیند سے بیدار ہوتا ہوں تو وہ فقرہ میرے حافظے سے بالکل ہی غائب ہو جاتا ہے جس کے دہرانے سے تم مجھے حاصل ہو سکتی ہو۔'' میری بات سن کر وہ بولی'' جن الفاظ کو تم بھول جاتے ہو ان کو تمہاری ہی قوت اختراع نے جنم دیا تھا، اور وہ بھی پہلے ہی دن۔'' میں نے جواباً کہا۔'' میں ان الفاظ کا بانی اس وقت ہی ہوا جب میں نے تمہاری آنکھوں کی گہرائی میں جھانکنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ میری مجبوری ہے کہ ''رات گئی بات گئی'' کے مصداق ہر اگلی صبح جاگنے پر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔'' وہ اب بھی چراغ کے قریب ہی کھڑی تھی۔ میری بات پر اس نے بھینچی ہوئی مٹھیوں کے ساتھ طویل سی سانس بھری اور بولی۔'' کاش تمہیں اس وقت اتنا تو یاد ہوتا کہ میں کس شہر میں بیٹھ کر تمہیں لکھتی رہی ہوں۔''

میں نے دیکھا اس کے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دانت چراغ کی روشنی میں دمک رہے ہیں۔'' اس وقت تم کو چھو لینے کو جی چاہتا ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ اب وہ چراغ کی بجائے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے اس کے بدن، اس کے ہاتھوں کی طرح اس کی آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی ہے اور میں کرسی پر جھولنے کے انداز میں بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔'' تم نے پہلے ایسا کبھی نہیں کہا تھا'' وہ بولی اور میں نے اسے جواب دیا۔'' لیکن اب میں تم سے کہہ رہا ہوں اور یہ سچ بھی ہے۔'' چراغ کی دوسری جانب سے اس نے مجھ سے ایک سگریٹ مانگا میں یہ بات بھی بھول چکا تھا کہ میں خود

بھی سگریٹ نوشی کر رہا تھا اور اس وقت بجھی ہوئی سگریٹ کا بچا کچھا حصہ میری انگلیوں کے درمیان دب کر تقریباً غائب ہو چکا تھا۔ وہ بولی ''لگتا تو عجیب سا ہے مگر میں یہ بات بھول چکی ہوں کہ کہاں بیٹھ کے میں نے یہ سب کچھ لکھا تھا۔'' میں نے اس سے کہا ''اس کی وجہ بھی وہی ہوگی جس کی بنا پر میں صبح جاگنے پر ان الفاظ کو بھول جاتا تھا۔'' میری بات سن کر وہ اداس سی ہوگئی اور بولی ''نہیں بس کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ وہ سب بھی محض ایک خواب ہی ہے۔'' میں کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور چہل قدمی کے انداز میں چراغ کے قریب آ گیا۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ میں نے ایک سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے سگریٹ کو ہونٹوں میں دبایا اور چراغ کے شعلے پر جھک سی گئی۔ مگر اس دوران مجھے ماچس کی تیلی جلانے کا موقع مل گیا۔ ''دنیا کے چند شہروں کی تمام دیواروں پر ان الفاظ کا لکھنا بے حد ضروری ہے۔ ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ ''اگر صبح آنکھ کھلنے پر مجھے یاد رہا تو میں تمہیں پا سکتا ہوں۔'' اس نے پھر اپنا سر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں کے درمیان دبی ہوئی سگریٹ کا ایک حصہ راکھ کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا ۔''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' اس نے آہ بھری۔ پھر شاید خیال آیا کہ سگریٹ اس کی ٹھوڑی پر جھک رہی ہے اور اسکی ایک آنکھ آدھی سے زیادہ بند ہو چکی ہے۔ اسی حالت میں اس نے سگریٹ کا کش چوسنے کے انداز میں کھینچا اور پھر سگریٹ کو ہونٹوں کے درمیان سے رہائی دلا کر اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان قید کر لیا۔ ''اب کیفیت کچھ بدل سی گئی ہے۔ مجھے گرمی محسوس ہونے لگی ہے۔'' بات کہتے ہوئے اس کا لہجہ بدل سا گیا تھا اور طرزِ عمل کی تبدیلی کو بھی میں محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ایسا لگا جیسے اس کی بجائے یہ بات کسی اور نے کہی ہو یا یہ کہ یہ بات وہ کاغذ پر لکھ کر چراغ کے شعلے کے قریب لے آئی ہو اور اس کی بجائے میں نے پڑھا ہو۔ ''مجھے گرمی سی محسوس ہو رہی ہے۔'' اس وقت اردگرد کی ہر چیز عجیب سی لگ رہی تھی اور میں اس کی بات کی گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔ کاغذ کا ٹکڑا جیسے شعلے کی زد میں آ گیا تھا اور اس کے الفاظ یکے بعد دیگرے جل کر خاکستری لبادہ اوڑھتے جا رہے تھے اور پھر جیسے سارا کاغذ جل گیا اور راکھ کا ڈھیر کسی ان دیکھی چھلنی میں سے چھن چھن کر فرش پر گرتا گیا۔ ''میرا خیال ہے یہ ٹھیک ہی ہوا۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''بعض مرتبہ تمہیں یوں چراغ کے قریب کپکپاتے ہوئے دیکھ کر میں ڈر سا جاتا ہوں۔''

ہم دونوں کی شناسائی اب کافی پرانی ہو چکی تھی۔ برسوں سے ہم ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ بعض اوقات ہم دونوں کی ملاقات کے درمیان باہر کوئی آواز پیدا کرتا تو ہم ہڑبڑا کر آنکھیں ملتے ہوئے جاگ پڑتے۔ آہستہ آہستہ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ ہماری دوستی، ہماری جان

پہچان چھوٹے بڑے واقعات سمیت خارجی عوامل کی رہین منت ہے، اور ان پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ بس ملاقاتوں کے دوران جب ہم دونوں کے احساسات ایک دوسرے میں جذب ہونے کی کوشش کرتے تو ایک معمولی سی آواز بھی خلل اندازی کا جواز بن کر صبح صادق سے کچھ پہلے ہم دونوں کو بیدار ہونے پر مجبور کر دیتی۔

اب وہ پھر چراغ کے قریب کھڑے ہو کر مجھے بڑے غور سے دیکھے جا رہی تھی، اس کی نگاہوں کے متعلق کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ماضی میں بارہا اس نے مجھے ایسی ہی نظروں سے دیکھا تھا۔ اور میں خواب کے ان مناظر میں ہمیشہ کرسی پر بیٹھا بے مقصد اپنی ٹانگیں ہلاتا ہوا اجنبی عورت کی خاکستری آنکھوں کے آگے ایک بے بس معمول بن کر رہ جاتا تھا۔ میں نے ایسے ہی ایک خواب میں پہلی مرتبہ اس سے پوچھا تھا کہ ''تم کون ہو؟'' اور اس نے جواب دیا تھا۔ ''مجھے یاد نہیں میں کون ہوں۔'' اس کی بات سن کر میں نے کہا تھا ''میرا خیال ہے ہم دونوں پہلے بھی مل چکے ہیں'' اور وہ لاتعلقی کے انداز میں بولی تھی۔ ''مجھے محسوس ہوتا ہے میں ایک مرتبہ خواب میں اسی کمرے کے اندر تمہیں دیکھ چکی ہوں۔'' اس کی بات سن کر میں نے کہا تھا ''ہاں یہی بات ہو سکتی ہے۔ اب مجھے یاد آنے لگا ہے۔'' اس پر وہ بول پڑی تھی۔ ''عجیب سی بات ہے مگر اب میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ہم دوسرے خوابوں میں مل چکے ہیں۔''

اس نے سگریٹ کے دو طویل کش کھینچے۔ میں ہنوز چراغ کے سامنے کھڑا تھا کہ اچانک اس کو تکنے کے انداز میں دیکھنے لگا۔ میں اس کے جسم کے اوپری اور پھر نچلے حصے کو دیکھتا گیا۔ وہ اب بھی تانبے کا ایسا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی جو بظاہر نہ تو سخت تھا اور نہ ہی نرم، بلکہ چمک دار، پیلے رنگ کا ملائم اور بے حد لوچ دار قسم کا۔۔۔۔ ''میں چاہتا ہوں تمہیں چھو کر دیکھوں۔'' میں نے دوبارہ اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بے ساختہ بول پڑی۔ ''یوں تم ہر چیز کو ختم کر دو گے۔'' مگر میرے اصرار کی شدت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ ''ایسا کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، دوبارہ ملاقات کے لئے ہم کو محض تکیے پر سر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔'' میں اپنے ہاتھ کو چراغ کے قریب لے آیا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت و صامت کھڑی رہی۔ ''تم اچھی بھلی ہر چیز کو برباد کر دو گے۔'' اس کی آواز نے ایک بار پھر مجھے خبردار کیا۔ ''ممکن ہے تمہارے ایسا کرنے سے ہم خوفزدہ حالت میں دنیا کے ایسے دور افتادہ حصے میں بیدار ہو جائیں جس کے متعلق ہمیں کچھ علم نہ ہو۔'' اس کی یہ بات سن کر بھی میں بضد رہا۔ ''بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' اور وہ بولی ''یہ سچ ہے بقول تمہارے کہ ہمیں دوبارہ ملنے کے لئے خاطر محض تکیے کو الٹا کر لیٹ جانے کی ضرورت ہے۔ مگر تم جاگو

گے تو ہر بات بھول چکے ہو گے۔'' میں کمرے کے دوسرے کونے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ وہ میرے پیچھے چراغ کے شعلے کی حرارت سے اپنے ہاتھوں کو گرمانے کی کوشش میں مصروف رہی۔ جب میں نے اس کی آواز سنی تو اس وقت بھی میں کرسی کے قریب نہیں تھا۔ وہ کہہ رہی تھی ''جب بھی آدھی رات کو میری آنکھ کھل جاتی ہے تو میں اپنے بستر پر کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہتی ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تکیے کی جھالر سے میرا گھٹنا جلنے لگا ہے اور میں اسی حالت میں صبح ہونے تک دہراتی جاتی ہوں۔''سنگِ نیلگوں کی آنکھیں''

میں دیوار کی طرف منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ ''صبح ہونے کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔'' میں اس کو دیکھے بغیر بول پڑا۔ اب بھی میں اسی پوزیشن میں کھڑا تھا۔ ''جب رات کے دو بجے تھے تو میں جاگ رہا تھا اور یہ ایک عرصے قبل کی بات معلوم ہوتی ہے۔'' اب میں دروازہ کے قریب کھڑا ہو چکا تھا۔ جب میں نے دروازے کا گول دستہ ہاتھ میں پکڑا تو مجھے اس کی وہی غیر متغیر سی آواز سنائی دی۔ ''دروازہ مت کھولو۔'' وہ بولی۔ ''برآمدہ عجیب و غریب خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔'' اس کی بات سن کر میں نے اس سے دریافت کیا۔ ''تم یہ بات کیسے جانتی ہو؟'' اور اس نے جواب دیا ''کیوں کہ کچھ دیر قبل میں وہاں گئی تھی مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ میں بائیں کروٹ پر سو رہی ہوں تو میں فوراً وہاں سے واپس آ گئی۔'' اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھول دیا۔ مجھے چند قدم پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ سرد ہوا کا ایک لطیف جھونکا تر و تازہ سبزیوں کے کھیتوں اور بھیگے ہوئے میدانوں کی بو باس کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے پھر کچھ کہا تھا مگر میں نہیں سن سکا اور دروازے کو تھوڑا اور کھولتے ہوئے میں نے اس سے کہا ''میں نہیں سمجھتا کہ دروازے کے باہر کوئی برآمدہ ہے میں تو مضافاتی علاقے کی مخصوص بو باس سونگھ رہا ہوں۔'' وہ تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی اور شاید یکسوئی کے ساتھ اس نے میری بات کو سنا بھی تھا وہ بولی ''دروازے کے باہر جو کچھ ہے اس کا علم مجھے تم سے زیادہ ہے۔ اصلاً بات یہ ہے کہ باہر اس وقت ایک عورت دیہات کا خواب دیکھنے میں مصروف ہے۔'' اس نے شعلے کی تیز آگ پر سے اپنے بازو کو گزارا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی ''درحقیقت یہ وہ عورت ہے جو ہمیشہ دیہات میں زندگی گزارنا چاہتی تھی مگر اس کے لیے شہر چھوڑنا کبھی ممکن نہیں تھا۔'' مجھے یاد آنے لگا کہ میں نے اپنے کسی گزشتہ خواب میں اس عورت کو دیکھا تھا مگر اس وقت ادکھ کھلے دروازے کے پاس کھڑا میں جانتا تھا کہ آدھے گھنٹے کے دوران مجھے نیچے ناشتے کے لیے جانا ہی پڑے گا۔ میں نے اس سے کہا ''بہر حال اب مجھے یہاں سے جانا ہو گا تاکہ بستر پر جاگ سکوں۔''

''اچانک چند ثانیوں کے لیے ادھ کھلے دروازے کے باہر ہوا کا شور تیز ہو گیا۔ مگر پھر فوراً ہی ہر طرف سکوت پھیل چکا تھا۔ اس دبیز خاموشی میں ایک سوئے ہوئے شخص کے تنفس کی مخصوص آواز سنائی دینے لگیں جو ابھی ابھی بستر پر دراز ہو کر خوابِ خرگوش میں کھو گیا تھا۔ بھیگے ہوئے میدانوں کی طرف سے آنے والی ہوا بھی اب دم توڑ چکی تھی۔ اب بو باس کا بھی کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ ''کل میں تمہیں پہچان لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت پہچان لوں گا جب میں سڑک پر ایک عورت کو دیواروں پر فقرہ لکھتے ہوئے دیکھوں گا، ''سگِ نیلگوں کی آنکھیں'' میں نے اس کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ کو ابھرتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک ایسی عورت کی مسکراہٹ تھی جس کو ناممکن کی جستجو میں ناکام ہونے کے بعد ہتھیار ڈال دینا پڑا تھا۔ ''تم بھلا مجھے کیسے پہچان سکو گے جب دن میں جاگنے کے دوران تو تمہیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو چراغ پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر گالی گھٹا سی چھا گئی تھی۔ وہ بڑی مایوسی سے بولی۔ ''تم وہ واحد مرد ہو جس کو جاگنے کے بعد یاد ہی نہیں رہتا کہ اس نے کیا خواب دیکھا تھا۔''



(مشمولہ: ''بادبان''، کراچی، شمارہ نمبر ۸، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲ء)

قیلولہ

ترجمہ: خاقان ساجد

(مارکیز کولمبیا (لاطینی امریکہ) میں ۶ مارچ ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ کسی بھی مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ ۱۹۵۰ء سے وہ لاطینی امریکہ اور کئی دوسرے ملکوں کے جرائد و اخبارات کے ساتھ بطور صحافی منسلک رہا۔ اس نے ایڈیٹر سکرین رائٹر اور کاپی رائٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

گیبریئل گارسیا مارکیز عہد جدید کا عظیم ناول نگار اور کہانی کار ہے او رساری دنیا میں مقبول ہے۔ اس کے ہر ناول اور کہانی کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو میں بھی اس کی کئی کہانیاں اور ناول ترجمہ ہوئے ہیں۔ اس کا ناول ''تنہائی کے سو سال'' اس دور کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس کے ناولوں اور کہانیوں میں حقیقت اور صداقت کے ساتھ فنکارانہ انداز میں قوت متخیلہ کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ انسانی زندگی کی کشمکش کو بڑی فنکاری سے بیان کیا ہے۔ اس کے ہاں الیگوری، سرئیلزم اور عہد حاضر کی صداقت یک جان ہو جاتے ہیں۔ وہ نظریاتی اعتبار سے دنیا بھر کے محنت کشوں اور ناداروں کا حامی ہے۔ اس کی سیاسی تحریریں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ مارکیز بیسویں صدی کی اہم شخصیت بن گیا ہے۔

مارکیز کے اثرات عالمی ادب پر واضح طور پر محسوس کئے جا رہے ہیں۔
وہ بیسویں صدی کا ایک خلاق ترین کہانی کار اور ناول نویس ہے۔)
(گیبرئیل گارسیا مارکیز کے لئے مترجم کا تعارفی نوٹ)



ریل گاڑی ریتیلے پتھروں کی مرتعش سرنگ میں سے برآمد ہوئی اور کیلوں کے لامتناہی اور متناسب کاشت کئے ہوئے باغوں میں سے گزرنے لگی۔ ہوا زیادہ بوجھل ہو گئی اور اب انہیں سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ دھویں کا ایک دم گھونٹنے والا جھونکا گاڑی کے ڈبے کے اندر داخل ہوا۔ یہ گاڑی کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی تنگ سڑک پر کچے کیلوں سے لدی بیل گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سڑک سے پرے، غیر مزروعہ زمین پر، غیر یکساں فاصلوں پر قائم، دفتروں کی بجلی کے پنکھوں سے آراستہ عمارتیں، سرخ اینٹوں کے مکان اور بنگلے دکھائی دینے لگے تھے جن میں میزیں اور چھوٹی سفید کرسیاں گرد آلود کھجور کے پودوں اور گلاب کی جھاڑیوں کے درمیان چبوتروں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ابھی صبح کے گیارہ بجے تھے اور گرمی شروع نہیں ہوئی تھی۔

''بہتر ہے کہ کھڑکی بند کر دو۔'' عورت نے کہا۔'' تمہارے بالوں میں کالک بھر جائے گی۔''

لڑکی نے کوشش کی مگر زنگ کی وجہ سے کھڑکی ہل نہ سکی۔

گاڑی کے تیسرے درجے کے ڈبے میں صرف یہی دونوں مسافر تھیں۔ گاڑی کا دھواں لگاتار ڈبے کے اندر آ رہا تھا، اس لئے لڑکی کھڑکی کے پاس سے اُٹھ گئی۔ اپنا اسباب، جس میں کھانے کے سامان والی پلاسٹک کی تھیلی تھی اور اخبار کے کاغذوں میں لپٹا ہوا ایک گل دستہ، اس نے وہیں نشست پر رہنے دیا اور خود، کھڑکی سے دور، اپنی ماں کے سامنے والی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں سادہ اور غریبانہ ماتمی لباس پہنے ہوئے تھیں۔

لڑکی بارہ سال کی تھی اور پہلی بار ریل گاڑی کا سفر کر رہی تھی۔ عورت اتنی عمر رسیدہ تھی کہ اس کی ماں نہ لگتی تھی، اس کے پپوٹوں پر نیلی رگیں اُبھر آئی تھیں، اس کا جسم مختصر، نرم اور بے ڈھب تھا، اور لباس کسی پادری کے جبے کی وضع کا تھا۔ وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کی ٹیک مضبوطی سے کرسی کی پشت کے ساتھ لگا کر بالکل سیدھی بیٹھی تھی اور گود میں اس نے چمک دار نقلی چمڑے کا دستی تھیلا دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ تھیلے کا چمڑا کئی جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر

ایسے متقی لوگوں کی سی استقامت تھی جو غربت اور تنگ دستی کے عادی ہوں۔

بارہ بجے تک گرمی شدید ہو چکی تھی۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر، جس کے ساتھ کوئی قصبہ نہ تھا، پانی لینے کے لئے دس منٹ ٹھہری۔ باہر، باغوں کی پراسرار خاموشی میں، سائے زیادہ گہرے لگ رہے تھے۔ ڈبے کے اندر کی ہوئی ہوا میں کچھ چمڑے کی سی بو تھی۔ گاڑی نے رفتار نہ پکڑی۔ وہ دو باہم مشابہ اسٹیشنوں پر رکی جن کے اردگرد شوخ رنگوں والے لکڑی کے بنے گھر تھے۔ عورت سر جھکا کر اونگھنے لگی۔ لڑکی نے اپنے جوتے اتار دیئے۔ پھر وہ غسل خانے میں جا کر گل دستے پر پانی چھڑکنے لگی۔

جب وہ اپنی نشست پر واپس آئی تو اس کی ماں کھانا کھانے کے لیے اس کی منتظر تھی۔ اس نے پنیر کا ٹکڑا، مکئی کی آدھی روٹی اور ایک بسکٹ لڑکی کو دیا اور اپنے لئے بھی اتنی ہی مقدار میں کھانا پلاسٹک کی تھیلی میں سے نکالا۔ جس وقت وہ دونوں کھانا کھا رہی تھیں، گاڑی نے آہستہ رفتار سے لوہے کا ایک پل پار کیا اور ایک قصبے میں سے گزری جو کہ پہلے دو قصبوں جیسا ہی تھا، صرف اس کے چوک میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ شدید دھوپ میں ایک بینڈ شگفتہ سی دھن بجا رہا تھا۔ قصبے کے دوسرے سرے پر، جہاں باغ ختم ہوتے تھے، زمین خشک سالی کے سبب تڑخ چکی تھی۔

عورت نے کھانا ختم کیا۔

''جوتے پہن لو۔'' اس نے کہا۔

لڑکی نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جہاں سے گاڑی کی رفتار تیز ہونا شروع ہوئی تھی وہاں بے آباد زمین کے سوا کچھ نہ تھا تاہم اس نے بسکٹ کا ٹکڑا تھیلی میں رکھ دیا اور جلدی سے جوتے پہن لئے۔ عورت نے اس کے ہاتھ میں کنگھی تھما دی۔

''اپنے بال بھی ٹھیک کر لو۔'' اس نے کہا۔

جس وقت لڑکی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی، گاڑی نے سیٹی بجانا شروع کر دی۔ عورت نے اپنی گردن پر سے پسینا پونچھا اور انگلیوں پر لگی چکنائی کو صاف کیا۔ جب لڑکی بال سنوارنے سے فارغ ہوئی، گاڑی کسی قصبے کے مضافات میں سے گزر رہی تھی۔ یہ قصبہ پہلے تمام قصبوں سے بڑا تھا مگر ان سب سے زیادہ اداس بھی دکھائی دے رہا تھا۔

''اگر تمہیں کچھ اور کرنا ہے تو ابھی کر لو'' عورت نے کہا۔ ''بعد میں خواہ پیاس سے تمہارا دم نکل رہا ہو کسی کے گھر پانی کا گھونٹ تک نہیں پینا۔ اور یاد رکھو، رونا نہیں ہے۔''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ خشک اور گرم ہوا کا جھونکا، گاڑی کی سیٹی اور پرانے ڈبوں کی

کھٹا کھٹ کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ عورت نے پلاسٹک کی تھیلی میں کھانے کی چیزیں رکھ کر، اسے تہہ کر کے، اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ ایک لمحے کے لئے قصبے کا مکمل عکس، اگست کے اس روشن منگل کے دن، کھڑکی کی شیشے میں اُجاگر ہوا۔ لڑکی نے گل دستے کو اخبار کے گیلے کاغذوں میں لپیٹا اور کھڑکی سے تھوڑی دور کھڑی ہو کر اپنی ماں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ماں جواباً مسکرائی۔ گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ ہونے لگی، اور تھوڑی دیر بعد رک گئی۔

اسٹیشن پر کوئی نہ تھا۔ سڑک کی دوسری جانب، بادام کے درختوں کے سائے میں، صرف بلیرڈ ہال کھلا تھا۔ سارا قصبہ گرمی میں تیر رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر انہوں نے ویران اسٹیشن کو عبور کیا۔ اسٹیشن کے فرش کی ٹائلیں درمیان میں گھاس اُگنے سے پھٹ رہی تھیں۔ وہ دونوں دوسری جانب، سڑک کی سایہ دار سمت میں چلی گئیں۔

اس وقت تقریباً دو بجے کا عمل تھا اور غنودگی کے بوجھ تلے دبا ہوا قصبہ قیلولہ کر رہا تھا۔ دکانیں، دفتر، سکول، سب گیارہ بجے بند ہو جاتے تھے اور چار بجے سے پہلے، جب گاڑی واپس جاتی تھی، نہیں کھلتے تھے۔ صرف اسٹیشن کے سامنے والا ہوٹل، اپنے بلیرڈ ہال اور شراب خانے سمیت اور چوک کے ایک کونے میں واقع تار گھر دوپہر میں کھلے رہتے تھے۔ قصبے کے گھر، جن میں سے زیادہ تر بنانا کمپنی کے ماڈل کے مطابق ایک ہی وضع کے بنے ہوئے تھے، اندر سے بند تھے اور ان کے پردے گرے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض گھروں کے اندر اتنی گرمی ہوتی تھی کہ گھر کے باسی باہر آنگن میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ باقی لوگ اپنی کرسیاں بادام کے درختوں کے سائے میں، دیوار کے ساتھ ٹکا کر سڑک پر ہی قیلولہ کر لیا کرتے تھے۔

بادام کے درختوں کے پُر حفاظت سائے میں چلتے چلتے اور قیلولے میں خلل ڈالے بغیر، عورت اور لڑکی قصبے میں داخل ہوئیں۔ وہ سیدھی پادری کے گھر گئیں۔ عورت نے اپنے ناخن سے گھر کے باہر لوہے کے جنگلے کو کھرچا، پھر ایک لمحہ انتظار کرانے کے بعد دوبارہ یہی عمل دہرایا۔ اندر بجلی کا پنکھا گھوں گھوں کر رہا تھا، اور ماں بیٹی اندر سے آنے والی قدموں کی آہٹ کو بھی نہ سن سکیں۔ انہوں نے بہ مشکل دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ اور اس کے فوراً بعد کی محتاط آواز سنی، جو جنگلے کے قریب سے آئی تھی اور جس نے دریافت کیا تھا: ''کون ہے؟''

عورت نے جنگلے کے درمیان میں سے گھر کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔

''مجھے پادری سے ملنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ آرام کر رہے ہیں۔''

''معاملہ بہت ہنگامی نوعیت کا ہے۔'' عورت کی آواز میں ٹھہراؤ والا عزم تھا۔

دروازہ آواز پیدا کئے بغیر تھوڑا سا کھلا اور اندر سے بڑی عمر کی ایک فربہ عورت باہر آئی جس کے چہرے کی جلد پیلی اور سر کے بال فولاد کے رنگ کے تھے۔ موٹے شیشوں والی عینک کے عقب میں اس کی آنکھیں بہت چھوٹی لگ رہی تھیں۔

''اندر آ جاؤ۔'' اس نے کہا اور دروازہ پورا کھول دیا۔

وہ کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ اندر پرانے پھولوں کی بوبسی ہوئی تھی۔

وہ عورت انہیں ایک لکڑی کی بنچ کی طرف لے گئی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی تو بیٹھ گئی، مگر ماں، غیر حاضر سی، دونوں ہاتھوں میں تھیلے کو تھامے کھڑی رہی۔ بجلی کے پنکھے کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ گھر کے اندر کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر دروازے میں گھر والی عورت پھر نمودار ہوئی۔ ''وہ کہہ رہے ہیں کہ تین بجے کے بعد آنا'' اس نے دبی زبان میں کہا۔

''ابھی پانچ منٹ پہلے وہ سونے کے لیے لیٹے ہیں۔''

''گاڑی ساڑھے تین بجے واپس چلی جاتی ہے۔'' عورت نے کہا۔

یہ جواب مختصر تھا، لیکن وثوق اور خود اعتمادی سے دیا گیا تھا، اور جواب دیتے وقت عورت کا لہجہ خوش گوار اور دھیما تھا۔ گھر والی عورت پہلی بار مسکرائی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

جب کمرے کے دوسرے سرے پر دروازہ پھر بند ہو گیا تو عورت اپنی بیٹی کے نزدیک بیٹھ گئی۔ انتظار کا تنگ سا کمرہ غریبانہ، مگر نہایت صاف ستھرا تھا۔

لکڑی کے ایک کٹہرے نے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ کٹہرے کے دوسری جانب ایک سادہ سی میز تھی جس کے مومی میز پوش کے اوپر ایک قدیم طرز کا ٹائپ رائٹر گل دان کے نزدیک رہا تھا۔ ذرا دور مسیحی حلقے کے تمام کوائف رکھے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی غیر شادی شدہ عورت نے اس دفتر کا انتظام سنبھال رکھا ہو۔

سامنے والا دروازہ کھلا اور پادری اپنی عینک کے شیشے رومال سے صاف کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عینک پہن لینے پر ہی اس کی مشابہت سے ظاہر ہوا کہ دروازہ کھولنے والی عورت اس کی بہن تھی۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

"قبرستان کی کنجیاں!" عورت نے جواب دیا۔

لڑکی گود میں گل دستہ سنبھالے بیٹھی تھی اور بنچ کے نیچے اس کے پیر ایک دوسرے کو قطع کر رہے تھے۔ پادری نے اس کی طرف اور پھر عورت کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی کی لوہے کی جالی میں سے روشن اور بادلوں سے خالی آسمان کو دیکھ کر کہا:

"اس گرمی میں؟ سورج غروب ہونے کا انتظار کر لیا ہوتا۔"

عورت نے آہستگی سے سر ہلایا۔ پادری کٹہرے کے دوسری جانب چلا گیا۔

وہاں الماری میں سے اس نے ایک کاپی جس پر موی کاغذ چڑھا ہوا تھا، لکڑی کا قلم دان اور سیاہی کی دوات نکالی اور میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر اتنے بال تھے کہ سر پر بالوں کی کمی کی کافی حد تک تلافی ہو رہی تھی۔

"کس کی قبر پر جانا چاہتی ہو؟" پادری نے پوچھا۔

"کارلوس سانتیسنو" عورت نے جواب دیا۔

پادری کے پلے اب بھی کچھ نہ پڑا تھا۔

وہ چور جو پچھلے ہفتے یہاں مارا گیا۔" عورت نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں اس کی ماں ہوں۔"

پادری نے غور سے عورت کا جائزہ لیا۔ عورت نظریں جما کر پرسکون اعتماد کے ساتھ اسے دیکھتی رہی، حتیٰ کہ پادری جھینپ گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور لکھنے لگا۔ صفحہ بھرتے اس نے عورت سے کہا کہ اپنی شناخت کرائے۔ بغیر حیل و حجت کے عورت نے وضاحت اور تفصیل سے بات کی جیسے کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہی ہو۔ پادری کا پسینا بہنا شروع ہو گیا۔ لڑکی نے اپنے بائیں جوتے کا بکسوا کھولا اور ایڑی جوتے میں سے نکال کر بنچ کے نیچے لگی ہوئی لکڑی پر رکھ لی پھر دائیں پاؤں کے ساتھ یہی کیا۔

اس واقعے کا آغاز پچھلے ہفتے کے سوموار کو صبح کے وقت یہاں سے چند بلاک پرے ہوا تھا۔ بیوہ ربیکا نے جو عجیب اگڑم بگڑم چیزوں سے بھرے ہوئے گھر میں تنہا رہتی تھی، اس روز بوند اباندی کی آواز سے بلند، باہر سے کسی دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔ وہ اٹھی اور الماری میں سے ڈھونڈ کر ایک قدیم ریوالور نکالا، جسے کرنل اوریلیانو بوئندیا کے زمانے کے بعد سے کسی نے استعمال نہ کیا تھا۔ ریوالور لے کر، اور گھر کی بتیاں جلائے بغیر، وہ نشست کے کمرے میں آ گئی۔ اس کا یہ ردِعمل دروازے کے تالے کے کھولے جانے کی آواز کے باعث کم اور اس دہشت کی وجہ سے

زیادہ تھا جو اٹھائیس برسوں کی تنہائی نے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ اپنے ذہن میں اس نے نہ صرف دروازے کی جگہ کا، بلکہ تالے کی زمین سے اونچائی کا بھی قطعی حساب لگایا، اور دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑ کر آنکھیں بند کر کے گھوڑا دبا دیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی آتشیں ہتھیار چلایا تھا۔ دھماکے کے فوراً بعد اسے جست پر بارش کی کن من کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر اسے باہر انگنائی کے سیمنٹ والے فرش پر کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی اور کسی نے آہستہ سے، تلخی کے بغیر مگر سخت تھکے ہوئے لہجے میں ''ہائے ماں'' کے الفاظ ادا کیے۔ جو شخص اس صبح ربیکا کے گھر کے باہر مردہ پایا گیا (اس کی ناک کے پرخچے اڑ گئے تھے) اس نے فلالین کی رنگ دار دھاریوں والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کی پتلون روز مرہ والی تھی جسے اس نے پیٹی کے بجائے رسی سے باندھا ہوا تھا اور وہ ننگے پاؤں تھا۔ قصبے میں اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔

''تو اس کا نام کارلوس سانتیسو تھا؟'' پادری نے لکھنے کا کام ختم کر کے کہا۔

''سینتیسو نویالا'' عورت نے کہا۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔''

پادری دوبارہ الماری کی طرف چلا گیا۔ الماری کے دروازے کے اندر دو زنگ آلود بڑی کنجیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے سوچا جیسے کہ اس کی ماں نے اپنے لڑکپن میں سوچا تھا، اور جیسے کہ پادری نے بھی کسی نہ کسی وقت سوچا ہوگا، کہ وہ حضرت پطرس کی کنجیاں ہیں۔ پادری نے کنجیوں کو کیل سے اتارا، انہیں کٹہرے پر رکھی کھلی ہوئی کاپی کے صفحے پر رکھ کر اپنی شہادت کی انگلی سے صفحے پر ایک جگہ اشارہ کیا اور عورت سے کہا:

''یہاں دستخط کرو۔''

عورت نے تھیلے کو بغل میں دبا کر اپنا نام اس جگہ پر گھسیٹ کر لکھنا شروع کر دیا۔ لڑکی نے گلدستہ ہاتھ میں اٹھایا اور پاؤں رگڑتی ہوئی کٹہرے کے پاس آ کر ماں کو غور سے دیکھنے لگی۔

پادری نے آہ بھری۔

''تم نے کبھی اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش نہیں کی؟''

عورت نے دستخط ختم کرنے کے بعد پادری کو جواب دیا:

''وہ بہت اچھا آدمی تھا۔''

پادری نے پہلے عورت کی طرف اور پھر لڑکی کی جانب دیکھا اور صالح تحیر کے ساتھ باور کیا کہ ماں بیٹی دونوں میں سے کسی کا آنسو بہانے کا ارادہ نہیں ہے۔ عورت نے اسی انداز میں بات جاری رکھی: ''میں نے اس سے کہا تھا کہ جو چیز کسی کے کھانے کی ہو اسے چوری نہ کرے اور اس

نے ہمیشہ میرا کہا مانا۔ اس کے برعکس، پہلے، جب وہ مکے بازی کیا کرتا تھا، مار کھا کر بے حال ہو جانے کے باعث اس کے تین تین دن بستر پر گزرتے تھے۔"

"اور اسے اپنے دانت بھی تو نکلوانے پڑے تھے۔" لڑکی نے اضافہ کیا۔

"ہاں" عورت نے اتفاق کیا۔ "ان دنوں میرے ہر نوالے میں اس مار کا ذائقہ ہوتا تھا جو میرے بیٹے نے ہفتے کی راتوں کو کھائی ہوتی تھی۔"

"خدا کی منشا کو کون جان سکتا ہے!" پادری نے کہا۔

مگر یہ اس نے بغیر کسی یقین کے کہا تھا، کچھ تو اس لیے کہ اس کو زندگی کے تجربے نے ذرا شک میں ڈال دیا تھا اور کچھ گرمی بھی بہت زیادہ تھی۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ سرسام سے بچنے کے لئے اپنے سروں کو ڈھانپ کر باہر جائیں۔ جمائیاں لیتے ہوئے اور تقریباً سوتے سوتے اس نے انہیں کارلوس کی قبر تک پہنچنے کا راستہ سمجھایا اور کہا کہ کنجیاں لوٹانے کے لئے واپسی پر انہیں دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں، باہر کے دروازے کے نیچے کنجیاں رکھ دیں اور اگر ممکن ہو تو گرجے کے لئے نذر و نیاز بھی وہیں چھوڑ دیں۔ عورت نے بہت توجہ سے پادری کی ہدایات کو سنا، لیکن شکریہ ادا کرتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

سڑک والا دروازہ کھولنے سے پیشتر ہی پادری نے بھانپ لیا تھا کہ کوئی شخص لوہے کے جنگلے سے ناک لگائے گھر کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ باہر بہت سارے بچے جمع ہو گئے تھے۔ جب دروازہ کھلا تو سب ادھر ادھر ہو گئے۔ عموماً دوپہر کے اس وقت سڑک پر کوئی نہیں ہوتا تھا۔ آج نہ صرف وہاں بچے تھے، بلکہ بادام کے درختوں کے نیچے بالغوں کے گروہ بھی موجود تھے۔ پادری نے گرمی میں تیرتی ہوئی سڑک کا جائزہ لیا اور ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔" اس نے عورت کی طرف دیکھے بغیر اس سے کہا۔

پادری کی بہن پرے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے شب خوابی کے کپڑوں پر کالی جیکٹ پہن رکھی تھی اور بال شانوں پر کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" پادری نے اس سے پوچھا۔

"لوگوں کو پتا چل گیا ہے۔" اس کی بہن نے سرگوشی کی۔

"بہتر ہوگا کہ تم دونوں انگنائی والے دروازے سے باہر جاؤ۔ پادری نے کہا۔

"وہاں بھی وہی حال ہے۔" پادری کی بہن نے کہا۔ "سب لوگ کھڑکیوں میں سے

جھانک رہے ہیں۔''

اس وقت تک بات عورت کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اس نے لوہے کے جنگلے میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ تب اس نے لڑکی کے ہاتھ سے گل دستہ لے لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

''سورج غروب ہونے تک رک جاؤ۔'' پادری نے مشورہ دیا۔

''تم پگھل جاؤ گی۔'' پادری کی بہن نے کہا، جو کمرے کے عقب میں بے حس وحرکت کھڑی تھی۔ ''ٹھہرو، میں تمہیں اپنا چھاتا دیے دیتی ہوں۔''

''نہیں شکریہ'' عورت نے جواب دیا۔ ''ہم یونہی ٹھیک ہیں۔''

اس نے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور دروازہ عبور کر کے سڑک پر نکل گئی۔



(مشمولہ: ''نوبل انعام یافتہ ادیبوں کے بہترین افسانے''، مترجم: خاقان ساجد، راولپنڈی، نواب سنز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)

کاغذی پھول

ترجمہ: ندا محسن

صبح کاذب کے ملگجے اندھیرے میں مینا نے راستہ محسوس کرتے ہوئے اپنا وہ لباس پہنا جس کی آستینیں الگ ہو جاتی تھیں۔ پھر ٹرنک میں اس لباس کی آستینیں تلاش کرنے لگی۔ اُس نے کھونٹیوں پر اور دروازوں کے پیچھے تلاش کیا مگر بے سود۔ اُس کی کوشش تھی کہ سارے عمل کے دوران کمرے میں سوئی ہوئی اس کی نابینا دادی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ لیکن جب وہ اندھیرے سے مانوس ہوئی تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کی دادی جاگ چکی تھی اور باورچی خانے میں موجود تھی۔ وہ باورچی خانے میں دادی سے اپنی آستینوں کے بارے میں پوچھنے چل دی۔

''وہ غسل خانے میں ہیں۔'' اندھی دادی نے کہا: ''میں نے انھیں دھوڈالا تھا۔''

دھلی آستینیں لکڑی کی کھونٹیوں سے لٹکی ہوئی تھیں اور ابھی تک گیلی تھیں۔ مینا دوبارہ باورچی خانے میں گئی اور آتشدان کے پتھروں پر انھیں پھیلا دیا۔

نابینا خاتون کافی کو ہلا رہی تھی اور اُس کی بے جان پُتلیاں برآمدے کے پتھریلے کناروں پر ٹکی ہوئی تھیں، جہاں ادویات کی جڑی بوٹیوں کے گملے قطار میں رکھے ہوئے تھے۔

''میری چیزوں کو مت چھیڑا کرو۔ آجکل سورج کا کوئی بھروسہ نہیں۔'' مینا نے کہا۔

اندھی عورت نے آواز کی سمت اپنا رُخ موڑا اور کہا۔'' میں بھول گئی تھی کہ آج پہلا جمعہ ہے۔''

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اندھی عورت نے اندازہ لگایا کہ کافی تیار ہو چکی ہے۔ اس نے کافی کا برتن چولہے سے ہٹالیا۔

"نیچے کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھ لینا کیوں کہ پتھر گندے ہیں۔" اُس نے مینا سے کہا۔

مینا نے اُنگلی پتھر کے کناروں پر پھیری۔ وہ گندے تھے لیکن گرد اتنی جم چلی تھی کہ آستینیں اُن سے رگڑ نہ کھاتیں تو گندی نہ ہوتیں۔

"اگر پتھر گندے ہیں تو اس کی ذمہ دار تم ہو۔" اُس نے کہا۔

اندھی عورت کپ میں کافی ڈال چکی تھی۔

"تم ناراض ہو؟" کرسی برآمدے میں کھینچتے ہوئے وہ مینا سے مخاطب ہوئی۔ "ناراضی میں مقدس دعا میں جانا گناہ ہے۔"

وہ کافی پینے کے لیے صحن میں گلابوں کے پھولوں کے سامنے بیٹھ گئی۔ جب دعا کے لیے تیسری گھنٹی بجی تو مینا نے آتش دان سے آستینیں اتار لیں۔ وہ ابھی بھی گیلی تھیں، لیکن مینا نے انھیں پہن لیا۔ فادر انجل اسے برہنہ کندھوں میں دیکھ کر کبھی درس نہیں دیں گے، (اُس نے سوچا)۔

اس نے منہ نہیں دھویا لیکن گیلے تولیے سے غازے کے نشانات رگڑ کر صاف کر لیے، دعاؤں کی کتاب اور شال کمرے سے اٹھائی اور باہر گلی میں نکل گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد واپس گھر آ گئی اور سیدھی غسل خانے کی طرف چل دی۔

"تم وہاں انجیلِ مقدس پڑھے جانے کے بعد جاؤ گی!"

صحن میں گلابوں کی مخالف سمت بیٹھی ہوئی اندھی عورت نے کہا۔

"میں دعا میں نہیں جا سکتی، آستینیں گیلی ہیں اور میرے سارے لباس پر سلوٹیں پڑی ہیں۔"

اُس نے محسوس کیا کہ ایک جانکاری والی نگاہ اس کے تعاقب میں ہے۔

"پہلا جمعہ ہے اور تم دعا میں نہیں جا رہی!" اندھی عورت بول اٹھی۔

غسل خانے سے واپس آ کر مینا نے اپنے لیے ایک کپ میں کافی ڈالی اور سفید روغن شدہ داخلی راستے کے سامنے اندھی عورت کے پاس بیٹھ گئی لیکن وہ کافی نہ پی سکی۔

"تمہارا ہی قصور ہے۔" وہ دبے ہوئے غصے میں بڑبڑائی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ آنسوؤں میں ڈوب رہی ہے۔

"تم رو رہی ہو؟" بوڑھی عورت بولی۔

اُس نے پانی دینے والا فوارہ آرگینو کے گملوں کے پاس رکھا اور باہر صحن میں نکل گئی

مینا نے اپنا کپ زمین پر رکھ دیا، ''میں غصے سے رو رہی ہوں۔'' اور جیسے ہی وہ اپنی دادی کے پاس سے گزری اُس نے مزید کہا۔

''تمھیں اعترافِ گناہ کے لیے لازماً جانا چاہیے کیوں کہ میں صرف تمہاری غلطی کی وجہ سے پہلے جمعے کی دعا میں نہیں جا سکی۔''

اندھی خاتون بے حس و حرکت اس انتظار میں بیٹھی رہی کہ مینا خواب گاہ کا دروازہ بند کر دے۔ پھر وہ خود برآمدے کے دوسرے سرے تک چلی گئی اور رُکتے ہوئے جھکی تاکہ کافی کا کپ اٹھا لے جو مینا نے ویسے کا ویسا پڑا رہنے دیا تھا۔ جب وہ کافی مٹی کے پیالے میں واپس اُنڈیل رہی تھی تو اُس نے اپنی بڑبڑاہٹ جاری رکھی، ''خدا جانتا ہے کہ میرا ضمیر صاف ہے۔''

مینا کی ماں خواب گاہ سے باہر آئی۔

''تم کس سے بات کر رہی ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''کسی سے بھی نہیں۔ میں نے تمھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں خبطی ہوتی جا رہی ہوں۔''

اپنے کمرے میں بند ہو کر مینا نے اپنے لباس کے بٹن کھولے اور تین چھوٹی چھوٹی چابیوں والا گچھا نکالا، جو اُس نے ایک سیفٹی پن سے اپنے زیریں لباس کے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ ایک چابی سے اس نے نچلا دراز کھولا اور اُس میں سے ایک ننھا سا صندوق نکالا، پھر ایک اور چابی سے اس صندوق کو کھولا۔ اندر رنگین کاغذوں پر لکھے ہوئے کچھ خطوط تھے جن کو ایک ربڑ بینڈ سے اکٹھے باندھا ہوا تھا۔ مینا نے ان خطوط کو اپنی زیریں بنیان کے اندر چھپا لیا۔ چھوٹے سے صندوق کو واپس اس کی جگہ پر رکھا اور دراز مقفل کر دیا۔ پھر وہ غسل خانے میں گئی اور خطوط اس کے اندر پھینک دیے۔

مینا باورچی خانے میں آئی تو اُس کی ماں نے کہا، ''میرا خیال تھا کہ تم چرچ گئی ہو گی۔''

''وہ نہیں جا سکی۔'' اندھی عورت نے مداخلت کی۔ ''میں بھول گئی تھی کہ یہ پہلا جمعہ تھا اور میں نے کل سہ پہر آستینیں دھو ڈالی تھی۔''

''وہ ابھی بھی گیلی ہیں۔'' مینا بڑبڑائی۔

''مجھے ان دنوں بہت زیادہ کام کرنا پڑا۔'' اندھی عورت نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''مجھے ایسٹر کے لیے پچاس درجن پھول دینے ہیں۔'' مینا نے کہا۔

اس روز سورج کی تمازت جلد شروع ہو گئی۔ سات بجنے سے پہلے ہی مینا نے اپنی مصنوعی گلابوں کی دکان سیٹ کر لی تھی۔ ایک بالٹی پتیوں اور لوہے کی تاروں سے بھری تھی۔ کریپ

پیپروں کا ایک صندوق، دو قینچیاں، دھاگے کا ایک گچھا اور ایک گوند کا ڈبہ بھی وہاں رکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ٹرینیڈیڈ (Trinidad) وہاں پہنچ گئی۔ اس نے بغل میں پھول چپکانے والا تختہ دبایا ہوا تھا۔ اس نے بھی مینا سے پوچھا کہ وہ دعا میں کیوں نہیں گئی۔

''میرے پاس آستینیں نہیں تھیں۔'' مینا نے جواب دیا۔

''تمہیں کوئی ادھار دے سکتا تھا۔'' ٹرینیڈیڈ نے کہا۔

اُس نے ایک کرسی کھینچی اور پتیوں والی ٹوکری کے پاس بیٹھ گئی۔

''مجھے دیر ہو چکی تھی۔''

اُس نے ایک گلاب بنا لیا تو ٹوکری مزید قریب کر لی تا کہ وہ پتیوں کو تراش سکے۔ ٹرینیڈیڈ نے تختہ فرش پر رکھا اور کام میں شریک ہو گئی۔ مینا نے صندوق کو دیکھا۔

''کیا تم نے جوتے خریدے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ مردہ چوہے جیسے ہیں'' ٹرینیڈیڈ نے کہا۔

چونکہ ٹرینیڈیڈ پتیوں کی تراش خراش میں ماہر تھی اس لیے مینا تاروں پر سبز کاغذ لپیٹ کر شاخیں بنانے لگ گئی۔ وہ دونوں خاموشی سے کام میں مشغول رہیں اور انھیں احساس بھی نہیں ہوا کہ سورج کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ مینا ٹرینیڈیڈ کی طرف مڑی تو اُس کا چہرہ غیر مرئی سا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹرینیڈیڈ بے حد نفاست سے پتیاں تراش رہی تھی اور پتیوں کی حرکت اُس کی انگلیوں میں محسوس تک نہیں ہو رہی تھی۔

مینا نے اس کے مردانہ قسم کے جوتوں کا مشاہدہ کیا۔ ٹرینیڈیڈ اس کی نظروں سے گریز کر رہی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں پیچھے سمیٹتے ہوئے سر اُٹھائے بغیر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

مینا اُس کی جانب جھک کر بولی، ''وہ چلا گیا۔''

ٹرینیڈیڈ کے ہاتھوں سے قینچی چھوٹ کر اُس کی گود میں جا گری۔

''نہیں''

''ہاں! وہ چلا گیا۔'' مینا نے دہرایا۔

ٹرینیڈیڈ بغیر پلک جھپکے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے دونوں ابروؤں کے درمیان عمودی لکیر میں گہری جھری پڑ گئی تھی۔

''اور اب؟'' اس نے پوچھا۔

مینا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا، ''اب کچھ بھی نہیں۔''

ٹرینڈیڈ نے دس بجے سے پہلے اسے خدا حافظ کہہ دیا۔

شناسائی کے بوجھ سے آزاد ہو کر مینا نے ایک لحہ کے لیے اُسے روکا، تاکہ وہ اس کے چوہے جیسے جوتوں کو غسل خانے میں پھینک سکے۔

اندھی خاتون گلاب کی پتیاں تراش رہی تھی۔

''میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تم نہیں جانتیں اس صندوق میں کیا ہے؟'' مینا نے اس سے کہا جب وہ پاس سے گزری۔

اس نے صندوق کو ہلایا لیکن اندھی عورت شناخت نہ کر سکی۔

''اس کو دوبارہ ہلاؤ۔''

مینا نے اس حرکت کو دہرایا لیکن اندھی عورت پھر بھی شناخت نہ کر سکی۔ اس کے تیسری مرتبہ ہلانے پر بھی اندھی عورت شناخت میں ناکام رہی۔

''یہ وہ چوہے ہیں جو ہم چرچ کے چوہے دان میں پکڑتے تھے۔''

جب وہ واپس آئی تو اندھی عورت کے قریب سے بِنا بولے گزر گئی، لیکن بوڑھی عورت اس کے تعاقب میں گئی۔ جب وہ کمرے میں پہنچی تو مینا بند کھڑکی کے پاس اکیلی کھڑی مصنوعی گلاب تراش رہی تھی۔

''مینا اگر تم خوش ہونا چاہتی ہو تو اجنبیوں کے ساتھ اقرار مت کرو۔''

مینا کچھ کہے بغیر اُسے دیکھتی رہی۔ اندھی عورت اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور کام میں اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن مینا نے اسے منع کر دیا۔

''تم پریشان ہو؟'' اندھی عورت نے کہا، ''تم دعا میں کیوں نہیں گئیں؟''

''تم خوب جانتی ہو کہ کیوں۔'' مینا نے کہا۔

''اگر یہ آستینوں کی وجہ سے ہوتا تو تم گھر سے نکلنے کی ہی زحمت نہ کرتیں۔ کوئی راستے میں تمہارا منتظر تھا جس نے تمھیں مایوس کر دیا۔''

مینا نے اپنا ہاتھ نابینا خاتون کی آنکھوں کے سامنے اس طرح لہرایا جیسے کسی اَن دیکھی دھند کو صاف کر رہی ہو۔

''تم ایک جادوگرنی ہو۔'' مینا نے کہا۔

''تم آج صبح دو مرتبہ غسل خانے میں گئی۔'' اندھی خاتون بولی۔ ''تم ایک مرتبہ سے زیادہ کبھی نہیں جاتیں۔''

مینا بدستور پھول بنانے میں مشغول رہی۔

''کیا تم مجھے وہ دکھاؤ گی جو دروازوں میں چھپا رہی تھی؟'' اندھی عورت نے کہا۔

مینا نے پھولوں کو بلا تاخیر کھڑکی میں رکھا اور اپنے کپڑوں سے تین چابیوں کا گچھا نکال کر اندھی خاتون کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''تم خود دیکھ سکتی ہو۔''

بوڑھی خاتون نے چابیوں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے محسوس کیا۔ ''میری آنکھیں غسل خانے میں نیچے تک نہیں دیکھ سکتیں۔''

مینا نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ایک عجیب سنسنی محسوس کی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اندھی عورت جانتی ہو کہ وہ اس کی جانب دیکھ رہی ہے۔

''اگر تمھیں میرے سارے کاموں سے اتنی ہی دل چسپی ہے تو تم خود کو غسل خانے کے اندر گرا کر دیکھ لو۔''

اندھی عورت نے قطع کلامی کو نظر انداز کر دیا۔

''تم بستر میں صبح تک لکھتی رہتی ہو۔'' اس نے کہا۔

''تمھی لائٹ بند کرتی ہو۔'' مینا نے کہا۔

''اور تم فوراً ہی فلیش لائٹ استعمال کرنا شروع کر دیتی ہو اور مجھے معلوم ہے کہ تم اپنی ہر سانس کے ساتھ لکھتی رہتی ہو۔''

مینا نے خاموش رہنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اپنا سر اوپر اٹھائے بغیر وہ بولی، ''ٹھیک ہے، فرض کر لو ایسا ہی ہے تو اس میں کیا خاص بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' اندھی عورت نے جواب دیا۔ ''صرف یہ کہ اس کی وجہ سے تمہارے پہلے جمعہ کی دعا رہ گئی۔''

دونوں ہاتھوں سے مینا نے دھاگے کا گچھا، قینچی، ٹہنیاں اور گلاب اٹھائے، یہ سب ایک ٹوکری میں رکھا اور اندھی عورت کے سامنے بیٹھ گئی۔

''کیا تم یہ جاننا چاہو گی کہ میں غسل خانے میں کیا کرنے گئی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

دونوں تجسس میں تھیں، تب مینا نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دے دیا۔

''میں پاخانہ لینے کے لیے گئی تھی۔''

اندھی عورت نے چابیاں ٹوکری میں پھینک دیں۔

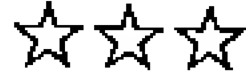
''یہ ایک اچھا بہانہ ہے۔'' وہ باورچی خانے میں جاتے ہوئے بڑبڑائی۔

''میں یقین کر لیتی اگر تمہاری زندگی میں یہ پہلی مرتبہ ہوتا، تم ہمیشہ ایسا کرتی ہو۔''

مینا کی ماں اپنے بازوؤں میں کانٹے دار گلاب سمیٹے برآمدے میں آ رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں پاگل ہو گئی ہوں۔'' اندھی عورت نے کہا۔ ''مگر بظاہر تم مجھے پاگل خانے بھیجنے کا نہیں سوچ رہیں کیوں کہ میں نے ابھی لوگوں پر پتھر پھینکنا شروع نہیں کیے۔''



(مشمولہ: ''نقاط''، فیصل آباد، شمارہ نمبر ۵، دسمبر ۲۰۰۷ء)

بچوں کی کہانیاں

ایستیبان

ترجمہ: محمود احمد قاضی

سب سے پہلے جن بچوں نے سمندر کی طرف سے بہہ کر آنے والی اس سیاہ پھولی ہوئی چیز کو دیکھا تو انہوں نے سمجھا کہ یہ کوئی دشمن کا جہاز ہے، تب پھر انہوں نے دیکھا کہ یہ شے تو جھنڈے اور مستول کے بغیر ہے اور یوں وہ سمجھے کہ یہ ایک وہیل مچھلی ہے لیکن جب یہ ساحل تک آن پہنچی اور انہوں نے اس پر سے سمندری پودوں کے گچھوں، لعابی مچھلی کے ریشوں اور تباہ شدہ جہاز کی باقیات کو صاف کیا تو پھر ان پر ظاہر ہوا کہ یہ ایک ڈوب جانے والا آدمی تھا۔

وہ ساری سہ پہر اس کے ساتھ کھیلتے رہے کبھی وہ اسے ریت میں دبا دیتے اور کبھی باہر نکال لیتے پھر اسی لمحے کسی کی نظر ان پر پڑی تو اُس نے سارے گاؤں میں یہ خبر پھیلا دی۔ جو لوگ اس کو اُٹھا کر گاؤں کے سب سے قریبی گھر میں لائے۔ انہوں نے محسوس کیا اس کا وزن کسی بھی ایسے ڈوب جانے والے آدمی سے زیادہ تھا جس سے انہیں پہلے کبھی سابقہ پڑا تھا۔ ان کی نظر میں اس کا وزن ایک گھوڑے جتنا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بتایا کہ ایسا شاید اس لیے تھا کہ یہ کہیں بہت دور سے تیرتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور شاید پانی اس کی ہڈیوں میں گھس گیا تھا۔ جب انہوں نے اسے فرش پر لٹایا تو اُنہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ دوسرے تمام آدمیوں سے زیادہ لمبا بھی تھا، کیونکہ یہ گھر اب اس کے لئے چھوٹا پڑ رہا تھا۔ پھر انہوں نے سوچا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید ڈوب جانے والے آدمیوں میں مرنے کے بعد بھی بڑھتے رہنے کی خصوصیت پیدا ہو جاتی

ہے۔ اس کے آس پاس سمندر کی بو پھیلی ہوئی تھی اور یہ محض اس کا مہاندرا تھا جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ آدمی کی لاش ہے کیونکہ اس کی جلد پر چھلکوں کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

انہوں نے اس کا چہرہ صاف کرنے کی کوشش ہی نہ کی کہ پتہ چلتا کہ یہ تو یعنی مردہ شخص کوئی اجنبی تھا۔ یہ گاؤں بیس کے قریب لکڑی کے بنے ہوئے گھروں پر مشتمل تھا جن کے صحن پتھریلے تھے اور جن میں کوئی پھول تک نہ تھا اور یہ سارے گھر صحرا جیسے، ساحل کے آخری کونے پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں اتنی تھوڑی سی زمین تھی کہ مائیں جب بھی باہر نکلتیں تو انہیں یہ خوف دامن گیر رہتا کہ کہیں ہوا ان کے بچوں کو اڑا نہ لے جائے اور پچھلے سالوں میں جو چند ایک مر گئے تھے تو وہ چٹانوں سے بھی پرے جا گرے تھے، لیکن سمندر پر سکون اور فیاض تھا اور تمام آدمی اپنی سات کشتیوں کے ساتھ مگن تھے اسی لیے جب انہوں نے اس ڈوب جانے والے آدمی کو پایا تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ آیا وہ تمام کے تمام یہاں موجود تھے۔

اس رات وہ سمندر میں اپنے کام پر نہیں نکلے۔ جب مرد دوسرے قریبی گاؤں میں یہ پتہ کرنے کے لیے نکلے کہ کہیں وہاں کا کوئی آدمی تو گم نہیں ہوا، تب عورتیں اس ڈوب جانے والے آدمی کی حفاظت کے لیے وہاں رہ گئیں۔ انہوں نے گھاس کی کوچی کے ساتھ اس پر سے کیچڑ کو صاف کیا اور انہوں نے اس کے بالوں میں اٹک جانے والے سمندری کنکروں کو ہٹایا اور انہوں نے مچھلی صاف کرنے کے آلات کے ساتھ اس پر جمی تمام آلائش کو صاف کیا۔ جب وہ یہ سب کچھ کر رہی تھیں تو انہیں محسوس ہوا کہ اس سے برآمد ہوتی باس دور دراز کے اور گہرے سمندروں کی تھی اور اس کے جسم پر کپڑے کی جو دھجیاں تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ جیسے یہ مونگے کی بھول بھلیوں میں سے گزر کر آیا ہو اور پھر انہیں یہ بھی پتہ چلا کہ اس نے موت کو فخر کے ساتھ گلے لگایا تھا کیونکہ اس کے چہرے پر دریاؤں میں ڈوب جانے والے پتلے دبلے اپنی ضرورتوں کے مارے ہوئے لوگوں کی طرح یا سمندر میں سے برآمد ہونے والے دوسرے ڈوبے ہوئے لوگوں کی طرح کے اکیلے پن کا کوئی پرتو نہیں ملتا تھا لیکن جب انہوں نے اس کے جسم کو صاف کرنے کے کام کو ختم کر لیا تو تب ہی ان پر کھلا کہ وہ کس قسم کا آدمی تھا اور اسی بات پر وہ حیران و ششدر رہ گئیں۔

انہوں نے اب تک جن طاقتور مردوں کو دیکھا تھا۔ یہ ان میں سب سے زیادہ لمبا، مضبوط اور مردانگی سے بھرپور تھا مگر پھر بھی وہ جب اس کی طرف دیکھ رہی تھیں تو وہ ان کے تصورات میں آنے والی کسی بھی چیز سے مختلف تھا۔ اس گاؤں میں وہ اس کے لیے ایسا بستر نہ تلاش کر سکیں جو اس کے بڑے وجود سے مطابقت رکھتا ہو اور نہ ہی انہیں کوئی ایسی مضبوط میز ملی جس پر اس کا جثہ سما

سکے۔ نہ تو اسے چھٹی کے دن پہنی جانے والی لمبے ترین آدمیوں کی پتلونیں ہی پوری آئیں اور نہ ہی سب سے موٹے آدمیوں کی پھولدار قمیضیں اور نہ ہی سب سے بڑے پاؤں والوں کے جوتے اس کو فٹ آئے۔ اس کی خوبصورتی اور بہت بڑے جثے سے متاثر ہو کر عورتوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے لیے بادبانی کپڑے سے ایک پتلون تیار کی جائے اور شادی والے لینن کے کپڑے سے اس کے لیے قمیض بنائی جائے تا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی شان برقرار رہ سکے۔ جب وہ ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ کر اس کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے لباس کو سی رہی تھیں اور ٹانکے لگا رہی تھیں تو انہیں محسوس ہوا کہ آج کی رات ہوا جس یکساں رفتار سے چل رہی تھی اور سمندر جس طرح سے بے قرار تھا تو یہ تبدیلی مرنے والے شخص کے ساتھ کچھ کرنے والی تھی۔ وہ سوچنے لگیں کہ اگر یہ شاندار آدمی اس گاؤں میں رہتا ہوتا تو اس کے گھر کے دروازے سب سے زیادہ چوڑائی والے ہوتے۔ چھت سب سے اونچی ہوتی۔ اس کے گھر کا فرش سب سے زیادہ مضبوط ہوتا۔ اس کی چارپائی جہازی تختوں سے بنی ہوتی جنہیں کہ لوہے کے کابلوں سے جوڑا گیا ہوتا اور یوں اس کی عورت سب سے زیادہ خوش باش عورت ہوتی۔ انہوں نے سوچا کہ وہ ایک ایسا بااختیار شخص ہوتا کہ محض وہ مچھلیوں کو ان کے ناموں سے پکارتا تو وہ اس کی طرف لپکی چلی آتیں اور وہ اتنا محنتی، اور دھن کا پکا شخص ہوتا کہ چٹانوں سے چشمے پھوٹ نکلتے اور اس طرح وہ ان چٹانوں کی چوٹیوں پر پھول اُگانے کے قابل ہو جاتا۔

انہوں نے نہایت رازدارانہ انداز میں اس شخص کا موازنہ اپنے آدمیوں سے کیا تو انہوں نے جانا کہ ان کے مرد اپنی ساری زندگی میں وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے جو وہ ان کے لیے ایک رات میں کرنے کا اہل تھا اور پھر انہوں نے اپنے مردوں کے بارے میں فیصلہ دیا کہ وہ اس زمین پر رہنے والی مخلوق میں سب سے زیادہ کمزور، نہایت کمینے اور بے حد بے کار مرد تھے۔ وہ اپنی ان تصوراتی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھیں کہ سب سے زیادہ عمر رسیدہ عورت نے، جس نے کہ سب سے زیادہ بوڑھی ہونے کے ناطے سے اس ڈوب جانے والے آدمی کی طرف جذباتی ہونے سے زیادہ ترس کے ساتھ دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھری۔

''اس کا چہرہ کچھ اس جیسا ہے جسے کہ ایستیبان کہا جاتا ہے۔''

یہ سچ تھا۔ ان میں سے زیادہ تر نے اس کی طرف یہ دیکھنے کے لیے دوبارہ نگاہ ڈالی تھی کہ اس کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا نام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ان میں سے جو زیادہ سرکش تھیں اور جو کہ نوجوان تھیں وہ کچھ دیر تک اسی سرابی کیفیت کا شکار رہیں کہ جب اسے کپڑے پہنا دیئے جائیں

گے اور وہ اپنے مخصوص چمڑے کے بوٹوں کے ساتھ پھولوں کے درمیان لیٹا ہوگا تو اس کا نام ''لتارو'' ہی ہو سکتا ہے لیکن یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ ان کے پاس وافر کینوس نہیں تھا۔ غیر ماہرانہ انداز میں کاٹی گئی اور پھوہڑ پن کے ساتھ سی گئی پتلون بہت تنگ تھی۔ اور اس کے دل کی غیر مرئی طاقت اس کی قمیض کے بٹنوں کو توڑ دینے پر تلی نظر آتی تھی۔ آدھی رات کے بعد ہوا کا زور تھم گیا اور سمندر بھی اپنی پہلے والی حالت میں آ گیا۔ اس خاموشی نے رہے سہے شکوک کو بھی ختم کر دیا۔ وہ یقینی طور پر ESTEBAN تھا۔ جن عورتوں نے اسے لباس پہنایا، اس کے بالوں میں کنگھی کی اس کے ناخن تراشے اور اس کی شیو بنائی تو وہ اسے زمین پر لٹاتے ہوئے دکھ کے ساتھ جھرجھری لئے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ وہی لمحہ تھا جب یہ بات ان کی سمجھ میں آئی کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے اس بڑے جثے سے کس قدر ناخوش رہا ہوگا کیونکہ یہ اس کے مرنے کے بعد بھی تکلیف دے رہا تھا۔ وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھیں کہ وہ اپنی زندگی میں دروازوں میں سے گزرتے ہوئے دائیں بائیں چھولتے ہوئے چوکھٹ سے اپنا سر پھوڑ بیٹھتا ہوگا اور ملاقاتوں کے وقت اپنے پاؤں پر قائم رہتے ہوئے اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنے ان نرم بھورے سمندری بچھڑے جیسے ہاتھوں کا کیا کرے، پریشان ہوتا ہوگا جبکہ گھر کی مالکن اس کے لیے مضبوط ترین کرسی تلاش کرنے کے بعد نہایت خوفزدہ حالت میں اسے کہتی ہوگی۔ ''ایستیبان۔ پلیز یہاں بیٹھو'' اور وہ دیوار کے ساتھ لگتے ہوئے مسکراتے چہرے کے ساتھ کہتا ہوگا۔ ''مادام تکلیف نہ کریں میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' ہر ملاقات پر یہ سب کچھ دہراتے ہوئے اس کی ایڑیاں دکھتی ہوں گی اور اس کی پیٹھ اینٹھ جاتی ہوگی۔ اسے ایک بار پھر کہنا پڑتا ہوگا۔ ''میں یہیں ٹھیک ہوں مادام'' محض اس ڈر سے کہ کہیں اس کے بیٹھنے سے کرسی نہ ٹوٹ جائے اور شاید اسے یہ بھی پتہ نہ چل سکا ہوگا کہ جس کسی نے اسے کہا ہوگا۔ ''ایستیبان نہ جاؤ۔ کم از کم کافی تیار ہونے تک تو رُکے رہو''۔ وہ ان میں سے ایک ہوگی جس نے اس کے جانے کے بعد اپنے آپ سے کہا ہوگا۔ ''اچھا ہی ہوا کہ اس سے جان چھوٹ گئی۔ اچھا ہی ہوا کہ یہ خوبصورت احمق چلا گیا''۔ وہ عورتیں یہ سب کچھ اس کی لاش کے قریب رہ کر صبح ہونے سے تھوڑی دیر پہلے تک سوچتی رہیں۔ بعد میں جب انہوں نے اس کے چہرے کو ایک رومال سے ڈھانپ دیا تاکہ روشنی اسے تکلیف نہ دے، تب وہ انہیں بالکل اپنے مردوں کی طرح ہمیشہ کے لیے مر چکا اور غیر محفوظ مرد لگا۔ اور اس وقت ان کے دل غم کے آنسوؤں سے بھر گئے۔ نوجوان عورتوں میں سے ایک رونے لگی۔ جو دوسری تھیں انہوں نے پہلے آہیں بھریں پھر وہ بھی گریہ زاری کرنے لگیں۔ جوں جوں وہ سسکیاں بھرتیں یوں لگا کہ وہ رو رہی ہیں۔ کیونکہ اب

ڈوب جانے والا مردان کے نزدیک اور بھی ''ایستیبان'' کی مانند ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح بے اختیار روتی چلی گئیں کیونکہ وہ سب سے زیادہ بدنصیب، سب سے زیادہ صلح جو اور نہایت بامروت تھا۔ بے چارہ ''ایستیبان'' بے چارہ ''ایستیبان'' پھر جب مرد اس خبر کے ساتھ واپس آئے کہ ڈوب جانے والا آدمی کسی بھی قریبی گاؤں سے تعلق نہیں رکھتا تھا تو عورتوں نے روتی آنکھوں کے ساتھ ایک طرح کی خوشی محسوس کی۔

''خدا کا شکر ہے۔'' انہوں نے آہ بھری۔ ''وہ ہمارا ہے۔''

مردوں کے خیال میں یہ شوروغل محض نسوانی بے ہودگی تھی۔ رات گئے کیے جانے والے عجیب وغریب سوالات سے تنگ آ کر مرد اب یہ چاہتے تھے کہ اس سے پہلے کہ اگلے خشک اور حبس آلود دن کا سورج شدت پکڑے انہیں اس اجنبی سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ انہوں نے مستول کے اگلے حصوں کے ساتھ چیزوں کو نئی شکل دے کر رسیوں کے ساتھ اس طرح باندھ دیا کہ چٹانوں تک لے جانے کے لیے اس کا جسم سہارا جا سکے۔ وہ اس کے جسم کے ساتھ کسی سامان ڈھونے والے جہاز کا لنگر باندھنا چاہتے تھے تاکہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ گہرے پانیوں میں چلا جائے جہاں پر کہ مچھلیاں اندھی ہوتی ہیں اور جہاں غوطہ لگانے والے ناسٹلجیا کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ وہ اسے گہرے پانیوں میں اس لیے ڈبونا چاہتے تھے کہ تیز لہریں اسے دوبارہ اُوپر نہ لے آئیں جیسا کہ اس سے پہلے کئی لاشوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ لیکن وہ جتنا جلدی فارغ ہونا چاہتے تھے عورتیں اتنا ہی وقت ضائع کرنے کے طریقے سوچ رہی تھیں۔ وہ اپنی چھاتیوں پر سمندری ٹونے ٹوٹکوں کو سجا کر بدحواس مرغیوں کی طرح چل پھر رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ ایک طرف سے ڈوب جانے والے آدمی پر نہایت عمدہ قسم کی ہوا والے پر ڈال رہی تھیں اور کچھ دوسری طرف سے اس کی کلائی پر کمپاس (سمت نما) باندھ رہی تھیں اور یہ سب کچھ کامیابی کے ساتھ سرانجام دے کر عورتیں وہاں بلا جواز کھڑی تھیں لیکن اس مبالغے کے ساتھ کہ جیسے کسی نے انہیں مردہ شخص کے اُوپر دھکیل دیا ہو۔ تمام مرد اندرونی خلفشار کا شکار ہو گئے۔ وہ بڑبڑانے لگے کہ آخر ایک اجنبی کے لیے اتنی اہم رسومات کیوں۔ ان کی سمجھ سے یہ باہر تھا کہ اس اجنبی کے لیے اتنی بہت سی مقدس پانی کی بوتلیں اور کیلیں کیوں اکٹھی کی گئی ہیں، جبکہ شارکوں نے اسے سالم نگل جانا تھا۔ لیکن عورتیں آگے پیچھے دوڑتی، لڑکھڑاتی ہوئی ہر قسم کے کباڑ کا ڈھیر لگاتی چلی جا رہی تھیں اور پھر جب وہ اپنی آہوں کے ذریعے اس چیز کا اظہار کرنے لگیں جو کہ وہ اپنے آنسوؤں سے نہ کر سکتی تھیں تو مردوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا کیونکہ آج تک ایسا ہنگامہ ایک ٹھنڈے بدھ واری

گوشت کے ٹکڑے، ایک ڈوب جانے والے بے نام ونشان آدمی اور ایک لاوارث لاش کے اُوپر برپا نہیں ہوا تھا۔ عورتوں میں سے ایک نے جذباتی انداز میں اردگرد سے لاپرواہ ہو کر جب مردہ شخص کے چہرے پر سے رومال ہٹایا تو مرد حضرات بھی دم بخود رہ گئے۔

وہ ''ایستیبان'' تھا۔ اس کی پہچان کے لیے اب ان کے لیے ضروری نہیں رہا تھا کہ وہ اس نام کو دہرائیں۔ اگر انہیں اس کا نام سروالٹر ریلے بتایا جاتا تب وہ اس کے گرینگو لہجے، کندھوں پر موجود میکاؤ (طوطے) اور اس کی آدم خوروں کو مارنے والی پرانی وضع کی بندوق سے متاثر تو ضرور ہو سکتے تھے لیکن ''ایستیبان'' تو دنیا میں صرف ایک ہی ہو سکتا تھا اور وہ یہی تھا۔ جو ایک سپرم وہیل کی طرح وہاں پھیلا پڑا تھا جس کے پاؤں میں جوتے نہ تھے، جس نے کسی بچے کے سائز کی پتلون چڑھا رکھی تھی جس کے پتھر کی طرح سخت ناخنوں کو کسی چاقو سے ابھی کاٹا جانا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ اس کے چہرے سے رومال ہٹا کر صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ وہ شرمندہ تھا اس لیے کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا کہ وہ اتنا لمبا چوڑا، اتنا بھاری اور اتنا خوبصورت تھا اور اگر یہ وہ یہ جانتا ہوتا کہ یہ سب کچھ پیش آئے گا تو اس نے ڈوبنے کے لیے کوئی اور دور افتادہ جگہ تلاش کی ہوتی (یقین کیجئے۔ میں نے اپنی گردن کے گرد کسی قدیم ہسپانوی جہاز کا لنگر باندھ لیا ہوتا اور کسی چٹان پر سے ایسے شخص کی طرح چھلانگ لگا دی ہوتی جو لوگوں کو اس بدھ والے دن کے مردہ جسم سے پریشان نہ کرنا چاہتا ہو۔ جیسے کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ اس جیسے ٹھنڈے گوشت کے گندے ٹکڑے سے دوسرے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ ٹھنڈے گوشت کا گندا ٹکڑا جس کا کہ میرے لیے بھی کوئی مصرف نہیں رہا)۔ اس کے چہرے پر اتنا اعتماد تھا کہ بہت زیادہ بے اعتماد لوگ بھی خوفزدہ ہو کر طویل سمندری راتوں کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے جان گئے تھے کہ اب ان کی عورتیں ان کی بجائے ڈوب جانے والے آدمیوں کے خواب دیکھا کریں گی۔ وہ بھی اور دوسرے بھی، جو کہ ان سے زیادہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ ایستیبان کے خلوص سے متاثر ہو کر اپنی ہڈیوں کے گودے کی گہرائی تک کپکپا اُٹھے۔

تو اس طرح وہ سب اس متروک شدہ ڈوب جانے والے آدمی کے شاندار جنازے کے انتظامات کرنے کے قابل ہوئے۔ کچھ عورتیں جو دوسرے قریبی گاؤں سے پھول لینے کے لیے گئی تھیں جب وہ لوٹیں تو ان کے ساتھ اور بہت سی عورتیں بھی تھیں جنہوں نے اس واقعے کا جو کہ انہیں سنایا گیا تھا یقین نہیں کیا تھا اور جب انہوں نے اس مردہ شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وہ مزید پھول لینے کے لیے واپس گئیں۔۔۔۔۔۔ اور وہ مزید اور پھر مزید پھول لاتی چلی گئیں حتیٰ کہ

وہاں اتنے پھول اور اتنے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ آخری لمحے میں اُسے ایک لاوارث کی طرح اپنے پانیوں کے سپرد کرتے ہوئے انہوں نے دکھ محسوس کیا اور تبھی انہوں نے اچھے لوگوں میں سے ایک باپ اور ایک ماں کو چنا، پھر خالائیں، چچا اور بھائی بہن چنے گئے تاکہ گاؤں کے تمام لوگ اس کے حوالے سے اس کے قریبی رشتہ دار کہلائیں۔ کچھ ملاح جنہوں نے کہ کسی کے رونے کی آواز سنی وہ اس طرف گئے تو انہوں نے ایک آدمی کو دیکھا، جس نے اپنے آپ کو بڑے مستول سے باندھ رکھا تھا اور وہ سائرن کی پرانی حکایات دہرا رہا تھا۔ جب وہ چٹان کے ڈھلوانی راستے پر اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، تب انہیں پہلی بار اس ڈوب جانے والے آدمی کی خوبصورتی اور شان وشوکت کے مقابلے میں اپنی گلیوں کے اجاڑ پن، صحنوں کی بے کیفی اور اپنے خوابوں کے بنجر ہونے کا احساس ہوا۔ انہوں نے اسے سمندر کے سپرد کرنے کے لیے لنگر کو استعمال نہ کیا تاکہ اگر وہ چاہے تو واپس آسکے خواہ کسی بھی وقت اس کی یہ خواہش پوری ہو اور انہوں نے صدیوں کے سے قلیل عرصے کے لیے اپنے سانس روک کر اس کے جسم کو اتھاہ گہرائیوں کے سپرد ہوتے دیکھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر یہ محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ سب یہاں موجود نہیں تھے اور شاید کبھی بھی نہ ہوں گے، لیکن وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ اس لمحے کے بعد سب کچھ بہت مختلف ہو جائے گا یعنی ان کے گھروں کے دروازے فراخ ہوں گے چھتیں اونچی ہوں گی اور فرش بھی مضبوط ہوں گے تاکہ ایستیبان کی روح چوکھٹوں سے ٹکرائے بغیر ہر جگہ گھوم پھر سکے۔ اسی لیے مستقبل میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکے گا کہ آخر کار بڑے جثے والا گاؤدی مر گیا ہے، احمق خوبصورت آج مر چکا ہے۔ کیونکہ اب وہ ایستیبان کی روح کو زندہ جاوید بنانے کے لیے اپنے گھروں کے ماتھوں کو خوبصورت رنگوں سے مزین کرنے جا رہے تھے اور اب وہ اپنے گھروں کے پچھلے حصوں کی پتھریلی جگہ کی کھدائی کر کے بہار کے موسم میں چٹانوں کے اوپر پھول اُگانا چاہتے تھے تاکہ مستقبل میں سمندر سے گزرنے والے جہازوں کے مسافر صبح کے وقت فضا میں رچی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھتے ہوئے بیدار ہوں اور انہی جہازوں کے کپتان اپنی پوری وردی میں، اپنے اضطراب، اپنے سمت نما اور سینے پر سجے تمغوں کے ساتھ اپنے پلیٹ فارم سے نیچے اُتر کر اُفق پر بہت دور تک نظر آنے والے گلابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختلف زبانوں میں کہہ اُٹھیں گے........''

ادھر دیکھو جہاں ہوا اتنی پرسکون ہے کہ لگتا ہے کہ وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہی ہے.........

وہاں دیکھو جہاں سورج اتنا روشن ہے کہ سورج مکھی کے پھول اس مخمصے میں مبتلا ہیں کہ اب وہ کس

کس طرف اپنا چہرہ کریں۔۔۔۔ ہاں! اس طرف نگاہ کر دکہ وہ ایستیبان کا گاؤں ہے۔۔۔۔!!



(مشمولہ: ''کتھانگر: لاطینی امریکی کہانیاں''، مترجم: محمود احمد قاضی، لاہور، جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۱ء)

دنیا کا حسین ترین ڈوب مرنے والا

ترجمہ: عطا صدیقی

پہلے پہل جن بچوں نے اس پراسرار ڈولتے اُبھار کو سمندر کی جانب سے اپنی طرف بہہ کر آتے دیکھا انھوں نے خیال کیا کہ دشمن کا کوئی جہاز ہو گا۔ پھر ان کو نظر آیا کہ اس پر نہ تو کوئی مستول ہے اور نہ کوئی پھریرا، تو اس کو ویل سمجھا۔ مگر جب وہ کنارے آلگا اور جب انھوں نے اس پر سے سمندری جھاڑ جھنکار، جیلی فش کے پنجے، مچھلیوں کے بچے کھچے حصے اور تیرنے والا کباڑ صاف کر لیا، تب ہی ان کو معلوم ہوا کہ وہ کوئی ڈوب کر مر جانے والا ہے۔

ساری سہ پہر وہ اس سے کھیلتے رہے؛ کبھی اس کو بالو میں دبا دیتے، کبھی اس کو نکال لیتے، کہ اتفاقاً کسی کی نظر ان پر پڑ گئی اور اس نے گاؤں میں خبر پھیلا دی۔ جو لوگ اس کو اٹھا کر قریب ترین گھر تک لائے، انھوں نے دیکھا کہ وہ ان تمام مُردوں سے کہیں زیادہ بھاری بھرکم ہے جن سے اب تک ان کا سابقہ پڑا تھا۔ وہ قریب قریب گھوڑے جتنا لدھڑ تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہو سکتا ہے کافی عرصے تک پانی میں رہنے کی وجہ سے پانی اس کی ہڈیوں تک میں اتر گیا ہو۔ جب ان لوگوں نے اس کو فرش پر لٹا دیا تو بولے کہ یہ تو باقی سب لوگوں سے زیادہ دراز قد نکلا، کیونکہ گھر کے اندر اس کی سمائی کے لیے جگہ ناکافی تھی، مگر انھیں خیال آیا کہ شاید مر جانے کے بعد بھی بالیدگی کی صلاحیت بعض ڈوب مرنے والوں کی فطرت میں شامل ہو۔ اس میں تک سے سمندری بساند اٹھ رہی تھی اور صرف اس کی بناوٹ ہی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی انسانی لاش ہے کیونکہ اس کی جلد مٹی کی پپڑیوں اور مچھلیوں کے سفنوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

اتنا معلوم کرنے کے لیے کہ مرنے والا کوئی اجنبی ہے، انھیں اس کا چہرہ صاف کرنے کی

کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گاؤں میں کوئی بیس ایک پتھریلی انگنائیوں والے چوبی مکانات تھے جن میں پھول پودے نام کو نہیں تھے اور سب کے سب ایک ریتیلی راس کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں زمین اتنی کم تھی کہ مائیں ہر وقت ڈری سہمی رہتی تھیں کہ کوئی جھکڑ کہیں ان کے بچوں کو اڑا نہ لے جائے، اور وقتاً فوقتاً مر جانے والوں کو ساحلی چٹانوں کے کنارے لے جا کر سمندر میں ٹھنڈا کر دیا جاتا تھا۔ مگر سمندر پُرسکون اور بڑا سخی داتا تھا اور گاؤں کے کل مرد سات کشتیوں میں سما جاتے تھے۔ اس لیے لاش ملنے کے بعد انھوں نے بس ایک نظر ایک دوسرے پر ڈال کر تسلی کر لی کی وہ سب کے سب موجود ہیں۔

اس رات وہ اپنی روزی کی تلاش میں سمندر کی طرف نہیں گئے۔ مرد آس پاس کی بستیوں میں یہ معلوم کرنے نکل گئے کہ کہیں کوئی لاپتا تو نہیں اور عورتیں ڈوب مرنے والے کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہ گئیں۔ انھوں نے گھاس کی کوچیوں کی مدد سے اس کے بدن پر لگی ہوئی کیچڑ کو صاف کیا، اس کے بالوں میں پھنسی سمندری بالو کو نکالا اور مٹی کے پپڑیوں کو مچھلیوں کے سفنے اتارنے والے اوزاروں سے کھرچا۔ یہ کام کرتے کرتے انھوں نے بھانپ لیا کہ جو جھاڑ جھنکاڑ اس کے جسم سے چمٹا ہوا ہے، وہ دور دراز کے گہرے پانیوں سے آیا ہے اور اس کے بدن پر لیریاں لگی ہوئی ہیں جیسے وہ مونگوں کی بھول بھلیوں میں سے ڈبکیاں کھاتا ہوا آیا ہو۔ انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ اپنی موت کو خود داری کے ساتھ سہہ رہا ہے؛ نہ تو اس کا منھ دوسرے ڈوب مرنے والوں کی مانند اُجاڑ سا تھا اور نہ دریا میں غرق ہونے والوں کی طرح بھک منگوں کا سا اُترا اُترا تھا۔ اس کو پوری طرح پاک صاف کر لینے کے بعد ہی یہ عیاں ہو سکا کہ وہ کس قسم کا آدمی تھا، اور ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان سب مردوں میں جواب تک ان کی نظر سے گزرتے تھے، سب سے زیادہ دراز قد سب سے زیادہ توانا، سب سے زیادہ زور آور اور سب سے زیادہ خوش اندام تھا بلکہ اتنا تکے جانے کے باوجود وہ ان کے تصور میں سما نہیں پا رہا تھا۔

گاؤں بھر میں نہ تو اتنا بڑا پلنگ دستیاب تھا جس پر اس کو لٹایا جا سکتا اور نہ کوئی میز اتنی سخت تھی جو اس کی سوگ جاگ کے لیے استعمال کی جا سکتی۔ اس کے بدن پر نہ تو سب سے لانبے آدمی کا کوئی بڑھیا پتلون چڑھا، نہ سب سے موٹے آدمی کی اتوار کو پہنی جانے والی قمیض اور نہ سب سے بڑے پیر والے کے جوتے۔ اس کے پہاڑ سے تن و توش اور اس کے حسن سے مسحور ہو کر عورتوں نے طے کیا کہ وہ بادبان کے کسی بڑے ٹکڑے سے اس کے لیے پتلون بنائیں اور عروسی

لنن سے قمیض تیار کریں، تا کہ وہ راہِ عدم کا سفر اپنی حیثیت کے مطابق طے کر سکے۔ جب وہ جھرمٹ مارے سلائی میں جُتی تھیں اور ٹانکے بھر بھرتے ٹکر ٹکر اس کو دیکھے جا رہی تھیں تو ان کو یوں لگا کہ نہ تو ہوا کبھی اتنی یکساں رفتار سے چلی اور نہ سمندر کبھی اس قدر بے چین بے چین سا رہا جس قدر وہ آج رات ہے، اور انھوں نے فرض کر لیا کہ ہو نہ ہو مرنے والے کا اس تبدیلی سے کوئی واسطہ ضرور ہے۔ انھیں خیال آیا کہ اگر وہ عظیم الشان انسان ان کے گاؤں میں رہتا ہوتا تو اس کے مسکن کے دروازے سب سے کشادہ، چھت سب سے بلند اور فرش سب سے مضبوط ہوتا، اس کی مسہری کسی جہازوں والی لکڑی کی پٹیوں سے بنی ہوتی جن کو لوہے کے پیچوں سے کسا گیا ہوتا، اور اس کی بیوی خوبصورت ترین عورت رہی ہوتی۔ انھوں نے سوچا کہ اس کا اس قدر رعب و دبدبہ ہوتا کہ وہ مچھلیوں کو نام بہ نام پکار کر سمندر میں سے بلا لیا کرتا اور اس نے اپنی زمینوں پر اس قدر محنت کی ہوتی کہ چٹانوں میں سے چشمے اُبل پڑے ہوتے اور یوں اس نے سمندر کے ساحلی کراڑوں کو پھولوں کی تختہ بندی کے قابل بنا لیا ہوتا۔ دل ہی دل میں انھوں نے اس کا موازنہ اپنے اپنے مردوں سے کر ڈالا اور سوچا کہ وہ سب ساری عمر بھی کریں تو وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جو وہ ایک رات میں کر گزرا ہوتا، اور انھوں نے اپنے اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اپنے اپنوں کو زمانے بھر میں سب سے زیادہ بودا، سب سے زیادہ گھٹیا اور سب سے زیادہ نکما آدمی ٹھہرا کر دل سے نکال دیا۔ وہ اپنے تصورات کی بھول بھلیوں میں گم تھیں کہ اتنے میں ان میں سے سب سے بڑی عمر والی عورت، جو عمر رسیدہ ہونے کے باعث ڈوب مرنے والے کو محبت سے زیادہ شفقت بھری نظر سے دیکھ رہی تھی، بولی، ''صورت تو اس کی ایستے بان نامی شخص کی سی ہے۔''

بات پتے کی تھی۔ اس کا کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا، اتنی بات مان لینے کے لیے ان میں سے اکثر کو اس پہ بس ایک نظر اور ڈالنی پڑی۔ وہ عورتیں جو عمر میں سب سے کم تھیں اور خود سر بھی، چند گھنٹے اس تصور میں مگن رہیں کہ جب وہ اس کو نئے کپڑے پہنا دیں گی اور وہ چمکدار جوتے ڈالے، پھولوں کے بیچ لیٹا ہو گا تو لاتارو نام شاید اُس پر زیادہ جچے، مگر یہ ایک خام خیال تھا۔ ان کے پاس کینوس خاطر خواہ نہیں تھا، پھر بُرا بیونتا گیا اور خراب تُرپا گیا پتلون تنگ بھی بہت تھا، اور درونِ دل کسی دبی قوت سے اس کی قمیض کے بٹن بھی پٹ پٹ کھل گئے تھے۔ ہوا کی سائیں سائیں بند ہو چکی تھی اور سمندر کو بھی اپنی بدھ کے دن والی اونگھ آ گئی تھی۔ اس سکوت نے گویا ان کے آخری شبہات بھی دور کر دیے، وہ ایستے بان ہی تھا۔ جب ان کو اس کا فرش پر گھسیٹا جانا مجبوراً برداشت کرنا پڑا تو وہ عورتیں جنھوں نے اس کے کپڑے بدلائے تھے، بال سنوارے تھے، ناخن

تراشے تھے ارجامت بنائی تھی، ترس کے مارے کپکپانے سے باز نہ رہ سکیں۔ اس وقت کہیں جا کر ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے اس جہاز کے جہاز ڈیل ڈول کے ہاتھوں کتنا تنگ رہتا ہوگا جبکہ مرنے کے بعد بھی اس قباحت نے اس کا پیچھا لے رکھا ہے۔ وہ اس کو جیتا جاگتا دیکھ سکتی تھیں، دروازوں میں سے ترچھا ہو کر گزرنے کی سزا بھگتتے ہوئے، چھت کی کڑیوں سے سر ٹکراتے ہوئے، کہیں ملنے گیا تو کھڑا رہنے پر مجبور، اس الجھن میں مبتلا کہ اپنے نرم گلابی سیل نما ہاتھوں کا کیا کرے، جبکہ خاتون خانہ گھر بھر کی سب سے مضبوط کرسی چن کر اپنا دم خشک کیے کیے اس کو پیش کرتی، لو ایستے بان اس پر بیٹھ جاؤ، اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے لگائے مسکراتا، نہیں مادام تکلف کی ضرورت نہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، ہر ملاقات پر بار بار یہی کرتے کرتے اس کے تلوے چھلنی اور پیٹھ سوختہ ہو چکی تھی مگر کرسی توڑ دینے کی شرمندگی سے بچنے کے لیے ہمیشہ وہی ایک بات: نہیں مادام، تکلف کی ضرورت نہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، اور غالباً اس بات سے قطعی نا آشنا رہتے ہوئے کہ جو ابھی ابھی یہ کہتیں کہ رُکو ایستے بان، کافی تیار ہونے تک تو رک جاؤ، وہی پیٹھ مڑتے ہی زیر لب بول اٹھتیں، آخر کار ٹل گیا دیو پیکر بوبک، اچھا ہوا خوبصورت بھوندو گیا۔ دن نکلنے سے ذرا پہلے لاش کے چاروں طرف بیٹھی ہوئی عورتیں یہی کچھ سوچ رہی تھیں۔ بعد میں جب انھوں نے رومال سے اس کا منہ اس لیے ڈھک دیا کہ دھوپ اس کو کہیں نہ ستائے، تو وہ ان کو جنم جنم کا مرا ہوا لگا، بے یار و مددگار، بالکل ان کے اپنے مردوں کا سا، اور رقت نے ان کے کلیجوں میں ابتدائی دراڑیں ڈال دیں۔ وہ کوئی نوجوان عورت تھی جس نے پہلے پہل رونا شروع کیا، دوسری عورتیں بھی دیکھا دیکھی ٹھنڈی آہوں سے لے کر بین تک کرنے لگیں، اور جتنی زیادہ وہ سسکیاں بھرتیں اتنا ہی زیادہ ان کا دل امنڈتا کہ ڈوب مرنے والا اب ان کی نظروں میں عین مین ایستے بان ہوتا جا رہا تھا، چنانچہ وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں، کیونکہ وہی تو دنیا بھر میں سب سے زیادہ محروم، سب سے زیادہ صلح کل، سب سے زیادہ بامروت تھا، بے چارہ ایستے بان۔ اس لیے جب مرد لوگ یہ خبر لے کر لوٹے کہ مرنے والا آس پاس کی کسی بستی کا نہیں تو عورتوں کو اپنے آنسوؤں کی جھڑی میں مسرت پھوٹتی محسوس ہوئی۔

'خداوند کی حمد ہو،'' انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری، ''یہ اپنا ہے!''

مردوں نے اس کہرام کو زنانہ خرافات جانا۔ رات بھر کی کٹھن پوچھ تاچھ سے بے حال ہو چکنے کے بعد وہ تو بس اتنا چاہتے تھے کہ کسی طرح اس خشک اور ہوا بند دن، دھوپ چڑھ جانے سے پہلے پہلے، اس نووارد کے جھنجھٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فارغ ہو جائیں۔ انہوں نے فالتو

پڑے ہوئے بادبانوں اور ماہی گیری کے نیزوں کو جوڑ جاڑ کر ایک ڈولا سا بنایا اور اس کو رسیوں سے خوب کس کس کر باندھا تا کہ وہ اس کا بوجھ اس وقت تک برداشت کر لے جائے جب تک وہ چٹانوں کے کنارے تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ بار بردار جہاز کا لنگر بھی باندھنا چاہتے تھے تا کہ وہ بہ آسانی قعرِ دریا میں اُتر جائے جہاں مچھلیوں کو بھی کچھ سجھائی نہیں دیتا اور جہاں غوطہ خور تک خشکی کی ہُڑک میں ختم ہو جاتے ہیں، اور پھر اس لیے بھی کہ تند لہریں اس کو دوبارہ کنارے پر نہ لے آئیں، جیسا کہ دوسری کئی لاشوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ مگر مرد جتنی جتنی عجلت کرتے، عورتیں وقت ٹالنے کی اُتنی اُتنی ترکیبیں نکالتیں، اپنے سینوں پر سمندری تعویذ جھلاتی وہ بے چین مرغیوں کی مانند کُڑکُڑاتی پھر رہی تھیں۔ کچھ ایک جانب سے مداخلت کرتیں کہ مرنے والے کو مبارک ہوا والا متبرک احرام پہنایا جائے تو چند دوسری جانب سے رائے دیتیں کہ اس کی کلائی پر قطب نما باندھا جائے، اور ''ایک طرف ہو جا بی بی، راستے سے ہٹ، دیکھو دیکھو! مجھے مُردے پر گرا ہی دیا تھا'' کی کافی سے زیادہ چل پوں کے بعد آخر کار مردوں کے دلوں میں شکوک سر اٹھانے لگے اور انھوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا کہ ایک اجنبی کی خاطر بڑی قربان گاہ والے اتنے سارے چڑھاوے آخر کیوں، کیونکہ چاہے جتنی بھی میخیں چڑھاؤ اور متبرک پانی کے جتنے چاہو اتنے برتن چڑھا دو، پر شارک بہر صورت اس کو چٹ کر جائیں گی۔ مگر عورتیں تھیں کہ لپک جھپک گرتی پڑتی اپنے تبرکات کا سارا کباڑ لا لا کر اس پر نچھاور کیے جا رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ جو کچھ اپنے آنسوؤں سے ظاہر نہیں کر پا رہی تھیں، وہ ٹھنڈی آہوں کی صورت نکال رہی تھیں، یہاں تک کہ مرد لوگ آپے سے باہر ہو گئے۔ ''ارے ایک بھٹکتی لاش، ایک انجانے بے حقیقت آدمی، ایک بدھواری ٹھنڈے گوشت کی خاطر اتنے چونچلے بھی کاہے کو ہوئے تھے جو اَب ہونے لگے؟'' احترام کی اس کمی سے دل برداشتہ ہو کر ان میں سے ایک عورت نے مرنے والے کے منہ پر سے رومال ہٹا دیا، اور پھر تو مردوں کی بھی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

وہ ایستے بان تھا۔ اس کو پہچان لینے کے لیے ان کے سامنے اس کا نام دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر کہا جاتا کہ سر والٹر ریلے، تو وہ شاید اس کے فرنگی لہجے، اس کے کندھے پر بیٹھے طوطے، اس کی آدم خوروں کو مارنے والی توڑے دار بندوق کے رعب میں آ گئے ہوتے، مگر ایستے بان تو سارے عالم میں بس ایک ہی تھا، اور وہ سامنے پڑا تھا، بالکل سفید ویل کی طرح، جوتے اتارے، کسی بونے کا پتلون چڑھائے، سخت ناخنوں والا، جن کو چاقو سے تراشنا پڑا تھا۔ یہ جان لینے کے لیے بس اس کے چہرے سے رومال ہٹنے کی دیر تھی کہ وہ بہت نادم ہے، یوں کہ اس میں اس کا کوئی

قصور نہیں کہ وہ اتنا جہاز کا جہاز، اتنا بھاری بھرکم اور اتنا صورت دار ہے، اور جو کہیں اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ سب کچھ یوں ہوگا تو اس نے اپنی غرقابی کے لیے کوئی الگ تھلگ سی جگہ دیکھی ہوتی۔ مذاق نہیں، میں تو بلکہ حالات سے بیزار ہو جانے والے آدمی کی طرح اپنے گلے میں کسی جنگی جہاز کا لنگر باندھ بوندھ کر کسی کراڑ پر سے جا لڑھکتا تاکہ اب تو اس بدھواری لاش کی طرح لوگوں کو پریشان نہ کروں۔ بقول آپ لوگوں کے، ٹھنڈے گوشت کے اس غلیظ لوتھڑے سے کسی کا ناک میں دم کیوں کیا جائے جس سے اب میرا کوئی واسطہ بھی نہ ہو۔ اس کے انداز میں اس قدر کھری صداقت تھی کہ نہ صرف ان سب سے زیادہ وہی لوگوں کے، جو کہ سمندر میں گزاری ہوئی ان بے انت راتوں کی تلخیوں کو محسوس کر سکتے تھے جن میں ان کو یہ خوف کھائے جاتا تھا کہ کہیں ان کی عورتیں ان کے خواب دیکھتے دیکھتے تھک ہار کر غرق ہو جانے والوں کے خواب نہ دیکھنے لگی ہوں، بلکہ دوسرے ان سے بھی بڑھ کر سخت لوگوں تک کے تن بدن کے رونگٹے ایستے بان کی بے ریائی پر کھڑے ہو گئے۔

اور یوں اُنھوں نے اپنی ذہنی اُڑان کے مطابق ایک لاوارث ڈوب مرنے والے کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا۔ جب کچھ عورتیں پھولوں کی تلاش میں قریب کے گاؤں میں گئیں تو وہاں سے ان عورتوں کو ساتھ لے آئیں جن کو سنی سنائی پر اعتبار نہ آیا تھا، اور جب انھوں نے مرنے والے کے دیدار کر لیے تو وہ مزید پھول لانے چل دیں اور پھر تو اور آتے گئے، یہاں تک کہ وہاں اس قدر پھول اور اتنی زیادہ خلقت جمع ہو گئی کہ پیر سرکانے بھر کی جگہ نہ رہی۔ آخری لمحات میں ان کا دل اس بات پر دکھا کہ اس کو یتیمی کی حالت میں پانی کے سپرد کر دیا جائے، اور انھوں نے اپنے معتبرین میں سے اس کے باپ اور ماں کو منتخب کیا، اور خالائیں اور پھوپھیاں اور چچا اور ماموں اور خلیرے اور چچیرے اور ممیرے بھائی بند، یہاں تک کہ اس کے توسط گاؤں کا گاؤں ایک دوسرے کا قرابت دار بن گیا۔ چند ملاح جنھوں نے دور سے ان کے بین سنے، اپنے راستے سے بھٹک گئے اور لوگوں نے ایک کے بارے میں یہاں تک سنا کہ اس نے قدیم داستانوں کی سائرن عورتوں کا گمان کرتے ہوئے خود کو مرکزی مستول سے کس کر بندھوا لیا۔ جس وقت وہ سب چٹانوں کی کھڑواں رپٹ پر اس کو اپنے اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے شرف کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے، اس وقت اپنے ڈوب مرنے والے کے کروفر اور حسن کا سامنا کرتے ہوئے، کیا مرد اور کیا عورتیں سبھی کو پہلی بار اپنی گلیوں کی ویرانی، اپنی انگنائیوں کی بے برگ و باری اور اپنے خوابوں کی تنگ دامنی کا احساس ہوا۔ انھوں نے اس کو لنگر کے بغیر ہی جانے دیا تاکہ اگر

وہ آنا چاہے تو واپس آسکے، جب بھی وہ آنا چاہے۔ اور جگلوں کے اس مختصر ترین پل تک وہ سب دم سادھے رہے جب تک کہ لاش گہرائی میں نہ پہنچ گئی۔ یہ جان لینے کے لیے کہ وہ سب نہ اب وہاں موجود ہیں اور نہ کبھی ہوں گے، انھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر وہ اتنا ضرور جان گئے تھے کہ اس وقت کے بعد ہر چیز کی کایا پلٹ جائے گی، اب ان کے گھروں کے دروازے کشادہ، چھتیں بلند اور فرش مضبوط ہوا کریں گے، تاکہ ایستے بان کی یاد جہاں چاہے کڑیوں سے سر ٹکرائے بغیر آ جا سکے اور آئندہ کسی کو بھی زیرِ لب یہ کہنے کی ہمت نہ ہو کہ دیو پیکر بوبک آخر کار مر گیا، بہت برا ہوا خوبصورت بھوندو انجام کار جاتا رہا، کیونکہ اب وہ ایستے بان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے اپنے گھروں کو باہر سے چٹکیلے رنگوں سے رنگنے جا رہے تھے اور چٹانوں کے درمیان سے چشمے نکالنے اور کراڑوں پر پھولوں کی تختہ بندی کرنے کے لیے جی توڑ مشقت کرنے جا رہے تھے، تاکہ آنے والے زمانوں میں صبح سویرے بڑے بڑے جہازوں کے مسافر سمندر پر آتی ہوئی پھولوں کی مہکار سے گھٹ کر جاگ اٹھیں، اور کپتان کو اپنی پوری وردی، اپنے اسطرلاب، اپنے قطب تارے اور جنگ میں کمائے ہوئے اپنے تمغوں سمیت عرشے پر اتر کر آنا پڑے، اور پھر سامنے افق پر گلابوں کی پٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ چودہ زبانوں میں کہے: اُدھر دیکھو جہاں ہوا اتنی پرسکون ہے جیسے کیاریوں میں پڑی نیند لے رہی ہو، اُدھر جہاں دھوپ اتنی روشن روشن ہے کہ سورج مکھی بھی حیران ہے کہ کدھر منھ کرے، وہاں اُس طرف، وہی ایستے بان کا گاؤں ہے۔



(مشمولہ: ''گابرئیل گارسیا مارکیز: منتخب تحریریں''، کراچی، آج، ۲۰۱۱ء)

بڑے بڑے پروں والا ایک بوڑھا پھوس

ترجمہ: عطا صدیقی

لگا تار بارشوں کے تیسرے دن وہ اتنے بہت سے کیکڑے ٹھکانے لگا چکے تھے کہ پیلایو کو اپنا پانی بھرا صحن پار کر کے اس سب کو سمندر میں پھینکنے کے لیے جانا پڑا۔ بات یہ تھی کہ نومولود بچے کو تیز بخار تھا، اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کا سبب ان کیکڑوں کی بساند ہے۔ منگل کے دن سے سارا عالم اداس اداس تھا۔ کیا سمندر اور کیا آسمان، سب ایک جیسے گدلے گدلے دکھائی دے رہے تھے، اور ساحل کی وہ ریت جو مارچ کی راتوں میں مثل افشاں کے جھلملایا کرتی تھی، اس وقت کیچڑ اور سڑے بُسے گھونگوں کی گاد بن چکی تھی۔ عین دوپہر میں بھی روشنی اتنی کم تھی کہ پیلایو جب کیکڑے پھینک کر گھر واپس آرہا تھا تو اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آخر وہ کیا شے ہے جو صحن کے پچھواڑے رینگ رہی ہے اور کراہ رہی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ایک بڈھا ہے، اسے اس کے بہت ہی قریب جانا پڑا: ایک پیرِ فرتوت جو منھ کے بل کیچڑ میں پڑا ہے اور سر توڑ کوشش کے باوجود اپنے بڑے بڑے پروں کی وجہ سے اٹھ نہیں پا رہا۔

اس کابوس سے دہشت زدہ ہو کر پیلایو اپنی بیوی ایلی سینڈا کو بلانے لپکا، جو کہ بیمار بچے کے ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھ رہی تھی، اور اس کو لے کر صحن کے پچھواڑے تک آیا۔ دونوں زمین پر پڑے ہوئے اس جسم کو گم سم، پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ وہ چندیاں بٹورنے والوں کا سا لباس پہنے تھا۔ اس کی سپاٹ چندیا پر چند گنے چنے بال رہ گئے تھے اور منہ میں دانت بھی اکا دکا تھا، اور اس کی تر بتر، سگرودادوں والی افسوسناک حالت نے اس کی رہی سہی شان کو، جو اس میں کبھی رہی ہوگی، خاک میں ملا دیا تھا۔ اس کے میلے، اَدھ نُچے، بڑے بڑے عقاب جیسے پنکھ ہمیشہ

کے لیے کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ دونوں اس کو اتنی دیر تک اور اتنے غور سے دیکھا کیے کہ پیلایو اور ایلی سینڈا کی حیرانی دھیرے دھیرے جاتی رہی، اور ہوتے ہوتے وہ ان کو مانوس سا لگنے لگا۔ تب انھوں نے اس سے بات کرنے کی ہمت کی، جس کا جواب اس نے ملاحوں کی سی بھاری آواز میں کسی انجانی زبان میں دیا۔ یوں انھوں نے پروں والی دقت کو نظر انداز کرتے ہوئے، اپنی دانست میں بڑی دانشمندی سے، یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ طوفان کے مارے کسی شکستہ فرنگی جہاز کا آخری بچ جانے والا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے پڑوس کی اُس عورت کو بلا لیا جو زندگی اور موت کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی، تاکہ وہ اس کا معائنہ کر لے۔ ان کے غلط اندازے کو جھٹلانے کے لیے اس عورت کا اس کو بس ایک نظر دیکھنا کافی تھا۔

''یہ تو فرشتہ ہے۔'' اس نے ان کو بتایا۔ ''وہ بچے کے لیے آ رہا ہوگا، پر بے چارہ اتنا بوڑھا ہے کہ بارش نے راستے ہی میں ڈھیر کر دیا۔''

اگلے دن سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ایک جیتا جاگتا فرشتہ پیلایو کے گھر میں بند ہے۔ پڑوس کی سیانی عورت کی رائے کے برخلاف، جس کا کہنا تھا کہ آج کل کے فرشتے دراصل ایک آسمانی سازش کے بعد بچ جانے والے بھگوڑے ہیں، ان کا دل نہ مانا کہ وہ ڈنڈے مار مار کر اس کی جان نکال دیں۔ اپنا بیلف والا ڈنڈا اٹھائے اٹھائے پیلایو ساری سہ پہر باورچی خانے میں بیٹھا اس کی نگرانی کرتا رہا۔ اور رات کو سونے سے قبل اس نے اسے کیچڑ میں سے گھسیٹا اور لے جا کر جالی دار ڈربے میں مرغیوں کے ساتھ بند کر دیا۔ آدھی رات گئے جس وقت بارش تھمی تو پیلایو اور ایلی سینڈا ابھی کیکڑے ہی مار رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بچے کی آنکھ کھل گئی: اس کو بخار نہیں تھا اور وہ کچھ کھانے کو مانگ رہا تھا۔ تب ان کی دریا دلی نے جوش مارا اور انھوں نے طے کر لیا کہ وہ فرشتے کو تازہ پانی اور تین دن کی رسد دے کر، ایک تختے پر سوار کرا کے، سمندر میں تن بہ تقدیر چھوڑ آئے گے۔ مگر جب وہ منھ اندھیرے صحن میں گئے تو کیا دیکھا کہ پورا محلّہ ٹولہ ڈربے کے سامنے جمع، فرشتے کے ساتھ دل لگی بازی میں لگا ہے۔ وہ ٹوٹی ہوئی جالی میں سے کھانے کی چیزیں ذرا سے بھی ادب واحترام کے بغیر اس کی طرف اس طرح پھینک رہے تھے جیسے وہ کوئی علوی وجود نہ ہو بلکہ سرکس کا کوئی جانور ہو۔

اس عجیب وغریب خبر سے گھبرا کر پادری گون زاگا کوئی سات بجے سے پہلے ہی پہلے آ گئے۔ اس وقت تک صبح والوں سے ذرا کم شریر تماش بین آ چکے تھے، اور قیدی کے مستقبل کے بارے میں جو منھ میں آ رہا تھا، رائے زنی کر رہے تھے۔ ان میں سب سے بھولے کا خیال تھا کہ اس

کو ساری دنیا کا میسّر نامزد کر دیا جائے۔ ذرا زیادہ عقل کے بوڑھوں نے محسوس کیا کہ اس کو پنج ستاری جنرل ہونا چاہیے کہ ساری جنگیں فتح کر لے۔ چند خیال پرستوں نے آس لگائی کہ اس سے نسل کشی کا کام بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ روئے زمین پر پَردار سیانوں کی ایک ایسی نسل پیدا کر دے جو پوری کائنات کا چارج سنبھال سکے۔ لیکن پادری گون زاگا پادری بننے سے پہلے ایک تنو مند لکڑہارے رہ چکے تھے۔ جالی کے پاس کھڑے کھڑے انھوں نے جھٹ پٹ علمِ دینیات کے تمام سوالات و جوابات کو دماغ میں تازہ کیا اور ان لوگوں سے کہا کہ دروازہ کھولیں تاکہ وہ قریب سے اس دُکھیا آدمی کو دیکھیں جو حیران پریشان، مرغیوں کے درمیان خود ایک بڑی سی خستہ حال مرغی لگ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں پھلوں کے چھلکوں اور بچے کھچے ناشتے کی چیزوں کے درمیان، جو صبح کو آنے والے پھینک گئے تھے، پڑا اپنے پھیلے ہوئے پروں کو دھوپ میں سکھا رہا تھا۔ جس وقت پادری گون زاگا نے ڈربے میں داخل ہو کر لاطینی زبان میں صبح بخیر کہا تو اس نے دنیا کی گستاخیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بس اپنی عمر رسیدہ نظریں اٹھائیں اور اپنی بولی میں کچھ منمنایا۔ جب پادری گون زاگا نے دیکھا کہ نہ تو وہ خدا کی زبان جانتا ہے اور نہ اس کے خادموں کے استقبال کے آداب سے واقف ہے، تو ان کو پہلی بار اس پر جعلیا ہونے کا شبہ ہوا۔ پھر انھوں نے غور کیا کہ بہت قریب سے دیکھنے پر وہ بالکل آدمیوں جیسا ہے۔ اس کے پاس سے کھلے میں رہنے والوں کی سی ناقابلِ برداشت بو آ رہی تھی، اس کے پروں میں جوئیں بجک رہی تھیں اور زمینی ہواؤں نے اس کے اصل پروں کا براحشر کر دیا تھا اور اس میں کوئی بات بھی تو ایسی نہیں تھی جو فرشتوں کے قابلِ فخر وقار کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ پھر وہ ڈربے سے باہر آئے اور ایک مختصر خطبے کے ذریعے متجسس نفوس کو طباع بننے کے خطرات سے خبردار کیا۔ انھوں نے ان کو یاد دلایا کہ شیطان کی ایک بری عادت کارنیوالی کرتبوں کا استعمال کرنا بھی ہے تاکہ غافلوں کو دھوکا دے سکے۔

انھوں نے دلیل پیش کی کہ اگر ہوائی جہاز اور عقاب میں فرق کرنے کے لیے پنکھ لازمی عنصر نہیں تو فرشتوں کی پہچان کے لیے تو ان کی اہمیت اور بھی کم ہوگی۔ پھر بھی انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اُسقف کو عریضہ روانہ کریں گے، تاکہ وہ اپنے اُسقفِ اعظم کو اس بابت لکھیں، تاکہ وہ پاپائے روم کو لکھیں، اور یوں اعلیٰ ترین عدالت سے قول فیصل حاصل ہو جائے گا۔

ان کی دانشمندی چکنے گھڑوں پر ضائع گئی۔ اسیر فرشتے کی خبر اتنی تیزی سے پھیلی کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر صحن میں بازار کی سی چہل پہل ہوگئی اور سنگین بردار سپاہی بلوانے پڑے تاکہ

اس مجمعے کو منتشر کریں جو کہ مکان کو تلپٹ کیے دے رہا تھا۔ ایلی سیندا کو جس کی کمر اتنا سارا بازاری گند جھاڑتے جھاڑتے دوہری ہو چکی تھی، یہ سوجھ گئی کہ صحن میں کٹہرا لگا دے اور فرشتے کو دیکھنے کے لیے ہر ایک سے پانچ پانچ سینٹ وصول کر لے۔ مشتاقانِ دید دور دور سے آنے لگے۔ ایک گشتی کارنیوال نے پھیرا لگایا۔ اس میں ایک اُڑان بھرنے وال نَٹ مجمعے کے سروں پر بار بار پھڑ پھڑاتا پھرا، مگر کسی نے اسے گھاس نہ ڈالی کیونکہ اس کے پَر فرشتوں کی مانند نہیں تھے بلکہ چمگادڑوں جیسے تھے۔ زمانے بھر کے بدنصیب ترین معذور لوگ تندرستی کی آس میں آتے لگے۔ ایک دُکھیاری جو بچپن سے دل کی دھڑکنیں شمار کر رہی تھی اور گنتے گنتے جس کی گنتی ہی ختم ہو گئی تھی، ایک پرتگالی مرد جو اس لیے سو نہیں سکتا تھا کہ ستاروں کا شور اس کو تنگ کرتا تھا، ایک نیند میں چلنے والا جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے دن میں کیے ہوئے کام بگاڑا کرتا تھا اور دوسرے، بہت سارے جن کے مرض ان سے ذرا کم تشویش ناک تھے۔ پیروں تلے کی زمین ہلا دینے والی، ڈوبتے جہاز جیسی اس ہڑبونگ کے بیچ پیلایو اور ایلی سیندا اپنی تھکن میں بھی مگن تھے، کیونکہ ایک ہفتے سے بھی کم مدت میں انھوں نے اپنا گھر رقم سے ٹھسا ٹھس بھر لیا تھا اور اب بھی اپنی باری کے منتظر زائرین کی قطار افق کے اُس پار تک پہنچی ہوئی تھی۔

فرشتہ ہی فقط ایک واحد ہستی تھا جو خود اپنے تماشے میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا۔ جالی کے نزدیک رکھے گئے تیل کے چراغوں اور عشائے ربانی والی موم بتیوں کی جہنمی تمازت سے چکرایا چکرایا سا، وہ اپنا وقت اپنے مانگے کے ٹھکانے میں آسائش کی جستجو میں گزارتا۔ اوّل اوّل انھوں نے اس کو کپڑوں میں رکھنے والی گولیاں کھلانے کی کوشش کی، جو سیانی پڑوسن کے علم کے مطابق فرشتوں کی غذا تھی، لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا، بالکل اسی طرح جیسے اس نے پوپ کا وہ خاصہ کھانے سے انکار کر دیا تھا جو تائب لوگ لاتے تھے۔ وہ اتنا بھی نہ جان سکے کہ اس کا سبب اس کا فرشتہ ہونا تھا یا یہ کہ وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور آخر کو وہ بینگن کے گودے کے سوا کچھ نہیں کھاتا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت ہی ایک اکیلی خارقِ عادت بات نظر آتی تھی، خاص کر ابتدائی ایام میں، جب مرغیاں ان سماوی جوؤں کی تلاش میں جو اس کے پروں کے اندر بڑھتی چلی جا رہی تھیں ٹھونگیں مارا کرتیں، اور اپاہج لوگ اپنے ناقص اعضا سے چھُوانے کے لیے اس کے پر نوچا کرتے، اور سب سے زیادہ مہربان لوگ تک اس کو کھڑا کرنے کی کوشش میں پتھر مار دیا کرتے تاکہ وہ اس کو کھڑے قد دیکھ سکیں۔ وہ صرف ایک بار اس کو اپنی جگہ سے ہلانے میں کامیاب ہو سکے تھے، جب انھوں نے بچھڑوں کو داغنے والے لوہے سے اس کے پہلو میں چرکا لگا دیا تھا۔ بات یہ تھی کہ

وہ اتنے گھنٹوں سے بے حس وحرکت پڑا تھا کہ انھوں نے سوچا کہیں مر نہ گیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے بھرے اپنی جناتی زبان میں بلبلانے لگا اور دو ایک بار اپنے پَر پھڑپھڑائے تو مرغیوں کی بیٹ اور قمری خاک کا بگولا ناچنے لگا اور دہشت کا وہ جھکڑ چلا جو اس دنیا کا تو لگتا نہیں تھا۔ گو بہتوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ خفگی کا نہیں بلکہ تکلیف کا مظاہرہ تھا، مگر اس دن کے بعد سے وہ سب احتیاط کرنے لگے کہ اس کو ناراض نہ کریں، کیونکہ اکثر لوگ سمجھ چکے تھے کہ اس کی مفعولیت اُس سورما کی سی نہیں جو اگلے حملے کے لیے سستا رہا ہو، بلکہ خوابیدہ فتنے کی سی ہے۔

قیدی کی اصلیت کے بارے میں قولِ فیصل آنے کے انتظار کے دوران پادری گون زاگا نے مجمعے کی شرارتوں کو خادماؤں کی سی سوجھ بوجھ والے چٹکلوں سے قابو میں رکھا۔ مگر روم کی ڈاک نے آنے میں کوئی عجلت نہ دکھائی، کبھی وہ لوگ یہ دیکھتے کہ اس کی ناف ہے یا نہیں، کبھی یہ سوچتے کہ اس کی بولی کا تعلق آرامی زبان سے تو نہیں، کبھی یہ کہ ایک سوئی کی گھنڈی پر وہ کتنی مرتبہ سما سکتا ہے، یا یہ کہ کہیں وہ محض کوئی پردار نارو ے والا نہ ہو اور یوں وہ لوگ اپنا وقت بتایا کرتے تھے۔ اگر رحمتِ خداوندی نے آڑے آکر پادری کی زحمتوں کا خاتمہ نہ کر دیا ہوتا تو یہ مختصر سے عریضے قیامت تک آتے جاتے رہتے۔

ہوا یہ کہ انھی دنوں میں آنے والے بہت سے کھیل تماشوں میں ایک ایسی عورت کا گشتی تماشا بھی آیا جس کو والدین کی نافرمانی کرنے پر مکڑی بنا دیا گیا تھا۔ اس کو دیکھنے کی قیمت نہ صرف یہ کہ فرشتے کی دید کی رقم سے کم تھی، بلکہ لوگوں کو اس بات کی بھی اجازت تھی کہ وہ اس کی مضحکہ خیز حالت کے بارے میں قسم قسم کے سوالات بھی پوچھ سکیں اور سر سے پیر تک اس کو چھو کر معائنہ بھی کر سکیں تاکہ کسی کو بھی اس ہولناک حقیقت پر کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ وہ مینڈھے جتنی ایک ڈراؤنی ٹرن ٹولا مکڑی تھی جس کا ایک سر ایک غمزدہ دوشیزہ کا سا تھا۔ تاہم سب سے بڑھ کر دل ہلا دینے والی شے اس کی نامانوس ہیئت نہ تھی بلکہ وہ پُرخلوص اندازِ بیان تھا جس میں وہ اپنی بپتا کی ایک ایک تفصیل سناتی تھی۔ ابھی وہ بالی ہی تھی کہ ایک بار ناچ رنگ میں حصہ لینے کے لیے گھر سے چھپ کر چپ چاپ نکل گئی تھی، اور جب وہ بغیر اجازت لیے ساری رات ناچ لینے کے بعد جنگل میں سے ہوتی ہوئی گھر لوٹ رہی تھی تو ایک ہولناک کڑاکے نے آسمان کو دو کر دیا، اور شگاف میں سے لاوے کا برقی تیر سالپکا جس نے اسے مکڑی بنا دیا۔ اس کا پیٹ فقط ان کوفتوں سے بھرتا تھا جو سخی لوگ اس کے منہ میں ڈال دیتے تھے۔ ایک ایسے نظارے کو جس میں اتنی انسانی

سچائی بھری ہو اور اتنی خوف دلانے والی نصیحت ہو، کوشش کیے بغیر ایک ایسے نک چڑھے فرشتے کی نمائش پر غالب رہنا ہی تھا جو فانی انسانوں کی طرف آنکھ اٹھانا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ علاوہ ازیں جو تھوڑی بہت کرامات فرشتے سے منسوب کی گئیں ان میں بھی کچھ نہ کچھ عقل کا فتور نظر آیا۔ مثلاً وہ نابینا جس کو بینائی تو نہ ملی مگر تین نئے دانت نکل آئے، یا وہ مفلوج جو چل تو نہ سکا لیکن لاٹری تقریباً جیت لی، اور وہ کوڑھی جس کے زخموں کے اندر سے سورج مکھی پھوٹ نکلے۔ ان بہلانے والی کرمات کے سبب جو کہ ہنسی دل لگی سے زیادہ کیا تھیں، فرشتے کی ساکھ گر تو چکی تھی کہ مکڑی بن جانے والی عورت نے آ کر آخر کار اس کو بالکل ملیا میٹ کر دیا، اور یوں پادری گون زاگا کا بے خوابی کا روگ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاتا رہا، اور پیلایو کا آنگن بھی پھر سے اتنا ہی خالی خالی رہنے لگا جتنا وہ اس تین دن کی بارشوں کے زمانے میں تھا جب کیکڑے کمروں میں رینگا کرتے تھے۔

گھر والوں کے لیے کڑھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جو رقم انھوں نے اس دوران جمع کر لی تھی اس سے انھوں نے چھجوں اور پھلواریوں والی دو منزلہ حویلی کھڑی کر لی جس میں اونچی اونچی جالیاں لگائی گئی تھیں کہ جاڑوں میں کیکڑے نہ گھس آئیں، اور دریچوں میں لوہے کی سلاخیں لگوائی گئی تھیں کہ فرشے اندر نہ آ جائیں۔ پیلایو نے بستی کے قریب ہی خرگوش پالنے کا کاروبار جما لیا اور بیلفِ کی نوکری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی اور ایلی سیندا نے ساٹن ایڑی والے چند پمپ اور ست رنگی ریشم کی پوشاکیں خریدیں، وہی جو اس زمانے کی من موہنی عورتیں اتوار کے دن زیبِ تن کیا کرتی تھیں۔ بس مرغیوں کا دڑبا ہی ایک ایسی چیز تھا جس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ جو وہ کبھی کبھار اس کی دھلائی کریولن سے کر دیتے تھے اور اس کے اندر مُر اور لوبان سلگا دیتے تھے تو یہ کوئی فرشتے کی عقیدت میں نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد فضلے کی اس سڑاند سے پیچھا چھڑانا ہوتا تھا جو آسیب کی طرح ہر وقت لپٹی رہتی تھی اور ان کے نئے مکان کو بھی پرانا کیے دے رہی تھی۔ جب بچے نے چلنا سیکھ لیا تو پہلے پہلے انھوں نے احتیاط کی کہ وہ دڑبے کے بہت نزدیک نہ جانے پائے، پھر رفتہ رفتہ ان کا خوف دور ہوتا گیا، اور وہ بد بو کے عادی ہوتے گئے، اور دوسرا دانت نکلنے سے پہلے ہی بچہ کھیلنے کے لیے جہاں سے جالی ٹوٹ رہی تھی دڑبے میں گھس گیا۔ فرشتہ بچے سے بھی اتنا ہی لیے دیے رہا جتنا وہ دوسرے لوگوں سے رہتا تھا، مگر وہ اس کی نت نئی چھیڑ خانیوں کو اس کتے کے سے صبر سے برداشت کرتا رہتا جس کو کوئی خوش فہمیاں نہ ہوں۔ دونوں کو ایک ساتھ خسرہ نکل آئی۔ جس ڈاکٹر نے بچے کا علاج کیا وہ فرشتے کے دل کی دھڑکن سننے کے شوق کو دبا نہ سکا، اور

اس نے اس کے دل میں اس قدر سیٹیاں بجتی اور گردے میں اتنی آوازیں سنیں کہ اس کو فرشتے کا زندہ رہنا محال نظر آیا۔ پروں کی تُک نے اس کو سب سے زیادہ حیرت میں ڈالا۔ اس مکمل انسانی بدن پر وہ اتنے فطری لگتے تھے کہ ڈاکٹر کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ آخر سب انسانوں کے جسم پر وہ کیوں نہیں ہوتے۔

جس وقت بچے نے اسکول جانا شروع کیا تو مرغی خانے کو دھوپ اور بارشوں کی وجہ سے تباہ ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ فرشتہ ایک بھٹکتے ہوئے جاں بہ لب آدمی کی طرح یہاں وہاں گھسٹتا پھرتا تھا۔ وہ اسے جھاڑو مار مار کر خوابگاہ میں سے نکالتے تو پل بھر بعد وہ باورچی خانے میں نظر آتا وہ بیک وقت اتنے مقامات پر نظر آنے لگا کہ وہ یہ سوچنے لگے کہ وہ ایک سے دو ہو گیا ہے، کہ وہ گھر بھر میں اپنی نوع کو بڑھاتا پھر رہا ہے اور بھنائی اور بولائی ہوئی ایلی سیندا چیخ پڑی کہ اس فرشتوں بھرے جہنم زار میں جینا دوبھر ہو گیا۔ وہ اب مشکل ہی سے کھایا تا تھا، اور اس کی بوڑھی آنکھیں دُھندلا گئی تھیں کہ وہ ستونوں سے ٹکراتا پھرتا تھا۔ اب اس کے پاس جھڑے ہوئے آخری پروں کے ننگے سرے ہی رہ گئے تھے۔ پیلایو اس پر کمبل ڈال دیتا اور اتنا احسان اور کرتا کہ اس کو سائبان میں پڑ رہنے دیتا۔ اور تب ہی انھوں نے دیکھا کہ رات کو اسے بخار ہو جاتا اور وہ ہذیانی سا ہو کر بوڑھے نارویے والوں کی طرح زبان گھمایا کرتا۔ یہ چند موقعوں میں سے ایک موقع تھا جب وہ پریشان ہو گئے، کیونکہ انھوں نے سوچا کہ اس کا آخری وقت آگیا اور پڑوس کی سیانی عورت بھی یہ بتانے سے قاصر تھی کہ وہ مرتے ہوئے فرشتے کے لیے کیا کیا کریں۔

اس کے باوجود وہ نہ صرف یہ کہ اپنا بدترین موسمِ سرما جھیل گیا بلکہ دھوپ سے روشن دنوں کے شروع ہوتے ہی سنبھالا لیتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ صحن کے پرلے سرے پر، سب کی نظروں سے دور، کئی دنوں تک چپ چاپ پڑا رہا، اور دسمبر شروع ہوتے ہی چند لمبے اور سخت پر اس کے شہپروں پر نمودار ہونے لگے، بجو کے کے پر جو اس سے کہیں زیادہ، ناتوانی کی ایک اور نحوست دکھائی دیتے تھے۔ مگر وہ اپنی تبدیلیوں کی وجہ ضرور جانتا ہوگا، اسی لیے وہ اس بات کا بہت خیال رکھتا تھا کہ کوئی ان تبدیلیوں کو دیکھ نہ لے، کوئی وہ سمندری گیت نہ سن لے جو وہ وقتاً فوقتاً تاروں کی چھاؤں میں گنگنایا کرتا تھا۔ ایک صبح ایلی سیندا بیٹھی پیاز کتر رہی تھی کہ ہوا کا ایک جھونکا جو سمندروں پر سے ہوتا ہوا آرہا تھا، باورچی خانے میں در آیا۔ وہ اٹھ کر دریچے کے پاس گئی اور تب ہی اس نے فرشتے کو اُڑان بھرنے کی ابتدائی کوششیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ کوششیں اس قدر بھونڈی تھیں کہ اس کے ناخنوں نے سبزی کی کیاری میں گہرا نشان ڈال دیا تھا، اور اپنے پروں کی

بھدی سی پھڑ پھڑاہٹ سے، جو ہوا میں ٹِک نہیں پا رہے تھے، وہ سائبان کو گراتے ہی والا تھا۔ پھر بھی وہ تھوڑا بہت اوپر اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایلی سینڈا نے جب اس کو ایک پھُوس عقاب کی طرح تشویش ناک انداز میں پَر ہلا ہلا کر، اور کسی نہ کسی طرح خود کو ہوا میں سنبھالے، آخری مکانوں کے اوپر سے دور ہوتے دیکھا تو اس نے خود اپنے لیے اور اس کی خاطر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی، پیاز کترنے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ تکتی رہی، اور اس وقت تک نظریں جمائے رہی جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ اس کے جی کا جنجال نہ تھا بلکہ سمندری افق پر ایک خیالی نقطہ تھا۔



(مشمولہ: ''گابریئل گارسیا مارکیز: منتخب تحریریں''، کراچی، آج، ۲۰۱۱ء)

نثر پارہ

ایک اغوا کی خبر

(ایک خصوصی اقتباس)

ترجمہ: خالد سعید

[ہسپانوی سے انگریزی ترجمہ ایڈیشن پر پہلی نظر گیبریئل گارسیا مارکیز نے ہفت وار رسالہ نیوز ویک کو اپنی تازہ کتاب (News of Kidnapping) سے ایک مختصر اقتباس شائع کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ایڈتھ گراسمین (Edith Gross Man) نے کیا ہے۔ اس مترجم نے مصنف کی اور کتابوں (Love in the Times Of Cholera) (وبال کے دنوں میں محبت) (General in his own Labyrith) (جنرل خود اپنے ہی جال)، (Strange Pilgrims) (نامانوس زائرین) اور ''Of Love Other Demons'' ''کچھ محبت'' اور دیگر آفات کے بارے میں'' کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے۔ ''Love in the Times of Cholera'' کا ترجمہ معروف اُردو ناول نگار ارشد وحید ''وبا کے دنوں میں محبت'' کے نام سے کیا ہے۔ (مترجم)]

''کمرے میں روشنی اتنی مدہم تھی کہ اُن کی آنکھوں کو وہاں دیکھنے کا عادی ہونے کے لیے کچھ عرصہ لگا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جو دو ضرب تین مربع میٹر سے زائد ہر گز نہ تھی۔ اُس میں اوپر کی

جانب ایک تختے سے بنی کھڑکی تھی۔ یہاں فرش پر پیال سے بھرے گدے پر دو مرد بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے پہلے گھر والے آدمیوں کی طرح اپنی گردنوں پر ہڈ چڑھائے ہوئے تھے اور وہ ٹی وی دیکھنے میں منہمک تھے۔ یہاں ہر شے سے اُداسی اور اضمحلال ٹپکتے تھے۔ دروازے کے بائیں جانب ایک کونے میں لوہے کے پائیوں سے بنے تنگ بستر پر ایک انتہائی کمزور اور زرد رُو عورت بیٹھی تھی۔ وہ انسان کی بجائے محض ایک عکس دکھائی دے رہی تھی۔ مرجھائے ہوئے سفید بال، چندھیائی ہوئی آنکھیں، ہڈیوں پر منڈھی ہوئی جھری دار جلد، اُس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا کوئی نشان نہ ملتا تھا کہ اُس نے انہیں اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہو، نہ تو اُس نے انہیں ایک نظر دیکھا اور نہ ہی کوئی ذرا گہری سانس لی۔ کسی ردِ عمل کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایک نعش بھی اِس قدر مردہ اور بے روح دکھائی نہ دے سکتی تھی۔ ماروجا (Maruja) کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ کون تھی، تو اُسے اپنے اوپر طاری ہونے والے صدمے کی کیفیت کو روکنے کے لئے بڑی کوشش سے کام لینا پڑا۔ ''میرینا (Marina) اُس نے سرگوشی کی۔

میرینا مونٹویا (Marina Montoya) کو تین مہینے قبل اغوا کیا گیا تھا اور قریب قریب ہر شخص کا خیال یہ تھا کہ اَب تک اُسے مار دیا گیا ہوگا۔ اُس کا بھائی ڈان جرمین مونٹویا (Don German Montoya) جمہوریہ کے صدر کا جنرل سیکرٹری رہا تھا اور ورجیلیو بارکو (Virgilio Barco) کی سرکار میں ایک طاقتور اور انتہائی بارسوخ شخصیت تھا۔ اُس کے بیٹے الوارو ڈائیگو (Alvary Diego) کو جو پروبولسا میں ایک باصلاحیت اور موثر منتظم تھا، ڈرگ کا کاروبار کرنے والوں نے اغوا کرلیا تھا تاکہ حکومت کو مذاکرات کرنے پر مجبور کیا جاسکے۔ ظاہری تاثر یہ تھا کہ ڈان جرمین نے اپنے بیٹے کی خاطر مافیا والوں سے سمجھوتا کرلیا تھا اور اُس کے بیٹے کو انہوں نے رہا بھی کر دیا تھا لیکن سرکار نے معاہدے کے اپنے حصے کا پاس نہ کیا اور کچھ مہینوں کے بعد جب اُس کی بہن میرینا کو اغوا کیا گیا تو اکثر حلقوں میں اِس واقعہ کی تعبیر ایک سنگین انتقامی کاروائی کے طور پر کی گئی کیونکہ اب اُسے یرغمال بنا کر کچھ حاصل نہ کیا جا سکتا تھا۔ بارکو (Barco) سرکار اَب باقی نہ رہی تھی، جرمین مونٹویا، اَب کینیڈا میں کولمبیا کا سفیر تھا اور ہر شخص کے ذہن میں یہ خیال واضح تھا کہ انہوں نے میرینا (Marina) کو محض بے دردی سے ہلاک کرنے کی نیت سے اغوا کیا تھا۔

اُس کے اغوا پر شروع شروع میں تو بہت شور و ہنگامہ ہوا، قومی اور بین الاقوامی رائے عامہ حرکت میں آگئی، پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرینا (Marina) کا نام اخبارات کے

صفحات سے غائب ہو گیا۔ ماروجا (Maruja) اور بیٹ رز اُسے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن یہاں اُس کی موجودگی کو تسلیم کرنا اُن کے لیے بے حد کٹھن ہو رہا تھا۔ جہاں تک اُن دونوں کا تعلق تھا۔ یہ امر واقعہ کہ اُنہیں بھی میرینا والے سیل میں لایا گیا تھا، کا صرف یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ یہاں وہ اُن قیدیوں کے سیل میں تھے، جنہیں بہت جلد ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے۔ میرینا نے انہیں دیکھ کر بھی اپنے جسم کے کسی عضو کو حرکت نہ دی۔ ماروجا نے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور اُس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میرینا کے ہاتھ نہ تو گرم تھے اور نہ ہی سرد، حقیقت یہ تھی کہ اُس کے وجود کے درجہ حرارت سے کسی قسم کی کوئی خبر نہ مِل رہی تھی۔

رات کے وقت مکمل خاموشی تھی اور بے اَنت تنہائی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ اِس میں کبھی کبھار ایک دیوانہ مُرغا مخل ہوتا، جو حِس زماں سے محروم ہوتا اور جس کا جب کبھی جی چاہتا، بانگ دے اُٹھتا۔ اُفق پر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں اور ان آوازوں میں سے ایک آواز انہیں اتنے قریب سے آتی ہوئی لگتی کہ وہ انہیں ایک تربیت یافتہ محافظ کُتا لگتا۔ ماروجا کے لیے یہاں ایک بُرے آغاز کی شروعات تھیں۔ وہ گدے پر مُڑ تُڑ کر لیٹ گئی، اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر کئی دنوں تک اُس نے دوبارہ اپنی آنکھیں نہ کھولیں، ماسوا اُن حالات کہ جب اُسے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا۔ یہ دراصل اُس خلوت کو حاصل کرنے کے جتن تھے، جو اُس کے لیے اپنے سوچ کو صاف اور واضح رکھنے کے لیے لازم تھے۔ بات یہ بھی نہیں تھی کہ وہ مسلسل آٹھ آٹھ گھنٹے محوِ نیند رہتی۔ وہ بس ایک آدھ گھنٹہ کے لیے اونگھتی اور دوبارہ پھر اُسی حقیقت میں جاگتی، وہی کوفت اور کرب جو اُس کی گھات میں لگا تھا۔ یہ ایک مستقل اور مسلسل دہشت و ابتلا کی کیفیت تھی۔ اُس کے معدے میں کسی سخت اور ٹھوس شے کی جسمانی حس مستقل ایک کنڈل مارے رہتی اور ایک دھماکے کے ساتھ اُسے ایذا دینے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتی۔ ماروجا اپنی پوری گزشتہ زندگی کو ایک فلم کی ریل کی صورت میں دوہراتی تا کہ اُن میں سے خوشگوار یادوں کو گرفت میں لایا جا سکے لیکن تکلیف دہ یادیں اس میں ہمیشہ زیادہ مداخلت کرتیں۔۔۔۔

تمام اغوا کنندگان میں ایک مشترک حالت اُن کا قسمت پر اندھا یقین تھا۔ اُن سب کو معلوم تھا کہ وہ عالمِ جوانی میں ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، وہ اِسے قبول کرتے تھے اور موجودہ لمحہ میں جینے کے جتن کرتے۔ وہ اپنے قابلِ ملامت اور گھناؤنے کاموں کے لیے خود اپنے سامنے بہانے گھڑتے تھے۔

اِس کا مطلب تھا اپنے اہلِ خانہ کی امداد و معاونت: نت نئے اور جدید ملبوسات کی

خریداری، موٹر سائیکل رکھنا، اپنی ماؤں کی خوشیوں کو یقینی بنانا، جنہیں وہ اس دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے اور جن کی خاطر وہ مرنے مارے کے لیے ہمہ وقت تیار رہے۔ وہ مقدس بچے (حضرت عیسیٰ) اور مہربان خاتون (حضرت بی بی مریم) کی تعظیم کرتے اور ہر دن اُن کے حضور ایک ہتیلی پر جوش عقیدت سے دعا کرتے، اُن سے اپنی حفاظت کی منت اور اپنے گناہوں کے لیے عفو و درگزر کی التجا کرتے۔ اُن کے مقدس ناموں پر قسمیں اُٹھا کر قربانیاں دیتے تاکہ انہیں اپنے جرائم میں کامیابی و کامرانی نصیب ہو۔ مقدس بچے (حضرت عیسیٰ) کے بعد وہ ایک مسکن دوا رووِیگنا (Rovignal) کی ستائش کرتے جو انہیں حقیقی زندگی میں فلم جیسے مناظر پیش کرنے کی ہمت عطا کرتی۔ ''تم ان گولیوں کو بیئر میں ملا کر پیو تو تم فوراً ہی خود کو ہشاش بشاش اور حوصلہ مند محسوس کرو گے۔'' ایک محافظ نے وضاحت کی۔ ''پھر تم ایک چاقو حاصل کرو، ایک کار چوری کرو اور اُس پر خوب سیر کرو۔ اس میں بھی اصل لطف تو اُن کے چہروں سے ٹپکنے والی سراسیمگی اور ہراس کی وہ کیفیت ہے، جب وہ گاڑی کی چابیاں تمہارے حوالے کر رہے ہوتے ہیں۔'' اس کے علاوہ وہ ہر شے سے نفرت کرتے۔ سیاستدان، سرکار، ریاست، قانون، پولیس، تمام معاشرہ، وہ کیا کرتے، زندگی محض ایک فضلہ ہے، ایک بکواس۔

ماروجا کا جی انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ خصوصاً پاگل اور احمق براباس (Barrabs) کی حرکتوں کی وجہ سے، جو اُسے جگانے کے لیے مشین گن کے بیرل سے اُس کی کنپٹیوں پر زور سے دباؤ ڈالتا۔ اُس کے بال تیزی سے گرنے لگے تھے، جیسے ہی صبح اُس کی آنکھ کھلتی تو ناگاہ اُس کی نگاہ تکیے پر گرے اپنے بالوں کے گچھوں پر پڑتی اور اِس سے اُس پر ایک شدید اُداسی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔

اُسے معلوم تھا کہ اُس پر تعینات محافظوں میں ہر فرد خود اپنی ہی ایک قسم کا ہوتا تھا لیکن وہ سارے کے سارے باری باری شدید احساسِ عدم تحفظ اور شبہات کا نشانہ بنتے تھے۔

ماروجا اپنی دہشت و ہراس سے کام لے کر اُن میں اِن احساسات کو اور برانگیختہ کر دیتی تھی۔ ''اِن حالات میں تم کیسے قائم و دائم رہ سکتے ہو۔ تمہاری یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟'' پھر وہ انہیں خبردار کیے بغیر ایک مطالبہ داغ دیتی۔ ''بتاؤ! تم کس شے پر یقین رکھتے ہو؟'' کیا تم میں دوستی اور محبت کے احساسات کی کوئی رمق بھی موجود ہے؟'' اس سے پہلے کہ وہ اُسے کوئی جواب دیتے۔ وہ انہیں شرمندہ کرتے ہوئے مزید وار کرتی۔ ''سنو! ایک لفظ کمٹ منٹ (پاسداری) تمہارے لیے کوئی معنویت رکھتا ہے؟'' وہ کوئی جواب نہ دیتے، لیکن اُس کے اتنے

ڈھیر سارے سوالات کے ردِ عمل میں اُن کی مسلسل خاموشی اس میں تشویش اور بے کلی کی کیفیت اور بڑھا دیتی اور کسی درشت اور گستاخانہ جواب کی بجائے یہ خاموشی ہر شے کو مارو جا کی جانب پلٹا دیتی۔ صرف باراباس (Barrabas) اُس سے محاذ آرائی کے لیے ہر وقت تیار رہتا: ''چند سری اشرافیہ سرکار کی بدمعاش پٹھو!'' اُس نے ایک بار چلا کر جواب دیا۔ ''سنو! کیا واقعی تمہارا خیال یہ ہے کہ تم چیزوں کو اسی طرح چلاتے رہو گے؟ لعنت ہو: تمہارا یہ سب کھیل ختم ہو چکا ہے!'' مارو جا جو دل ہی دل میں اُس سے بے حد خائف تھی، مگر اُس نے اِس دعوتِ مبارزت کا جواب اُسی طیش کے ساتھ دیا۔

''سنو! تم۔۔۔تم اپنے دوستوں کو ہلاک کرتے ہو اور تمہارے دوست تمہیں قتل کرتے ہیں۔ بالآخر تم سب ایک دوسرے کو قتل کر کر کے نیست و نابود ہو جاؤ گے۔'' وہ اُسے اور غصہ دلاتے ہوئے اور بلند آواز میں چلائی۔ ''تمہیں کون سمجھ سکتا ہے۔ میرے سامنے کسی ایسے شخص کو لاؤ، جو مجھے یہ بتا سکے کہ تم کس قسم کے جانور ہو؟'' شدید مایوسی، طیش اور بے بسی کے عالم میں کہ وہ اُسے اِس وقت ہلاک نہ کر سکتا تھا۔ باراباس نے اپنا مُکّہ دیوار میں زور سے دے مارا اور اُس کی کلائی کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ ایک وحشی کی طرح ڈکرایا اور غضب کے آنسو اُس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑے لیکن مارو جا خود کو ترس کے جذبے سے ملائم ہونے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔۔۔''



(مشمولہ: ''ماسٹر پیٹر کی داستانِ محبت'' تعارف، ترتیب و ترجمہ: خالد سعید، ملتان، صنوبر یز اکادمی، ۲۰۱۳ء)

تنقیدی مطالعہ

زوال آمادہ تنہائی اور گارسیا مارکیز

اشولال

(۱)

دنیا میں ان سوداگر یلغاروں کے (جو بعد میں دور دور تک پھیلا ہوا نو آبادیاتی نظام تشکیل دینے میں کامیاب ہوئیں)، سیاسی اثرات سمیت اور نیٹل مقامی ثقافتوں پر ان کے لٹریری اثرات بہت گہرے ہیں، خاص کر ناول کی مستند مغربی رایات (فرانسیسی، انگریزی، روسی، امریکی وغیرہ) مقامی ادبی تحریکوں میں صحت مند پیش رفت کا باعث بنی ہیں۔ اس سے پہلے اورنیٹل مقامی ثقافتیں قصہ کہانی کی منہ زبانی روایت (Oral Tradition) اور عالی مرتبت شاعری کے ملبے تلے دبی ہوئی تھیں۔

صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری کی اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والے کمیونسٹ انقلاب پوری دنیا میں ترقی پسند ادبی تحریکیں چلانے میں تو کامیاب ہوئے لیکن بندے کی اس بے گانگی کو ختم کرنے میں ناکام رہے۔۔۔ جس کا اشارہ مارکس نے کیا تھا۔ بہر حال بائیں بازو کے انسان دوست میلان کے بارے میں خدشات ایک حد سے آگے کم نہ ہو سکے کہ ادب میں وابستگی سے کیا مراد ہے؟

جنگ، محبت، زوال، عروج، ڈرگ وغیرہ جیسے موضوعات انسانی یادداشتوں کے بہت دور تک ساتھ چلتے ہیں۔۔۔۔ مفادات کی وابستہ مصیبتوں کی وجہ سے وہ مزاحمتی روایت جو کولونیل ازم کے خلاف سوشلسٹ سائے میں پلی بڑھی۔۔۔ بعد از کالونیل دور میں آپس کی خانہ جنگیوں اور تشدد کی لہر میں بہہ جاتی ہے اور ان قوم پرست رجحانات کی گنجائش میں مخلوط کلچر اور کمیونٹی ازم کی

تازہ برکتیں اس وقت تک پوری طرح فیض یاب نہیں ہو سکتیں، جب تک حقیقت نگاری کا دور(حقیقت کے نام پر) انہی بنیادی پرستی کے حق میں بہت سی دلیلیں لے کر صف آرا نہیں ہو جاتا کہ یوں لکھنا ٹھیک ہے اور یوں لکھنا ٹھیک نہیں ہے۔اور یہ رویہ ناول کی دنیا کو اس طرح پھیلنے نہیں دیتا جس طرح اسے پھیلنا چاہیے۔ بنگالی، ہندی، اُردو میں چند ناموں کو چھوڑ کر ناول کی جدید روایت اس پیک کو نہیں پہنچتی، جسے ناول کی مقامی روایت کا نام دیا جا سکے اور جسے ناول کی مغربی روایت کی (Litrary Relativity) میں رکھا جا سکے۔اس کی سب سے بڑی وجہ شاعری اور موسیقی کا غلبہ بتاتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے ناول ترجمہ کرنے سے آہستہ آہستہ اس جھجک پر بڑی حد' تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ وجہ نہیں کہ مقامی زبانیں ناول کے لئے موزوں نہیں ۔۔۔۔ بلکہ اصل میں وہ ابھی تک شاعری اور تصوف کے آنند سے باہر ہی نہیں نکل سکیں۔

پوسٹ کالونیل دور کی مقامی لٹریری روائتوں میں لاطینی امریکہ کی لٹریری روایت ایک طاقتور روایت کے طور پر ابھرتی ہے جسے مائیکل وڈ ''ادبی فراوانی'' کا دور کہتا ہے۔یہ روایت جہاں بالزاک، جیمز جوائس، فاکنر اور ہیمنگ وے سے متاثر نظر آتی ہے، وہاں اس اکتساب سے ایک نئی روایت بھی وجود میں آئی ہے جو اس بدیسی روایت کو مقامی روایتوں سے گزارتی ہے۔اس میں ''بورخس،، اور'' گارسیا مارکیز'' کے نام قاری کے لئے نئے نہیں ۔۔۔۔۔''ڈان کہوٹے'' کے بعد خاص کر گارسیا کے لئے اپنے قاری کی یہ فتح اس کے ناول'' تنہائی کے سو سال' کا نتیجہ ہے۔۔۔ جسے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے، جسے یہ آپ کی اپنی بستی کی کہانی ہو۔

(۲)

عہد نامہ قدیم کھولیں تو'' پیدائش'' کے تازہ تازہ ماحول میں (جہاں ابھی چیزوں کے نام نہیں رکھے گئے)''تنہائی کے سو سال'' ۔۔۔۔ ان چھوٹی چھوٹی حیرانیوں سے شروع ہوتی ہے جو اب بھی کہیں نہ کہیں، دور کی بستیوں میں پکھی واس اپنے ساتھ لاتے ہیں ۔۔۔۔ عجیب و غریب محدب عدسے، مقناطیس، جانور۔۔۔ ایسی حیرانیاں جو بچوں میں بہتر طور پر سٹڈی کرنے والی ہیں۔اس ناول کے مرکزی کردار'' کرنل ارلیا نو بوئیندا'' کی چیزوں کو یاد کرنے کی یہ صلاحیت '' دوستو فسکی'' کے فائرنگ سکواڈ کا سامنا کرنے والے کردار سے مختلف ہے۔۔۔۔ اسی طرح وباؤں کے بیانات بھی قاری کو کہیں ۔۔۔۔ عہد نامہ قدیم میں سے لے کر آگے بڑھتے ہیں،'' البرٹ کامیو'' تک یہ وبائیں روز کے واقعات سے ہو کر گزرتی ہیں ۔۔۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں جیسے آپ کو اپنے شہر محلے میں'' شاپروں'' کی کسی وباء کا سامنا ہو۔۔۔ آبادکاری کی

وباء کا سامنا ہو۔ ہر بستی یقیناً کسی نہ کسی انسان نے بسائی ہوتی ہے۔ جس طرح بندہ بڑا ہوتا ہے اسی طرح جگہیں بھی بڑی بوڑھی ہوتی ہیں اور بالآخر مر بھی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک بستی کی کہانی ۔۔۔''تنہائی کے سو سال'' میں ملتی ہے۔ تین چار نسلوں پر محیط یہ محض ''بوئندا خاندان'' کی کہانی نہیں بلکہ تہذیبوں کے عروج اور زوال کا وقت مقامی ثقافتوں اور ان کے قصے کہانی کی روایت سے ہو کر گزرتا ہے۔۔۔۔ واقعات در واقعات اسے بنانے میں جتنا ہاتھ گارسیا کا ہے۔۔۔۔ اتنا ہاتھ اس میں ''کولمبیا'' کا بھی ہے جو لاطینی امریکہ کے پوسٹ کالونیل اثرات کی تاریخ میں بڑا ہوا ہے۔ اسی ''کولمبیا'' کی ایک بستی ''ماکوندو'' سو سال میں بہت تیز رفتاری سے ان سب مصائب کو دیکھ لیتی ہے جہاں سے واپسی کا کوئی رستہ نہیں ملتا۔۔۔۔ جنگ، ڈرگ، خانہ جنگی اور کلچرل تشدد کے پیچھے اس ''بنانا بخار'' (Banana Fever) کا ہاتھ کہتے ہیں جسے ''یونائیٹڈ فروٹ کمپنی'' اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اپنی قریبی یادداشتوں میں یہ بات ویسی ہے جیسے بے پاؤں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' چائے کے باغات سے گزر رہی ہو۔ مقامی ثقافتوں میں اندری اندر تنہائی کا روگ لبرل اور کنزرویٹو میں صرف تین گھنٹے وقت نہیں ہے، جیسے اس ناول میں ایک جگہ بیان ہوا ہے۔

''لبرل دعائے ربانی کے لئے پانچ بجے جاتے ہیں اور کنزرویٹو آٹھ بجے!''

بلکہ اس کے پیچھے نسل در نسل وہ ''جھجک'' چھپی ہے جو آسانی سے ثقافتوں کو ایک دوسرے میں گم نہیں ہونے دیتی، نئے شکاری پرانے جال لے کر آتے ہیں۔۔۔۔ لیکن اب مچھلیاں بھی کہیں یہ جان گئی ہیں کہ کڑاہی میں تلے جانے سے تو بہتر ہے کہ وہ اپنی تنہائی میں کہیں اندر ہی اندر مر جائیں۔ تہذیبوں کے ساتھ یہ وباء وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں چیزیں بظاہر سادگی کے نام پر پیچیدگیوں سے گزرتی ہیں اور آہستہ آہستہ چیزوں کی فراوانی، معلومات کی وباء سے ہوتی ہوئی بندے سے اس کی یادداشت چھین لیتی ہے۔ یہ تنہائی کا انتہائی درجہ ہے جہاں انسانی دماغ ان کو یاد رکھنے کی صلاحیت سے بھی مکت ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ہر وقت یاد رکھنے کی مصیبت سے چھٹکارا دلا دیتا ہے، اس کے تھوڑا اور آگے۔۔۔۔ موت کی تنہائی ہے جسے مرنے سے پہلے نہیں سوچا جا سکتا صرف فرض کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔ ''تنہائی کے سو سال'' میں اس ''طاعون'' کا بیان ''ماکوندو'' کی ترقی کے باب میں بہت زوردار ہے۔ وست پوچا اور اس کے مائل بہ تیزی وقت کا کلچر مقامی اور غیر مقامی ''جھجک'' کی وجہ سے اور بھی شدید ہونے لگتا ہے۔ جب ریاست Maffunctiong Structural کا شکار ہو۔ ''کولمبیا'' کے کلچرل تشدد کی لپیٹ میں آنے کی بھلے سو وجوہات ہوں۔۔۔۔ اس کی ایک نشانی ہیں وہ پے در پے واقعات، جن کو گارسیا، گلیوں،

کوچوں، محلوں، کتابوں سے چنتا ہے اور غیر معمولی شعوری سکیم کی صلاحیت اس کی تحریروں میں مواد کا کام دیتے ہیں۔۔۔۔"تنہائی کے سو سال" میں مکالمے کا ماحول نہیں ہے بلکہ واقعات کا یقین ہے شاید یہ اس لئے بھی ضروری ہو تا کہ" تنہائی کے" زوال کی اس شدت کو ابھارا جائے۔۔۔۔ جو اس ناول کا اصل موضوع ہے۔

تہذیبوں کا تنہائی کے خول سے باہر آنے اور ایک عمر گزار کے واپس اس میں داخل ہونے کا امکان۔۔۔تہذیبوں کے ساتھ ان کے اپنے ہیجانات کا بھلے بے شک نتیجہ نہ وہ لیکن اس وجہ سے شدید ضرور ہوا ہے، تنہائی کی یہ وباء بندوں کو تہذیبوں کو اتفاقاً نہیں لگتی۔ پہلے پہل "تنہائی" کسبستی میں "ملکیا دیس" کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ سنسکرت کے زمانے کا یہ خبطی کردار کسی نہ کسی بستی میں آج بھی مل جاتا ہے۔۔۔۔الگ تھلگ، سونا بنانے کی دھن میں مگن یہ مصروف بوڑھے بچوں کی خاص توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔۔۔۔اپنے علم کی تنہائی میں گم "ملکیا دیس" لوگوں کی نظر میں چاہے کتنا لاتعلق ہو "عمل" کا ریکارڈ ضرور رکھتا ہے اور کوئی نہ کوئی نسل اس ریکارڈ کو پڑھنے میں بالآخر کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔تنہائی کی وہ سب قسمیں جن کا تہذیبیں کسی نہ کسی شکل میں شکار ہوتی ہیں۔۔۔مثلاً اقتدار کی تنہائی، علم کی تنہائی، رج کی تنہائی وغیرہ کو گارسیا اپنی تحریوں میں "زوال" کی اس صنعت کے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہوا ہے جو مقامی قصہ کہانی کے ابہام اور شگون سے پھوٹتی ہے۔

"تنہائی کے سو سال" کا ماحول اس بوسیدہ، لاتعلق اور زوال آمادہ تنہائی سے بھرا پڑا ہے۔۔۔۔ جنگ اور تشدد سے گزر کے واقعات اس تنہائی کو اور بھی شدید کرتے ہیں۔۔۔۔اس بے گانہ اور خالی تنہائی کو اس کے کرداروں کے پاس بھرنے کے لیے جنسی عمل کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔۔۔۔"ملکیا دیس" کو وہ پڑھ نہیں سکتے "سدھارتھ" کے "واسو دیو" کی طرح عام دنیا کا تصور ابھی ان کے دھیان سے گزرا ہی نہیں۔۔۔۔جو تنہائی کی انتہائی خوشگوار شکل ہے۔

ناول کا ایک حصہ جنگ کے موضوع سے گزرتا ہے، جنگ "ہیمنگ وے" کی طرح گارسیا کا ذاتی تجربہ نہیں ہے بلکہ یہ جنگ واقعات در واقعات کہیں اس کے "نانا" کی یادداشتوں میں سے ابھرتی ہے۔۔۔۔ پیچھے بہت دور تک، کابیل، قابیل تک، جنگ بندے کے ساتھ ساتھ آ رہی ہے۔۔۔۔اس کا بھلے جو بھی کارن ہو، جنگ کی بدقسمتی کو کسی ادرش کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ۔۔۔ جنگ کے حق میں تمام دلیلیں بالآخر خطرناک ثابت ہوتی ہیں جیسے اس کا ایک کردار بتاتا ہے۔

جنگ شروع کرنا جنگ بند کرنے سے زیادہ
آسان ہے۔'' ''سب ٹھیک ہے'' کی رٹ اس
بے انت جنگ کا سب سے خوفناک حصہ
تھی۔۔۔۔جنگ خود ٹھیک نہیں تو سب کچھ کیسے
ٹھیک ہو سکتا ہے۔

جنگ کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ سوچنے نہیں دیتی۔ تاوقتیکہ آپ تھک نہ جائیں۔۔۔۔ بہت دیر بعد اس کی اکتاہٹ کے نتیجے میں کہیں یہ بات کھلتی ہے کہ جس ''لبرل'' اور ''کنزرویٹو'' ادرش کے نتیجے میں جنگ لڑی جا رہی تھی وہ تو صرف ''تین گھنٹے'' وقت کا فرق ہے۔۔۔۔ اور جس طرح یکدم ایک دن ''ارلیانو'' ''کرنل ارلیانو'' بنتا ہے اسی طرح پیشاب کرتے ہوئے مر بھی جاتا ہے۔۔۔۔ اس کا مرنا بھی گارسیا کے نزدیک اسی طرح روز کا واقعہ ہے۔۔۔۔ جیسے اس جنگ کا شروع ہونا، بالآخر ہتھیار پھینک کر، اپنی شاعری کا ٹرنک جلا کر، سونے کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بنانے کی خواہش سے وہ تنہائی ابھرتی ہے جو بوئندا خاندان کا وراثتی میلان ہے۔

''وہ اصرار کرتا رہا کہ وہ قطعاً کوئی قومی ہیرو نہیں
ہے وہ محض مزدور ہے اور اس کا بس اتنا ہی
خواب تھا کہ وہ ان بھولی بسری یادوں کے بوجھ
تلے اور سونے کی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے
عذاب میں مر جائے۔''

تہذیب بندوں کو نہیں بناتی، بندے اسے بناتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کے ٹریپ میں آ جاتے ہیں اس کا صرف ایک ہی حل ہے یا تو وہ اپنے اس خلا کو پے در پے جنسی عمل سے بھرتے رہیں یا پھر خوبصورت ''ریمیدس'' کی طرح سر پر استرا پھروا کر اپنی خوبصورتی کی تنہائی کا مزا لیں ،جو بندے مارتی ہے۔

سو سال کے عرصے میں ''ماکوندو'' بڑھ کر قصبہ، قصبے سے شہر کے مندارج طے کرتی ہے۔۔۔۔''ریل کی آمد'' تک تبدیلی کی بے شمار حیرتوں سے گزرتی ہے اور بالآخر تنہائی میں مبتلا ہو کر مر جاتی ہے۔۔۔۔ تین چار نسلوں میں ہی اس وراثت کو جو''سور کی دم'' سے شروع ہوئی تھی۔ بڑبڑیمک اپنے بل کی طرف گھسیٹ کر لے جا رہی ہے اور''بوئندا خاندان'' کی آخری نشانی ارلیانو

(بابی لونیا) پر یہ بات ''ملکیا دیس'' کے ہاتھوں منکشف ہوتی ہے کہ تنہائی کا یہ عذاب کسی ایک فرد کا نہیں، کسی ایک خاندان یا نسل کا بھی نہیں بلکہ نئے اور پرانے وقت کی دہلیز پر پوری انسانی تہذیب کا ہے جسے پھر سے آباد ہونے کا اس دھرتی پر دوسرا موقعہ نہیں ملتا۔

(۳)

گارسیا کے اپنے خیال میں اس نے لکھنا ''کافکا'' کی ایک کہانی سے سیکھا ہے۔۔۔ جسے قاری ''کایا کلپ'' یا ''Metamorphosis'' کے نام سے جانتے ہیں۔۔۔ بظاہر اتنی چھوٹی سی بات کہ آپ رات کو سوئیں اور صبح بستر پر کیکڑے کی شکل میں تبدیل ہوئے پڑے ہوں۔۔۔ کہانی ہوسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ وقت جو قصہ کہانی کے وقت سے، شاعری کے وقت سے ہو کر گزرتا ہے۔۔۔ اس میں اس طرح کے عجیب وغریب واقعات روز کے یقین کی حیثیت رکھتے ہیں کہ کیسے کوئی شہزادہ مکھی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔۔۔ قالین اڑنے لگتے ہیں اور اس طرح کا بے شمار مواد ناول کی جدید روایت سے غائب تھا۔ یہ طلسماتی حقیقت نگاری (مغرب کے خیال میں) مقامی ثقافتوں میں ایک زمانے سے روز کے یقین کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا ابہام ہی اصل میں اس کے یقین کی طاقت ہے۔ ''اورنٹیل ابہام'' اور ''مردہ خامشی'' جیسی اصطلاحوں اور پروپیگنڈے کے تواتر سے مغرب جس حقیقت نگاری کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔۔۔ اصل میں وہ بہت سی حقیقتوں سے گریز ہے۔۔۔ جو اس محاورے میں جگہ نہیں پاتی جو مشرقی معاشروں میں روز کا یقین ہے۔۔۔ محیر العقول واقعات، چھ ٹانگوں والی گائیں، سور کی دم والے بچے، ان سب سے وابستہ شگون اور نشانیوں کی معنویت انڈین Cultural Uncioncious کا صدیوں سے حصہ ہے۔۔۔ اپنی دعاؤں، وباؤں، معجزوں سمیت چیچک کا ''ماتا'' کے طور پر احترام واقعی حیران کن ہے۔

گارسیا کے اپنے الفاظ میں ''ادیب کچھ بھی لکھ سکتا ہے اگر وہ اپنے قاری کو اس کا یقین بھی دلا سکے۔'' مقامی ثقافتیں واقعات کی جس تنہائی کا شکار ہوئی ہیں، لاطینی امریکی ادیبوں نے اس تک رسائی پالی ہے۔ ''ڈان کہوٹے'' کے بعد ''تنہائی کے سو سال'' اس کی سب سے اہم مثال ہے۔

اگر آپ خوابوں کی علامتوں کو سمجھ لیں تو خواب بھی اتنے حقیقی ہوتے ہیں جیسے نیند ایک حقیقت ہے۔۔۔ حقیقی اور غیر حقیقی اس نصابی بحث سے ہٹ کر یہ ضروری نہیں کہ جو معلومات ایک صحافی کے لیے اہم ہیں وہ ناول نگار کے لیے بھی اہم ہوں۔

بہر حال اساطیر اور قصے کہانی کے وقت کی جھال گارسیا کے ہاں صحافتی سفاکی سے ہو کر گزرتی ہے۔صحیفوں کی وجدانی زبان اور شاعری کی ایک مخصوص خوشبو گارسیا کو اپنا مواد پھیلانے میں مدد دیتی ہیں۔ وہ واقعات ،خبر اور معلومات کو اپنے بیان میں جس مہارت سے ناول کا حصہ بناتا ہے۔۔۔۔۔اسے محض ''صحافتی ٹرکس'' کا نام دینا ٹھیک نہیں ۔(جیسا کہ کچھ شوقیہ نقاد سمجھتے ہیں)اس کہانی کو انتہائی سادہ سکیم میں بہت سہولت کے ساتھ لکھ لینے کے پیچھے وہ بے بہا مہارت موجود ہے جو اپنے مواد کو قاری کے یقین سے گزار لیتی ہے۔۔۔۔خوف اور دہشت کی فضا میں بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی تنہائی ،اس یقین کی حاجت مند ہے جو اسے بتا سکے کہ ریل کے ان دوسو چھکڑوں میں کیلے نہیں تین ہزار لاشیں لدی ہوئی ہیں۔۔۔واقعات کے تسلسل میں وہ بار بار اتنے دن ،اتنے مہینے ،اتنے گھنٹے'' چھتیس جنگیں'''' کرنل ارلیانو کے سترہ بیٹے'''' سات ہزار دو سو آٹھ سونے کے ڈلے'' وغیرہ کے استعمال میں اس یقین کو دوبارہ دریافت کر لیتا ہے جو خانہ جنگوں کے ماحول میں کہیں گم ہو جاتا ہے اور وہ اس ٹیکنیک کا استعمال اس تواتر سے کرتا ہے کہ ایک یقین کی فضا قائم ہونے لگتی ہے اور ایک مقام پر یہ معلومات صحافتی معلومات سے الگ ہو کر کہانی میں جذب ہو جاتی ہے۔

تنہائی کے سو سال کا یہ بیانیہ انداز اپنے کرداروں کے اینٹی ہیروز ماحول کو واقعات میں سے چنتا ہے، ان کے ساتھ رہتا بولتا ہے۔۔۔اور کہیں کہیں ان کے مرنے پر رونے بھی لگ جاتا ہے۔۔۔اصل میں اینٹی ہیروز کی یہ روایت ''دوستوفسکی'' اور ''کافکا'' ایسے لکھنے والوں نے ''فرائیڈ'' اور ''یونگ'' کو تحفے میں دی۔۔۔ قصے کہانی اور اساطیر کے وقت میں علامتوں کا یہ سفر بہت دور تک سفر کرتا ہے اور اس کے ابہام میں بے بہا معنویت چھپی ہوئی ہے۔۔۔۔جس طرح ناخن چبانے ،مٹی کھانے ،اور دیوار کی سوراخوں میں انگلیاں دینے کا مطلب ہوتا ہے اسی طرح آپ اس معنویت کو بھی دریافت کر سکتے ہیں۔

اگر اس ناول میں جنسی اختلاط کی بہتات (خاص کر آخیری حصے میں) نظر آئے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔۔۔۔یہ اس لاتعلق تنہائی کو بھرنے کا عمل ہے ویسے بھی لفظ ''لنگم'' سے ڈرنے کی بجائے سات گراریوں والے چاقو کے ننگے پن سے ڈرنا چاہیے۔

''ماکوندو'' کی تمام حیرانیوں کے ملبے میں ،حبس گھٹن ،تشدد اور بے دلی کا ماحول ابھرتا ہے۔اس کا کہیں کلچرل آوٹ لیٹ نہیں ہے۔ جو اس بے چینی کو دور کر دے جو تہذیب کے ہیجان سے پھوٹتی ہے۔۔۔ پادری اس ناول میں بہت ہی ناتوانی کے عالم میں ہے۔۔۔ بلکہ یوں کہنا

چاہیے کہ ایسا ہونا اس ناول میں ''تنہائی'' کی اس شدت کو ابھارتا ہے جو اندری اندر اس ناول کا فلو ہے۔۔۔۔ جوں جوں عہد نامہ قدیم کا ماحول عہد نامہ جدید میں داخل ہوتا ہے۔۔۔۔ تنہائی کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔ تہذیب اپنے ساتھ ہیجانات کی جس وباء کو لے کر آتی ہے۔۔۔۔ اس میں ایسا ہونا قریبی امکان ہے۔۔۔۔ اب بندے اگر مچھر، مکھی اور طاعون کی وباء سے نہیں مرتے تو ''بلڈ پریشر'' سے مرنے لگ جاتے ہیں۔۔۔۔ یادداشت گم ہونے لگی ہے۔۔۔۔ نیند نہیں آتی وغیرہ وغیرہ

اس ناول میں صفت کہیں بھی اکیلی نہیں ہے کسی نہ کسی اضافی کیفیت کا بوجھ اس کے کندھوں پر ضرور ہے۔ مثلاً صحت مند بھونچال، مسکراتی سازشیں، عظمتوں کی کھائی، بے مقصد مبارکبادیں، غصہ ور نامردی، جیسی ترکیبوں کا بے دریغ استعمال جا بجا اس ناول میں نظر آتا ہے۔۔۔۔ نسل در نسل وراثتی یقین کے عذاب طویل اور موت کے مترادف تنہائیوں کا دروازہ کھولتے ہیں۔۔۔۔ وجدانی جملوں اور شاعری کی خوشبو سے ہوتی ہوئی تنہائی کے اس اخیری دور کا گواہ آخری ''ارلیانو'' کے ساتھ ''گارسیا'' خود بھی ہے (اخیری باب) جو جھینگر کی طرح مرنے والی ''ارسلا'' کے پس منظر میں اپنے ساتھ، اپنی ''نانی'' اور ''نانا'' کے ساتھ۔۔۔۔ ایک بڑی دنیا پر چھوٹے سے ''کولمبیا'' کے ساتھ اور ایک بڑے ''کولمبیا'' پر چھوٹی سی بیس کچے گھروں کی بستی ''ماکوندو'' کے ساتھ۔ ''گارسیا'' کو پڑھ کر ہمیشہ ایسے لگتا ہے۔۔۔۔ جیسے یہ سب کچھ تو قاری نے خود لکھنا تھا۔ ناول کی دنیا میں اس سے بڑھ کر حیرانی اور کیا ہوسکتی ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ: ''تنہائی کے سو برس'' از گیبریئل گارسیا مارکیز، مترجم: ڈاکٹر نعیم کلاسرا، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء)

گارسیا مارکیز: سیاست اور نثر

ایڈتھ گراسمین/ خالد سعید

گزشتہ ہفتے علی الصبح جب فون کی گھنٹی بجی، گیبریئل گارسیا مارکیز نے ریسیور اُٹھایا اور تب فوراً ہی دوسری جانب سے آنے والی آواز کو پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی بیوی کے اغوا کی کہانی نے نوبل انعام یافتہ ناول نگار کو کولمبیا کے متشدّدانہ ڈرگ کلچر پر بہ ظاہر ایک غیر افسانوی کتاب تحریر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کچھ گھنٹے قبل ہی اُس نے ''اغوا کی خبر'' (News of Kidnapping) کے آخری پروف دیکھنے کے بعد مسودہ اپنے پبلشر کے حوالے کیا تھا۔ فون کرنے والے نے اگرچہ اَب اُسے اغوا کی ایک اور خبر دی تھی جس کا تعلق کولمبیا کے سابق صدر سیزار گویریا کے بھائی کے اغوا سے تھا۔ اُسے یرغمال بنانے والوں نے اخبارات کو بھیجے جانے والے ایک کھلے خط کے ذریعے ایک عجیب وغریب تجویز پیش کی تھی۔ وہ گارسیا مارکیز کو کولمبیا کا صدر دیکھنا چاہتے تھے۔ ''گابو'' خط میں رقم تھا۔ ''ہمیں رُندھے ہوئے گلوں کے ساتھ آپ کو یہ بتانے کی اجازت دو، نوبل، براہِ کرم، آگے بڑھ کر آبائے وطن کو بچاؤ!''

مارکیز نے فون ایک جانب رکھا، آنکھیں ملتے ہوئے بستر پر اُٹھ بیٹھا اور عالمِ حیرت میں خود سے گویا ہوا: ''یہ کیا، میں اپنی کتاب کو خود ہی جی رہا ہوں!'' زندگی نے شاید، لاطینی امریکہ کی ایک انتہائی تہ دار دنیا کی سب سے توانا ادبی شخصیت کے فن کو نقل کرنے کا انداز اپنا لیا تھا۔ وہی تخیلاتی لینڈ سکیپ جو اُس کے جدید کلاسیک کا درجہ رکھنے والے ناولوں ''تنہائی کے سو سال'' (One Hundred Years of Solititude) اور ''پدرسری کی خزاں'' (The Autumn of the Patriarch) میں عکس بند کیا گیا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں سیاست اور

نثر باہم مدغم ہو گئے ہیں، المیہ اور طربیہ ایک ہی زمانی تناظر میں موجود ہیں اور جہاں حقائق افسانے سے زیادہ عجیب و غریب اور اپنے آپ کو منوانے والے ہیں۔ اغوا کنندگان کی یہ درخواست بیرونی دنیا کے لیے خواہ کتنی ہی ناقابلِ فہم کیوں نہ ہو، مگر کولمبیا میں یہ بات اتنی لاطینی قطعاً نہیں لگتی جہاں گابو کو ایک طرح سے قومی سرمایے کی حیثیت حاصل ہے اور یہ واقعہ یا حادثہ محض اِس اَمر کو ظاہر کرتا ہے کہ اُنہتر سالہ گارسیا مارکیز، بیک وقت اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور بائیں بازو کی سیاست کو گرفت میں رکھتے ہوئے اپنی جسمانی اور ذہنی توانائیوں کی بلندیوں پر موجود ہے اور جب قوم نے اپنے ریڈیو اور ٹی وی سیٹ آن کیے تو اُس نے اغوا کنندگان کی درخواست مسترد کر دی لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس نے انہیں کھلے انداز میں ایک مخلصانہ مشورہ دیا: ''اپنے ہتھیار پھینک دو، اپنے نقاب اُتار ڈالو، باہر نکلو اور آئینی نظام کے تحت اپنے نظریات کا پرچار کرو۔'' دوسرے اور بالکل سیدھے لفظوں میں، خیال پرستو: حقیقت پسند بنو!

یہ وہ نصیحت ہے جسے وہ اتنے جوش و خروش اور کثرت سے دہراتا ہے کہ اُس کا بلند بانگ لہجہ اُس کی عمر سے لگا نہیں کھاتا۔ قریب قریب تین دہائیوں سے، کولمبیا کے ایک ٹیلی گراف آپریٹر کے بیٹے نے لاطینی امریکہ کی آواز کو اپنی جادوئی حقیقت پسندی کے ذریعے ہیئت بند کیا ہے۔ ایک ایسا اسلوب جو دن سپنے اور حقیقت کو اتنی سہولت کے ساتھ اِک دوجے میں گھول میل دیتا ہے کہ چاکلیٹ پیتے ہوئے ایک راہب کی روحانی پرواز یا بے خوابی کے طاعون میں مبتلا پورا شہر، عین فطری محسوس ہوتا ہے۔ ''تنہائی کے سو سال'' (One Hundred Years of Solitude) (سالِ طباعت ۱۹۶۷ء) کی دنیا کی تیس سے زائد زبانوں میں دو کروڑ سے زائد کاپیاں بک چکی ہیں۔ اِس رزمیہ کے وسیلے اُسے انیس سو بیاسی ۱۹۸۲ء میں نوبل انعام ملا اور اُسے دور دراز کی زمینوں اور دیسوں بشمول یورپ، افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور برصغیر پاک و ہند میں اَن گنت پرستار ملے۔ اَب بھی ایک لبنانی ناشر ریاض الریّس کے مطابق گارسیا مارکیز عرب دنیا کا سب سے زیادہ مقبول مصنف ہے۔ اُس کے اتنی شدت سے چاہے جانے کا ایک جزوی سبب تو اُس کی سامراج مخالف سیاست ہے، لیکن اُس کی اصل کشش اُس کے ناولوں کی خوابناک اور انقلابی فضا ہے جو اُس کے شبدوں کی اصل اور سچی آتما ہے اور الریّس رقمطراز ہے: ''عربوں کے لیے یہ سب کچھ یوں ہی ہے جیسے وہ انہیں خود اُن کے ہی خواب دِکھا رہا ہو۔''

لیکن گابو کے ہوائی قلعے اَب اور زمینی ہوتے جا رہے ہیں۔ اُس کی تخلیقیت کی حالیہ تیز رو برشا معمولی مقدار میں جادو اور زیادہ گہری حقیقت پسندی کا اظہار ہے۔ ''نیوز ویک'' کے لیے

دیے گئے ایک خصوصی انٹرویو میں اُس کا اصرار تھا کہ وہ اپنے فلسفیانہ نکتۂ نظر سے منحرف نہیں ہوا بلکہ یہ سب کچھ محض بدلے ہوئے حقائق کی مطابقت میں ہے۔

خیر آج تو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اُس کے پرستار اُسے اِس صورت میں بھی معاف کر دیں گے اگر وہ جنوبی کیلی فورنیا (امریکہ) کے علاقے میں جھولنے کے بستر میں لیٹ جائے یا اپنی اَب تک کی وفاداریاں ترک کر دے اور اپنے ذہن سے اپنی تمام یادداشتوں کو کھرچ بھی دے لیکن گابو اَب بھی آرام کرنے سے منکر ہے۔ صرف گزشتہ چند ماہ میں اُس نے ایک دستاویزی کتاب مکمل کی ہے: ''ایک اغوا کی خبر''۔ ایک شاندار اور اپنی نوعیت کی انوکھی فلم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے ''ایڈیپس دی میئر'' جو اگلے ماہ کینس میں پہلی بار نمائش کے لیے پیش کی جائے گی۔ وہ محبت کے بارے میں تین مختصر ناولوں پر کام کر رہا ہے، ایک جرنلزم ورکشاپ کا اہتمام کر رہا ہے، کیوبا میں اپنے فلمی ادارے کی نگرانی اور سرپرستی کر رہا ہے۔ حال ہی میں کولمبیا کی فوج میں اپنے سابق ایذا رسانوں سے خوش دلی سے ملا اور سیاسی بحرانوں سے نمٹنے کے طریقوں سے بہت سے ملکوں کے سربراہوں سے تبادلہ خیالات کرتا رہا ہے۔

وہ کیا شے ہے جو اِس طرۂ امتیاز کے حامل معمر ادیب کو اِس جانکاہ محنت پر مجبور کرتی ہے؟ جزوی طور پر تو سادہ لفظوں میں اتنی سی بات ہے کہ گارسیا مارکیز ایک چھوٹے قد، گٹھے ہوئے کسرتی وجود اور جھاڑ جھنکار ایسی مونچھوں کا حامل شخص ہے۔ اُس کے ناک کو ایک معروف مصنف نے گوبھی کے پھول سے تشبیہ دی۔ جس میں سے خیالات، الفاظ اور تمثالوں کی ہڈی اپنے کناروں سے اُبھر آئی ہے۔ وہ کچھ کیے بغیر رہ نہیں سکتا اور وہ کہتا ہے: ''اگر میں کام کرنا بند کر دوں، تو میں مر جاؤں گا۔'' لیکن اُس کی توانائی، اُس کے اُس احساس عدم تحفظ سے، جس کی جڑیں اُس کے ابتدائی بچپن تک پھیلی ہوئی ہیں اور بڑھ جاتی ہے، وہ کیسے دن تھے جب اُسے ایک مضافاتی بچے کا ظاہری گنوار پن کھونا پڑا تھا ____ ایک بدلباس، ادنیٰ اور چپ چپے ذوق کا حامل شخص۔ آج کا گابو ہمیشہ کے لیے رہنا چاہتا ہے، چاہے یہ کسی صدرِ مملکت کے کان میں سرگوشی ہو یا یہ جاننے کی کوشش کہ اُس کے دوست اُس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ ''گابو کے بارے میں بات کرنا خود کو مشکل میں ڈالنے کے مترادف ہے۔'' اُس کے ایک قریبی دوست نے تبصرہ کیا، ''اُسے ہر شے کے جملہ حقوق چاہئیں اور وہ خود کہتا ہے کہ اُس کے بارے میں گفتگو کرنا اُس کے ساتھ دوستی کو ہمیشہ کے لیے خطرے میں ڈالنے والی بات ہے۔'' لیکن گارسیا مارکیز وقت کو تو فتح نہیں کر سکتا اور خاص طور پر اَب جب کہ یہ بڑی تیزی سے اُس کے دونوں ہاتھوں سے پھسلا جا رہا ہے تو وہ اپنے

خوابوں کو رنگِ حقیقت دینے کے لیے اور بھی زیادہ تندہی سے محنت کرتا ہے۔ کہانی کہنے کے فن کی حفاظت اور اپنے ہی ورثے کو قائم رکھنا۔

لیکن گارسیا مارکیز کو ایک اور ارفع مقصد بھی متحرک رکھتا ہے اور یہ ہے لاطینی امریکہ کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی یک جہتی کا خواب، اُس کا لاطینی امریکہ ایک ایسا براعظم ہے جو اپنے اندرونی خلفشار کے باعث ہمیشہ مفلوج رہا ہے۔ یہ سمون بولیوار کا نصب العین ہے۔ انیسویں صدی میں لاطینی امریکہ کو متحد کرنے کے جتن میں ناکام رہنے والا جانباز، جس کے آخری تکلیف دہ دنوں کی یاد کو گارسیا مارکیز نے اپنے ناول ''اپنے ہی جال میں جکڑا ہوا جنرل'' (General in his own Labyrinth) سالِ اشاعت ۱۹۹۰ء میں لفظ بند کیا ہے۔ ''میرے لیے جو شے بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ بولیوار کا نظریہ ہے اور یہ نظریہ ہے لاطینی امریکہ کے اتحاد کا۔'' وہ کھلے لفظوں میں کہتا ہے، ''یہی وہ نظریہ ہے جس کے لیے جان کی قربانی دینا میرے لیے عین سعادت ہو گی۔'' یہ اُس کا ایک پرانا خواب ہے لیکن ''گابو'' کو ساتھ ہی ساتھ اِس بات کا بھی پوری طرح سے احساس ہے کہ اِس خطے میں رومانوی آدرش سیاست (انقلاب) اور ادب (جادوئی حقیقت پسندی) اَب زیادہ قابلِ عمل نہیں رہے۔ یہ ایک ایسا خطہ ہے جو نگی آمریتوں کے جنگل سے نکل کر زیادہ مبہم اور غیر یقینی دور میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ پی کیپ کی بجائے بریف کیس کا زمانہ ہے اور اَب تبدیلی کے لیے نسبتاً کم رومانوی ذرائع پر انحصار کرنا ہو گا۔ سیاست میں اس کا مطلب ہے کہ قانون اور آئین کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک مہذب اور شائستہ سماج کی تشکیل کے لیے کوششیں۔ ثقافت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت پر کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے بغیر ایک نگاہ ڈالی جائے۔ گارسیا مارکیز اپنے سماج کے پدرسری نظام کی خزاں میں ایک دیوانگی کے ساتھ دونوں محاذوں کے اگلے مورچوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔

بولیوار کے خواب، بہرحال گارسیا مارکیز کی سیاست کو اور زیادہ مبہم اور متنازعہ بنا رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے لاطینی امریکہ کا خواب دیکھتا ہے جو متحد ہو کر سامراج (اسے امریکہ ہی پڑھیں) کے خلاف صف آرا ہو سکے۔ ہمارا سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ اپنے تشخص کی کھوج ہے اور وہ کہتا ہے: ''یہ ہمیں آج تک کہیں نہیں ملا'' ماسوا کیوبا کے جہاں تک اُس کے ذہن کی پرواز جا سکتی ہے۔

جبرائیل گارشیا کے مختصر سوانح:

ا۔ ۱۹۲۷ء: پیدائش اریکاٹیکا میں

۲۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء: قانون کی تعلیم

۳۔ ۱۹۴۸ء: بطور صحافی کام کا آغاز

۴۔ ۱۹۵۴ء: پہلا ناول ''پتوں کا طوفان'' (Leaf Storm)

۵۔ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء: کام بطور نامہ نگار

۶۔ ۱۹۵۸ء: مرسیڈیز بارچا پارڈر سے بیاہ

۷۔ ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۱ء: کیوبا میں نیوز ایجنسی پبلشرز کے لیے کام اور کہانیوں کا مجموعہ ''کوئی بھی کرنل کو کچھ نہیں لکھتا۔'' (No one writes to the Colonel)

۸۔ ۱۹۶۷ء: ''تنہائی کے سو سال'' (One hundred years of solitude)

۹۔ ۱۹۷۴ء: لاطینی امریکہ میں انسانی حقوق کی پائمالی کی تفتیش

۱۰۔ ۱۹۷۵ء: ''پدرسری کی خزاں'' (Autumn of the Patriarch)

۱۱۔ ۱۹۸۱ء: گرفتاری کے خوف سے کولمبیا سے فرار

۱۲۔ ۱۹۸۲ء: نوبل انعام

۱۳۔ ۱۹۸۵ء: سالِ اشاعت ''وبا کے دنوں میں محبت'' (Love in the times of Cholera)

۱۴۔ ۱۹۸۹ء: سالِ اشاعت ''جنرل خود اپنے ہی جال میں'' (General in his own labyrinth)

۱۵۔ ۱۹۹۴ء: سالِ اشاعت '' کچھ محبت اور دیگر آفات کے بارے میں''

۱۶۔ ۱۹۹۷ء: سالِ اشاعت ''ایک اغوا کی خبر'' (News of Kidnapping)

اُس کے بارے میں ایک خبر یہ ہے کہ اپنی جوانی کے دنوں میں وہ کمیونسٹ پارٹی کا باقاعدگی سے چندہ ادا کرنے والا رکن تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ذاتی طور پر وہ اِس بات کی پُرزور تردید کرتا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں فیڈل کاسترو کی کامیابی سے وہ اِس قدر جذباتی طور پر متاثر ہوا کہ فوراً ہی انقلابی نیوز ایجنسی پرینزیا لاطینیا (Prensia Latinia) کے عملے میں شامل ہو گیا، حالاں کہ اُن دنوں وہ نیویارک میں مقیم تھا۔ اُس وقت سے اَب تک اُس کے نظریات میں وہ شدت تو نہیں رہی، لیکن کاسترو کے ساتھ اُس کی رفاقت اَب بھی قائم ہے۔ کاسترو ہی ایک ایسا فرد ہے جس سے وہ مختلف کتابوں پر بحث کرتا ہے، مچھلی پکانے کی ترکیبات پر معادمات کا تبادلہ ہوتا ہے اور دونوں جب کبھی اکٹھے ہوتے ہیں تو مختلف موضوعات پر رات گئے تک تبادلہ خیالات اور بحث

وتجیص جاری رہتی ہے۔ گارسیا مارکیز کا اصرار ہے کہ اُس کی دوستی اور عنایات (جس میں ہوانا میں اُس کے لیے سرکاری طور پر مہیا کردہ مرسیڈیز کار، شوفر اور دیگر سہولتیں شامل ہیں) نے خود اُس کے نظریات و خیالات کو قطعاً متاثر نہیں کیا۔ اگر کیوبا میں انقلاب نہ آتا، اُس نے اشارہ کرتے ہوئے نشان دہی کی تو اَب تک امریکہ اِس سے بھی بڑی عفریت بن چکا ہوتا ہے۔

اُس کے ناقدین کا کہنا ہے کہ اَب بھی گابو کی سیاست جادوئی حقیقت پسندی سے رنگی ہے۔

جہاں تک کیوبا کا تعلق ہے یہاں گابو یہ تسلیم کرنے سے قطعاً نہیں ہچکچاتا کہ ''میں جانبدار ہوں'' اور وہ مزید اضافہ کرتا ہے: ''میں ہمیشہ اِسے ایک مثبت پہلو سے دیکھتا ہوں۔ گابو اِس سلسلے میں بدہیئت حقائق کو یا تو اُن کی شدت کو کم کر کے بیان کرتا ہے یا پھر وہ اِن پر بات کرنے سے گریز کرتا ہے۔ جیسے کیوبا میں سیاسی جبر وتشدد، اقتصادی پس ماندگی یا پھر حال ہی میں کیوبا کے جلاوطن گروہ کے دو سویلین طیاروں کے مار گرائے جانے کے سنگین واقعہ کو۔ وہ اِس آخری واقعہ کو ایک حادثہ کہتا ہے جسے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا اور بالخصوص کاسترو تو کسی بھی صورت نہیں۔ ''میں اِس سلسلے میں خبر کے اپنے وسیلے کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا''۔ اُس نے مسکراتے ہوئے ''نیوز ویک'' کے ادارے کو بتایا۔ لیکن سامراج کے بارے میں اُس کی رایوں میں اَب بھی کوئی کمی نہیں۔

خیر یہ انتہائی نکتہ ہائے نظر، مارکیز کو نظریاتی حد بندیاں پار کرنے سے باز نہیں رکھتے ___ ایک ایسا وصف جو اُسے ایک عملیت پسندانہ برتری عطا کرتا ہے۔ اُس میں بے پناہ لچک اور تحرک ہے جس کے سبب وہ بالکل مختلف بلکہ متضاد الخیالات لوگوں سے بھی بآسانی مکالمہ کر سکتا ہے۔ اٹلی میں کولمبیا کے سفیر پلینیو اپولیو مینڈوزا (Plinio Apuleyo Mendoza)، جو اُس کا پرانے وقتوں کا ساتھی اور آج کل کاسترو کے دشمنوں میں شامل ہے، کا کہنا ہے ''اور اِس وصف کی بنا پر وہ ایک بے حد کارآمد اور مفید شخص ہے۔ مثلاً کیوبا کے سلسلے میں کاسترو کا حمایتی اور دکیل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس نے کمانڈنٹ (کاسترو) کو جمہوری طور طریقے اپنانے پر آمادہ بھی کیا ہے۔

علاوہ ازیں اُس نے کیوبا کے منحرف ادیبوں اور دانش وروں کو قید سے رہا کرانے کے لیے ممکن حد تک اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا۔ بالخصوص معروف ادیب ناربرتو فیونتیس (Norberto Fuentes) کو ۱۹۹۴ء میں بحفاظت میامی تک پہنچنے میں مدد دی (فیونتیس کا اُس کے لیے ایک ستائشی تبصرہ کچھ یوں ہے جو گزشتہ مہینے (اپریل ۱۹۹۴ء) میں ایک رسالہ میں چھپا۔ اِس مضمون میں فیونتیس نے گابو کا خاکہ اُڑاتے ہوئے اُسے ''آمر کا ننھا قاصد'' قرار دیا ہے)۔

میکسیکو میں، جہاں گارسیا مارکیز سال کا نصف حصہ گزارتا ہے وہ اَب معزول صدر اور نولبرل

مصلح کارلوس سالیناس ڈی کورٹاری (Carlos Salinas Decortari) کا ناقابلِ یقین حد تک معتمد علیہ (ہم راز) بن چکا ہے۔ جب اُس سے یہ پوچھا گیا کہ آیا وہ مارکوس (Marcos) کے نام کوئی پیغام دینا چاہتا ہے جو زاپٹسا (Zapatista) کسانوں کی بغاوت کا روپوش رہنما اور گابو کا پرستار ہے تو اُس نے کہا، ''دقیانوسی طرز کے انقلابات کا زمانہ لد چکا ہے اور باغیوں کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے جہاز خود تیار کریں اور اپنے لیے نئے اُفق تلاشیں۔'' اِس دوٹوک مشورہ نے بلاشبہ جنگل میں مورچہ بند مارکوس کو بہت دنوں تک گمبھیر سوچ اور غور وفکر پر مجبور کیا ہوگا۔

گابو کے سیاسی ارتقا کی کئی اور واضح علامات بھی دِکھائی دیتی ہیں۔ امریکہ پر اُس کے تیز و تند حملوں اور تنقید میں اَب وہ پرانی کاٹ نہیں رہی جس کی وجہ سے اُسے امریکی ویزے سے محروم ہونا پڑا تھا۔ جب اُس سے ایک صحافی نے یہ سوال کیا کہ آیا وہ اَب بھی اِس اَمر پر پریشان رہتا ہے کہ امریکی مفادات ایک سچی لاطینی امریکی ثقافت کی ترقی کی راہ میں مزاحم ہوں گے تو اُس نے ایک طنز سے بھرپور ہنسی میں کہا، ''یہی تو اَب دنیا ہے اور ترقی کی رفعتوں پر زندہ وقائم ہے۔''

گابو نے ۱۹۹۴ء میں بل کلنٹن کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ وہ قصرِ صدارت سے اُچھلتا کودتا اور خطابت کے دریا بہاتا آیا جس میں صدر کے وسعتِ علم اور کبھی نہ چین لینے والے تجسس کے بارے میں ایک طویل بیان تھا۔ اگر اس کی اَنا کو سہلایا جائے تو وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ کلنٹن کی بیٹی چیلسی (Chelsea) نے اُسے بتایا کہ وہ اُس کا پسندیدہ مصنف ہے۔ کولمبیا میں بھی مارکیز نے پرانی دیواروں کو گرا دیا ہے۔ اپریل ۱۹۹۴ء کی ابتدا میں اُس نے دو گھنٹے کے لیے اعلیٰ فوجی افسران سے ملاقات کی ___ اُسی ٹولے کے اراکین، جنہوں نے پندرہ برس پہلے اُسے جلاوطن ہونے پر مجبور کیا تھا۔ فوجی ٹولے کے لیے اُس کی عمومی حقارت اور ناپسندیدگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُس کے بہت سے پرانے دوستوں کا خیال تھا کہ یہ ملاقات بے حد انوکھی اور غیر معمولی تھی۔ لیکن گابو اِس ملاقات کے بارے میں بے حد پُرجوش اور خوش تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ ملاقات اُس کی نوحقیقت پسندی کی کوئی رمز ہو اور اُس نے کامبیو-۱۶ (Cambio-16) نامی رسالہ کے کولمبین ایڈیشن میں لکھا: ''طاقت کے مختلف طور طریقوں کی جانب میرا میلان ماورائے ادب ہے۔ اِسے تقریباً 'انسانیاتی' کیا جاسکتا ہے۔''

سیاست نہیں بلکہ طاقت وہ شے ہے جو صحیح معنوں میں مارکیز کے لیے انتہائی کشش کی حامل ہے۔ اُس کے ناول، آمروں، آدرش پرستوں اور مزاحمت کرنے والے آہنی ارادوں کے حامل

ستونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ حتیٰ کہ ''اغوا کی خبر'' میں بھی وہ واضح طور پر پبلو اسکوبر (Pabloescober) کی شخصیت سے زیادہ متاثر دکھائی دیتا ہے۔ مرحوم پبلو اسکوبر جو منشیات کا دھندا کرنے والی غیر قانونی تنظیم کا سرغنہ تھا۔ ''کولمبیا کی پوری تاریخ میں اُس جیسا کوئی اور شخص نہیں جس نے اُس کی مانند اپنی صلاحیتوں اور ذہانت کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے رائے عامہ کو اِس حد تک متشکل کیا ہو۔'' اُس نے رقم کیا، ''کسی اور کے پاس کرپشن کی اتنی بڑی طاقت نہ تھی۔'' طاقت کے ساتھ اُس کا یہ والہانہ لگاؤ، اُس کے دوستوں کا کہنا ہے، اِس اَمر کی صراحت کرتا ہے کہ وہ کیسے بیک وقت اتنی حد تک مختلف النوع افراد سے متاثر ہوتا ہے۔ جیسے کلنٹن، سالیناس (Salinas)، کاسترو، فرانکوئز متراں وغیرہ۔ یوں لگتا ہے کہ اِن سب کے ساتھ ساتھ گابو خود اپنی ساحرانہ قوت سے بھی یکساں طور پر متاثر ہے لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اُس کی ہر دلعزیز اور پُرکشش شخصیت سے زیادہ اُس کی شہرت کا کرشمہ ہے۔ ''کوئی شخص بھی اُس وقت تک آپ کی بات پر کان نہیں دھرتا جب تک کہ آپ کی بہت سی کتابیں مارکیٹ میں نہ بک رہی ہوں۔ اُس کا کہنا ہے ''جس شخص کے پاس شہرت ہے تو پھر اُس کے پاس معاشرت کے سٹیج پر ادا کرنے کے لیے ایک اہم کردار بھی ہے ____ کیوں کہ لوگ اُس کی بات کو دھیان سے سنتے ہیں اور اُس شخص کا ایک اعتبار ہوتا ہے۔''

گارسیا مارکیز ایک للچاہٹ کے ساتھ طاقت کو اپنی ذات میں مرکوز کرتا ہے لیکن غور کریں تو لگتا یہ ہے کہ اختیار اور حکمرانی کا یہ سارا ذوق وشوق محض اپنے بولیوارین خواب کا تعاقب ہے۔ جو لاطینی امریکن اتحاد کا سب سے قرین قیاس مقام ہے اور یہ مقام روایتی سیاست میں نہیں بلکہ کلچر کے زیادہ بے ساختہ اور بار آور میدان میں ہے۔ اِس ضمن میں کہانی کہنے کا فن ایک فالتو شے ہرگز نہیں ہے۔ اگر لکھاری اپنے علاقوں کی مٹی کی حقیقتوں کو بیان کرسکیں۔ وہ بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے تو نہ صرف یہ کہ انہیں دلچسپ، انوکھی اور نرالی کتابیں ملیں گی، بلکہ اِس کے ساتھ ساتھ وہ اُن مسائل کی نشان دہی بھی کرسکیں گے کہ جنہیں حل کرنا آج کی ایک اہم ضرورت ہے۔ گارسیا مارکیز کے نزدیک حقیقت پسند ہونے کا مطلب محض عوامی خدمت نہیں بلکہ یہ عمل بنیادی طور پر تخلیقی احیا کا ہے۔ وہ خود اپنے خلاف بھی صف آراء ہے اور خود کو بھی دعوت مبارزت دیتا ہے۔ اُس کے ایک دوست کا کہنا ہے: ''میرا خیال ہے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے جسے وہ جادوئی حقیقت پسندی کا نام دیتا ہے اور یہ جادوئی حقیقت پسندی کیا ہے؟ ____ یہ کہ میں نے یہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے اور اسے کرکے دکھا بھی دیا ہے، مگر اب آگے مجھے اور کیا کرنا ہے؟ اور میں

کیا کر سکتا ہوں۔ اور اِسی سوچ اور جتن میں مَیں تخلیقی طور پر بانجھ نہیں ہو سکوں گا؟"

بتدریج اُس نے اِس سوال کا جواب اپنی ابتدا یعنی صحافت کی جانب مراجعت کی صورت میں دیا ہے۔ گارسیا مارکیز کو بلاشبہ اُس کے ناولوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، لیکن صحافت بھی اُس کے لیے فکشن کی طرح ہی اہم ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب وہ بوگوٹا ڈیلی اِسپکٹا ڈور کے نامہ نگار کے طور پر کام کر رہا تھا تو وہ ہر کہانی سے خبر کی تفصیلات کا ہر آخری قطرہ تک نچوڑنے سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اَب یہی کچھ اُس نے اپنی کتاب "اغوا کی خبر" میں کیا ہے۔ یہ کتاب ابتدائی طور پر یک سالہ منصوبے کی صورت میں شروع ہوئی مگر پھر یہ دورانیہ تین برسوں تک پھیلتا چلا گیا۔ یہ تحریر اُس کے انچاس برسوں پر محیط پیشہ ورانہ اور ادبی سرگرمی میں سادہ رپورٹ نگاری کا طویل ترین ٹکڑا ہے، یہ تاریخ وار سوانح نو اغواؤں کا احاطہ کرتی ہے، جس میں ایک صحافی کا اغوا بھی شامل ہے ---- یہ سب واقعات و حادثات ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء کے دوران وقوع پذیر ہوئے جب ڈرگ مافیہ کے بادشاہ پابلو ایسکوبر نے حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کیا اِس کتاب کو بھی قبولِ عام کی سند حاصل ہو گی؟ گابو کو جب کبھی موقع ملتا ہے، وہ اِس موضوع پر تفصیلی اظہار سے نہیں چوکتا۔ "اِس کتاب میں واقعات اِس قدر غیر معمولی ہیں" وہ کہتا ہے "کہ یہ ایک افسانہ لگتی ہے، میرے پہلے تمام افسانوں سے کہیں بڑا اور حیران کن افسانہ۔" گزشتہ ہفتہ کے ماورائے حقیقت (سریلسٹ) واقعہ کے بعد ایسا کون ہے جو اُس سے اختلاف کرے گا؟ اِس کتاب کے کولمبین ناشر کو پوری پوری اُمید ہے کہ یہ کتاب اُن سب لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے گی جو اِس دیس کے سب سے مہان ادیب کو اِس سب سے بڑی کتھا سے نبرد آزما ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں لیکن کتاب کا انگریزی ایڈیشن جو اگلے سال یعنی ۱۹۹۷ء کی ابتدا میں شائع ہو گا، کی بکری کے امکانات کہیں کم یقینی ہیں۔ بہ ہر حال اِن کاروباری امکانات سے قطع نظر اُس کے تمام معاصر ادیب اِس امر پر متحیر ہیں کہ ایک بار پھر گابو نے خود کو کیسے عجیب انداز میں ایک کلچرل رہنما کے طور پر پیش کیا ہے۔ اپی گمینو اباره (Epigmenio Ibarra) میکسیکو ٹی وی کے نامور صحافی اور گابو کے دوست کا کہنا ہے: "یہاں ایک بار پھر "اُستاد" اگلے صفحے پر اپنی اُنگلی کو رکھتے ہوئے ہمیں سکھا رہا ہے اور صفحات مسلسل پلٹتے جا رہے ہیں۔" چند ہفتوں کے بعد جب کتاب چھپ جائے گی تو اُس کے کچھ ہی دنوں بعد "ایڈیپو الکالڈے" (Edipo Alcalde) کے تعاون سے گابو کی جدید ترین فلم "میئر ایڈیپس" (Oedipus the Mayor) کا "کینس" (Cannes) فلم فیسٹیول میں افتتاح ہو گا۔ اس فلم کا منظرنامہ (سکرین پلے)

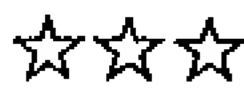
گارسیا مارکیز نے تحریر کیا ہے جب کہ ہدایت کاری کے فرائض کو ہمیں ہم وطن ''جارج ایلی ٹرایانا'' نے ادا کیے ہیں۔ اِس میں سوفوکلیز کے المیہ کو آج کے جدید کو ہمیں پس منظر میں نئے اسلوب اور حسیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ فلم کے کسکساہٹی تشدد کی عکس بندی ایک غصیلے اور غیض مند پادری کے ذریعے کی گئی ہے جو بندوق کی نوک پر ایک نوجوان گوریلا لڑکے سے زبردستی اقرارِ جرم کراتا ہے، اِس فلم میں کوئی جانباز (ہیرو) نہیں ہے۔ گارسیا مارکیز جس کی پردہ فلم پر اَب تک تمام کاوشیں ناکام رہی ہیں۔ ممکن ہے اِس بار کوئی بہتر کارکردگی دکھائے۔ فلم کی ہدایت کاری بے حد ہنرمندانہ ہے، بہترین سینما آٹوگرافی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں دِرخشندہ ستاروں کی طاقت سے بھی کام لیا گیا ہے ــــ ایڈیپس کا کردار معروف اداکار، جارج پیروگوریا (Jorge Perugorria) نے ادا کیا ہے، وہ کیوبن فلم انڈسٹری کا ''سٹرابیری چاکلیٹ'' ہیرو ہے۔ چوّن سالہ ٹریانا (Triana) کو پوری اُمید ہے کہ یہ فلم، لاطینی فلم انڈسٹری میں ایک بڑی ہلچل کا سبب بنے گی جو گابو کی نسل کے ادبی گرمئی بازار کی ہم سری کر سکے گی۔ ہم پردہء سیمیں پر اَب خود اپنی صدا کو دریافت کر رہے ہیں ــــ یورپ یا ہالی ووڈ کی آواز کو نہیں۔ اُس کا دعویٰ ہے۔ فلم بنانا بھی اِس عظیم مداری کی پٹاری کا ایک اہم جزو ہے۔ سال میں وہ کئی بار ہوانا کا سفر صرف اِس غرض سے کرتا ہے کہ وہ انسٹیٹیوٹ آف نیو لاطینی امریکن فلم میں سکرین پلے پر منعقد ہونے والے سیمیناروں میں لیکچر دے سکے۔ آج سے بارہ برس قبل خود اُس نے ہی اِس ادارہ کے قیام میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اِس ادارے کا مقصد ایسی جگہ مہیا کرنا ہے جہاں اِس پورے علاقے کے ایسے لوگ جو ایک آزادانہ فضا میں نئے انداز کی فلمیں بنانا چاہتے ہیں، اپنی ہنرمندی اور مہارتوں میں نشوونما کر سکیں اور اِس کے اچھے نتائج پہلے سے ہی محسوس ہونے لگے ہیں۔ ''میسر ایڈیپس'' کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرنے والوں، بہ شمول فلم کے پروڈیوسر ''جارج سانچز'' (Jorge Sanches) کے اکثر اسی ادارے سے فارغ التحصیل ہیں۔ اِس ادارے کی مالی معاونت کی غرض سے گابو، یورپ، امریکہ اور جاپان کے ٹی وی کے اہل کاروں کو مسلسل انٹرویوز ریکارڈ کرا دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، ''میں ہر انٹرویو کے لیے کم از کم پچاس ہزار ڈالر کا معاوضہ وصول کرتا ہوں اور یہ رقم براہِ راست اِس ادارے کو کیوبا میں بھجوا دی جاتی ہے۔''

حال ہی میں گابو نے نوجوان لاطینی امریکی صحافیوں کی تربیت کے لیے اِس سے بھی کہیں زیادہ کا حاصل ''دیواروں کے بغیر مکتب'' قائم کیا ہے۔ ''نیو اِبرو امریکن جرنلزم فاؤنڈیشن'' (New Ibro American Journalism Foundation) ایسے نوجوان صحافیوں کو

دعوت دیتی ہے جو تیس برس سے کم عمر کے ہوں۔ یہ لوگ سیمینار میں ایسے مسائل سے آگہی حاصل کرتے ہیں جو انہوں نے کسی باقاعدہ ادارے یا نیوز روم میں نہ سیکھے ہوں۔ جیسے کتھا کہنے کی کلا یا اخلاقیات وغیرہ۔ نوجوانوں کا انتخاب اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ عموماً تھکے ہوئے گھوڑے نہیں ہوتے اور نئی چیزیں سیکھنے کے لیے محنت سے جی نہیں چراتے۔ گارسیا مارکیز کہتا ہے: نوجوان اِن جدید ابلاغیاتی اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر اِس انداز سے باہر آتے ہیں، جیسے انہوں نے انجینئرنگ یا میڈیسن کا مطالعہ کیا ہو لیکن وہ اِس اَمر سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں کہ ایک اخبار کو کیسے نکالا اور جاری رکھا جا سکتا ہے۔ وہ یہاں اسی ہنر کی مشق حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ فاؤنڈیشن نے اِس برس چوبیس مختلف ورکشاپس کے لیے اشتہار دیا ہے۔ ہر ورکشاپ میں بارہ صحافی شریک ہوں گے اور گارسیا مارکیز نے اِن سیمینارز کے لیے معروف صحافیوں کو دعوت دی ہے۔ ٹیری اینڈرسن (Terry Anderson)، ایسوی ایٹڈ پریس کا سابقہ نامہ نگار، جسے لبنان میں یرغمال بنالیا گیا تھا، نے خطرناک رپورٹنگ پر اظہار خیال کیا۔ لیکن زیادہ تر جلسوں میں خود گارسیا مارکیز نے بنیادی لیکچر دیے۔ بہ ظاہر یہ سادہ سی ورکشاپس ہیں لیکن ان میں ایک گہرا اور رمز بھرا پیغام موجود ہوتا ہے کہ لاطینی امریکہ میں تبدیلی کا عمل انقلابی خوابوں سے بھی شروع ہو سکتا ہے لیکن ان کی ابتدا اداروں کی تعمیر کے دشوار عمل سے ہی شروع ہونی چاہیے۔ ”بعض اوقات، یہ عمل گھنے جنگل کے عین درمیان قدیمی بلند چیخ سے شروع ہو سکتی ہے، جیسے مارکوس نے اپنی بغاوت میں کیا۔“ میکسیکو کا معروف ادیب کارلوس فیونتیس (Carlos Fuentes)، جو گابو کے انتہائی قریبی دوستوں میں سے ہے، نے کہا۔ کارلوس میکسیکو میں ابتدائی سطح کے جمہوری فورمز کا بندوبست کرتا رہا ہے۔ لیکن اَب یہ عمل عظیم الشان نظریات کے بارے میں نہیں رہا۔ اَب اِس کا سمبندھ عملی چیزوں سے ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ایسی ورکشاپس کے انعقاد کے لیے گابو کے پاس اس سے بہتر وقت اور کوئی نہ تھا۔ اَب عریاں آمریت کا عہد اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا ہے۔ ادیب الما گلرمو پرائٹو (Alma Guillermorprieto) جو ”نیویارکر“ (New Yorker) کے لیے لکھتا ہے اور جس نے اِس ادارے میں تدریسی فرائض بھی سرانجام دیے تھے، کا کہنا ہے، ”لوگوں کو اَب اِس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ ایک مہذب معاشرت کی تشکیل کے لیے ہمارے پاس یہاں کچھ زیادہ اوزار موجود نہیں ہیں اور جو ہیں اُن میں سب سے اہم صحافت ہے۔

جب حال ہی میں رسالہ ”نیوز ویک“ کی انٹرویو ٹیم نے کارٹا جینا (Cartagena) کا دورہ کیا اور گارسیا مارکیز سے ملاقات کی تو وہ کالونیل عہد کی ایک قدیم مگر نوتزئین شدہ بلڈنگ میں

ایک میز کے گرد بارہ دیگر نوجوان صحافیوں کی ہمراہی میں بیٹھا تھا۔ اُس کا ناشر کتاب کے آخری پروف پڑھنے کے لیے اُسے گزشتہ ایک ہفتہ سے مسلسل دق کر رہا تھا۔ اُس کی فلم ٹیم کو فلم کی آخری ایڈیٹنگ کے لیے میکسیکو میں اُس کی موجودگی کی اَشد ضرورت تھی۔ کولمبیا، کیوبا اور میکسیکو کے سیاسی بحران اُس کی جانب سے فوری توجہ کے طالب تھے۔ لیکن وہ اِن سب سے دور یہاں پر انتہائی آسودہ، مطمئن اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا اور سہ روزہ ورکشاپ کے اختتام پر ہر ایک کے ساتھ آزادانہ بحث و مباحثہ میں مصروف تھا، اَب وہ ذرا شرماتے ہوئے شکوہ کر رہا تھا کہ کسی شخص نے بھی ''اغوا کی خبر'' میں سے اُس کے پڑھے ہوئے اقتباس پر تنقیدی جائزہ پیش نہ کیا تھا۔ لیکن اَب یہ پُراعتماد صحافی بات کرتے ہوئے قطعاً نہ ہچکچا رہے تھے۔ انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ شروع کی اور گابو نے خوش مزاجی سے اپنا وقار برقرار رکھتے ہوئے اور اپنا اسقفی مرتبہ ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اچھے مزاج کے ساتھ انہیں جوابات دیے۔ میرے لیے اِس نسل کے ساتھ تعلقات انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ اُس نے انہیں بتایا ''یہ مجھے مطمئن رکھتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ میں یہ کچھ کر سکتا ہوں۔'' اور کچھ پہروں کے لیے ہی سہی اُسے جادوئی انداز میں ساکت بٹھا دیتے ہیں۔



(مشمولہ ''تناظر''، گجرات، شمارہ نمبر ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء)

مارکیز: یاد، طلسم اور تخیل کا امتزاج

ڈاکٹر امجد طفیل

مارکیز کا تخیل مجھے ان داستان سنانے والوں کی یاد دلاتا ہے جو اپنے لفظوں سے طلسم تخلیق کرتے تھے اور سننے/پڑھنے والے اس طلسم میں کھو سے جاتے تھے۔ طلسم کے معنی ہی یہ ہیں کہ سب کچھ نظر کا دھوکا ہو لیکن دیکھنے والوں کو اس پر ایسا اعتبار آئے کہ فریب حقیقت میں ڈھل جائے اور انسان اس میں ایسا اسیر ہو کہ باہر نکلنے کا رستہ تک نہ ملے۔ تنہائی کے سو سال (One Hundred Years of Solitude) پڑھتے ہوئے مجھے یہی گمان گزرا۔ جیسے میں ایک ایسی دنیا میں داخل ہو چکا ہوں جس میں انسان، روحیں، چرند، پرند اور پودے سب ایک دوسرے سے گندھے ہوئے ہیں۔ مارکیز کے قدم سختی سے زمین میں گڑے ہیں لیکن اس کے تخیل کی اڑان ایسے کردار تراشتی ہے جو ہاتھوں کی قوت سے طاقت ور بیل کو روک سکتے ہیں۔

جوزے آرکادیو (Jose Acradio) کی علامت اتنی بڑی ہے کہ اس کی والدہ جب پہلی بار دیکھتی ہے تو خوف اور فخر سے کانپ جاتی ہے۔ پراسرار بیماریاں حملہ آور ہو کر سارے قصبے کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہیں۔ تب کہیں سے ایک خانہ بدوش بوڑھا نمودار ہوتا ہے اپنے محلول کے چند قطروں سے تمام قصبے کو نجات دلاتا ہے۔ قتل ہونے والے انسانوں کی روحیں اپنے قاتل کو پریشان کرتی ہیں۔ اپنے زخموں سے بہتے خون کو روکنے کے لیے پانی کی تلاش میں مقتول کے گھر میں بے چین و پریشان پھرتی ہیں۔ قتل ہونے والے کی روح جوزے آرکادیو بوئندیا (Jose Arcadio Buendia) سے انتقام لیتی ہے اور اسے اپنی بستی چھوڑ کر ایک نئے جہان کی تلاش میں نکلنا پڑتا ہے۔ اس سے ناول نگار اس نئے جہاں کی تخلیق کرتا ہے جو ''تنہائی کے سو سال

''میں ہمارے سامنے آشکار ہوتا ہے۔

ناول کا آغاز لاطینی امریکہ کے نوآبادیاتی بننے کے عمل کے آغاز سے شروع ہوتا ہے جب قزاق سر فرانسز ڈریک (Sir Francis Drake) سولہویں صدی میں ریوہاچا (Riohacha) پر حملہ آور ہوتا ہے۔ تب ارسلا کے آباؤ اجداد کو ہجرت کر کے مقامی انڈین کی ایک پُرسکون بستی میں جانا پڑتا ہے جہاں بوئندیا کے اجداد سے ان کی رشتے داری استوار ہوتی ہے جو آیندہ تین صدیوں تک ایک مضبوط بندھن میں ڈھل جاتی ہے۔ انھی خاندانوں کے دو افراد ارسلا اور بوئندیا جب آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں خاندانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ آپس میں شادیوں سے عجیب الخلق بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ ارسلا اور بوئندیا شادی کے بعد ایک بددعا کے اثر میں ہیں اور اس سے نجات پانے کے لیے ایک لمبے سفر پر نکلتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ناول کی کہانی ابتدا ہی میں داستان اور طلسم کے عناصر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس سفر کا اختتام دو سال کے بعد ایک بے آباد علاقے میں دریا کے کنارے پر ہوتا ہے جہاں بوئندیا پڑاؤ ڈالتا ہے اور ایک نئے جہاں کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ اس جہان کا خالق خود ایک بچے یا ابتدائی انسان کی حیرت سے دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ ماکوندو (Macondo) مارکیز کا خواب نگر (Dream Town) جسے اس نے خود تخلیق کیا ہے۔ جس کی گلیوں، گھروں کا نقشہ اس کا اپنا تیار کردہ ہے یہ قصبہ بار بار مارکیز کے تخلیقی شعور میں ابھرتا ہے۔ ماکوندو ہی ہے جہاں چیزیں اور انسان ایک ابدی آہنگ میں زندہ ہیں۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہے کہ ایک دن مارچ کے مہینے میں مفلوک الحال خانہ بدوشوں کا قبیلہ گاؤں کے قریب ڈیرے ڈالتا ہے۔ یہ برسوں بعد بیرونی دنیا سے ماکوندو کے باشندوں کا پہلا رابطہ ہے۔ خانہ بدوش اپنے ساتھ دنیا میں ہونے والی ایجادات لاتے ہیں جو اس مختصری بستی کے لوگوں کے لیے حیرتوں کے جہان وا کرتی ہیں تب بوئندیا ایک تخلیق کار کی حیرت سے ان ایجادات کو قبول کرتا ہے اور اپنے طور پر ان امکانات کو کھنگالتا ہے جن کا ظہور ان ایجادات کی بدولت ممکن ہے۔ ماکوندو کی دنیا رسمی اخلاقیات کی جکڑ بندیوں سے آزادی ہے قانون اور کلیسا اس کی سرحدوں سے بہت دور ہیں۔ سب لوگ اپنی مرضی سے زندگی گزارتے ہیں۔

مارکیز اپنی تخلیقی قوت ''یاد'' کے مظہر سے حاصل کرتا ہے۔ وہ یادیں جو اس کے بچپن کے لاطینی امریکہ اور خاص طور پر کولمبیا کے معاشرے میں موجود حقیقت پر مبنی ہیں۔ جو بیسویں صدی کے یورپی معاشرے سے بالکل جدا ایک ایسی دنیا ہے جس میں بہت سے زمانے ایک ساتھ زندہ

ہیں۔ کچھ دن پہلے ٹیلی ویژن نے ایک مختصر فلم دکھائی کہ پیرو کے ساحل کے پاس ایک غرق شدہ جہاز میں مرنے والوں کی روحوں کو بھگانے کے لیے وچ ڈاکٹروں سے ان کے مخصوص عمل کروائے گئے۔ یہ ڈاکٹر جن کشتیوں میں سوار تھے ان کے کناروں پر صلیبیں بنی تھیں اور یہ اپنے جادوئی عمل سے مرنے والوں کی روحوں کو بھگا رہے تھے۔ تو یہ وہ معاشرہ ہے جس میں مارکیز نے پرورش پائی ہے اس لیے وہ جب اپنے اردگرد پھیلے لوگوں کا احوال اسی طرح بیان کرتا ہے جیسے وہ ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ اس کا اسلوب حقیقت نگاری (Realism) سے جدا کوئی چیز ہے کیوں کہ ہم نے حقیقت نگاری کی تعریف مغربی فکر اور معاشرت سے لی ہے جہاں چار سو سالوں کی عقلیت نے چیزوں کو دیکھنے کے سطحی نقطہ نظر کو عام کیا ہے۔ اُردو ادب میں حقیقت نگاروں نے اپنی معاشرت میں موجود حقائق کو بیان کرنے کی بجائے مغرب سے مستعار تصورات کے تحت حقیقت کی ترمیم شدہ تصویر پیش کی ہے۔ اب ایک ایسا معاشرہ جس میں بہت سے زمانے ایک ساتھ سانس لے رہے ہوں۔ جہاں عقلیت کی بنیاد پر بننے والے ذہن کے ساتھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اب بھی روح، جادو اور مافوق الفطرت قوتوں کی عمل کاری پر یقین رکھتے ہیں۔ جہاں زرعی اور قبائلی معاشرت، صنعتی معاشرت کے پہلو بہ پہلو موجود ہے جہاں لوگ ماہر ترین معالج سے دوائی لینے کے بعد کسی پیر یا بزرگ کی درگاہ پر ثواب اور برکت کے حصول کے لیے حاضری دیتے ہیں تو ایسے معاشرے میں چیزوں کو سیدھی لکیر کے طور پر بیان کرنے سے سپاٹ حقیقت نگاری جنم لیتی ہے۔ مارکیز کے ذریعہ لاطینی امریکہ کے جس معاشرے سے میرا تعارف ہوا وہ مجھے اپنے ہاں کے معاشرے سے حیرت انگیز مماثلت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ مارکیز جس ماحول کی تعمیر کرتا ہے وہ مجھے اپنے اردگرد سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یوں میں اسے ایک ایسے تخلیق کار کے طور پر پڑھتا ہوں جو ہماری ہی کہانی بیان کر رہا ہے۔

یادیں مارکیز کا وہ سرمایہ ہیں جن سے وہ اپنی تخلیقات کی بنیادیں استوار کرتا ہے اور پھر اپنے تخیل کی بے پناہ جولانی سے ایک طلسمی فضا کی تعمیر کرتا ہے۔ مارکیز کے دوست پلینیو اپولیو مینڈوزا (Plinio Apuleyo Mendoza) نے مارکیز کے تخلیقی سوتے کی طرف اپنے مضمون گیبریئل (Gabriel) میں یوں اشارہ کیا ہے۔

> ”دونا ترانکیلینا (مارکیز کی نانی) اس مکان پر حکمران تھیں جس کو وہ بعد میں ایک وسیع و عریض، قدیم مکان کے طور پر یاد رکھنے والا تھا، جس کے پائیں باغ میں تپتی ہوئی راتوں میں چنبیلی کی گاڑھی خوشبوئیں تیرتی رہتی

تھیں اور جس کے بے شمار کمرے تھے جن میں سے گا ہے بہ گا ہے مرحوم رشتہ داروں کے آہیں بھرنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں ۔ دونا ترانکیلینا کا خاندان جھلتی ریت کے جزیرہ نما گواہیرا سے تعلق رکھتا تھا جو مقامی انڈین باشندوں، سمگلروں اور ساحروں کا مسکن تھا۔ وہ غیر معمولی چیزوں کے بارے میں اس طرح بات کرنے کی عادی تھیں گویا وہ روز مرہ کی باتیں ہوں ۔ آہنی عزم کی مالک، پستہ قد اور بھینگی آنکھوں والی اس عورت کے ذہن میں مرے ہوؤں اور زندوں کے درمیان سرحد واقع نہ تھی اور جوں جوں ان کی عمر میں اضافہ اور بینائی میں کمی ہوتی گئی یہ سرحد اور بھی زیادہ دھندلی ہونے لگی، یہاں تک کہ خاتمے کے قریب انھیں اکثر مردوں سے باتیں کرتے اور ان کی آہیں، سسکیاں اور شکایتیں سنتے ہوئے پایا جا سکتا ہے۔"

(ترجمہ: اجمل کمال)

مارکیز کی ننھیال کا گھر، اس کا پرہیبت ماحول، اس کے ننھیالی رشتے دار، بار بار اس کے ہاں ظاہر ہوتے ہیں ۔ مارکیز کا بچپن اپنے نانی نانا کے ہاں گزرا۔ وہ بڑوں کی دنیا میں گم ایک ایسا بچہ تھا جو اپنے ماحول کو سمجھنے اور اس میں اپنے مقام کا تعین کرنے میں سرکھپاتا لیکن اس کا حیرت سے پر بچکانہ ذہن اس کے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ یہ سوال آگے چل کر ساری زندگی مارکیز کا پیچھا کرنے والے تھے ۔ بار بار اس کے ذہن کی سطح پر ابھر کرنت نئی شکلوں میں ظاہر ہونے والے تھے ۔غرض کہا جا سکتا ہے مارکیز کا تخلیقی شعور، بچے کی حیرت، بڑے کی سمجھ بوجھ، دانا کی حکمت اور متجسس ذہن کی تلاش اور جوانی کی جذباتیت سے عبارت ہے۔

مارکیز نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جو کردار تراشے ہیں وہ روز مرہ زندگی میں نظر آنے والے معمولی لوگ نہیں ہیں بلکہ غیر معمولی صلاحیتوں، خوبیوں اور جسمانی خصائص کے حامل افراد ہیں ۔ مارکیز کو غیر معمولی افراد اور واقعات اپنی طرف کھینچتے ہیں ۔ ان غیر معمولی کرداروں کو پیش کرنے کے لیے مارکیز جو فضا تیار کرتا ہے وہ بھی غیر معمولی عناصر سے پر ہے۔ مافوق الفطرت عناصر، انسان، جانور، پودے، بے جان چیزیں، مردے سب ایک دوسرے سے پیوست ہیں ۔ مارکیز کی تحریروں میں ہمیں لاطینی امریکہ کا معاشرہ سانس لیتا نظر آتا ہے۔ اسے اپنی تحریروں میں کوئی غیر معمولی پن دکھائی نہیں دیتا جو مغربی نقاد اس میں دریافت کرتے ہیں ۔ اجمل کمال نے

مارکیز کے اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مارکیز کے اسلوب کو بیان کرنے کے لیے مغربی دانش وروں نے ''طلسمی حقیقت نگاری'' کی اصطلاح وضع کی ہے۔ مارکیز کو اس سے قطعی اتفاق نہیں، وہ اپنے اسلوب کو محض حقیقت نگاری کہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تخلیق کا سرچشمہ، آخری تجزیے میں، حقیقت ہی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں مبالغے کی کارفرمائی کم ہی دیکھتا ہے، لیکن بلاشبہ مارکیز کی حقیقت نگاری اس سہل انگار اسلوب سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی جو حقیقت کو یک رخا دیکھنے کی عادی ہے اور جس کا ہمارے ہاں بھی بہت چلن رہ چکا ہے۔ دوسری جانب اس کا حقیقت نگاری کے اس بے بنیاد رویے سے بھی کچھ واسطہ نہیں، ہمارا آج کل کا بیش تر فکشن جس کا شکار ہے ''آپ عقلیت کا برگ انجیر اسی وقت اتار کر پھینک سکتے ہیں'' مارکیز کہتا ہے'' جب آپ مکمل انتشار اور لغویت اور فینٹسی کی دلدل میں دھنس جانے کے خطرے سے آزاد ہوں'' تخیل اور حواس سے کام لے کر اپنی حقیقت کو دریافت کرنے کے علاوہ، لکھنے کے عمل کا نوے فی صد حصہ بڑھئی کے کام پر مشتمل ہے جس پر اس کے خیال میں لکھنے والے کو پوری طرح حاوی ہونا چاہیے۔''

''حقیقت کو پوری طرح اپنے شعور اور بیان کی گرفت میں لے آنا اسے تسخیر کر لینے ہی کی ایک شکل ہے۔ مارکیز کی تحروں میں آپ یہی سحر دیکھیں گے اور اس کی حیرت اور مسرت سے گزر جانے کے بعد شاید یہ سوال باقی رہ جائے کہ آخر کیوں ہماری حقیقت ہمارے ادیبوں کی تحریروں میں اپنا مکمل اظہار پانے سے محروم ہے۔''

مارکیز کے اسلوب کے جن اجزا کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی کئی اہم عناصر ہیں جن میں سے ایک کی طرف میں اس وقت اشارہ کرنا چاہوں گا جیسا میں نے اوپر لکھا ہے کہ ''یاد'' مارکیز کے بنیادی سوتے کا درجہ رکھتی ہے۔ ماضی ایک ایسا خزانہ ہے جسے وہ بار بار کھنگالتا ہے اور ہر بار ایک نئے اسرار سے ہمیں متعارف کرواتا ہے۔ لیکن مارکیز خود کو صرف ماضی کی یادوں تک محدود نہیں رکھتا۔ اس کے کردار اور وہ خود اپنے کرداروں کی مستقبل کی زندگی کو بھی

پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ اس خاص وقت میں رونما ہونے والا واقعہ اور حاصل ہونے والا تجربہ آگے چل کر کیا اثرات مرتب کرے گا اس کی جانب بھی وہ اشارے کرتا جاتا ہے اور یہ اس کا ایک امتیازی وصف ہے۔

مارکیز کے ادبی اور تخلیقی سفر کا آغاز ۱۹۵۰ء کے قریب ہوتا ہے۔ جب اس نے تعلیم چھوڑ کر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ ابتدا میں اس نے کہانیاں لکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے پہلے ناول ''پتوں کا طوفان'' (Leaf Storm) پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۵۵ء میں ایک اخبار ''ایل اسپیکٹا دور'' کے نامہ نگار کی حیثیت سے اس نے یورپ کا سفر کیا۔ فرانس میں اس نے اپنے ناول ''کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا'' (No One Writes to the Colonel) پر اپنے کام کا آغاز کیا ۔ یہ ناول ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ ''منحوس وقت'' (In Evil Hour) ۱۹۶۲ء میں چھپا۔ اس دوران مارکیز کی آٹھ کہانیوں پر مشتمل مجموعہ (Big Mama's Funeral) ۱۹۶۱ء میں چھپ چکا تھا۔ مارکیز کے یہ ابتدائی افسانوی مجموعے اور ناول اس کے لیے کوئی ادبی مقام بنانے میں ناکام رہے۔ اگر چہ ان میں وہ تمام حالات وواقعات موجود ہیں جو آگے چل کر ''تنہائی کے سو سال'' میں زیادہ خوب صورتی اور ماہرانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ مارکیز یادوں سے تخلیقی انگیخت حاصل کرتا ہے۔ دوسرا وہ اپنی زندگی کے واقعات کو ناول اور افسانے کی بنیاد بناتا ہے اس لیے ہمیں اس کا فکشن (Auto Biographycal) نظر آتا ہے دوسرا واقعات و حالات کی تکرار ملتی ہے لیکن مارکیز کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بار کسی واقعہ کو دہراتے ہوئے اس میں کسی نئی بات، پہلو یا سمت کا اضافہ کردیتا ہے۔

مارٹن لنگز (Martin Lings) نے ولیم شیکسپیئر پر اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ایک بڑا تخلیق کار اپنے طور پر کائنات کی تشکیل کرتا ہے وہ جس دنیا میں رہتا ہے روزمرہ کی زندگی گزارتا ہے اس میں اپنی آرزوئیں، خواہشات اور خواب شامل کر کے ایک نئی دنیا کی تخلیق جو پرانی دنیا سے بیک وقت مماثل اور متضاد ہوتی ہے۔ اسی طرح جوزف کانرڈ (Joseph Corand) نے ایک جگہ فکشن اور غیر فکشن میں فرق اس طرح کیا ہے کہ فکشن دنیا کی تخلیق (Creat) کرتا ہے اور غیر فکشن دنیا کو پیش (Represent) کرتا ہے۔ مارکیز کے ہاں ہمیں ایک نئی دنیا کی تخلیق کی کوشش نظر آتی ہے۔ اس نے ابتدا میں اپنی کہانیوں اور ناولوں میں اس دنیا کو اجزا میں تخلیق کیا۔ مثلاً ''پتوں کا طوفان'' میں وہ عناصر کافی حد تک موجود ہیں جو اس کے بعد کے بڑے فکشن کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنے والے تھے۔ ''ماکوندو'' گارسیا مارکیز کے خواب نگر

(Dream Town) کے نقوش ابھرنے لگے تھے۔ انسان کی خارجی دنیا کی ویرانی اور انسان کا اپنی گزاری ہوئی زندگی کے ساتھ شدید وابستگی کا رویہ ناول میں ظاہر ہو چکا تھا۔ اسی طرح کا معاملہ اس کی کہانیوں کا ہے جو دو مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئیں اور پھر "منحوس وقت" ایک بار پھر قصبے کی زندگی پر غیر معمولی واقعات کے ظہور اور قصبے کی ہم آہنگ زندگی (Harmony) میں رخنہ اندازی کو پیش کرتا ہے۔ "پتوں کے طوفان" کا ابتدائیہ بھی ایک سطح پر "تنہائی کے سو سال" کے ابتدائیے سے مماثل ہے۔ پہلے ناول میں ابتدائی منظر ایک تدفین کا ہے اور پھر وقت میں پیچھے کی طرف سفر (Flash Back) سے ہوتا ہے۔ "تنہائی کے سو سال" میں ابتدا کرنل کے فائرنگ سکواڈ کا سامنا کرتے ہوئے وقت میں پیچھے کی طرف سفر میں پورا ناول کھلتا (Unfold) ہوتا ہے۔ منحوس وقت (In Evil Hour) میں ہمیں لاطینی امریکہ کا ایک خوابیدہ قصبہ نظر آتا ہے جہاں ایک "صبح" سے ایسے واقعات کے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے جو قصبہ کے پرسکون ماحول میں ہلچل مچا دیتے ہیں اور قصبے کے امراء کی زندگی کے خفیہ گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ پورے قصبے کو جیسے ایک دم بدی کی بہت سی قوتیں اپنے گھیرے میں لیتی ہیں۔ ان واقعات کا مرکزی کردار قصبے کا میئر ہے جو جائز و ناجائز طریقے سے دولت سمیٹنے میں مصروف ہے۔ وہ قصبے کے لوگوں کو بتاتا ہے کہ ہم ایک مہذب اور پرامن قصبہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو قصبے کی ایک عورت جواباً طنز کرتی ہے کہ تمہاری آمد سے پیشتر یہ قصبہ ایسا ہی تھا یہ جگہ ہمیں پھر "تنہائی کے سو سال" کی طرف لے جاتی ہے۔ جب قصبہ میں پہلی بار داخل ہونے والے مجسٹریٹ کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ قصبہ کے لوگ کسی بیرونی عنصر کو اپنے اندر جگہ دینے کو تیار نہیں تاکہ وہاں کی زندگی کے ڈھرے میں رخنہ اندازی نہ کر سکے۔ مارکیز کے نقاد مائیکل وڈ نے مارکیز کی تحریروں میں مماثلات کے بارے میں لکھا ہے۔

> "پتوں کے طوفان" (۱۹۹۵ء) میں گارسیا مارکیز ماکوندو کی دنیا کو دریافت کرنا شروع کرتا ہے۔ ماکوندو منطقہ حارہ کی بارشوں کا شکار، کیلے کے باغوں والا قصبہ جو "تنہائی کے سو سال" کا محل وقوع ہے اور جو "بڑی ماما کا جنازہ" نامی مجموعے کی کہانیوں میں، کبھی اپنے نام کے ساتھ اور کبھی گمنام، نمودار ہوتا ہے۔ گارسیا مارکیز انکسار کے ساتھ بالزاک اور فاکنر کی پیروی کرتے ہوئے، کرداروں اور واقعات کی جابجا تکرار سے کام لیتا ہے۔ اس طرح کہ کہانی کے ٹکڑے بہتے بہتے ایک متن سے دوسرے متن

میں چلے جاتے ہیں ۔ یہ عمل اس وقت بھی پیش آتا ہے ۔ مثلاً'' کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا''، ''منحوس وقت'' اور'' ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' میں جب یہ مقام ماکوندو میں بلکہ اس بے نام ملک کے اسی حصے میں واقع ایک اور قصبہ ہے جہاں ریلوے لائن نہیں ہے اور جہاں تک صرف دریائی کشتی سے پہنچا جا سکتا ہے۔'' خود مارکیز نے ایک جگہ کہا ہے'' عام طور پر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ادیب ایک ہی کتاب لکھتا ہے، اگرچہ واحد کتاب کئی جلدوں میں مختلف عنوانات کے تحت شائع ہوتی ہے۔ یہ بات آپ کو بالزاک، کونریڈ، میلول اور بلاشبہ فاکنر کے ہاں نظر آتی ہے۔''

(امرود کی مہک، ترجمہ: اجمل کمال)

تنہائی کے سو سال (One Hundred Years of Solitude) ۱۹۶۷ء میں چھپا اور اس کے ساتھ ہی مارکیز کی عالم گیر شہرت کا آغاز ہوتا ہے ۔ اسے (The Magnificent Family Chronicle) کہا گیا ہے۔ اس ناول میں ہمیں بانڈو خاندان کے عروج و زوال کی کہانی ملتی ہے ۔ اس ناول میں ہمیں متضاد موضوعات ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں ۔ موت، پیار، جنگ، امن، جوانی، بڑھاپا، ان موضوعات کے ساتھ ناول کی خوابناک فضاء قاری کے باطن میں سلگنے کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس ناول میں ہم قدم قدم پر حیرت سے دوچار ہوتے ہیں ۔ یہ حیرت حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے انوکھے پن سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ناول میں مارکیز کی ابتدائی زندگی کے حالات وواقعات اس کی اپنی نانی اور خالاؤں سے سنی زبانی روایات اور داستانیں ایک بڑے کینوس پر متشکل ہوتی ہیں ۔ گارسیا مارکیز کا زرخیز تخیل ان کہانیوں کو حیرت انگیز شکل دینے لگتا ہے۔'' تنہائی کے سو سال'' میں ایک واقعہ ہے جب'' ماکوندو'' کے باشندے اپنی یادداشت سے محروم ہونے لگتے ہیں تو جوزے آرکادیو بوئنڈیا (قصبہ کا خالق) لوگوں کے لیے اشیا کے نام اور ان کی افادیت کو برقرار رکھنے کے لیے تحریر سے مدد لیتا ہے تو ہمیں گمان ہوتا ہے کہ اب لوگوں کی زندگیوں میں زبانی روایت کی جگہ تحریر لے رہی ہے۔ زبانی روایت لچک دار طرز فکر کی نمائندہ ہے جس میں لوگ اپنے اپنے زمان ومکان کے مطابق تبدیلی کرتے چلے آئے تھے۔ اب اس کی جگہ تحریر نے لے لی ہے جو بے لچک ہے جس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی ۔ زبانی روایت اجتماعی ملکیت ہے اس کے حقوق پورے گروہ یا قوم کے نام محفوظ ہوتے ہیں جب کہ لکھی تحریر پر اس کے مصنف کا حق فائق سمجھا جاتا ہے ۔ یوں

ناول کا ایک معمولی واقعہ انسانی تہذیب میں آنے والی فیصلہ کن اور پیچیدہ تبدیلی کا استعارہ بن جاتا ہے۔

''تنہائی کے سو سال'' میں ہمیں وقت کی تباہ کاریاں اور تقدیر کا جبر بہت اہم موضوع کے طور پر ملتے ہیں۔ جوزے آرکادیو بوئندیا جس انجام سے بچنے کے لیے اپنی بستی کو چھوڑتا ہے، وہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ بوئندیا خاندان کی سو سالہ تاریخ میں انھیں جگہ جگہ سزا ملتی ہے اور وہ اپنے بزرگ کے کرم کا پھل پاتے ہیں۔ گارسیا مارکیز نے خود بوئندیا خاندان کی تنہائی کا منبع، اس خاندان میں محبت کا فقدان کو قرار دیا ہے لیکن ظاہری سطح پر تو اس خاندان کے لوگ ایک دوسرے سے چمٹے نظر آتے ہیں جو لوگ گھر چھوڑ جاتے ہیں وہ بھی بالآخر اس جگہ واپس لوٹتے ہیں۔ ناول میں مکان کی حرکت نہ ہونے کے برابر ہے ساری حرکت زماں میں ہے۔ لوگ، واقعات سب ایک دوسرے کو دہرا رہے ہیں۔ مرنے والے نئے پیدا ہونے والوں کی صورت دوسرا جنم لیتے ہیں۔ گارسیا مارکیز نے بعض جگہ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ کر کے تقدیر کی جبریت کو نمایاں کیا ہے۔ ''تنہائی کے سو سال'' سے زیادہ اس موضوع پر ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' (Chronicle of a Death Foretold) میں زیادہ وضاحت سے اظہار ملتا ہے۔ دوسرا مارکیز کے کم و بیش تمام ناولوں کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں ناول میں رونما ہونے والے واقعات پہلے ہی رونما ہو چکے ہوتے ہیں۔ تب (Flash Back) سے ناول اپنے نقطۂ آغاز پر آتا ہے اور رفتہ رفتہ اس انجام تک پہنچتا ہے جو اس کے لئے پہلے ابتدا میں طے کیا جا چکا ہے۔ اس ساری ساخت کے پیچھے تقدیر کی جبریت (Determination) کی جکڑ محسوس ہوتی ہے۔ ''تنہائی کے سو سال'' کے آخر میں ہمیں ماکوندو کے قصبے پر ایک طوفان باد و باراں کی یلغار نظر آتی ہے تو ہمیں مارکیز کا یہ خوابوں کا قصبہ معدوم ہوتا نظر آتا ہے اور مارکیز کے تخلیقی سفر کے جاری رہنے کے لیے ضروری تھا کہ اب اس کے فکشن میں زمان کے ساتھ ساتھ مکاں کی تبدیلی بھی واقع ہو مارکیز نے اس ناول کو جس جملے پر ختم کیا ہے وہ ناول کی معنویت کو مزید اجاگر کر دیتا ہے۔

Before reaching the final line , however ,
he hadalready understood that the city of
mirrors (or Mirages) would be wiped ,out
by the wind and exiled from the memory of

men at the precise moment when Aurchiano Babilionia would finish deciphering the parchments, and that everything written on theme was unrepeatable since time un.memorial and for ever ,more , because races condemned to one hundred years of solitude did not have a second opportunity on earth.

مارکیز کے اسلوب کا ایک امتیاز یہ ہے کہ وہ فرد کے خارج و باطن، سماجی، سیاسی، شخصی سطحوں کو ایک دوسرے میں اس طرح گوندھتا ہے کہ ایک پیچیدہ متن تشکیل پا جاتا ہے۔ قاری اس متن کی مختلف سطحوں سے لطف اٹھاتا ہے۔ مارکیز کی فنی پختگی بیان پر اس گرفت کو جنم دیتی ہے جس سے مختلف فکری سطحیں ایک دوسرے میں یوں مدغم ہوتی ہیں کہ وہ اپنے اپنے امتیازات کو قائم بھی رکھتی ہیں اور ایک بڑے دائرے میں ایک دوسرے میں تحلیل بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ فکشن کے فن کی معراج ہے اور ''تنہائی کے سو سال'' اس طرز کا اعجاز ہے۔

مارکیز نے اپنے دوست پلینیو اپولیو میدوزا (Plinio Apoleyo Mendoza) کے ساتھ ایک طویل مکالمہ کیا جو ۱۹۸۳ء میں امرود کی مہک (The Fragrance of Guava) کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں مارکیز نے اپنی زندگی، فن، سیاست، لاطینی امریکہ کی صورتِ حال اور اپنے تخلیقی رویوں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ اپنے تخلیقی تجربے کی وضاحت اس نے یوں کی ہے۔

> ''میں سمجھتا ہوں دوسرے ادیبوں کے لیے کتاب کا جنم کسی خیال یا کسی تصور سے ہوتا ہے۔ میری ہر تحریر کسی بصری منظر سے جنم لیتی ہے۔'' (ترجمہ: اجمل کمال)

ناول کی حقیقت کے بارے میں وہ کہتا ہے۔

> ''میرے خیال میں ہر ناول حقیقت کی ایک شاعرانہ تقلیب ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ میرے نزدیک ناول خفیہ کوڈ میں بیان کی گئی حقیقت ہے، دنیا کے بارے میں ایک قسم کی پہیلی۔ ناول میں آپ جس حقیقت

سے دوچار ہوتے ہیں وہ اصل زندگی کی حقیقت سے مختلف ہوتی ہے۔
اگر چہ اس کی جڑیں اسی میں ہوتی ہیں۔ یہی بات خوابوں کے بارے میں
بھی درست ہے۔(ترجمہ: اجمل کمال)

اسی طرح گارسیا مارکیز نے اپنے ناولوں کے کرداروں کے پیچھے موجود حقیقی افراد کا حوالہ دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ فکشن نگار کے قلم سے ان کرداروں کی تقلیب ہو جاتی ہے۔اب ''وبا کے دنوں میں محبت'' (Love in the time of Cholera) کی ابتدا عشق کے جس تجربے سے ہوتی ہے وہ دراصل اس کے اپنے ماں باپ کی شادی کی کہانی ہے لیکن مارکیز نے اپنے فکشن میں صورتِ حال کو بالکل جدا رنگ میں پیش کیا ہے ''تنہائی کے سو سال'' کے بعد مارکیز کے اب تک پانچ ناول اور کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔لیکن ان میں ''وبا کے دنوں میں محبت'' کو ایک بڑا تخلیقی تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ''تنہائی کے سو سال'' اور ''وبا کے دنوں میں محبت'' کو اگر ساتھ ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک تخلیق کار کے ہاں زبان و بیان اور اسلوب کا تنوع، زمان و مکان کی تبدیلی اور بہت سے دیگر اختلافات کے باوجود مختلف سمتوں میں بڑے تخلیقی تجربے ہو سکتے ہیں۔شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بڑی تخلیق کو کسی فارمولے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ان دونوں ناولوں میں اختلافات کے ساتھ ساتھ کئی مشترک باتیں بھی نظر آتی ہیں۔یہ بھی مارکیز کی یادوں سے ابھرتا ہے۔اس کے کردار اور حالات و واقعات بھی مارکیز کی زندگی کے حقیقی کردار و واقعات ہیں۔اپنی ابتدا میں یہ ناول بھی واقعات کے ہو چکنے کے بعد کی داستان سناتا ہے۔ناول میں محبت کی ایسی کہانی ہے جو اپنے اندر حیرت کا وہی عنصر لیے ہوئے ہے جو ہمیں مارکیز کے فکشن میں نظر آتا ہے لیکن یہاں ہمیں مارکیز کرداروں کی زندگی کو بیان کرتا نظر آتا ہے۔ وقت رفتہ رفتہ خستگی اور بوسیدگی پیدا کر رہا ہے۔جوان جسم بڑھاپے کی چادر اوڑھ رہے ہیں۔ان کرداروں کے ارد گرد کی دنیا تغیرات کی زد پر ہے۔ ہر چیز بدل چکی ہے لیکن فلورنیشو آریزا (Florentino Ariza) کی محبت میں کوئی کمی نہیں آتی جو وہ فرنینا (Fernina Daza) کے لیے محسوس کرتا تھا۔وہ فرنینا دازا کی بیوگی کی پہلی رات اکیاون سال، نو ماہ اور چار دن کے بعد ایک بار پھر اس کے لیے اپنی لافانی محبت اور وفاداری کی تجدید کرتا ہے۔

فنی سطح پر ایک انحراف جو ''تنہائی کے سو سال'' سے ''وبا کے دنوں میں محبت'' میں نظر آتا ہے وہ بیانیہ کے انداز کا ہے ''وبا کے دنوں میں محبت'' میں ہمیں بیانیہ کی وہ تہہ داری تو نظر نہیں آتی کیوں کہ یہاں پلاٹ کی تشکیل صرف عشق کی داستان پر کی گئی ہے۔دوسرا ''وبا کے دنوں میں

محبت'' کی مرکزی کردار فرینا دازا جذبے کے مقابلے میں عقل کے حق میں فیصلہ کرتی ہے۔ وہ فلوزتینو آریزا سے اپنی محبت کے زمانے کی یادوں سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔

مارکیز کی تحریروں میں ''محبت'' عقل سے ماورا جذبہ نظر آتی ہے۔ اس کا واضح رجحان عقلیت اور خاص طور پر مغرب میں پروان چڑھنے والی عقل کی محدود تعریف سے گریز کا ہے۔ مارکیز کی تحریروں میں ہمیں جبلتیں، جذبے اور غیر عقلی عناصر کرداروں کو اپنی گرفت میں لیے نظر آتے ہیں۔ عقلی باتوں کو ٹھکرا کر مارکیز کے کردار فوک دانش (Folk Wisdom) کو قبول کرتے ہیں اور ان کے یہاں فطرت سے ہم آہنگی کا وہ رویہ نظر آتا ہے جو مغربی ادب میں خال خال ملتا ہے چوں کہ خود مارکیز نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نسلی اعتبار سے اس میں ہسپانوی، کریبین اور افریقی اثرات موجود ہیں۔ اس لیے بلاواسطہ وہ مشرق میں پروان چڑھنے والے رویوں کا حامل بھی نظر آتا ہے جہاں فطرت پر غلبہ پانے اس میں مدغم ہوجانے کی بجائے فطرت اور انسانی وجود میں امتیاز باقی رکھتے ہوئے دونوں کے درمیان ایک ایسے آہنگ کی تلاش کی جاتی ہے جہاں دونوں کے اپنے اپنے وجود بھی سلامت رہیں اور دونوں ایک وسیع کل کا حصہ بھی نظر آئیں۔

''وبا کے دنوں میں محبت'' مارکیز کے پسندیدہ موضوعات ہی سے عبارت ہے۔ وقت کی تباہ کاری، قربانی، غیر عقلی رویے (آریزا کا) لیکن اس میں ایک نئی سمت کا اضافہ یوں ہے کہ آریزا کو یقین ہے کہ مستقبل میں وہ دازا کو پانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ ڈاکٹر آرینو کو اس سے پہلے مرنا ہوگا یہ اس کی قسمت میں لکھا جاچکا ہے۔ آریزا کا اپنی بات پر یقین عقیدے کے درجے پر پہنچا ہوا ہے۔ وہ ساری زندگی اس ساعت کا انتظار کرنے میں گزار دیتا ہے جب وہ اپنی کھوئی محبت کو پانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ بقول مارکیز وہ محبت کی ایک ایسی کہانی لکھنا چاہتا تھا جس کا انجام طربیہ ہو۔ یہ کہانی مارکیز نے بہت کام یابی سے لکھی ہے لیکن حقیقی زندگی میں کتنے عاشق اس قدر خوش قسمت ہوسکتے ہیں کہ انھیں اپنی کام یابی کے لیے اکیاون سال نو ماہ اور چار دن کی مہلت مل سکے۔ دل چسپ صورت حال یہ ہے کہ خود مارکیز نے جب ۸۵-۱۹۸۴ء میں یہ ناول مکمل کیا تھا اس کی اپنی عمر بھی کم و بیش اکیاون، باون سال ہی تھی۔ ایک سطح پر یہ ناول مارکیز کی تخلیقی زندگی کا استعارہ بھی بنتا ہے۔ جب ناول کے آخر میں آریزا اپنی محبت کے سفر کے ابد تک جاری رہنے کا تذکرہ کرتا ہے۔

۱۹۸۵ء سے اب تک مارکیز کے دو ناول (The General in his Labyrinth) اور (Of Love and other Demons) اور ایک کہانیوں کا مجموعہ (Strange

Pilgrims) ہو چکے ہیں۔(اس مضمون میں غیر فکشن تحریروں سے بحث نہیں کی گئی) مارکیز کی بارہ کہانیوں میں ہمیں پہلی بار مارکیز اپنی مخصوص یادوں سے باہر نظر آتا ہے۔اس میں جدید زندگی کے بعض پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا گیا ہے مثلاً(Sleeping Beauty and tha Airplace)دنیا کی خوب صورت ترین عورت نشست کے ساتھ والی سیٹ پر آٹھ گھنٹے کے طویل سفر کی روداد ہے جو اخوب صورت عورت نے سونے کی حالت میں کیا ہے۔آخر تک معلوم نہیں ہوتا کہ واقعی اس عورت کا کوئی وجود بھی تھا یا سب کچھ مرد کردار کی فینٹسی تھی۔اس مجموعے میں شامل وہ کہانیاں خاص طور پر توجہ طلب ہیں ایک (I only came to use the phone) اور دوسری (The Saint) ہے۔پہلی کہانی (Maria de La Luz Cerbantes) پاگل خانے کے مریضوں اور ڈاکٹروں کے علاوہ اپنے خاوند کو بھی یہ یقین دلانے کی کوشش کررہی ہے کہ پاگلوں کی بس میں اس لیے سوار ہوئی ہے کہ اس کی گاڑی خراب ہوگئی تھی اور قریب میں کوئی فون موجود نہیں تھا۔اس کہانی میں بعض جگہ ایسا تاثر ملتا ہے کہ جیسے واقعی وہ درست کہہ رہی ہے لیکن آخر تک جاتے جاتے حقیقت اور افسانے کی حدیں پھر دھندلا جاتی ہیں۔

(The Saint)ایک ایسے کردار کو سامنے لاتی ہے جو دور دراز کا سفر کر کے روم آیا تاکہ وہ پوپ کو ایک معجزے کے بارے میں بتائے لیکن برسوں کی جدو جہد کے بعد بھی وہ کسی کی توجہ حاصل کرنے اور کسی کو اپنی بات پر یقین دلانے میں کام یاب نہیں ہو سکتا۔آخر میں (Margarito Duarte) خود ولی کے روپ میں ڈھل جاتا ہے۔بے انتہا مشکلات اور تکالیف برداشت کرنے کے باوجود اس کا اعتقاد متزلزل نہیں ہوتا۔ایک معجزے کے واقعی ظہور پذیر ہونے کے بارے میں دوسروں کو متفق کرنے میں وہ اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ظاہر ہے ایسا اعتقاد ایک ولی ہی کا ہوسکتا ہے یا پھر ولی بننے کے لیے ایسے ہی اعتقاد کی ضرورت پڑتی ہے۔

محبت اور دوسرے آسیب (Of Love and other Demons) جنوبی امریکہ کے ساحل پر نو آبادیاتی عہد میں جنم لینے والی کہانی ہے۔سرویا ماریہ(Seirva Maria)ایک معزز خاندان کی اکلوتی اولاد ہے جو اپنے باپ کے مکان میں غلاموں کے کوارٹر میں پرورش پاتی ہے۔ماریا کا کردار اپنی خصوصیات کے اعتبار سے تنہائی کے سو سال کے کردار Rabica کی یاد دلاتا ہے۔اپنی زندگی کے بارہویں سال لڑکی کو ایک پاگل کتا کاٹتا ہے جس کے بعد اس میں جنون کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔اس کا باپ ڈاکٹر سے علاج کرواتا ہے لیکن چرچ کے مجبور کرنے پر اسے اپنی بیٹی کو ان کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔(Father Cayetavo

Delaura) خواب میں ایک ایسی لڑکی سے مل چکا ہے جس کے لمبے بال اس کے گھٹنوں تک آتے ہیں۔(Father) لڑکی کو آسیب سے چھٹکارا دلاتے دلاتے خود ایک آسیب میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اپنی عبادت، نیکی اور پرہیزگاری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔اس ناول میں مارکیز محبت کو ایک تخریبی قوت کے طور پر بیان کر رہا ہے جو ایک آسیب کی طرح فرد کی شخصیت کے تار و پود بکھیر دیتی ہے۔وبا کے دنوں میں محبت، میں محبت فرد کی شخصیت کو ایک مرکزہ عطا کرتی ہے۔ان دو ناولوں میں مارکیز نے محبت کے متضاد روپ پیش کیے ہیں اور ایسی فن کارانہ مہارت سے کہ قاری بہ یک وقت دونوں میں ایک جیسی کشش محسوس کرتا ہے۔اس ناول کا بیانیہ اکہرا ہے زمان و مکان کے اعتبار سے اس کا دائرہ محدود ہے۔زمان و مکان میں کرداروں کی حرکت بہت معمولی سی ہے۔ صرف دو کردار ماریا اور ڈیلا یورا قابلِ ذکر ہیں۔ان سب کے باوجود مارکیز کے بیانیہ کی سحر انگیزی قاری کو پہلی سطر سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔اگرچہ یہ ناول "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے پائے کا تو نہیں لیکن بلاشبہ مارکیز کے اچھے ناول میں شمار ہوگا۔

مارکیز عالمی سطح پر ایک ایسے ناول نگار کے طور پر جانا اور مانا جاتا ہے جو ساری دنیا کے ادیبوں اور قارئین کے لیے حیرتوں کے نئے جہان تخلیق کرتا ہے۔اس نے دنیا کے ایک پسماندہ خطے سے تعلق رکھتے ہوئے مغربی معاشرے میں اپنی تخلیقی تجربوں سے بڑا مقام بنایا ہے اور وہ لاطینی امریکہ کے ایسے سفارت کار کی حیثیت رکھتا ہے جس سے مکالمہ کرتا جدید مغرب کے ادیب اور دانش ور اپنے لیے باعث فخر محسوس کرتے ہیں۔

پس ماندہ ممالک کے لکھنے والوں کے لیے وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کو پڑھنا، سمجھنا اور اس سے سیکھنا قابلِ فخر بات ہے۔اس نے چھوٹے ممالک کے لکھنے والوں میں موجود کمتری کے احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے جو پسماندہ ممالک کے ادیبوں اور دانش وروں میں مغرب کی چکا چوند سے پیدا ہوتا ہے۔مارکیز کے ہاں ہمیں کسی مغربی ادیب یا مغربی روایات کی تقلید نظر نہیں آتی بلکہ وہ اپنے مقامی حالات و واقعات، کرداروں، محسوسات اور تجربات کو پیش کرتا ہے۔یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہمارے ادیب بھی عالمی ادب میں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔مغربی رجحانات کی نقالی سے تو ہم ان کے تخلیقی تجربوں کی گھٹیا نقلیں ہی تیار کر سکتے ہیں۔جن کی عالمی سطح پر کوئی حیثیت نہیں بن سکتی۔

☆☆☆

(مشمولہ:"ادب کا عالمی دریچہ" از ڈاکٹر امجد طفیل، اسلام آباد، ترتیب ۲۰۱۲ء)

ایک پیش گفتہ موت کی روداد

(گارسیا مارکیز کے ناولٹ کا تجزیاتی مطالعہ)

پروین افشاں راؤ

معاشرے میں کسی بھی تبدیلی یا جمود کا باعث بہت سارے عوامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ادب اور ادیب بھی ہے جس پر ذمہ داریاں اور الزامات یکساں عائد ہوتے ہیں۔ خوش آئند تبدیلی ہو تو یہ "ذمہ داری" سے عہدہ برآ ہوتا ہے اور اگر معاملہ جمود یا بے راہ روی پھیلانے کا ہو تو غیر ذمہ داری جیسے الزام کے لیے جواب وہ ہونا پڑتا ہے۔ اسی لیے دنیا بھر میں ادب کے حوالے سے ادیب، نظریات کی ترویج و تنسیخ میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

انسانی زندگی میں عادات و نظریات کی ترویج نسبتاً آسان اور ان کی تنسیخ ایک مشکل کام رہا ہے۔ ہمارے دماغ میں ہمیشہ نئے نام، نئے کام، نئی عادتیں، نئے رشتے، نئے مادی و غیر مادی خیالات کے لئے بے پناہ گنجائش موجود رہتی ہے۔ لیکن جو کچھ ایک بار سیکھ لیا، جان لیا، حاصل کر لیا، اس سے دستبردار ہونے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ کسی نظریہ یا عمل کے یک دم غلط اور نقصان دہ ثابت ہو جانے کے باوجود ہم اس سے فوری دستبردار نہیں ہوتے۔

درست یا غلط، تمام نظریات صدیوں تک ہمارا پیچھا کرتے ہیں۔ کارآمد نظریات زندگی میں گھل مل جاتے ہیں۔ روزمرہ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ غیر محسوس طور پر اگلی نسل کو منتقل ہو جاتے ہیں اور ناکارہ نظریات اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ ان کے لئے ہمیں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔ لیکن چند نظریات، غلط اور درست، کی درمیانی منزل پر کھڑے، متروک ہو جانے کے باوجود ایک آسیب کی طرح ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں اور آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔ وہ کسی بھی جگہ،

کسی بھی لمحے اچانک زندہ و جاوید بن کر یوں نمودار ہو جاتے ہیں جیسے وہ مکمل ''درستی'' کے باوصف ہم میں موجود ہوں۔

بس یہیں سے ادیب اور ادب کی کڑی ذمہ داری کا باب شروع ہو جاتا ہے کہ وہ نظریات کی ''مشکوک درستی'' پر سوال اٹھائے اور اپنی محنت سے حقائق کی اتنی تفصیل ضرور منظر عام پر لائے جس کے بعد معاشرہ فیصلہ صادر کرنے کا بھرپور اعتماد حاصل کر سکے۔

''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' اسی سلسلے کی ایک مثال سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ ناولٹ اس متروک روایت کی سرگزشت ہے جو مختلف معاشروں میں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے آشنا یا محبوب کو دیکھتے ہی قتل کر دینے کے نظریات پر قائم ہے۔ ہمارے یہاں اکثر اخباروں میں ہر کچھ ہفتوں کے بعد اس نوعیت کے قتل کی خبر اخباروں میں چھپتی رہتی ہے۔ حالانکہ قانون میں کہیں ایسی شق نہیں کہ بیوی یا بیٹی کے محبوب کو قتل کرنے پر قاتل کو مجرم نہیں سمجھا جائے گا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک مختلف النوع سماجی عمل ہے۔ ہمیشہ سے تمام غیرت مند مرد اپنی عورتوں سے منسوب آدمی کو واجب القتل نہیں سمجھتے۔ اس میں متنوع ردِعمل سامنے آتے رہتے ہیں۔ مثلاً کچھ مرد تو اس معاملہ کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے اور خواتین کو ان کی مرضی کی آزادی دے دیتے ہیں۔ کچھ اپنے مفاد کے پیش نظر زورِ بازو سے اپنی خواتین کی سوچ تبدیل کرنے پر لگ جاتے ہیں۔ کچھ حالات سے سمجھوتہ کر کے خواتین کی مرضی کے تابع ہو جاتے ہیں اور کچھ مرنے یا مارنے پر تل جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کسی عورت کا محبوب یا عاشق ہونا ایک ایسا سماجی عمل ہے جس میں تمام مجرمین ہمیشہ عملی سزا نہیں پاتے بلکہ یہ نظریاتی سزا صرف سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہے اور عموماً زبانی دہشت پر قائم رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی حالات ''معصوم قاتل'' کو ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں کہ اسے معاشرے میں سرخرو ہونے کے لئے اس سینہ بہ سینہ چلتے ''نظریہ'' (بہن، بیوی، بیٹی کے آشنا کو قتل کر دینا چاہیے) کو عملی شکل دینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ وہ قتل جیسے کریہہ اقدام سے لاکھ بچنے کی کوشش کے باوجود ایک مصنوعی ہیرو ازم (جو صرف نظریے کا پیدا کردہ ہے۔ اس کی بذاتِ خود کوئی عملی افادیت نہیں) کے نرغے میں پھنس کر جرم کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔ بظاہر عزت کی خاطر مر مٹنے والا انسان اندرونی طور پر ایک انسانی قتل سے پیدا ہونے والے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور نازک احساسات کی سولی پر چڑھ کر اپنے آپ میں کڑی سزا پاتا ہے۔

انسانوں کا اجتماع، جو ایسے کسی ایک نظریے کا صرف نام نہاد طور پر ہم خیال ہوتا ہے لیکن دل میں برعکس خیالات رکھتا ہے ایسے ظالمانہ عمل کو اپنی ہزار طرفہ آنکھ سے دیکھنے والا تماشائی تو بن

جاتا ہے لیکن اس کی بیخ کنی کے لئے کوشاں نہیں ہوتا۔ اس سارے عمل کو اس کہانی میں انتہائی موثر طور پر پیش کیا گیا ہے۔

قصبے میں شہر سے ایک دولت مند، تعلیم یافتہ، خوبرو اور گوناگوں خوبیوں والا نوجوان وارد ہوتا ہے۔ وہ ایک حسین لڑکی سے متاثر ہو کر اس سے شادی کا ارادہ کر لیتا ہے اور لڑکی کو قائل کرنے کی بجائے والدین کو اس رشتے میں پوری طرح الجھا لیتا ہے۔ انجلا ویکاریو اپنی والدہ سے یہ عذر پیش کرتی ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی لیکن والدہ "محبت سیکھی جا سکتی ہے" کہہ کر اسے لاجواب کر دیتی ہے۔ تمام خاندان والے مل کر اس پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ اتنا اچھا رشتہ لوٹانا بالکل غلط بات ہے۔ اور اس کی خوشی جانے بغیر شادی کر دیتے ہیں۔ دولہا اس شادی پر بے انتہا دولت خرچ کرتا ہے جس میں تمام قصبہ مہمان کے طور پر مدعو ہے اور سب لوگ نہایت مسرور ہیں۔

پہلی ہی رات صبح کاذب کے وقت جب شادی کی رنگ رلیوں کے آثار ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئے تھے، دلہن انجلا ویکاریو گھر واپس لوٹا دی جاتی ہے کیونکہ وہ کنواری نہیں تھی۔۔۔۔۔۔گھر واپس آئی دلہن سے "مجرم" کا نام پوچھا جاتا ہے جس نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ اس نے سوچ سمجھ کر سنتیا گو نصر کا نام لیا۔ یہ درست انکشاف نہیں تھا بلکہ اصلی آدمی کو بچانے کی خاطر کسی ایسے آدمی کا نام لے دیا گیا جو قصبے میں اونچی حیثیت اور اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ جسے چھونے کی کسی میں ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن حالات دوسرا ہی رخ اختیار کر لیتے ہیں۔ دلہن کے دو جڑواں بھائی، جو معصوم بے ضرر کم عمر لڑکے تھے جن میں کسی کو قتل کر دینے کی بھیانک خواہش پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ زبانی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور ہو گئے۔

انجلا ویکاریو کی ماں اپنے جڑواں بیٹوں کو خاموشی سے بلاتی ہے اور اپنی اس بے عزتی کا بدلہ (جو دراصل دولت مند نے دلہن کو واپس لوٹا کر کی تھی) لینے کے لئے کہتی ہے جو انجلا ویکاریو کے کنوار پن چھن جانے سے ہوئی تھی۔ دونوں بھائی اپنی حیثیت سے اونچی شادی کے دوران پورے قصبے کے فخر میں شامل تھے۔ اس شادی کے اسی رات ختم ہو جانے پر ماں کے ساتھ غصے کے دباؤ میں آ گئے اور گھر کے باڑے سے جانوروں کو ذبح کرنے والے بڑے چھرے لے کر قصبے کے چوک میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ ہر ایک کو بتانے لگے کہ ہم سانتیا گو نصر کو قتل کرنے والے ہیں۔ کسی نے ہمت کر کے پوچھا "کیوں" تو جواب دیا "سانتیا گو نصر کو معلوم ہے۔۔۔۔۔" اس طرح چند ہی گھڑیوں میں تمام قصبے والوں کو خبر ہو گئی کہ انجلا ویکاریو کنواری نہ ہونے کی بنا پر گھر واپس لوٹا دی گئی ہے۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے غیرت مند بھائی

سانتیا گونصر کو قتل کرنے والے ہیں کیونکہ وہی قصور وار ہے۔

جڑواں بھائی دودھ والے کی ایسی دکان پر بیٹھے تھے جہاں قصبے کا ہر شخص کچھ نہ کچھ خرید نے کے لئے ضرور آتا تھا سوائے سانتیا گونصر کے۔ چنانچہ اس بات کے زیادہ امکانات پیدا ہو گئے کہ قصبے کے مرکزی چوک میں بیٹھ کر ہر ایک کے سامنے اعلان قتل کرنے سے یہ خبر سانتیا گونصر تک پہنچ جائے گی اور وہ اپنی جان بچانے یا حفاظتی انتظامات کرنے کے لئے مستعد ہو جائے گا۔ لیکن عوام کی لاتعلقی، خواص کی بے حسی اور اتفاقات کی جکڑ بندی اس بے خبر کو عین قاتلوں کے روبرو لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ قاتل اس کے گھر تک مجبوراً پہنچنے کے باوجود ایسے گیٹ کے سامنے اسکا انتظار کر رہے تھے جہاں سے وہ عام طور پر آمدورفت نہیں رکھتا تھا۔

قصبے کے ذمہ دار لوگوں کی غیر ذمہ داری کے نتیجے میں ایک ایسا قتل پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ جس کے لئے قاتل بھی تیار نہیں تھے۔ انہوں نے چوک میں بیٹھ کر ہر آنے جانے والے اور سانتیا گونصر سے گہرے مراسم رکھنے والوں کو خاص طور پر روک روک کر خبر دی کہ ہم سانتیا گونصر کو قتل کرنے والے ہیں جس کے نتیجے میں کچھ ہی دیر میں تمام قصبے کے لوگ اس ہونے والے قتل، قاتل، مقتول اور یہاں تک کہ وجہ قتل سے بخوبی آگاہ ہو گئے۔ لیکن ایک گھنٹے کے طویل دورانیے میں جس کے ہر پل میں لوگ بے چینی کا شکار ہو کر رونما ہونے والے واقعہ کا تجسس اور خوف سے انتظار کر رہے تھے، کسی نے اس اقدام کو روکنے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہیں لی۔ اور سب کچھ جان لینے کے باوجود لاتعلق رہے۔ سوائے اس اشتیاق کے، جس میں غرق ہو کر وہ صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے واقعے کا نظارہ کرنے والے تھے۔۔۔۔ یہی وہ باریک نکتہ ہے جسے مارکیز نے اپنے یکتا تحریری ہنر کے ساتھ حیرتناک گہرے مشاہدے، تفصیلی تجزیے اور زندگی میں برتے جانے والے حقیقی رویوں کی تحقیق کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مصنف نے اس بات کی طرف بہت شدومد سے اشارہ کیا ہے کہ کسی بھی نا مناسب روایت، رواج، قدر یا نظریہ کی تبدیلی کے لئے کوئی بھی شخص پہلا قدم اٹھانے کی اخلاقی ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہیں لیتا۔ نہ ہی وہ گمنام شخص جو خاموشی سے ایک خط سانتیا گونصر کے گھر میں اطلاع کے طور پر ڈال دیتا ہے (اسے چوک پر قتل کر دیا جائے گا کیونکہ انجلا کے بھائی اپنی بہن کی عزت بحال کرنے کے لئے اسے قتل کرنے والے ہیں اور دو چھرے لئے انتظار کر رہے ہیں) وہ سامنے آ کر اس ہونے والے قتل کو روکنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتا اور نہ سانتیا گونصر کو خود جا کر مطلع کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا خاموش، پوشیدہ عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اتفاق سے اس خط کو

گیٹ کے قریب سے تکمیلِ قتل کے بعد ہی اٹھایا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ قصبے کے اہم اداروں کے سربراہوں کی قانونی حیثیت بالکل مسلم تھی کہ وہ معاشرتی کج روی کے کسی خوفناک اقدام کو اپنی طاقت کے ذریعے روک لیں لیکن ذمہ دار ادارے کے افسر نے تو اسے اخلاقی ذمہ داری کے طور پر بھی اہمیت نہیں دی۔ (اخلاقی اس لئے کہ ابھی قتل سرزد نہیں ہوا تھا) کرنل (پولیس آفیسر) کو جب متوقع قتل کی خبر ملی تو ''کرنل ندارد آپونتے نے گزشتہ رات دوستوں کے درمیان اتنے جھگڑوں کا تصفیہ کرایا تھا کہ ایک اور تصفیہ کے لئے عجلت میں نہیں تھا۔''

کرنل اپنی سہولت سے آیا اور اس نے کوئی سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا۔ لڑکوں سے چھرے لے لئے اور انہیں کوئی خاص تنبیہ کیے بغیر چلا گیا۔۔۔۔ کرنل کے جانے کے بعد جڑواں بھائی دوسرے چھرے لانے پر مجبور ہو گئے کیونکہ اصل معاملہ جو قابلِ تصفیہ تھا وہ جوں کا توں تھا۔ یہ تو خبر ہوگئی کہ بہن کنواری نہیں اور گھر لوٹا دی گئی لیکن یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ جس بدبخت کا نام لیا گیا ہے وہ قصوروار ہے یا نہیں۔ اسے سزا دینا بھائیوں کا کام ہے یا قانون کا۔

اسی طرح کلیسا کے پادری نے بھی اس ذمہ داری کو اٹھانے سے گریز کیا۔ پادری تک جب قطعی خبر پہنچی تو اس نے اس بات کو یوں لیا۔

''میرا پہلا خیال یہ تھا کہ یہ میرا مسئلہ نہیں بلکہ شہری حکام کا ہے۔''

اور وہ مسلسل اپنے اس خیال پر اس وقت تک قائم رہا جب تک سانتیاگو نصر قتل نہیں ہو گیا۔

اس قتل کو روکنے کے لئے خواتین سب سے زیادہ متحرک تھیں لیکن ان کے اقدامات کے نتائج صفر رہے کیونکہ وہ اس عمل کو براہِ راست روکنے کی حیثیت میں نہیں تھیں۔ یہ معاشرہ ابھی مرد کا معاشرہ ہے، انسان کا معاشرہ نہیں۔

''اس (کرنل) نے انہیں (دلائل کو) اسی خوداعتمادی سے برتا جس سے اس نے اپنی بیوی کے انتباہ کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔''

عورتیں اپنے تمام تر مثبت جذبات کے باوجود اس منفی عمل میں مداخلت نہ کر سکیں۔

دو جڑواں بھائی۔ پہلے پہل یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مارکیز نے قاتل ایک کیوں نہیں رکھا جو عام طور پر ہوتا ہے کہ گھر کا ایک فرد زیادہ مشتعل ہو گیا اور اس نے موقع پر ہی کسی کو ہلاک کر دیا۔ چلیے، عزت کے معاملہ میں گھر کے ایک سے زیادہ افراد مشتعل ہو گئے تو وہ دو بھائی ہو سکتے تھے۔ (جڑواں نہیں) یا پھر باپ اور بھائی، دو افراد ہو سکتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جڑواں بھائی، ہم شکل اور کم عمر۔ قاتلوں کی چند خصوصیات پر بہت تفصیل ہے اور اس حوالے سے ان

کرداروں کی توجیہ یک جہت نہیں۔ مثلاً کم عمری ہی ان کے ذہنی بچپنے کی دلیل ہے جہاں وہ قتل جیسی واردات کی سنگینی کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور کم عمری ہی، اٹھتی جوانی کے اس جوش و جذبہ کی دلیل بھی ہے جو عزت کی بحالی جیسے روایتی اصول پر بھی مرنے یا مار دینے کی ہمت عطا کر دیتی ہے۔ لیکن جڑواں ہونا اور مل کر ایک ہی عمل کرنا آخر کس بات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ استعارہ ''عمومیت'' اور ''کڑ پن'' کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ دو مماثل انسان کسی ایک طرح کی پرورش میں کسی ایک روایتی اصول کو ایک ہی طرح سے قبول کرتے ہیں تو اس کے باوجود کہ وہ دونوں مختلف مزاج، مختلف محسوسات اور مختلف ردِعمل رکھتے ہیں انہیں معاشرتی رواج کے معاملہ میں نتیجہ ایک ہی دینا پڑتا ہے۔ ان دونوں کے محسوسات اور ردعمل جدا جدا تھے لیکن انہیں بار بار خود کو دھکیل کر اس ''عمومیت'' کی طرف لانا پڑا جو قتل کے ذریعے عزت بحال کرنے کے نظریے میں موجود ہے۔۔۔ اگر اس کہانی میں قاتل صرف ایک ہوتا تو یہ کہانی مخصوص صورتِ حال میں مخصوص شخص کا ردِعمل بن جاتی جس میں نظریے کے اس ''کڑ پن'' کا اظہار ہوتا جو قتل کے ذریعے عزت بحال کرنے جیسے نظریے میں موجود ہے۔

''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' میں دو نظریے آپس میں بہت ٹکرا رہے ہیں۔ ایک تو تبدیلی لانے کے لئے انسان کی ذمہ داری پر یقین۔ دوسرے تقدیر کا غلبہ۔ واقعات کی انتہائی باریک بنت اس بات کی غمازی ہے کہ معاشرہ کسی ایسے جرم میں مشترکہ طور پر شامل ہے۔ برابر کا مجرم ہے۔ کم از کم ایسے واقعہ میں جو اتنا پیش گفتہ ہو۔ اس بات کو جہاں تک ہو سکا مارکیز نے بد قسمت بھائیوں کے مخصوص ردِعمل میں واضح طور پر دکھانے کے علاوہ اپنے الفاظ میں ان کی ترجمانی کے ذریعہ بیان بھی کر دیا ہے تاکہ کوئی ابہام نہ رہ جائے۔

''ویکاریو برادران نے سانتیاگو نصر کو فی الفور اور تماشا بنائے بغیر قتل کرنے کے لئے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے اس سے کہیں زیادہ، جتنی تصور میں آ سکتی ہے، کاوش کی کہ کوئی ان کو قتل کرنے سے باز رکھ سکے۔''

اور ظاہر ہے کہ اسی کاوش کے نتیجے میں ان کے ارادوں کی خبر سارے قصبے کو ہو گئی مگر کسی نے آگے بڑھ کر انہیں اس کام سے باز رکھنے یا مقتول کو کھلم کھلا اپنی پناہ میں لینے کی طرف توجہ نہیں دی۔ آخری مراحل میں حالات قسمت کے تنگ گھیرے کے حوالے ہوتے گئے اور وہ عین اس جگہ پہنچ گیا جہاں قاتل اس خیال سے کھڑے تھے کہ وہ بڑے گیٹ سے گھر میں داخل نہیں ہو گا۔ یوں بھائیوں کو اسے بالکل ہی اپنے سامنے پا کر چھروں سے وار کرنے ہی پڑے اور ایک ایسا جرم وجود

پا گیا جس کی کسی کو خواہش نہیں تھی۔ نہ تو مجرموں کو، نہ ہی قصبے کے کسی ساکن کو اور نہ اسے جس نے الزام کے لئے اس بے گناہ شخص کا نام چنا تھا۔۔۔۔ پھر ایسے جرم، ایسے قتل کی آخر کسے ضرورت تھی۔ صرف نظریات کی اس کالی دیوی کو جو معاشرے میں نیم رضا کی صورت میں موجود رہتی ہے اور خود کو زندہ رکھنے کے لئے ہر کچھ عرصے کے بعد ایک بھینٹ مانگتی ہے۔

یا پھر ایسا ہے کہ انسان کی تقدیر میں ہی یوں لکھا ہے؟

اگر کسی گود کے لاوارث بچے کو ژالہ باری میں کسی دوسرے کے سہارے یا لاتعلقی کی بنا پر چھوڑ دیا جائے تو کیا ایسا عمل قدرت، قسمت اور تقدیر کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے؟

تحریر کی بنت میں موجود تقدیر کی سختی کو ذرا بھلا کر اگر ہم ان رویوں کو ترتیب وار دیکھیں کہ معاشرے کے سرکردہ افراد نے بے حسی اور عوام نے بزدلی و لاتعلقی کا مظاہرہ کیا تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ ایسا منفی اقدام جو کسی کی ذمہ دار دخل اندوزی کی بنا پر روکا جا سکتا تھا اور مثبت تبدیلی بن سکتا تھا، وہ معاشرے کی بے حسی، لاتعلقی، بزدلی اور بے عملی کے نتیجے میں تقدیر کے اتفاقات کے جال میں پھنس کر ایک ایسے نظریہ کو مزید کچھ عرصے کے لئے آکسیجن فراہم کر گیا جسے ہر حال میں اب مردہ ہو جانا چاہیے تھا۔

''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' کا دوسرا پہلو اس کا اندازِ تحریر ہے۔ واقعہ صرف ایک گھنٹے کی روداد ہے۔ سانتیا گو نصر قصبے کی ایک پر رونق شادی سے لوٹ کر تھوڑی دیر آرام کرتا ہے اور صبح چھ بجے ساحل تک آرچ بشپ کو خوش آمدید کہنے جاتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد واپسی پر اپنے ہی گھر کے دروازے پر پورے گاؤں کی موجودگی میں قتل کر دیا جاتا ہے۔

قصبے کا ایک شخص، جو موقع واردات پر موجود تھا، سانتیا گو نصر کا گہرا دوست اور قاتل جڑواں بھائیوں کا عزیز تھا۔ ستائیس سال بعد وہ اسی واقعہ کی دوبارہ تفتیش کرتا ہے۔ اس کرید میں پرانی گڈ مڈ یادداشتیں، مختلف مزاج، مختلف زاویۂ نظر سے پیدا ہونے والے مختلف نتائج ۔۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں ایک ہی شخص کی مختلف لمحات میں مختلف ترجیحات اور محسوسات جن کا ایک سرا ستائیس سال پہلے کا اصل واقعہ ہے اور دوسرا سرا گزرے برسوں کے بعد تک اس سے منسوب یادیں ہیں۔

ستائیس سالہ زندگی پر محیط کینوس پر مارکیز نے واقعہ سے متعلق لوگوں سے ان کے بیانات کی زبان میں اس تکلیف دہ عمل کو بیان کیا ہے۔ بنت اتنی باریک، لچھے دار اور فرق اتنا مہین ہے کہ

اگر ہم کسی وجہ سے خصوصی توجہ مرکوز کرنے میں ناکام رہ جائیں تو اصل مدعا کھو کر رہ جائے گا جو دراصل بیانات کی پھول پتیوں کے درمیان بیانات کی پھول پتیوں کے ذریعے ہی ابھارا گیا ہے۔ یہ بالکل کمپیوٹر کی سہ جہتی تصاویر کی طرح ہے جس میں توجہ مرکوز کرتے ہی حیران کن، شاندار، مختلف منظر رونما ہو جاتا ہے، عام نظر سے وہ بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ یہ انداز صرف لکھنے والے کی ہی آزمائش نہیں، قاری کی بھی ہے۔

عام طور پر کہانی کا انجام ہی تجسس کا منبع ہوتا ہے اور قاری بے چینی سے انجام کی طرف بڑھتا ہے لیکن یہاں عنوان سے ہی کہانی کے اصل مواد کا اشارہ مل رہا ہے۔ ایک پیش گفتہ موت کی روداد۔۔۔کہانی اپنے انجام یا تجسس کے آخری نکتہ سے بات کا آغاز کرتی ہے اس کے باوجود ہر دوسری سطر کے بعد تیسری سطر پڑھ لینے کی خواہش اور بے قراری تیز تر ہو جاتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تجسس صرف اختتام میں ہی نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے ہر لمحے میں موجود ہے۔ انسانوں کی جیتی جاگتی زندگی میں وہ دھڑکتے احساسات جو گنجلک تہذیبی اقدار کا شکار ہو کر دو جمع دو چار کا نتیجہ نہیں دیتے بلکہ کبھی پانچ اور کبھی دو جمع دو صفر ہی رہتے ہیں۔ یہی وہ عمل ہے جہاں تجسس کا تار کبھی نہیں ٹوٹتا۔

مارکیز نے اس قتل کی روداد کے ذریعے انسانی رویوں کو پڑھنے کی جستجو کی ہے اور ظاہر کیا ہے کہ ہر انسان کا ردِعمل کسی بھی دوسرے انسان سے تو مختلف ہو ہی سکتا ہے۔ لیکن خود اپنی ذات میں بھی مختلف اوقات میں مختلف حالات کے زیر اثر مختلف تضاد یا عجیب ہم آہنگی کا شکار ہو سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں سب سے زیادہ تجسس زندگی کے واقعات میں نہیں بلکہ انسان کے ردعمل میں ہے، جو انتہائی مختلف الجہت اور اکثر بعید از قیاس ہے۔ یہ روداد دراصل انسانی رویوں کے ہی متعلق ہے۔

تحریر میں ایک اور خصوصیت جسمانی اور نفسیاتی ہر دو پہلو سے گہری مشاہداتی نظر ہے۔ مثلاً

''لڑکی ابھی شوریدہ سر، اپنے غدود کی سرگرمی سے
مست نظر آتی تھی۔''

''اس کے پاس اتنے ملتوی شدہ غصے جمع تھے کہ

وہ سانتیا گو نصر کے ناشتے کو تلخ کرنے کے لئے
کتوں کو خرگوش کی انتڑیاں کھلاتی چلی گئی۔''

چند سطروں میں حقیقت کا مکمل، مختصر، واقعاتی بیان بھی ایک الگ خوبی ہے۔

''الوداعی جرعے کی تلچھٹ اپنی زبان پر لئے
جاگا اور اس نے انہیں شادی کی رنگ رلیوں کے
، جو آدھی رات کے بعد تک مچتی رہی تھیں ،
قدرتی اثر سے وابستہ کیا۔''

ایک چیز تمام تحریروں میں بہت تسلسل سے پائی جاتی ہے۔ وہ ماحول، رویوں اور ردعمل پر بہت سنجیدگی سے طنز کرتا ہے۔ وہ کسی چیز کا تحقیر آمیز مضحکہ نہیں اڑاتا۔

'' اس لئے انہوں نے مکان کو اصلی زرد رنگ
میں رنگا۔ دروازے ٹھیک کیے۔ فرش ٹھکوایا اور
جہاں تک بن پڑا، اسے ایسی پر شور شادی کا اہل
کر کے چھوڑا۔''

مارکیز نے کئی بار اس بات کا تذکرہ کیا کہ کچھ لکھنا ہو تو اس میں تخلیقی کام کے مقابلے میں بڑھئی کا کام زیادہ ہوتا ہے۔ مارکیز کی خاصی تحریریں پڑھ لینے کے باوجود اپنے یہاں کے رائج خیالات کے برعکس اس نظریے کو سمجھنا مشکل کام ہے کہ کسی تخلیقی عنصر میں مزدوریت، کب داخل ہوتی ہے؟

''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' کو انتہائی غور سے پڑھ لینے کے بعد مارکیز کے بتائے ہوئے اشاروں کی روشنی میں اس کی اپنی کہی ہوئی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ بقول مارکیز یہ ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے جب اس قسم کے قتل کی خبر اخباروں میں چھپی اور تیس سال بعد اس خبر کی بنیاد پر ایک کہانی تراشی گئی۔۔۔۔ کہانی میں تخلیقی عنصر یہ داخل کیا گیا کہ کوئی بھی عام سیدھا سادا انسان، جو بنیادی طور پر مجرم نہ ہو، روز مرّہ کی رواں زندگی گزار رہا ہو وہ صرف نظریاتی دباؤ کے تحت قتل کرنے کے لئے سفاکانہ حد تک فوری تیار نہیں ہو سکتا (مشتعل ہو کر ایسا قتل کرنا ایک الگ بحث

ہے) چنانچہ مصنف یہ کہتا ہے کہ قاتل یہ قتل نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ کوئی دوسرا انہیں اس خوفناک عمل سے روک لے۔ دوسرا اس لئے کہ یہ قتل دراصل دوسروں کی رائے اور دباؤ کے زیر اثر ہی تو واجب العمل تھا۔

اب کہانی میں اس تخلیقی عنصر کو داخل کرنے کے بعد بڑھئی کی مشقت کہاں آتی ہے۔ یہ سوال خاصا پریشان کن ہے لیکن تحریر کو بار بار پڑھنے کے دوران ہی جواب کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی مصنف کسی حقیقی سچ میں سے اس کے دوسرے رُخ پر ممکنہ سچ کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کام کے لئے ہر کردار کے حقیقی ممکنہ ردِعمل کے قریب پہنچنے کے لئے اسے ذاتی ذہانت، تخلیقی قوت اور قیاس آرائی سے ہٹ کر اسی کردار کے مخصوص رویوں کی جانچ پڑتال، کاٹ پیٹ اور تراش خراش کر کے ممکنہ نتیجہ برآمد کرنا ہوتا ہے جو واقعی ایک محنت طلب کام ہے۔

سانتیا گو نصر کی ماں نا دانستہ عملی غلطی سے خود کو بری الذمہ قرار دے لیتی ہے لیکن اپنی نا دانستہ، خیالی غلطی کو کبھی معاف نہیں کرتی۔

> ''پلاسیر الینیر و نے آخری لمحے میں اس دروازے کو مقفل کروا دیا تھا (جس دروازے سے سانتیا گو نصر جان بچانے کی خاطر گھسنے والا تھا اور قاتلوں کے ہتھے چڑھ گیا) مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو الزام سے بری کر دیا۔''میں نے اسے اس لیے بند کروا دیا تھا کہ دیونیا فلور (ملازمہ) نے مجھ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے میرے بیٹے کو اندر آتے دیکھا تھا۔'' اس نے مجھے بتایا۔'' مگر یہ سچ نہیں تھا۔۔۔''دوسری طرف اس نے خود کو درختوں کے سعد شگون اور پرندوں کے نحس شگون میں تمیز نہ کرنے پر کبھی خود کو معاف نہیں کیا اور کاہو کے بیج چبانے کی قبیح عادت کا شکار ہو گئی۔''

پادری اس جرم کو روکنے کے لئے کچھ کرسکتا تھا لیکن اس نے نہیں کیا۔

> ''اس نے اسے معالات اجارہ خداوندی میں دخل اندازی کا بہانہ بنایا اور پرسکون ہو گیا۔''

یہ بات طے ہے کہ مصنف اپنے تخیل کو کسی بھی موضوع سے متعلق جیسے چاہے استعمال کر سکتا ہے۔لیکن مارکیز نے اپنے تخیل کو استعمال کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا ہے کہ مصنف زندگی کو زندگی کے ممکنہ رنگ میں تلاش کرنے کا پابند ہے ورنہ زندگی کے حقیقی معاملات کو برتنے میں کوئی بھی غیر حقیقی رویہ اور بعید از قیاس صورتِ حال تخلیق کو مسخ کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

یہ ایک حقیقی واقعہ ہے جسے تخیل کے زور پر کہانی میں ڈھالا گیا۔کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ تفتیش خود نہیں کی گئی بلکہ تخلیقی زور پر تراشی گئی ہے۔وجہ ہر سطر میں سامنے آتی ہے کہ مصنف نے اصل زندگی سے تمام کردار چنے۔اس مخصوص موضوع سے متعلق ان کے روزمرہ کے اقوال و افعال اور عمل و ردعمل کے گہرے مشاہدے کو بنیاد بنا کر انتہائی کاریگری سے ''ممکنہ'' کی انگوٹھی میں فٹ کر دیا۔اس کاریگری کے نتیجے میں ہی بتایا گیا کہ انسانوں کے تمام رویے مثبت نہیں ہو سکتے۔



(مشمولہ: ''تجزیہ'' از پروین افشاں راؤ، کراچی، امیج میکرز، ۱۹۹۹ء)

گارسیا مارکیز اور معاصر لاطینی امریکی فکشن

عبدالعزیز ملک

لاطینی امریکہ ایک ایسا بر اعظم ہے جو اپنے اندرونی خلفشار کے کارن ہمیشہ مفلوج رہا ہے۔اس خطے کی تاریخ ،نو آبادیات ، آمریت ، بے پناہ تشدد،سیاسی بازی گری، خانہ جنگی اوراستعماری طاقتوں کی خون آشام حکمتِ عملیوں سے لبریز ہے۔لاطینی امریکی ممالک میں سیلاب ،وبائیں،قحط،قدرتی آفات اورصدیوں چلنے والی جنگیں اوراس کے نتیجے میں موت کی ارزانی اس کے علاوہ ہیں۔سولہویں صدی کے اختتام اورسترہویں صدی کے آغاز میں یورپی ممالک نے اپنے آہنی پنجے ان ممالک پر مضبوط کر لیے اور لاطینی امریکہ کا بیشتر حصہ فرانس، سپین ، پرتگال اورنیدر لینڈ کی کالونیوں کی شکل اختیار کر گیا۔ان نو آبادیوں کے ہمراہ عیسائی مشنریوں نے عیسائیت کی تبلیغ کی خاطر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنا شروع کردیا۔سولہویں اور سترہویں صدی کے بعد ان ممالک میں ایسی تبدیلیاں لائی گئیں جو سامراجی ممالک کے معاشی تقاضوں سے موافقت رکھتی تھیں۔سامراجیوں نے پیداواری قوتوں کی آزادانہ نشوونما کو روک کر کالونیل ریاستی نظام کو مسلط کیا تا کہ یہاں کے ذرائع پیداوار سے بھرپور استفادہ کیا جا سکے۔آغاز میں سامراجی ممالک نے یہاں کے ذرائع پیداوار کو لوٹا اور بعد میں جب صنعتی انقلاب رونما ہوا تو ان افلاس زدہ ممالک کو اشیاء کی کھپت کے لیے منڈیوں کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔یہی وہ حالات تھے جن کے تحت کالونیل معاشی نظام کو متعارف کروایا گیا اور کالونیل پیداواری تعلقات قائم کیے گے۔

انیسویں صدی میں آ کر ان ممالک میں بیشتر نے آزادی حاصل کر لی اور ان ملکوں میں امریکی مفادات کی خاطر کالونیل سیاسی نظام کو برقرار رکھا گیا جسے مابعد کالونیل نظام سے

موسوم کیا جا سکتا ہے۔۱۸۱۹ء میں کولمبیا سپین سے آزادی حاصل کر چکا تھا۔آزادی کے بعد یہ خطہ ایک صدی تک اندرونی خانہ جنگی کا شکار رہا۔۱۸۴۰ء میں یہاں کی سیاست دو پارٹیوں میں منقسم ہوگئی:ایک کنزرویٹو اور دوسرے لبرل۔ان دونوں پارٹیوں میں خانہ جنگیوں کی ایک طویل داستان ہے۔''ہزارروزہ جنگ'' ان پارٹیوں کے مابین وہ خون ریز ترین جنگ ہے جو۱۸۹۹ء سے۱۹۰۲ء کے درمیان لڑی گئی جس کے باعث ملک دیوالیہ ہوکر تباہی کے دہانے پر جا کھڑا ہوا۔

سولہویں اور سترہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک ان ممالک میں سپین، پرتگال اور فرانس نے مقامی تہذیب کو بدل کر رکھ دیا۔ یورپی قبضے سے قبل یہاں مایا،انکا اور ایزٹیک تہذیبیں ترقی یافتہ شکل میں موجود تھیں جو سامراجی ممالک کی خودغرضانہ پالیسیوں اور تہذیبی یلغار کے باعث اپنی اصلی حالت برقرار رکھنے میں ظفریاب نہ ہوسکیں۔بیسویں صدی تک آتے آتے سرمایہ کاری اور صنعت کاری کے باعث اس قدیم تہذیب وثقافت کے تمام نقوش نوآبادکاروں کے ہاتھوں مسخ ہوکر رہ گئے۔اس سارے منظرنامے نے لاطینی امریکہ کی تخلیقات پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ان اثرات کے باعث ایک نیا بیانیہ ابھر کر سامنے آیا جو باہر سے آکر بسنے والوں کے عقائد(جو کیتھولک اثرات کے حامل مشنری تھے۔)اور مقامی روایات و اساطیر سے تشکیل پذیر ہوا۔اس بیانیہ میں غیرحقیقی اور حقیقی عناصر کا امتزاج موجود ہے جسے ادبی نقاد'' جادوئی حقیقت نگاری'' (Magical Realism) سے موسوم کرتے ہیں۔دراصل یہ اس خالص منطقیت و استدلالیت اور سائنسی سوچ کے خلاف ردِعمل تھا جو یورپی تہذیب کے لاطینی امریکی ممالک پر اثرانداز ہونے کے نتیجے میں سامنے آیا۔اگر جائزہ لیا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ اس بیانیے کی تشکیل عام طور پر ان ممالک میں ہوئی جو مابعد نوآبادیاتی معیشت میں جکڑے ہوئے تھے۔اس بات کا اظہار یونی ورسٹی آف پورٹ ماؤتھ کی لیکچرار میگی این بورز اپنی کتاب "Magic(al) Realism" میں یوں کرتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

"This has meant that much magical realism has originated in many of tha postcolonial countries that are battling against the influence of their previous colonialrulers,and consider themselves to be at the margins of imperial power.It has also become a

common narrative mode for fictions written from the perspective of the politically or culturally disempowered, for instance indegenous people living under a covert colonial system such as native Americans in the united states....... "

''اس کا مطلب ہے کہ جادوئی حقیقت نگاری کا آغاز مابعد نوآبادیاتی ممالک سے ہوا جو سابقہ نوآبادیاتی حکمرانوں کے اثرات سے جنگ کر رہے تھے، اور خود کو سامراجی طاقت کے حاشیے پر تصور کرتے تھے۔ یہ سیاسی اور ثقافتی طور پر کمزور تناظر کے حامل فکشن کے لیے ایک معروف طریقہ کار بن گیا، مثال کے طور پر امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں بسنے والے مقامی لوگوں کے لیے جو بظاہر نہ نظر آنے والے نوآبادیاتی نظام کے تحت اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں......''

(Maggi Ann Bowers, Magical Realism ,Routledge, Abingdon.2004,pp31)

جدت اور قدامت کے امتزاج کے نتیجے میں سامنے آنے والے اس بیانیے نے فکشن کو خاصا متاثر کیا اور یورپ میں ناول کی جو روایت دم توڑتی جا رہی تھی وہ لاطینی امریکی فکشن نگاروں میں مقبول ہوئی اور ساٹھ کی دہائی میں کئی شاہکار ناول لاطینی امریکی مصنفین کے قلم سے تخلیق ہوئے جنھوں نے پوری دنیا میں دھوم مچا دی۔ اس سلسلے میں ''گیبریئل گارسیا مارکیز'' کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ جس کے ناولوں ''تنہائی کے سو سال''، ''وبا کے دنوں میں محبت'' اور ''محبتوں کے آسیب'' نے اس نئے بیانیے کو تقویت بخشی۔ جادوئی اور حقیقی عناصر کے امتزاج سے تشکیل پذیر ہونے والے اس بیانیے کے بارے میں لوکس بورخیس اپنی رائے دیتے ہوئے کہتا ہے کہ گویا یہ زبان و ادب کی نئی مابعد الطبعیات کو دریافت کرنے کے مترادف تھا۔ لاطینی امریکی فکشن نے جس تیزی کے ساتھ پوری دنیا میں اپنا نام اور مقام پیدا کیا وہ اس لیے بھی حیران کن ہے کہ انیسویں صدی میں اس خطے میں فکشن کا مطالعہ ممنوع تھا اور سروانتے کی تخلیق ڈان کیخوٹے ایسی کتابیں بھی چوری چھپے مطالعہ کی غرض سے لائی جاتی تھیں۔ سرِ عام ان کی اشاعت اور فروخت

پابندیوں کی زد میں تھی۔ فکشن کی کتب عموماً شراب کے بیرلوں میں رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاتی تھیں، جہاں اتنی پابندیاں ہوں وہاں بہترین فکشن کی تخلیق حیران کن نہ ہوتو کیا ہو؟ فکشن کی تاریخ کے مطالعے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ آگے چل کر فکشن کی روایت میں نمایاں تبدیلیاں صورت پذیر ہوئیں۔ نئے بیانیے کی دریافت نے فکشن کے بدلاؤ کو ممکن بنایا۔ اس موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے خالد جاوید اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں۔

> ''مطلب یہ کہ یہ بیانیہ سنائی دینے والے لفظ اور تحریری فکشن کے اچھوتے ملاپ کی ایک شکل تھا۔ یہ ایک انوکھی حقیقت تھی جس کے ایک حصے میں ہوا اور پسینے کے کڑوے رنگ تھے تو دوسرے حصے میں ایک طلسمی فینٹسی تھی جس کا تعلق انکا اور مایا نسلوں کی لوک کتھاؤں اور اساطیر سے چلا آتا تھا مگر سب سے اہم تو یہ بات ثابت ہوئی بلکہ کارنامہ ہی کہنا چاہیے کہ بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی حالات سے گزرتا ہوا لاطینی امریکہ کا یہ دورنگا جادوئی بیانیہ اپنے زمانے کی تمام آمری حکومتوں اور ملٹری کے مظالموں اور انسانی بے چینی کو جذب اور برداشت کرتے ہوئے عوام کی تمام تر تہذیبی آرزوؤں اور خواہشوں کا استعارہ بن گیا۔'' (خالد جاوید، گیبریئل مارکیز فن اور شخصیت، شہرزاد، کراچی، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۹۰)

گارسیا مارکیز جس دور میں ادب تخلیق کر رہا تھا اس دور میں لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک پر یا تو مطلق العنان حکمران قابض تھے یا پھر فوجی جرنیل۔ وہی بدعنوانیاں، معاشرتی کج رویاں اور افسر شاہانہ رویے عوام کے ساتھ بدستور روا رکھے جارہے تھے۔ اس دور میں کئی لکھاریوں نے ارفع تخلیقات متعارف کروائیں جن کو پوری دنیا میں ادب پڑھنے والوں نے سراہا۔ اس بیانیے کو اپنانے والے ادیبوں میں کیوبا کے الیخو کارپین ٹیر، گوئٹا مالا کے اینجل استوریاس، چلی کی خاتون ازابیل الینڈے، لارا ایسکوول، اینجلا کارٹر، حوان رلفو، حولیو کارتازار، کارلوس فوئنتیس، ماریو برگس یوسا اور لوئس بورخیس کے نام نمایاں ہیں۔ اس دور میں فکشن اس تیزی سے اس خطے میں ابھر کر سامنے آیا کہ بعض نقاد اس عہد کو ''بوم'' کا نام دیتے ہیں۔ مائیکل ووڈ اسے ''ادبی فراوانی'' کا دور بھی کہتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جو مارکیز اور معاصر لاطینی امریکی فکشن کا عہد زریں کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ بنیادی طور پر تو ''بوم'' اقتصادی اصطلاح ہے جس نادیب اور نقاد، ادب میں رواج دینے کے خلاف ہیں۔ مائیکل ووڈ ایسا نقاد بھی اس اصطلاح کو بازاری، غیر مناسب اور ادب کے

لیے توہین آمیز تصور کرتا ہے۔مخصوص وقت میں ایک ہی بیانیہ پر مبنی تحریریں بڑی تعداد میں سامنے آئیں تو اسے ''بوم'' سے موسوم کر بھی لیا جائے تو آخر ہرج ہی کیا ہے؟ یہ دور ساٹھ کی دہائی سے ستر کی دہائی کے آغاز تک چلتا ہے۔معروف ادیب دونوسو کا ناول "The Obscene Bird Of Night" لاطینی امریکی عہد کے ''بوم'' کا آخری ناول تصور کیا جاتا ہے۔''بوم'' کے اس دور کی بڑی وجہ ۱۹۵۹ء میں کیوبا میں ہونے والا انقلاب ہے جس نے لاطینی امریکہ کے دیگر ممالک پر عمیق اثرات مرتب کیے۔فیڈل کاسترو کی ۱۹۶۱ء میں کی جانے والی تقریر نے بھی یہاں کے لکھاریوں کو خاصا متاثر کیا۔اسی دور میں ہی دستاویزی ناول کی ایک نئی قسم معرض وجود میں آئی اس تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے متعدد ناول تخلیق کیے گئے جنھوں نے شہرتِ عام کی منزلوں کو عبور کیا۔اس حوالے سے ''میکیل بارنیت'' کے ناول "Autobiography of a Runway Slave" کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

گارسیا مارکیز کی تخلیقات سے پہلے کے لاطینی امریکی ادب کا جائزہ لیا جائے تو یورپ جدیدیت کے دور سے گزر رہا تھا اور یورپی ادب میں روز افزوں نئی نئی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ یورپ بالعموم اور فرانسیسی، جرمن اور انگلستانی ادب بالخصوص بڑی تیزی سے تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہا تھا۔ڈاڈازم، سرریلزم، کنسٹرکٹوازم، اظہاریت، فیوچرازم تمثال نگاری، نیو ہیومنزم، شعور کی رو، علامتیت اور کیوبزم ایسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں ۔ جدیدیت کی یہ لہر سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہونے والی ترقی کا لازمی نتیجہ تھی جو ادب میں نت نئے رجحانات کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی تھی۔۔ لاطینی امریکی ادب اس دور میں وہ روایت قائم نہ کرسکا جو یورپ میں پروان چڑھ رہی تھی ۔میکسیکو کے انقلاب پر ماریانو ارسویلا کے ناول "Under Dogs" کو شہرت تو ملی لیکن وہ لاطینی امریکی فکشن میں آفاقی ادب کی جڑیں مضبوط کرنے میں ناکام رہا۔وہ رجحانات جو یورپی ادب میں بیسویں صدی کے آغاز میں نمایاں ہو رہے تھے وہ بہت بعد میں نو آبادیاتی ممالک میں رونما ہوئے اور لاطینی امریکہ میں بہت بعد میں ان رجحانات کا چلن ہوا لیکن ایک بدلی ہوئی شکل میں ۔گارشیا مارکیز کے ناولوں کے ساتھ ساتھ بورخیس، الیخو کارپینٹیر، اینجل استوریاس ،کارلوس فوینٹیس اور ماریو برگس یوسا کے ناولوں میں ان رجحانات کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔

گارسیا مارکیز کے معاصر فکشن نگاروں میں بورخیس ایک معتبر نام ہے جس نے لاطینی امریکہ میں تقریباً تمام لکھاریوں کو متاثر کیا۔گارسیا مارکیز نے بھی اس کی تحریروں سے اثر قبول کیا ہے۔خاص طور پر گارسیا مارکیز کے معروف ناول ''تنہائی کے سو سال'' میں بورخیس کی چھاپ کو تلاشا جاسکتا

ہے۔ بورخیس نے شاعری اور مضامین کو تو اپنا تختۂ مشق بنایا ہی بنایا ہے لیکن کہانیاں لکھنے میں اس نے کمال کر دکھایا۔ان کے متعدد افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ۔ ان میں "The book of sand"اور "Labyrinth"بورخیس کے اہم افسانوی مجموعوں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ بورخیس کی کہانیاں خواب اور حقیقت کے امتزاج سے وسیع تر حقیقت کی ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہیں ۔ وہ انوکھے تصورات، تشبیہیں اور استعارات آرائش اور پیچیدگیوں کے ساتھ ملا کر ایک ایسا اسلوب تیار کرتا ہے جسے ناقدین "Baroque" کا نام دیتے ہیں ۔ "Baroque"اور "Fantsy"کے امتزاج سے بورخیس نے ایک منفرد اسلوب کی بنیاد رکھی جس سے اس کے بعد میں آنے والے ادیبوں نے بھرپور استفادہ کیا ہے ۔اسی سبب اسے ''جدید لاطینی امریکی فکشن کا باپ'' بھی کہا جاتا ہے ۔جن لوگوں نے بورخیس سے استفادہ کیا ،گارسیا مارکیز بھی ان میں سے ایک ہے جس نے اس کے انوکھے اور حیرت زا اُسلوب کو آگے بڑھایا اور جادوئی حقیقت نگاری کے بیانیے کو پوری دنیا میں متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔

بورخیس کے بعد میخائل اینجل استوریاس کا نام لاطینی امریکی فکشن میں خاصا اہم ہے جس کا تعلق گوئٹے مالا سے ہے۔ ایک ڈکٹیٹر کی زندگی پر تحریر کیے ہوئے استوریاس کے ناول "The President"نے یورپی ادب کو لاطینی امریکی فکشن سے متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا ۔اس ناول پر اسے ۱۹۶۷ء میں ادب کے نوبل انعام سے بھی نوازا گیا ۔ اس کا ایک اور اہم ناول "Man of Maize"(۱۹۴۹) ہے جس نے استوریاس کے موضوعات کی پیش کش کی تکنیک کو پوری دنیا میں متعارف کروانے میں کلیدی کردار انجام دیا ہے۔ استوریاس نے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا لیکن ان کی وجہٗ شہرت ناول نگاری ہی بنی۔ ماورائے حقیقت اسلوب اور مایا نسل کی تہذیب سے کشید کیے ہوئے انوکھے موضوعات سے انھوں نے لاطینی امریکی فکشن کے دامن کو زرخیز کیا۔ جو بعد میں آنے والے ادیبوں کے لیے مشعل راہ بنے۔

جدید لاطینی امریکی فکشن میں کارلوس فیونتیس کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ اس کا تعلق میکسیکو کی سرزمین سے ہے وہ ۱۹۶۷ء میں پاناما سٹی میں پیدا ہوا اور اس نے اپنے بچپن کے دن سنتیاگو، بوئینوس آئرس اور واشنگٹن میں گزارے ۔اس کی تحریروں کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ ادب پر گہری نظر رکھتا ہے جس کا اندازہ اس کے لیکچروں سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے امریکہ کی مختلف یونی ورسٹیوں میں ادبیات اور تاریخ کے موضوع پر دیے ہیں ۔فیونتیس نے اپنے

تحریروں میں تاریخ کے جبر کے شکار لوگوں کے مصائب کو کچھ اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تحریروں کا اثر لاطینی امریکی ممالک سے بڑھ کر پوری دنیا میں سراہا گیا ہے۔اس کے ناولوں میں ''جہاں ہوا صاف شفاف ہے''، ''آرتیمو کروز کی موت''، ''تیرانوسترا'' اور ''اورا'' خاصے اہم ہیں۔عہد حاضر کے معروف نقاد آصف فرخی کارلوس فیونتیس کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''فیونتیس کے ناولوں کا دوسرا پسندیدہ موضوع لاطینی امریکہ کی تاریخ ہے، کولمبس کے زمانے سے بھی پہلے سے جاری تاریخ جو سرابِ خیال (Phantasmogoria) بن کر بار بار پلٹتی ہے۔''کھال کی تبدیلی''، ''آرتیموکروز کی موت'' اور ''تیرانوسترا'' جیسے ناولوں میں ہر آنے والا عہد، اور سماجی اعمال کی ہر نئی ترتیب آخر میں جا کر ٹیڑھے آئینوں کا عکس ثابت ہوتی ہے۔جس میں مذہب محبت اور اقتدار کے وہی جرائم دہرائے جاتے ہیں جو اس سے پہلے کے زمانوں میں سامنے آتے رہے ہیں۔'' (کارلوس فیونتیس، ہالہ، مترجم: آصف فرخی، شہرزاد، کراچی، ستمبر ۲۰۰۱ء، ص ۱۴)

کارلوس فیونتیس اپنی تخلیقات میں اس بات کا اقرار کرتا ہے تاریخ میں ہماری زندگی اس سے پہلے جو تھی وہی رہے گی یعنی ایک ڈرا دینے والا خواب!،وہ یہ بھی تسلیم کرنے سے عار محسوس نہیں کرتا کہ زندگی کا پر اسرار اور مبہم عمل جاری و ساری رہے گا۔یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو ہمارے روز مرہ کے اطوار کو الٹا کر رکھ دے اور حقیقت کی پردہ کشائی کرے۔فیونتیس کی اس صلاحیت کی داد اس کے نقادوں نے بار ہا دی ہے۔

لاطینی امریکی فکشن میں ایک اور اہم نام کیوبا سے تعلق رکھنے والے الیجو کارپینٹیر کا بھی ہے۔کارپینٹیر نے ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک کا وقت فرانس میں گزارا جہاں اسے آواں گارد (Avant Garde) فنکاروں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔اس کا معروف ناول The Kingdom Of The World، ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آیا۔یہ دکھانے کے لیے کہ لاطینی امریکہ کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ اتنے حیرت انگیز اور پیچیدہ ہیں کہ وہ بادی النظر میں جادوئی دکھائی دیتے ہیں،اس ناول میں اس نے، Real Marvellous کی تکنیک استعمال کی جس کا اظہار وہ اس ناول کے دیباچے میں بھی کرتا ہے۔اس حوالے سے ماریا یوجینیا بی۔ ریو، رقمطراز ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

"The prologue of his second novel,The kingdom of this world,1949,contains the optimistic introduction of Carpentier's concept of "lo real marvavilloso" which became the basis of Latin American Magical realism"

''اس کے دوسرے ناول ''اس دنیا کی سلطنت'' کا دیباچہ کارپین ٹیر کے تصور ''Marvellous Realism'' کے رجائیت پسند تعارف پر مشتمل ہے جو لاطینی امریکی جادوئی حقیقت نگاری کی بنیاد بنا''

(Maria Eugenia B Rave, Magical Realism and Latin America, a master Project of M.A,The university of Maine,may ,2003,pp 26)

بعض ناقدین اس تکنیک کو جادوئی حقیقت نگاری کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ گارسیا مارکیز نے جس انداز سے جادوئی حقیقت نگاری کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے، وہ برملا اور صریح انداز الیجو کارپین ٹیر کے ہاں موجود نہیں ہے اس نے اگرچہ اس تکنیک کا استعمال کیا ہے لیکن خال خال۔ ۱۹۵۳ء میں The Lost Step کے نام سے اس کا ایک اور اہم ناول شائع ہوا جس نے اس کی شہرت کو نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ اس ناول میں Baroque اسلوب کو آسانی سے تلاشا جا سکتا ہے۔ اس کے خیال میں مذکورہ اسلوب فن کی ایسی شکل ہے جو انقلابی ہونے کے باعث اہم ہے۔ یہ اسلوب خود میں ہمیشہ وسعت پیدا کرتے ہوئے مروجہ حدود کو توڑ دینے کا کام کرتا ہے۔ کارپین ٹیر نے مقامی ادب کو متاثر کرنے والے یورپی اندازِ نگارش اور لاطینی امریکی طرزِ نگارش کے مابین توازن قائم رکھنے کی بھی کوشش کی ہے جو یقینی طور پر ایک کٹھن کام ہے۔ لاطینی امریکی ثقافت کے بطن سے جنم لینے والے منفرد اسلوب میں بذاتِ خود کئی ثقافتیں ممزوج ہیں۔ ان میں باہر سے آ کر بس جانے والے آبادکار بھی ہیں، افریقی غلام بھی، اور مقامی قبائل بھی، جن کے امتزاج سے اس ثقافت نے جنم لیا ہے لیکن الیجو کارپین ٹیر نے یہ ادق کام بڑی مہارت سے کر دکھایا ہے۔

حولیو کارتازار ایسے ادیب کو لاطینی امریکی فکشن میں کسی طور فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا شمار لاطینی امریکی فکشن نگاروں کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اس کا معروف ناول

Hopscotch شائع ہوا جس سے گارسیا مارکیز ایسے نامور ادیب نے بھی استفادہ کیا۔ اگر گارسیا مارکیز اور حولیو کارتازار کی تخلیقات کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گارسیا مارکیز کی نسبت حولیو کارتازار کو اپنے خطے (ارجنٹینا) کی شناخت اور جڑوں کی تلاش کا احساس زیادہ ہے۔اس کے علاوہ ''پیڈرو پارما'' کا مصنف حوان رلفو، کیوبا سے تعلق رکھنے والے ادیب کابریرا الفانتے جس نے The Trapped Tigers کے ذریعے شہرت پائی، پیرو کے ماریو برگس یوسا جو '' آنٹی جولیا اینڈ اسکرپٹ رائٹر'' کے ذریعے مشہور ہوا، اکتاویو پاز، آرمونیا سومرز، کلیرائس لسپکٹر، السیئو ڈیگو، جوان بوش، آگستو روابستوس، گیبریلا مسٹرل، خورخے آمادو، را برٹو آرلٹ اور لینونورس ایسے ادیبوں نے لاطینی امریکی خطے کی ادبی فضا کو اپنی تخلیقات کی دل لبھانے والی خوش بو سے معطر کیا۔ ان لکھاریوں نے ایسا منظر نامہ تشکیل دیا جس سے پوری دنیا کے ادب نے اثرات قبول کیے۔ محمود احمد قاضی نے لاطینی امریکی کہانیوں کا ترجمہ اردو میں '' کتھانگر'' کے عنوان سے کیا ہے جس کے پیش لفظ '' قاری سے مکالمہ'' میں وہ ایسی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

> ''اسی جہانِ حیرت، کتھانگر کے باسی کچھ سر پھرے لوگ لاطینی امریکی لکھاری کہلاتے ہیں جن کی نثر اور بیانیہ اتنا طاقتور ہے کہ اس نے ساری دنیا کے ادب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اسی پُر زور اور پُر اثر نثر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ۱۹۷۱ء میں ہسپانوی نقاد، آندرے امورس Andres Amoros نے کہا تھا '' یہ نثر انگریزی اور فرانسیسی ادب کے لیے اچھی مثال اور نمونے کا کام دے سکتی ہے۔'' (کتھانگر۔لاطینی امریکی کہانیاں، مترجم محمود احمد قاضی، جمہوری پبلیکیشنز ،لاہور، جون ۲۰۱۱ء ص ۸)

لاطینی امریکی فکشن کی ارفعیت کا اعتراف اس عہد کے کئی نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں کیا ہے۔جن میں وینڈے بی فارس ، لوئی پارکنسن زمورا، میگی این بووز، اینڈریو جینیفر، ایمرل بیٹرس کینیڈی ، برنڈا کوپر، پیٹریشا ہرٹ اور فریڈرک جیمی سن ایسے نام نمایاں ہیں۔ ان تمام نامور ادیبوں کی موجودگی میں جو نام اور مقام گیبریئل گارسیا مارکیز کو حاصل ہوا وہ کسی اور ادیب کا مقدر نہ بن سکا۔ مارکیز کی تحریروں کا قریباً تمام دنیا کی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور اس کا شمار ان ادیبوں میں شمار ہوتا ہے جس کی لکھتوں کا لوگ انتظار کرتے ہیں۔ اس نے اپنے عہد کے نہ صرف ادب کو متاثر کیا، بلکہ اپنے عہد کی سیاسی صورتِ حال کو بھی اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ سیاست

سے زیادہ طاقت کا مظہر گارسیامارکیز کوشش کرتا ہے۔اسی سبب اس کے ناول آدرش پرستوں، آمروں، مزاحمت کاروں اور آہنی ارادوں کے حامل افراد سے لبریز ہیں۔ایڈتھ گراسمین اپنے مضمون'' گارسیامارکیز: سیاست اور نثر'' (مترجم پروفیسر خالد سعید) میں ایک جگہ تحریر کرتا ہے کہ وہ طاقتور شخصیات سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے، جیسے پبلو اسکوبر، جو منشیات کا دھندا کرنے والی تنظیم کا سرغنہ ہے، امریکی صدر کلنٹن، سالیناس، کاسترو اور فرانکوئز متراں وغیرہ۔وہ ایک کشش اور للچاہٹ کے ساتھ طاقت کو اپنی ذات میں مرکوز کرتا ہے۔وہ دوسروں کے خلاف ہی صف آرا نہیں اپنی ذات سے بھی متصادم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کی تحریروں میں جیمز جوائس، ولیم فاکنر، فرانز کافکا، ورجینیا وولف، ہیمنگوے، گراہم گرین اور بورخیس کے فکشن کے اثرات آسانی سے تلاشے جا سکتے ہیں، لیکن بچپن میں اس کی نانی دوناترانکیلینا کی مختصر کہانیوں نے جو اثرات اس کے قلب وذہن پر مرتب کیے وہ گارسیامارکیز کے فکشن کے بیانیہ کی انوکھی روش کو مرتب کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔اس کی خالائیں بھی تخیل پرست عورتیں تھیں جو پرانی یادوں کے درمیان زندہ تھیں۔ان کی کہانیوں اور پراسرار اعتقادات نے گارشیا مارکیز کو متاثر کیا۔ گارسیا مارکیز کے ہمعصر ادیب ''پلینیو اپولیو میندوزا (Plinio Apuleyo Mendoza) نے ایک طویل دوستانہ گفتگو ''امرود کی مہک'' (Fragrance Of Guava) میں مارکیز کی خالاؤں کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''ان سب میں پیش گوئی کی حیران کن صلاحیت موجود تھی اور اکثر وہ اپنے گواہیر کے انڈین ملازموں کی طرح توہم پرستی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔وہ سب غیر معمولی واقعات کو اس طرح برتتی تھیں گویا وہ انتہائی فطری باتیں ہوں۔مثلاً خالہ فرانسسکا سیمونوسیا، جو ایک مضبوط اور کبھی نہ تھکنے والی عورت تھی، ایک روز اپنا کفن بننے بیٹھ گئی۔جب گابریئل نے پوچھا کہ'' آپ کفن کیوں بنا رہی ہیں؟'' تو اس نے جواب دیا'' اس لیے بیٹے کہ میں مرنے والی ہوں'' اور یہ حقیقت ہے کہ جوں ہی اس کا کفن تیار ہوا، وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور مر گئی۔'' (پلینیو اپولیو میندوزا، گابریئل، مترجم اجمل کمال، مشمولہ، آج، کراچی، مارچ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۴۳)

گارسیا کے اس مخصوص اسلوب کو تشکیل دینے میں ڈینیئل ڈیفو، برِم اسٹوکر کے ڈریکولا اور

ایڈگر رائس کے ٹارزن کے سلسلے کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔روسی ادیب میخائل بلگاکوف کے ناول ''دی ماسٹر اینڈ مارگریٹا'' کو بھی اس حوالے سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔تمام باتوں سے قطع نظر گارسیا مارکیز ایک ایسا ادیب ہے جسکے منفرد اسلوب نے پورے یورپ کو متاثر کیا۔سپین میں تو گارسیا کے انداز میں لکھنے والوں کی ایک نئی نسل سامنے آ گئی۔جادوئی حقیقت نگاری پر مبنی اس اسلوب نے گارسیا مارکیز کے ناولوں کو پوری دنیا میں متعارف کروا دیا۔مارکیز کے نمائندہ ناول ''تنہائی کے سو سال'' (One Hundred Years of Solitude) کے اب تک ستائیس سے زائد زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔لاطینی امریکی فکشن میں ''بوم'' کے جس دور کا ذکر کیا جاتا ہے اس کو نقطۂ کمال تک پہنچانے اور بین الاقوامی ادب میں ناول کے مابعد جدید دور تک کے ارتقاء میں مذکورہ ناول کا اہم کردار ہے۔اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سروانتے کے ''ڈان کہوٹے'' کے بعد یہ ہسپانوی زبان کا دوسرا ناول ہے جو اپنے معیار اور شہرت کے اعتبار سے ظفریاب ہے۔اس کے علاوہ ''پتوں کا طوفان''، ''سردار کا زوال''، ''منحوس وقت'' ''وبا کے دنوں میں محبت'' اور ''کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا'' ایسے ناول بھی مارکیز کی پیچیدہ تخلیقی قوت کا ثبوت ہیں۔مارکیز کے ناول یک رخے نہیں بلکہ درجنوں مفاہیم کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں جو ان کی ارفع تخلیقی صلاحیتوں پر دال ہیں۔

مارکیز اور معاصر لاطینی امریکی فکشن کا جائزہ لیا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں بھی اس طرح کی صورتِ حال کا چلن عام رہا ہے۔یہ خطہ لوک کتھاؤں، قصے کہانیوں، اساطیر، ثقافتی توہمات اور داستانوی روایت کا حامل رہا ہے۔اس خطے نے بھی نوآبادیاتی نظام کی خون آشام حکمت عملیوں کا سامنا کیا جس کے نتیجے میں یہاں مفلسی، ذہنی پسماندگی اور ناخواندگی عام ہوئی۔کھلی اور برملا حقیقت کو سات پردوں میں چھپا کر عام آدمی سے اوجھل کر دیا گیا۔ایک طرف بے نظیر، سونیا گاندھی، خالدہ ضیاء اور حسینہ واجد جیسی طاقت ور سیاسی بصیرت کی حامل خواتین موجود ہیں تو ایک ایسی عورتیں بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جس کو نام نہاد عزت کی خاطر آسانی سے قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ان مشترک عوامل کے باوجود ہمارے تخلیقی ذہنوں نے لاطینی امریکی فکشن نگاروں ایسی مہارت کا اظہار نہیں کیا۔ہمارا تخلیقی ذہن داستانوں کی روایت کو جدید حسیت سے ہم آہنگ کرنے سے قاصر رہا ہے۔ہماری داستانیں محض تفننِ طبع کا ذریعہ بن کر رہ گئیں جنھیں سیاسی اور معاشی زبوں حالی کے تبصرے کے طور پر پڑھا جانا ممکن نہیں رہا جس کارن وہ آج کے عہد میں دم توڑتی نظر آتی ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بیانیے سے منہ موڑنے

کی بجائے اسے مابعد جدید دور کے بیانیے سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جائے۔

☆☆☆

(مشمولہ ''تناظر''، گجرات، شمارہ نمبر ۳، جنوری تا دسمبر ۲۰۱۳ء)

مارکیز کے حُسن پرست بوڑھے کی یادیں

فاروق سرور

حال ہی میں کولمبیا کے نوبل انعام یافتہ ادیب گیبریئل گارسیا مارکیز کا نیا ناول مارکیٹ میں آیا ہے، جس کا عنوان ہے"میری غمزدہ طوائفوں کی یادیں۔" اگرچہ گارسیا نے دس سال کی طویل خاموشی کے بعد یہ ناول تحریر کیا ہے، لیکن ان کے گزشتہ طویل ناولوں" تنہائی کے سو سال" اور" وبا کے دنوں میں محبت" کے مقابلے میں یہ ناول نہایت ہی مختصر ہے، جس کے صفحات کی تعداد بس سو سے زیادہ ہوگی، بلکہ اگر ہم اسے ناول کی بجائے ایک طویل کہانی کہیں، تو بُرا نہیں ہوگا۔

گارسیا کی تخلیقات، چاہے وہ کہانیاں ہوں یا ناول اپنی محبتوں کے لیے مشہور ہیں۔ جن میں معصوم اریندرا، محبت کے اس پار منتظر موت اور" مونٹیئل کی بیوہ" کو کافی شہرت ملی۔ سو یہ ناول بھی محبت ہی کے جذبے کو سامنے لا رہا ہے، لیکن یہ عجیب سی محبت ہے جو ایک عورت کی بجائے ۵۱۴ مختلف عورتوں سے کی جا رہی ہے اور ناول کے راوی کے مطابق یہ سب کی سب باقاعدہ اس کی محبوبائیں رہ چکی ہیں اور وہ ان سب کو ہمیشہ ہی سے اپنا سمجھتا چلا آ رہا ہے۔

اگر ہم اس ناول کی کہانی کی طرف آئیں اور اس کا تجزیہ کریں، تو یہاں ایک حیران کر دینے والے نفسیاتی مسئلے سے ہمارا سامنا ہوگا۔ عجیب سی بات ہے کہ ایک بوڑھا شخص جو اب نوے سال کا ہو چکا ہے، اپنی نئی سالگرہ پر خود سے سوال کرتا ہے کہ وہ اس موقع پر خود کو کیا تحفہ دے۔ یوں اس کے پاس اس سوال کا یہی جواب ہوتا ہے کہ یہ تحفہ ایک ایسی نوجوان لڑکی کی صورت میں ہونا چاہیے، جو دوشیزہ ہو اور وہ اس سے پیار کرے۔ وہ ایک نائیکہ سے، جو اس کی پُرانی واقف کار ہے، رابطہ کر کے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے اور نائکہ سکّوں کے عوض اس کی

یہ خواہش پوری کرتی ہے۔ اب رات کو جو خوبصورت لڑکی اسے پیش کی جاتی ہے، اس کی عمر چودہ سال کے قریب ہے اور وہ اسے اپنی پیاری دلگا دینا کہتا ہے، لیکن ایک یہاں عجیب سی بات یہ سامنے آتی ہے کہ جب وہ دلگا دینا سے اپنے پیار کا اظہار کرنے لگتا ہے، تو وہ سو جاتی ہے، کیوں کہ وہ کافی تھکی ہوئی ہے۔ اب اس لڑکی کے متعلق یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ وہ انتہائی غربت کی زندگی گزار رہی ہے، وہ لباس بنانے کی ایک فیکٹری میں ملازمہ ہے اور اپنی قلیل آمدنی سے اپنی معذور ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کر رہی ہے اور فیکٹری میں دن بھر کے کام نے اسے تھکا دیا ہے۔ گارسیا کے ناول کے بوڑھے ہیرو کو اپنی نئی محبوبہ کی یہ ادا بہت پسند آتی ہے، وہ اس کے سرہانے بیٹھتا ہے، اس سوئے ہوئے حُسن کی تعریفیں کرتا ہے اور اس کی خوبصورتی میں کھو کر اپنی گزشتہ محبتوں کو یاد کرتا ہے۔

راوی کا کہنا ہے کہ وہ ایک اخبار میں کالم نویس ہے اور ایک ایسا آزاد مرد بھی جو عمر بھر کنوارا رہا۔ اب وہ اپنے شب و روز کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ اکیلا رہتا ہے اور اس کی تنہا زندگی بادشاہوں کی شاہانہ زندگی سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ گارسیا کے ہیرو کا کہنا ہے کہ اسے عورت کی خوبصورت قُربت سب سے پہلے اس وقت حاصل ہوئی، جب وہ تیرہ سال کا تھا اور اب تک پانچ سو چودہ عورتیں اس کی زندگی میں آچکی ہیں۔ راوی کو فخر ہے کہ اس نے ان عورتوں میں سے کسی کا احسان کبھی اپنے سر نہیں لیا اور اس نے ان سب کو ان کے حسن کا معاوضہ پیش کیا، گو کہ ان عورتوں میں بہت سی ایسی تھیں، جو پیشہ ور طوائفیں نہیں تھیں، وہ اس سے سچی محبت کرتی تھیں اور ان میں سے بہت سوں نے غصہ میں آکر وہ رقم اس کے مُنھ پر دے ماری اور اسے سخت بُرا بھلا بھی کہا، لیکن وہ کبھی بھی اپنی اس عادت سے باز نہیں آیا۔ بہر حال وہ ان سب سے اپنے گُزارے ہوئے اچھے لمحوں کو یاد کرتا ہے اور ماضی میں ڈوب جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو گارسیا کے ناول کے بوڑھے ہیرو کا یہ اندازِ محبت نیا نہیں، بلکہ گارسیا سے پہلے ہی جاپان کے نوبل انعام یافتہ ادیب یا سوناری کاواباتا ''خوابیدہ حُسن کا گھر'' کے عنوان سے ایسی ہی ایک کہانی لکھ چکے ہیں، جس کا ہیرو اگیوچی بوڑھا شخص ہے، جو ٹوکیو شہر کے مضافات میں پانچ بار ایک ایسی سرائے میں جاتا ہے، جو دراصل پیشہ ور طوائفوں کی آماجگاہ ہے اور جو شہر کے بوڑھوں کی پسندیدہ جگہ بھی، کیوں کہ یہاں سے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ یہاں صرف ایسی دوشیزائیں ملتی ہیں جو شراب کے نشے میں دُھت رہتی ہیں۔ اگیوچی جب بھی وہاں جاتا ہے اور وہ جس بھی دوشیزہ کو اپنے کمرے میں لاتا ہے، وہ نشے میں ڈوبی ہوتی ہے۔ یوں وہ ہر بار اپنی نئی محبوبہ کے سرہانے بیٹھتا ہے، اس کے حُسن

کو دیکھ کر اپنے ماضی میں ڈوب جاتا ہے اور پُرانے وقتوں کی حسین یادوں سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گیبرئیل گارسیا مارکیز کے ہیرو کا یہ کیسا اندازِ محبت ہے کہ وہ صرف ان لمحوں میں رہنا چاہتا ہے، جو اس نے اپنی محبوباؤں کے ساتھ گزارے ہیں، اس رویّے کے بارے میں فرائیڈ کا کہنا ہے کہ ہمارے حافظے میں ہماری رشتہ دار عورتوں اور بیویوں کی بجائے وہ عورتیں بھر پور طور پر زندہ رہتی ہیں، جو ہماری محبوبائیں رہ چکی ہوں اور جن کی محبتوں کو ہم نے رقم دے کر خریدا ہو اور جن کا یہ وظیفہ رہا ہو کہ وہ ہماری رضی ہی کے مطابق ہنسیں اور ہماری مرضی ہی کے مطابق بولیں۔ سو یہ نفسیاتی مسئلہ گارسیا کے اس نئے ناول میں مسلسل بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یہاں سامنے آتی ہے کہ کوئی شخص چاہے کتنا بھی بوڑھا ہو جائے، اس کی حُسن پرستی کی حس بوڑھی نہیں ہوتی اور پھر جب اس کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ اس کی موت قریب ہے، تو اس کے اس حس میں زیادہ تیزی اور توانائی آجاتی ہے۔ جبکہ گارسیا کا بوڑھا ہیرو بھی یہ اعتراف کرتا ہے کہ موت کا دیو کسی بھی وقت اسے گھیر سکتا ہے، اسی لیے وہ حُسن اور حسین یادوں سے زیادہ سے زیادہ لُطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

بہر حال ایک ایسے دور میں جہاں مارکیٹ میں تشدّد سے بھر پور ناولوں کی بھر مار ہے اور ہمارا متشدّد عالمی معاشرہ بھی ہم سب کو تشدّد سے بیزار کر چکا ہے، ایک ایسے ناول کی آمد جس کا لہجہ انتہائی دھیما اور خوبصورت ہے اور جو ہمارے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون پہنچاتا ہے اور ہمیں یہ باور کرواتا ہے کہ ہم صرف بدصورتیوں اور عالمی طاقتوں کی دہشت گردیوں میں زندگی نہیں گزار رہے، بلکہ یہاں پُرسکون اور بے فکرے لوگ بھی ہیں، ایک شاندار تحفے اور بھر پور خوشی سے کم نہیں۔



(مشمولہ: ''دنیا زاد'' کراچی، شمارہ نمبر ۱۷، مئی تا جون، ۲۰۰۶ء)

محبتوں کے آسیب

(پیش لفظ)

گیبریئل گارسیا مارکیز/ضیاء الحق

26 اکتوبر 1949ء اہم خبروں سے بھرپور دن نہ تھا۔ استاذ کلیمنٹ مینوئل زابلا نے کہ جو اس اخبار کا چیف ایڈیٹر تھا جہاں میں نے نامہ نگاری کی مبتدیات سیکھیں، عام سی دو تین باتوں کے بعد صبح کی میٹنگ ختم کر دی۔ اس نے کسی کے بھی ذمے کوئی مخصوص کام نہ لگایا۔ چند منٹ بعد ہی اسے ٹیلیفون پر بتایا گیا کہ سانتا کلارا کی قدیم خانقاہ کے مدفن خالی کئے جا رہے ہیں۔ کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے بغیر اس نے مجھے کہا: "وہاں چلے جاؤ اور دیکھو شاید تمہیں کوئی کام کی بات ہاتھ لگ جائے۔"

کلاریسان راہباؤں کی قدیم خانقاہ کو کہ جسے ایک صدی پیشتر ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا تھا، بیچا جا رہا تھا اور اس کی جگہ پر ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل تعمیر ہونے جا رہا تھا۔ چھت گرنے کے عمل نے اس کے ملحقہ گرجا گھر کو اس کی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ ننگا کر دیا تھا مگر اسقفاؤں راہباؤں اور دوسری اہم شخصیات کی تین نسلیں ابھی ابھی وہاں مدفون تھیں۔ پہلا مرحلہ یہی تھا کہ مدفن کے ان تہہ خانوں کو خالی کیا جائے، ان کی باقیات کو ان کے دعویداروں کے حوالے کر دیا جائے اور بقیہ کو ایک ہی قبر میں دفنا دیا جائے۔

مجھے اس تمام تر عمل کی انجام دہی میں روا ناشائستگی نے بہت حیران کیا۔ مزدور کدالوں اور کھرپیوں سے ان مدفنوں کو کھولتے، ان کے گلے سڑے تابوتوں کو کہ جو محض ہلانے جلانے کے عمل میں ہی ٹوٹ کر کھل جاتے، باہر نکالتے اور ہڈیوں کو گرد ولباس کے چیتھڑوں اور خشک بالوں

کے سفوف سے علیحدہ کر دیتے ۔ دفن شدہ شخص جس قدر نامور ہوتا یہ کام اتنا ہی مشقت طلب ہو جاتا۔ کیونکہ مزدور کو قیمتی پتھر اور سونے چاندی کی چیزیں حاصل کرنے کے لئے اس کی باقیات کو اُتھل پتھل کر کے اور ملبے کو کھنگالتے ہوئے بہت احتیاط کرنا پڑتی تھی۔

فورمین ہر کتبے پر لکھی تحریر ایک کاپی میں نقل کرتا، ہڈیوں کو علیحدہ علیحدہ ڈھیروں کی شکل میں ترتیب دیتا اور ان کی پہچان برقرار رکھنے کے لئے ہر ڈھیر پر اس کے متعلقہ نام کا حامل کاغذ رکھ دیتا ۔اسی لئے اس معبد میں داخل ہونے پر جو پہلی چیز میں نے دیکھی وہ چھت کے سوراخوں میں سے آتی ہوئی اکتوبر کی شدید دھوپ میں نہائی ہوئی اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے لکھے نام کے سوا کسی قسم کی شناخت سے مبرا، ڈھیروں کی صورت پڑی ہڈیوں کی یہی لمبی قطار تھی۔ تقریباً نصف صدی بعد بھی میں وقت کی تباہ کن گزران کے اس خوفناک ثبوت سے اپنے اندر پیدا ہونے والی پریشانی کو محسوس کر سکتا ہوں۔

وہیں دوسرے بہت سوں کے علاوہ پیرو کا ایک وائسرائے اور اس کی محبوبہ اس علاقے کا اسقف ڈان تو ریبیو ڈی کاسیرس ورٹوڈذ، مقدس ماں جوزفا میرانڈا سمیت اس خانقاہ کی بہت سی راہبائیں اور ماہرِ فن ڈان کرسٹوبل ڈی ایراسو کہ جس نے اپنی نصف عمر مدفن کی چھتوں کی تعمیر کے لیے وقف کر چھوڑی تھی، مدفون تھے۔ ایک مدفن کے پتھر پر مارکوس ڈی کاسلڈ ویرو ثانی و ڈان ینا شیوڈی الفرڈیوناس کا نام کندہ تھا مگر جب اسے کھولا گیا تو انہوں نے اسے خالی پایا۔ اسے استعمال ہی نہ کیا گیا تھا۔ تاہم اس کی مارکوس ڈونا اولالا ڈی مینڈوزا کی باقیات ایک ملحقہ مدفن کے کندہ پتھر کے نیچے موجود تھیں۔ فورمین نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی: طبقہ امراء کے ایک امریکہ نژاد فرد کا خود سے اپنا مدفن تیار کروانا اور کسی دوسرے میں مدفن ہونا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

تحیر اونچی قربان گاہ کے تیسرے طاق میں اس جانب مضمر تھا جدھر انجیل مقدس رکھی جاتی تھیں۔ پتھر کدال کی پہلی ہی ضرب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور تانبے کی سی بھرپور رنگت کے جاوداں بالوں کی ایک لہر سی مدفن سے ابل پڑی۔ فورمین نے مزدوروں کی مدد سے تمام تر بالوں کو باہر نکالنے کی کوشش کی مگر جتنا وہ انہیں باہر نکالتے اتنے ہی وہ مزید لمبے اور کثیر دکھائی دیتے حتیٰ کہ ان کے آخری سرے ایک نوجوان لڑکی کی کھوپڑی سے جڑی ہوئی حالت میں سامنے آ گئے۔ مدفن میں چند چھوٹی چھوٹی بکھری ہڈیوں کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ شور زدہ کتبے پر کسی قسم کے خاندانی نام کے بغیر لکھا ہوا ذاتی نام پڑھا جا سکتا تھا۔ سائیوا ماریہ ڈی ٹوڈوس لاس اینجلس۔ فرش پر پھیلی حالت

میں ان شاندار بالوں کی لمبائی بائیس میٹر اور گیارہ سینٹی میٹر نکلی۔

جذبات سے عاری اس فورمین نے وضاحت کی کہ موت کے بعد بال ہر ماہ ایک سینٹی میٹر کے حساب سے بڑھتے ہیں اور یہ کہ بائیس میٹر بال دوسو برس کے حساب سے ایک اچھی اوسط ہے۔ تاہم میں اسے کوئی معمولی بات نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ جب میں ابھی بچہ تھا میری دادی نے مجھے ایک ایسی چھوٹی سی بارہ سالہ مارکوئس کے بارے میں کہ جس کے بال اس کے پیچھے کسی دلہن کے لٹکتے ہوئے دامن کی طرح سے لہراتے ایک کہاوت سنائی تھی ۔ وہ ایک کتے کے کاٹنے سے لاحق شدہ باؤلے پن کی وجہ سے مرگئی تھی اور جسے کیریبئین کے ساحل کے ساتھ واقع قصبوں میں ان بہت سے معجزوں کی وجہ سے جو اس نے دکھائے تھے، عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ خیال کہ ممکن ہے یہ مدفن اسی کا ہو" اس دن کے لئے میری خبر اور اس کتاب کی بنیاد بنا۔"

(کارتاہنیاڈی انڈیاس۔۱۹۹۴ء)



(مشمولہ: "محبتوں کے آسیب" از گارسیا مارکیز، مترجم: ضیاء الحق، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء)

محبتوں کے آسیب

(ایک نوٹ)

ضیاء الحق

بہت سے دوسرے ناولوں کی طرح مارکیز کے اس ناول کا منظر نامہ بھی ماضی سے متعلق ہے۔ ساتھ ہی اس میں سینہ بہ سینہ چلنے والے قصوں کی روائتی تشکیک بھی پائی جاتی ہے کہ جس میں حقیقت اور افسانہ میں تفریق مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ناول کی مرکزی کردار سائیوا ماریہ کی حقیقت بھی انہی بھول بھلیوں میں گم ہوئی جاتی ہے۔ درحقیقت وہ والدین کی عدم توجہی کا شکار ہونے والے بچوں میں سے ایک ہے اور چونکہ اس کی پرورش حبشی افریقی غلاموں کے درمیان ہوئی اس میں اان کا رنگ ڈھنگ نمایاں ہے اور یوں وہ بہت سی خصوصیات جو ان غلاموں کے مذہبی عقائد کا نتیجہ ہیں اس میں بھی در آئی ہیں۔ والدین سے عدم لگاؤ اسے ان کے سامنے جھوٹ بول کر ایک خاص حظ اٹھانے پر اکساتا ہے اور پھر یہ رویہ وہ تمام سفید فام لوگوں کے ساتھ رکھنے لگتی ہے مگر اپنے افریقی کے ساتھ اس کا رویہ ہمیشہ دوستانہ رہا۔ مگر چونکہ عام خیال کے مطابق کتے کے کاٹنے کے نتیجے میں شیطان اس کے اندر حلول کر چکا تھا اس کے متعلق ایسی بہت سی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں جن کا تعلق شاید اتنا خود سائیوا ماریہ سے نہ ہو کہ جتنا اس بارے میں مروجہ عام عقائد سے۔ عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کی طاقت وعظمت کے اصولوں کے خلاف مختلف عوامل، پانی پر مستقبل کی جھلک نظر آنا اور مرغیوں کا اڑنا یہ سب باتیں باؤلے پن

کے مریضوں میں شیطانی تجسیم کے عام عقیدے کا نتیجہ تھیں۔ وہ واحد ثبوت جس کی وضاحت شاید یہی ''تجسیم'' ہی ہو سکتی ہے۔ فادر ڈیلا را کے سامنے سائیوا کا وہ روپ تھا کہ جب وہ رات کے وقت اس کے پاس اس کے باپ کی طرف سے بھیجا گیا سامان کا تھیلا لایا اور جس کے بعد ڈیلا را کو بھی اس شیطانی روپ کا یقین ہو گیا۔

سائیوا کے لئے ڈیلارا کی محبت نے اسے آسیب کی طرح جکڑا تھا۔ ایک ایسا شخص جو خواتین کو دلائل کے استعمال کی ایسی ناقابلِ یقین صلاحیت کی حامل سمجھتا ہو کہ جو انہیں خطرناک ترین حقائق سے نبٹنے کی صلاحیت دیتی تھی۔ دراصل خواتین کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اپنے رد عمل سے ڈرتا تھا۔ اور یہ خوف حقیقت میں ڈھل بھی گیا۔ سائیوا کی کم سنی اس کی آزمائش اور اس کے متوقع انجام نے مِل جُل کر اس کے جذبۂ ہمدردی کو ''محبتوں کے آسیب'' میں بدل ڈالا۔ اور پھر سائیوا کو ملنے والی اس محبت نے خود اسے بھی تبدیل کر ڈالا اب اس کی وحشتیں اپنے انجام کے حوالے سے تھیں نہ کہ خود اذیتی کے حوالے سے۔

لیکن ناول صرف سائیوا اور ڈیلا را کے تعلق تک محدود تھیں۔ مارکیز نے ایک ماہر قصہ گو کی طرح سے کئی ایک ذیلی قصے اصل کہانی میں شامل کئے ہیں۔ ان میں سائیوا کو کتے کے کاٹنے سے لے کر اس کے والدین کے غیر مطابقت والے رشتے اس کے نتائج مارکوس کی محبت میں گرفتار ڈلسے اولیویا ڈاکٹر ایبر نیسیو برنارڈا اور اس کے محبوب جوڈاس کا تعلق ڈیلا را کے اپنے طالب علمی کے حالات، یہ اور اس طرح کے دوسرے کئی ذیلی قصے اس ناول کے قاری کو جکڑ لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس سب پر مستزاد مارکیز کا طرزِ بیان اور طرز نگارش ہے۔ صرف مارکیز ہی اسقف کے منہ سے یہ الفاظ ادا کروا سکتا ہے کہ جو اس نے مارکوس سے کہے تھے کہ ''اہم بات یہ نہیں کہ تم خدا پر ایمان کھو بیٹھے ہو بلکہ اہم بات یہ ہے کہ خدا اب بھی تم میں یقین رکھتا ہے۔'' ڈیلا را کے سائیوا سے کہے ہوئے یہ الفاظ ''خدا کرے تم یہ سب برتاؤ ایسے شخص کے ساتھ کرو کہ جو اسے برداشت کرنے کی سکت رکھتا ہو'' ''محبتوں کے آسیب'' میں جکڑے کسی بھی شخص کے ہو سکتے ہیں۔

''محبتوں کے آسیب'' گیبریئل گارسیا مارکیز کا تازہ ترین ناول ہے۔ اس ترجمے میں میں نے حتیٰ المقدور کوشش کی ہے کہ اس ناول کے زبان و بیان کی اصل روح کو اُردو زبان میں منتقل کر

سکوں۔ تاہم اس کا حتمی فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ آخر میں، میں اس ترجمے کی اشاعت کے سلسلے میں برادرم وحید الرحمن خان، برادرم ظہور احمد خان اور رانا عبدالرحمان کی معاونت کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ ان کے بغیر یہ ترجمہ اس قدر جلد قارئین تک نہ پہنچ پاتا۔



(مشمولہ: ''محبتوں کے آسیب'' از گارسیا مارکیز، مترجم: ضیاء الحق، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء)

گارسیا مارکیز کا ای میل پیغام

اپنی نفرت کو برف پر لکھو!

(مارکیز کا دُنیا کے لئے ای میل پیغام)

لطیف قریشی

کولمبیا کا شہرہ ء آفاق ادیب گیبریئل گارسیا مارکیز(Gabrial Garcia Marquiz)فقط'' تنہائی کے سو سال' جیسی بے مثال کہانی (جس پر اسے نوبل انعام سے نوازا گیا) اور ایسی دیگر بہت سی کہانیوں کا خالق ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ ہے۔ وہ ایک بہت بڑا انسان ہے اور اس نے یہ بات انٹرنیٹ پر دیئے گئے اپنے الوداعی پیغام میں بدرجہ اولیٰ ثابت کی ہے۔ گارسیا کچھ عرصے سے کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہے اور شاید اب طبعیت زیادہ بگڑنے پر اس نے موت کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اپنے ساتھی انسانوں کو وہ پیغام دیا ہے جس میں زندگی کی خوبصورتیوں سے تمام تر انکسار کے ساتھ مستفیض ہونے کا درس ہے۔ پیغام اس قدر خوبصورت ہے کہ مجھے اسے اُردو زبان میں منتقل کرتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے۔

ملاحظہ ہو:

''اگر خدا مجھے دوبارہ زندگی دے تو میں جو کچھ سوچتا ہوں، اسے کہنے کے بجائے جو کچھ کہتا ہوں، اس کے بارے میں سوچوں گا۔ میں چیزوں کی قدران کی قیمت سے نہیں بلکہ ان کے بامعنی ہونے کی وجہ سے کروں گا۔ میں کم سوؤں گا اور جاگتے میں خواب دیکھوں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہر اس منٹ جب ہم آنکھیں بند کرتے ہیں، ہم پورے ساٹھ سیکنڈ

کے لیے روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جب دوسرے رُک جائیں گے میں چلتا رہوں گا۔ جب دوسرے سوئیں گے میں جاگوں گا۔ جب دوسرے بولیں گے میں سنوں گا۔ میں اچھی اچھی چاکلیٹ کھاؤں گا۔ اگر خدا مجھے دوبارہ زندگی دے تو میں اچھے اچھے کپڑے پہنوں گا۔ دھوپ تاپوں گا۔۔۔ فقط اپنے جسم کے لیے نہیں بلکہ اپنی روح تک اس کی تپش پہنچاؤں گا۔ اے خدا! اگر میں دل گرفتہ ہوں گا تو اپنی نفرت کو برف پر لکھوں گا اور سورج نکلنے کا انتظار کروں گا تاکہ برف کے ساتھ میری نفرت بھی پگھل کر بہہ جائے۔ میں وین گاگ (Van Gogh) کی طرح ستاروں پر نظمیں لکھوں گا اور چاند کے لیے محبت کے گیت گاؤں گا۔ میں اپنے آنسوؤں سے گلابوں کو سیراب کروں گا اور کانٹوں کا درد اور گلابی پنکھڑیوں کا لمس محسوس کروں گا۔ اے میرے خدا! مجھے دوبارہ زندگی ملے تو میں کوئی دن ایسا نہیں گزاروں گا جب لوگوں کو یہ پیغام نہیں دوں گا کہ مجھے ان سے پیار ہے۔ میں ہر مرد اور عورت کو بتاؤں گا کہ وہ مجھے محبوب ہیں۔ میں پیار سے پیار کروں گا۔ میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ وہ غلط سمجھتے ہیں کہ جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں نہیں معلوم کہ جبوہ محبت کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میں بچوں کو پر پرواز دوں گا، لیکن انہیں خود اڑنے کی کوشش کرنے دوں گا۔ میں بوڑھوں کو بتاؤں گا کہ موت بڑھاپے سے نہیں آتی بلکہ یہ سب کچھ بھول جانے سے آتی ہے۔ اے انسان! میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

میں نے یہ بھی سیکھا ہے کہ ہر کوئی پہاڑ کی چوٹی پر رہنا چاہتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ اصل خوشی اس بات میں ہے کہ چوٹی پر پہنچا کیسے گیا۔
میں نے یہ بھی جانا ہے کہ جب ایک نومولود بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑتا ہے تو وہ باپ کو ہمیشہ کے لیے اپنی محبت میں قید کر لیتا ہے۔ میں نے

یہ بھی جانا ہے کہ انسان کو نیچے کی طرف صرف
اس وقت دیکھنا چاہیے جب اسے کسی دوسرے
انسان کو اوپر اٹھانا ہو۔ اے انسانو! میں نے تم
سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اگر میں
اس سب کو اپنے سینے میں لے کر مر جاؤں تو یہ بد
قسمتی کی موت ہوگی۔"

اور آخر میں وہ مختصر نظم جو میں نے گارسیا کے اس پیغام سے متاثر ہو کر لکھی۔ یہ نظم میں گارسیا کے نام کرتا ہوں:

اپنی نفرت کو برف پر لکھو
جب بھی الفت کی دھوپ نکلے گی
برف پگھلے گی
اور اس کے ساتھ نفرت بھی!

☆☆☆

(مشمولہ: امر بیل، (نوبل کہانی نمبر)، لاہور، جلد ۸، شمارہ نمبر ۲۔۳، فروری تا مارچ ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر سیّدہ عطیہ نے حال ہی میں نمل یونیورسٹی، اسلام آباد سے ''پاکستانی اُردو افسانے کی تنقید کا ارتقا: تجزیاتی مطالعہ'' کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی سطح کا تحقیقی مقالہ مکمل کیا ہے۔ ان کے متعدد تنقیدی اور تحقیقی مقالات مختلف ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں علاوہ ازیں اُن کا شعری مجموعہ ''ستارا ریت پر'' شائع ہو کر ناقدینِ ادب سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ان کی بنیادی دلچسپی اُردو شاعری، فکشن اور بین الاقوامی ادب میں ہے۔

ان دنوں وہ پاکستان پروجیکٹ مینیجمنٹ آرگنائزیشن کے اکیڈمک سسٹم میں شعبۂ تعلیم و تدریس سے وابستہ ہیں۔

گبریئل گارسیا مارکیز

گارسیا مارکیز بیسویں صدی کا ایک ایسا طلسماتی لکھاری ہے جس کی تحریروں نے پوری دنیا کے فکشن کو متاثر کیا۔ وہ ۱۹۲۸ء کو کولمبیا کے ایک شہر میں پیدا ہوا۔ لاطینی امریکا کے فکشن کا ذکر گارسیا مارکیز کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا ناول ''تنہائی کے سو سال'' بلاشبہ ایک ایسا شاہکار ہے جسے دنیا شاید ہی کبھی بھول پائے۔ اس کی تحریروں کی جاذبیت اور تخلیقی اور فکری اپج کی ایک دنیا قائل ہے۔ اس نے ایک ایسے اسلوب کی طرح ڈالی ہے جس کا خالق بھی وُہی اور خاتم بھی وُہی ہے۔